رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰) جنوری سنہ ۱۹۷۰ء

معارف

مجلس دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنّفین اعظم گڈھ

کتبہ اقبال احمد

جلد ۱۰۵ ماہ شوال المکرم ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۷۰ء عدد ۱

مضامین

مقالات

ادبیات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا چھٹا اجلاس ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ء کو دار المصنفین میں منعقد اور کامیابی کے ساتھ ختم ہوا، اعظم گڈھ اس صوبہ کا دور دراز خطہ اور بہت چھوٹا مقام ہے، یہاں بڑے شہروں کی دلچسپیوں کا کوئی سامان نہیں ہے، اس لیے اندیشہ تھا کہ اس اجلاس میں زیادہ اجتماع نہ ہو سکے گا، لیکن ہم کو مسرت ہے کہ دار المصنفین کی کشش اہل علم کو ملک کے گوشہ گوشہ سے کھینچ لائی اور ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور علمی و اسلامی اداروں کے ساٹھ سے اوپر نمایندے اور دوسرے اصحاب علم شریک ہوئے، اجلاس کی صدارت جناب حکیم عبد الحمید صاحب نے فرمائی اور اس کا افتتاح مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے فرمایا، راقم نے استقبالیہ پیش کیا، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے اپنی افتتاحی تقریر میں اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے اصل مقصد و منشا کو بڑی خوبی سے واضح فرمایا، جو بہت پسند کیا گیا، مقالہ خوانی کی مختلف نشستوں میں اسلامیات کے مختلف پہلوؤں پر فاضلانہ مقالات پڑھے گئے، اختتامی تقریر جناب ڈاکٹر عبد العلیم صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے فرمائی، اور کانفرنس کے مقصد و منشا کو اپنے نقطۂ نظر سے واضح کیا، ان کی تقریر خیالات کے اعتدال و توازن کی بنا پر ہر خیال کے اہل علم میں پسند کی گئی، آخری دن شب کو عربی مدارس کے نصاب اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح پر ایک مذاکرہ ہوا، اس میں متعدد اہل علم اور اساتذہ نے اپنے خیالات ظاہر کیے،

کانفرنس کے سلسلہ میں دارالمصنفین کے نوادر اور قلمی نسخوں کی نمائش بھی کی گئی تھی، اسکا افتتاح جناب حکیم عبدالحمید صاحب نے فرمایا، دارالمصنفین کا کتبخانہ کتابوں کی تعداد کے لحاظ سے زیادہ بڑا نہیں ہے لیکن مذہب اسلام اور اسلامی تاریخ وثقافت کی تحقیق پر ایسا کلکشن اور منتخب ذخیرہ دوسرے کتبخانوں میں مشکل سے ملے گا، جس کا اعتراف کانفرنس کے اہل علم شرکاء نے بھی کیا، اس کی مطبوعہ کتابوں میں بھی بہت سی خصوصاً تاریخ، جغرافیہ اور طبقات وتراجم کی کتابیں اب نایاب ہیں مخطوطات میں بہت سے نسخے اپنی قدامت، تاریخی اہمیت نایابی اور حسن خط وغیرہ کے لحاظ سے نادر ونایاب ہیں، اس لیے یہ نمائش خاص طور سے اہل علم کی توجہ کا مرکز رہی، علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی تصانیف کے ان کے قلم کے مسودوں خصوصاً سیرۃ النبی، شعرالعجم، سوانح مولانا روم کے مسودوں اور مولانا شبلی کے دوسرے قلمی آثار کو بڑی دلچسپی سے دیکھا گیا، مولانا شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ہندوستان اور بیرون ہند کے اکابر کے خطوط کے البم سے بھی بڑی دلچسپی لی گئی۔

اس اجتماع کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ندوہ کے ابتدائی دور کی طرح قدیم اور جدید تعلیم کے نمائندے ایک مقصد کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے اور ان کو آپس میں تبادلۂ خیالات کا موقع ملا، اور دونوں کی راہیں جدا ہونے کے باوجود اسلامیات کی تحقیقات کے بارہ میں ایک نقطۂ اتصال نکل آیا جس پر مولانا سید ابوالحسن علی اور ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کی تقریریں شاہد تھیں، یہ اس اجلاس کی بہت بڑی کامیابی اور مولانا شبلی کے خواب کی روشن تعبیر ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مولانا سید ابوالحسن علی نے کانفرنس کے آیندہ اجلاس کیلئے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے دعوت دی، کانفرنس کی بیشتر تقریبات شبلی کالج کی عمارت میں انجام پائیں، جو دارالمصنفین سے بالکل ملا ہوا ہے، کالج کے پورے اسٹاف نے کانفرنس کے جملہ انتظامات میں بڑی محنت وجانفشانی کی، اور اسکی کامیابی میں اسکا بڑا حصہ ہے، کالج نے مہمانوں کے اعزاز میں ایک پرتکلف عصرانہ بھی دیا، کالج اور دارالمصنفین ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں، اس لیے کالج کا شکریہ ادا کرنا خود اپنا شکریہ ادا کرنا ہے،

یہ کانفرنس کی مختصر روداد ہے، مفصل روداد اور خطبۂ صدارت آئندہ مہینہ شائع ہوگا۔

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ مفتی محمد قائم صاحب فرنگی محلی نے انتقال فرمایا۔ مرحوم درس و تدریس اور فقہ و فتاویٰ میں خانوادۂ فرنگی محل کی آخری یادگار تھے، ایک مدت تک مدرسہ حنفیہ جونپور کے صدر مدرس رہے، مگر ادھر عرصہ سے کبرسنی کے باعث خانہ نشین ہوگئے تھے، چند برسوں سے بالکل معذور ہوگئے تھے، مگر اس حالت میں بھی افتا کا کام جاری تھا، اور مولانا محمد رضا فرنگی محلی ان کی نگرانی میں اسکو انجام دیتے تھے، فقہ کے علاوہ حدیث و رجال پر بھی ان کی وسیع نظر تھی، جس پر ان کی تصنیف معیار الحدیث شاہد ہے، اخلاق و وضعداری میں پرانے بزرگوں کا نمونہ تھے، ان کی وفات سے فرنگی محل کی علم و فضل کی آخری یادگار مٹ گئی۔ والبقاء للہ وحدہٗ۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

جامعہ ملیہ کی تعمیرات کے نقشہ میں ایک مسجد بھی تھی، اور اس کے لیے پچاس ہزار کی رقم بھی جمع تھی، لیکن مختلف موانع کی بنا پر ابتک اس کی تعمیر کی نوبت نہ آسکی تھی، وفات سے کچھ دنوں پہلے مسجد کی تعمیر کی طرف ڈاکٹر ذاکر صاحب کی بڑی توجہ ہوگئی تھی، اس کا نقشہ بھی تیار ہوگیا تھا، مگر ابھی تعمیر شروع نہیں ہوئی تھی کہ ان کا وقت آخر ہوگیا، ان کی موت نے ارباب جامعہ کو مسجد کی تعمیر کے لیے مستعد کر دیا، چنانچہ اس کی تعمیر شروع ہوگئی ہے، اس کے مصارف کا تخمینہ پانچ لاکھ ہے، جو جامعہ کی مسجد کے لیے کوئی بڑی رقم نہیں ہے، ہم کو امید ہے کہ مسلمان خاص طور سے بڑے تاجر اس کارخیر میں پورا حصہ لیں گے، اور سرمایہ کی کمی کی وجہ سے تعمیر میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہوگی۔ چندہ کی رقم مہتمم تعمیر مسجد جامعہ نگر، جامعہ ملیہ نئی دہلی کے نام بھیجی جائے۔

مقالات

معالم السنن امام خطابی

از ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

شکوک و اعتراضات کے جواب امام ابو سلیمان خطابی نے احادیث کے متعلق اعتراضات و شبہات کے جواب بھی تحریر فرمائے ہیں، جو اہم اور معلومات افزا ہونے کے علاوہ ان کی عالمانہ شان اور دقت نظر کا بھی نمونہ ہیں، اس لیے اس کی چند مثالیں پیش کیجاتی ہیں۔

مانعین زکوٰۃ کے ساتھ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے طرز عمل کے بارہ میں طویل بحث کی ہے، اس کے وہ حصے جو اعتراضات اور انکے جواب پر مشتمل ہیں، یہاں درج کیے جاتے ہیں، اردو میں حضرت ابو بکرؓ کی مفصل و مبسوط سوانح عمریاں لکھی جاچکی ہیں لیکن ان میں یہ مباحث موجود نہیں ہیں۔

اعتراضات حسب ذیل ہیں:-

(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رائے سے اختلاف کیا مگر آخر میں یہ فرمایا کہ

فلما رأیت ان اللہ قد شرح　　جب میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت

صدر ابی بکر عرفت انه الحق۔ — ابوبکرؓ کے لیے شرح صدر فرمادیا ہے تو میں بھی سمجھ گیا کہ وہی حق ہے (جو حضرت ابوبکرؓ فرما رہے ہیں)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے محض حضرت ابوبکرؓ کی تقلید پر اکتفا کر لیا تھا اور ان کو معصوم اور خطا، ولغزش سے بَرا سمجھنے لگے تھے۔

(۲) حضرت ابوبکرؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو کفار سے موسوم کیا، حالانکہ عام مسلمانوں کو اس بارہ میں تامل و تردد تھا۔

(۳) قرآن مجید کی آیت :۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (توبہ - ۱۰۴)

تو ان کے مال میں سے صدقہ لے تاکہ تو اس کے ذریعہ ان کو پاک اور بابرکت بنادے اور ان کو دعا دے، بیشک تیری دعا ان کے لیے تسکین ہے۔

میں خطاب صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کیونکہ اس کو ایسی شرطوں سے مقید کیا گیا ہے جو آپ کے سوا کسی دوسرے میں نہیں ہوسکتیں، مثلاً صدقہ دینے والوں کی تطہیر و تزکیہ اور ان کے لیے صلوٰۃ و دعا کرنا صرف آپ ہی کے شایان شان ہے

ان احتمالات کی موجودگی میں حضرت ابوبکرؓ کو مانعین زکوٰۃ کو معذور سمجھنا چاہیے تھا، اور ان کے خلاف تلوار اٹھانے سے باز آجانا چاہیے تھا، انھوں نے ان لوگوں کے ساتھ جو سخت گیری کی وہ انکے سوءِ خلق اور درشتی طبع وغیرہ کا نتیجہ تھا۔

ان اعتراضات کا جواب یہ ہے :۔

(۱) مرتدین کی دو قسمیں تھیں، ایک نے دین سے برگشتہ ہوکر دوبارہ کفر اختیار کر لیا تھا

ان ہی لوگوں کے متعلق حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا ہے (وکفر من کفر من العرب)۔ ان میں بھی دو طرح کے لوگ تھے، ایک جو مسیلمۂ کذاب اور اسود عنسی کو مانتے تھے، اور نبوت محمدی کے منکر ہو گئے تھے، حضرت ابوبکرؓ نے ان سے جنگ کرکے ان کا قلع قمع کر دیا، دوسری قسم میں وہ لوگ تھے جو دین سے منحرف اور شرائع اسلام کے منکر ہو گئے تھے، انھوں نے نماز و زکوٰۃ اور دوسرے اہم ارکان دین ترک کرکے زمانۂ جاہلیت کی روش اختیار کر لی تھی۔

ایک جماعت ان لوگوں کی تھی جو نماز و زکوٰۃ میں فرق کرتی تھی، یہ لوگ نماز کے قائل تھے مگر زکوٰۃ کی فرضیت کے منکر تھے اور اس کا ادا کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے، یہ لوگ درحقیقت باغی تھے لیکن اس نام سے موسوم کیے جانے کے بجائے ان کو بھی مرتدین کے زمرہ میں شامل کر لیا گیا تھا، کیونکہ ٹھیک اسی زمانہ میں جب ارتداد کا سیلاب اُمڈا تھا، ان لوگوں نے بھی شورش اور بغاوت برپا کر دی تھی، اس حیثیت سے ان کی بغاوت کو بھی اس کی ایک شاخ قرار دیکر اس پر ارتداد کا اطلاق کر دیا گیا۔

مانعین زکوٰۃ میں بعض لوگ زکوٰۃ دینا چاہتے تھے لیکن ان کے لیڈروں نے انھیں روک دیا تھا، جیسے قبیلہ بنی یربوع کے لوگوں نے صدقات جمع کرکے حضرت ابوبکرؓ کے پاس بھیجنا چاہا، لیکن مالک بن نویرہ نے روک دیا اور تمام صدقات ان ہی میں تقسیم کر دیے۔ ان ہی مانعین زکوٰۃ کے بارہ میں صحابہ کے درمیان اختلاف پیدا ہوا تھا، خصوصاً حضرت عمرؓ ان سے قتال کے بارے میں سخت متردد تھے، چنانچہ انھوں نے حضرت ابوبکرؓ سے بحث کی اور دلیل میں رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش کیا:۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ فمن قال لا الٰہ الا اللہ	مجھے لوگوں سے قتال کا حکم دیا گیا ہے تاآنکہ وہ لا الٰہ الا اللہ نہ کہدیں پس جس نے لا الٰہ الا اللہ کہدیا

فقد عصم نفسه وماله اس نے اپنی جان ومال کو محفوظ کر لیا،

مگر یہ استدلال محض ظاہر کلام پر مبنی تھا، حضرت عمرؓ نے اس کے تمام پہلوؤں اور معاملہ کی تمام شرطوں اور عواقب پر غور نہیں کیا تھا، جب حضرت ابوبکرؓ نے ان کو بتایا کہ زکوٰۃ حق المال کا نام ہے، اور جان ومال کی عصمت کا معاملہ ان کی ان شرطوں کے پورا کرنے سے معلق ہے، اور جو حکم دو شرطوں سے معلق ومشروط ہو وہ صرف ایک شرط کے پائے جانے اور دوسری کے مفقود ہونے کی صورت میں پورا نہیں ہو سکتا، حضرت ابوبکرؓ کا دوسرا استدلال نماز پر زکوٰۃ کا قیاس تھا، کیونکہ تارک صلوٰۃ سے قتال پر صحابہ کا اجماع ہے، اس لیے انھوں نے زکوٰۃ کے مختلف فیہ مسئلہ کو نماز کے متفق علیہ مسئلہ پر قیاس کیا، حضرت عمرؓ کا استدلال عموم پر اور حضرت ابوبکرؓ کا قیاس پر مبنی تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قیاس سے عام کی تخصیص ہو سکتی ہے، اور ایک چیز کے بارہ میں وارد ہونے والا خطاب جن چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے، جیسے شرط واستثناء وغیرہ، ان سب کا ان کی صحت میں بھی اعتبار کیا جائے گا۔

اس لیے جب حضرت عمرؓ پر حضرت ابوبکرؓ کی رائے کی صحت ثابت ہوگئی اور حق وصواب منکشف ہوگیا تو انھوں نے مانعین زکوٰۃ سے جنگ کرنے میں ان کی رائے مان لی۔ ان کے مذکورۂ بالا قول کا یہی مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ کا ایسی دلیل وبرہان کے ذریعہ شرح صدر فرما دیا جس پر نص ودلالت موجود تھی،

(۲) دوسرا اعتراض کرنے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ لوگ دین سے بے بہرہ تھے، ان کی ساری متاع بہتان، افترا، تکذیب اور اسلاف پر نکتہ چینی ہے، پہلے اعتراض کے ضمن میں مرتدین کی مختلف قسموں کے ضمن میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ ان میں کافر کون لوگ تھے، اور مانعین زکوٰۃ کی حیثیت باغیوں کی تھی، وہیں یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ ان کو مرتدین کے زمرہ میں شامل کیے جانے کی وجہ کیا تھی؟

(۳) رہا آیت میں خطاب کا مسئلہ تو قرآن مجید میں خطاب کی تین صورتیں ہیں:۔

(الف) خطاب عام مثلاً

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ	اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب
إِلَى الصَّلٰوةِ (مائدہ۔ ۶)	تم لوگ نماز کے لیے اٹھو۔

یا مثلاً

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (بقرہ ۱۸۳)	اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا۔

وغیرہ

(ب) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخصوص خطاب۔ اس طرح کے خطاب میں آپ کی تخصیص اور دوسروں کے شریک نہ ہونے کی مخصوص علامت موجود ہوتی ہے، مثلاً

وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ	اور کچھ رات جاگتا رہ قرآن کے ساتھ یہ
(اسرائیل۔ ۷۹)	زیادتی ہے تیرے لیے۔

یا جیسے فرمایا:۔

خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ (احزاب ۵۰)	یہ خاص ہے تیرے لیے سوائے سب مسلمانوں کے

(س) تیسری نوعیت کے خطاب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب روئے سخن ہونے کے باوجود آپ کے ساتھ پوری امت اس میں شامل ہوتی ہے، جیسے:۔

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ	قائم رکھ نماز کو سورج ڈھلنے سے رات کے
إِلَىٰ غَسَقِ اللَّيْلِ (بنی اسرائیل۔ ۷۸)	اندھیرے تک۔

دوسری جگہ ہے:۔

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ	سو جب تو پڑھنے لگے قرآن تو پناہ لے اللہ کی
مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ (نحل۔ ۹۸)	شیطان مردود سے۔

یا مثلاً فرمایا:-

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ	اور جب تو ان میں موجود ہو پھر
الصَّلٰوةَ (نساء - ۱۰۱)	نماز میں کھڑا کرے۔

ظاہر ہے آفتاب ڈھلنے کے وقت ہر مسلمان کے لیے نماز قائم کرنا واجب ہے، اور قرآن پڑھنے والے تمام لوگوں کے لیے استعاذہ کا حکم ہے، اسی طرح جس مسلمان کو بھی دشمنوں سے مقابلہ کی صورت میں نماز فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو اس کو اسی طرح نماز پڑھنی چاہیے جس طرح نبی اکرمؐ نے پڑھی ہے۔

زیر بحث آیت (خذ من اموالھم صدقۃ الخ) میں بھی اسی نوعیت کا خطاب ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت کے معاملات کے ذمہ دار کو بھی لوگوں سے صدقہ وصول کرنے میں آپ کے اصول و ہدایات کی پابندی کرنی ہوگی۔

اس طریقہ خطاب کا فائدہ یہ ہے کہ نبی خدا کی جانب سے داعی اور اس کی مراد و منشا کو لوگوں سے بیان کرنے والا ہوتا ہے، اس لیے اس کو خطاب میں مقدم کر دیا جاتا ہے، تاکہ امت دین کے احکام و شرائع میں اس کے اس طریقہ و منہاج کی پیروی کرے جو انہوں نے اس کے لیے متعین و مقرر کر دیا ہے، اسی مفہوم کی رعایت اس آیت میں بھی کی گئی ہے:-

يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ	اے نبی جب تم طلاق دو عورتوں کو تو
فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (طلاق-۱)	ان کو طلاق دو ان کی عدت پر۔

آپ کی اہمیت کے پیش نظر مخصوص طور پر آپ سے خطاب ہے، مگر حکم کے عموم کے پیش نظر پوری امت کو اس میں شریک کر لیا گیا ہے، بعض مواقع پر خطاب آپ سے ہوتا ہے لیکن اس سے آپ کے بجائے دوسرے لوگ مراد ہوتے ہیں، جیسے:-

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ	سو اگر تو ہے شک میں اس چیز سے کہ اتاری

إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ	ہم نے تیری طرف تو پوچھ ان سے جو پڑھتے
الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَاءَكَ	ہیں کتاب تجھ سے پہلے، بیشک آئی ہے تیرے
الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ	پاس حق بات تیرے رب سے، تو تو ہرگز مت ہو
الْمُمْتَرِينَ (یونس - ۹۴)	شک کرنے والا۔

ظاہر ہے کہ نبی پر جو کچھ اتارا گیا ہے اس کے بارہ میں اس کو کبھی کسی طرح کا شک نہیں ہو سکتا۔

رہا صدقہ دینے والے کے لیے دعا اور تطہیر و تزکیہ تو اس میں بھی کوئی اشکال نہیں، اللہ و رسول کی اطاعت کے ذریعہ یہ سب چیزیں حاصل کی جاسکتی ہیں، اور اسی پر کیا موقوف ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اطاعت کے جس کام پر بھی ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے وہ آپ کی وفات سے ختم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے امام اور عاملین صدقہ کو صدقہ دینے والے کے مال میں اضافہ و برکت کی دعا کرنا مسنون و مستحب ہے[۱]، اور اللہ تعالیٰ سے یہ امید رکھنی چاہیے کہ وہ دعا کو قبولیت بخشے گا اور سوال کو مسترد نہیں کرے گا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت زکوٰۃ کی فرضیت تسلیم نہ کرے اور وہ امام کو زکوٰۃ دینے سے انکار کردے تو کیا اس کو بھی باغی قرار دیا جائے گا، اور اسکے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس زمانہ میں زکوٰۃ کی فرضیت کا منکر بالاتفاق کافر سمجھا جائے گا، اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ کے مانعین زکوٰۃ کو معذور قرار دیے جانے کے باوجود ان سے جو جنگ کی گئی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حق کی ادائیگی کے لیے آمادہ ہو جائیں، انکی خونریزی مقصود نہ تھی۔

ان دونوں جماعتوں میں فرق کرنے کی متعدد وجہیں ہیں، وہ زمانہ عہد نبوت سے قریب تھا،

---

[۱] مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم لکھتے ہیں: "اب بھی ائمہ کے نزدیک مشروع ہے کہ جو شخص صدقہ لائے، امام مسلمین بحیثیت وارث نبی ہونے کے اس کے لیے دعا کرے، البتہ جمہور کے نزدیک لفظ "صلوٰۃ" کا استعمال نہ کرے جو حضور کا مخصوص حق تھا"
(ترجمۂ قرآن شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی ص ۲۶۳ - مدینہ پریس)

اس میں احکام نازل اور تبدیل ہو رہے تھے۔ دوسرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت یہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، اور دین کے امور و معاملات سے ناواقف تھے، اس لیے شکوک و شبہات میں مبتلا ہوگئے تھے اس بنا پر ان کو معذور سمجھا گیا جیسا کہ خود کلام مجید میں ایسے لوگوں کے لیے یہ رعایت ہے

لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ　　　جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان پر

جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا (مائدہ - ۹۳)　　　گناہ نہیں، اس میں جو کچھ پہلے کھا چکے۔

لیکن اس زمانہ میں اسلام کی پوری طرح اشاعت ہو چکی ہے، اور زکوٰۃ کے وجوب کا علم اتنا مشہور ہو چکا ہے کہ عام و خاص اور عالم و جاہل کوئی اس سے بے خبر نہیں رہا، اس لیے اب اس کے انکار کی تاویل کرنے والے کو معذور نہیں سمجھا جائے گا یہی حال اُن تمام امور دین کا ہے جن پر امت کا اجماع و اتفاق ہے اور جو پوری طرح معلوم و مشتہر ہو چکے ہیں، جیسے پنجوقتہ نماز، رمضان کے روزے، جنابت کا غسل، زنا، شراب اور محرمات سے نکاح کی حرمت وغیرہ۔ ان سب کے انکار کرنے والے کا وہی حکم ہوگا، البتہ اگر کوئی نیا نیا مسلمان ہوا ہو اور دین کے حدود وغیرہ سے پوری طرح واقف نہ ہو اور اس ناواقفیت کی وجہ سے کسی چیز کا انکار کر دے تو اس کو کافر نہیں قرار دیا جائے گا۔ یا جن امور پر اجماع ہو لیکن ان کو عموماً صرف خواص ہی جانتے ہوں جیسے بیوی کی پھوپھی اور خالہ سے نکاح، قاتل عمد کا میراث سے محروم ہونا اور دادی کا چھٹا حصہ وغیرہ تو اس طرح کے احکام کے منکر کی بھی تکفیر نہیں کی جائیگی، بلکہ اس کو معذور قرار دیا جائے گا، کیونکہ اس نے ایسے حکم کا انکار کیا جس کی نہ شہرت ہوئی ہے اور نہ عوام کو ان سے واقفیت ہوئی ہے۔

حدیث کی تاویل میں شکوک و شبہات پیدا ہونے کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے[1] اس کے بعض حصے

---

[1] حضرت ابوہریرہؓ کی روایت یہ ہے:-

عن ابی هريرة قال لما توفی رسول الله صلی الله علیه وسلم　　　حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(باقی حاشیہ ص ۱۳ پر)

حذف اور بعض کو مختصر کر دیا ہے، کیونکہ اس کو مکمل بیان کرنا اور واقعۂ ارتداد کی تفصیل پیش کرنا مقصود نہ تھا، بلکہ وہ صرف حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے مباحثہ کی حکایت اور مانعین زکوٰۃ سے قتال کے بارہ میں ان بزرگوں کے اختلاف و استدلال کی روداد بیان کرنا چاہتے تھے، دوسرے حضرت ابوہریرہؓ نے اس وجہ سے بھی واقعہ کو بعینہ اور حدیث کو مکمل بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ جن لوگوں سے وہ اس کو بیان کر رہے تھے وہ اس کو اور اس کی نوعیت کو اچھی طرح جانتے تھے، اس لیے اس کے بعض حصوں کے حذف و اختصار میں کوئی حرج اور عذر نہیں تھا،

اس کے مقابلہ میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور حضرت انس بن مالکؓ کی روایتوں میں بعض اضافے مذکور ہیں، امام ابوداؤد نے حضرت انسؓ کی حدیث کتاب الجہاد میں نقل کی ہے اور وہ یہ ہے:

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲)

واستخلف ابوبکر بعدہ وکفر من کفر من العرب قال عمر بن الخطاب لابی بکر رضی اللہ عنہما کیف تقاتل الناس، قد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ فمن قال لا الٰہ الا اللہ عصم منی مالہ ونفسہ الا بحقہ وحسابہ علی اللہ قال ابوبکر رضی اللہ عنہ واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ فان الزکوٰۃ حق المال واللہ لو منعونی عقالا کانوا یؤدونہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتھم علی منعہ فقال عمر بن الخطاب فواللہ ما ھو الا ان رأیت اللہ قد شرح صدر ابی بکر للقتال فعرفت انہ الحق (معالم ج ۲ ص ۲)

کا انتقال ہوا اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کئے گئے اور عرب کے لوگوں میں بعض کافر ہوگئے تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا آپ کس طرح لوگوں سے جنگ کریں گے جبکہ رسول اللہؐ نے یہ فرمایا ہے کہ مجھے لوگوں سے قتال کا حکم دیا گیا ہے تاآنکہ وہ لا الٰہ الا اللہ نہ کہدیں، پس جس نے لا الٰہ کہدیا اس نے مجھ سے اپنی جان و مال کو محفوظ کر لیا سوائے ان حقوق کے جن میں یہ حرمت ختم ہو جاتی ہے اور اس کا ذمہ اللہ پر ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا بخدا میں نماز و زکوٰۃ میں تفریق کرنے والوں سے جنگ کروں گا کیونکہ زکوٰۃ مال میں خدا کا حق ہے، بخدا اگر ان لوگوں نے اونٹ کے باندھنے والی رسی جس کو وہ رسول اللہؐ کو دیتے تھے دینے سے انکار کیا تو اس کے روکنے پر بھی میں ان سے جنگ کروں گا، حضرت عمرؓ نے کہا بخدا (اسکی یہ حالت اور دلائل فقہ)

عن انس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم امرت ان اقاتل الناس حتى يشهدوا ان لا اله الا الله وان محمدا عبده ورسوله وان يستقبلوا قبلتنا وان ياكلوا ذبيحتنا وان يصلوا صلاتنا فاذا فعلوا ذلك حرمت علينا دماؤهم واموالهم الا بحقها لهم ما للمسلمين وعليهم ما على المسلمين

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اسوقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ اس بات کی شہادت نہ دیدیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد خدا کے بندے اور رسول ہیں، نیز وہ ہمارے قبلہ کو اختیار اور ہمارا ذبیحہ کھانے اور ہماری نمازیں ادا کرنے لگیں، جب لوگ یہ تمام کام کرنے لگیں گے تو ہمارے اوپر انکی جان و مال حرام و ممنوع ہوجائے گا۔ بجز ان صورتوں کے جن میں جان و مال کا ذمہ ختم ہوجاتا ہے انکو وہی حقوق حاصل ہونگے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں اور ان پر وہ ذمہ داریاں بھی عائد ہونگی جو مسلمانوں پر عائد ہیں۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث کو جس میں زکوٰۃ کی شرط کا اضافہ ہے، امام بخاری نے اپنی جامع صحیح میں بیان کیا ہے:-

عن ابن عمر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال امرت ان اقاتل الناس حتى يشهدوا ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله ويقيموا الصلوٰة ويؤتوا الزكوٰة فاذا فعلوا

حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اسوقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی اور نماز و زکوٰۃ ادا کرنے لگیں

ذالک عصموا منی دماءھم واموالھم	جب وہ یہ باتیں کرنے لگیں تو اپنی جان اور
الا بحق اللہ وحسابھم علی اللہ	مال کو مجھ سے محفوظ کریں گے. علاوہ اس سزا
	کے جو اسلام نے (کسی جرم میں) ان پر مقرر
(معالم السنن ج ۲ ص ۳ تا ۱۱)	کر دی ہے اور انکا حساب اللہ کے ذمہ ہوگا۔

حج کے بیان میں انھوں نے ایک اور اہم اعتراض کا جواب دیا ہے، اس سے ہمارے زمانہ کے منکرین حدیث کی بھی تردید ہوتی ہے،

بعض ناواقفوں اور ملحدوں نے جو رسول اللہ کی حدیثوں پر طعن اور ائمہ محدثین اور رواۃ حدیث سے گستاخی کرنے میں بیباک واقع ہوئے ہیں، یہ اعتراض کیا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر میں ایک ہی حج کیا تھا تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ نے افراد، قران، تمتع تینوں حج کیے ہوں، اور آپ سے حج کے جو مناسک و احکام مروی ہیں وہ کس طرح مختلف ہو سکتے ہیں، اسی طرح حج کے متعلق مروی تمام حدیثوں کی سندیں کیونکر قوی، جید اور صحیح ہو سکتی ہیں، جبکہ ان میں تناقض و اختلافات موجود ہیں، دراصل ان لوگوں کا مقصد احادیث کا استخفاف اور حاملین و رواۃ حدیث پر طعن و تشنیع ہے، حالانکہ اگر ان میں حسن ذوق، معرفت صحیح اور احادیث میں توفیق و تطبیق کی صلاحیت ہوتی تو وہ اس قسم کے اعتراضات کی جسارت نہ کرتے، امام شافعی نے اپنی کتاب "اختلاف الحدیث" میں اس کا نہایت عمدہ اور تشفی بخش جواب دیا ہے، ان کی جامع اور پُر مغز تحریر کا ملخص یہ ہے :۔

عربی زبان کا یہ مشہور اسلوب ہے کہ کسی کام کا حکم دینے والے کی طرف بھی اس کام کی ویسے ہی نسبت کر دیجاتی ہے جس طرح خود اس کے کرنے والے کی جانب کی جاتی ہے، مثلاً اگر کسی شخص نے کسی گھر کی تعمیر کا حکم دیا تو کہتے ہیں (بنی فلان دارا) یا امیر و حاکم کسی کو سزا دینے کا

حکم دے تو اس موقع پر کہا جاتا ہے (ضرب الامیر فلانا) حدیث میں بھی ہے کہ

رجم رسول الله ماعزا رسول اللہ نے حضرت ماعزؓ کو سنگسار کیا۔

دوسری حدیث میں ہے:

قطع سارق رداء صفوان رسول اللہ نے حضرت صفوانؓ کی چادر چرانے والے کے ہاتھ کاٹ دیے،

حالانکہ آپ نے حضرت ماعزؓ کو سنگسار کرنے کا حکم دیا تھا، وہاں آپ موجود بھی نہیں تھے، اسی طرح آپ نے چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تھا۔ غرض اس کی مثالیں کلام عرب میں بے شمار ہیں، اسی طرح رسول اللہ کے بعض صحابہ نے افراد، بعض نے قران اور بعض نے تمتع کیا تھا۔ مگر ان سب نے مناسک و احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے سیکھے اور معلوم کیے تھے۔ اس لیے ان کی نسبت آپ کی جانب اس لحاظ سے جائز ہے کہ آپ ہی نے ان کی اجازت اور حکم دیا تھا، اس طرح ہر صحابی کی بات درست اور سب کا بیان ٹھیک تھا،

میرے خیال میں اس کی ایک اور توجیہ بھی ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ کچھ صحابہ نے آپ کو صرف "لبیک بحج" کہتے ہوئے سنا ہو، اس لیے انھوں نے یہ بیان کیا کہ آپ نے افراد کیا تھا، اور چونکہ "وعمرة" کو انھوں نے نہیں سنا تھا اس لیے اس کو نہیں بیان کیا، جیسے حضرت عائشہؓ، لیکن جن لوگوں نے کچھ اور بھی سنا تھا انھوں نے اس کو بھی بیان کیا، مثلاً حضرت انسؓ، جو فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو تو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "لبیک بحج وعمرة"، اور شہادتوں کی طرح اخبار و احادیث میں بھی اضافے غیر مقبول نہیں ہوتے، اختلاف و تناقض صرف اس صورت میں ہوگا جب اضافہ اور زیادتی سے دوسرے قول کی نفی و تردید ہوتی ہو، لیکن اگر وہ مثبت ہو تو اس میں کسی شک اور تناقض کا سوال ہی نہیں رہتا،

یہ احتمال بھی ہے کہ بیان کرنے والے نے آپ سے جو کچھ سنا اس کی نوعیت دوسروں کو تعلیم و تلقین

کرنے کی رہی ہو، یعنی آپ نے لبیک بحج و عمرۃ کہنے کے باوجود خود افراد ہی کیا ہو،

باقی جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آپ نے تمتع کیا تھا وہ حضرت عائشہؓ کے اس بیان کو کہ آپ نے حج کا احرام باندھا اور حضرت انسؓ کی اس روایت کو کر من العمرۃ والحج کو تسلیم کرتے ہیں اور بعض دوسری روایتوں سے اس کو مزید محکم بناتے ہیں۔

اس لیے بظاہر مختلف ہونے کے باوجود ان حدیثوں میں کذب کی کوئی آمیزش نہیں اور نہ ان کی تکذیب کی گنجائش ہے، اور ان کے درمیان تطبیق و توفیق نہ صرف ممکن بلکہ بالکل آسان ہے[1]،

ایک اور اعتراض اور اس کا جواب ملاحظہ ہو:۔

مکہ کی حرمت اور فتح کے سلسلہ کی ایک حدیث میں ہے کہ

ان اللہ حبس عن مکۃ الفیل و	اللہ نے مکہ سے ہاتھی والوں کو روک دیا اور
سلط علیھا رسولہ والمومنین	ان پر اپنے رسول اور مومنین کو مسلط کر دیا۔

اس پر بعض ملاحدہ کا اعتراض یہ ہے کہ "زمانۂ جاہلیت میں تو اللہ تعالیٰ نے ہاتھی والوں سے مکہ کو بچایا لیکن زمانۂ اسلام میں حجاج بن یوسف سے جب اس نے کعبہ میں منجنیق نصب کی، آگ لگائی قتل و خونریزی کی، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ اور ان کے رفقاء کو مسجد کے اندر قتل کیا، نہیں بچایا، اسی طرح قرامطہ کو بھی جنھوں نے کعبہ کو لوٹا، اس کا غلاف اتار لیا، حجر اسود کو توڑا پھوڑا اور اسکو اٹھالے گئے اور علماء حجاج اور نیکوکار مسلمانوں کو کعبہ کے سامنے قتل کیا، نہیں روکا"۔ امام خطابی اس کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

"بعض علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اصحاب فیل کو روکنا آپ کی نبوت کی علامت اور دلیل کے طور پر تھا، اور آپ کے آباء کی حرمت و عظمت شان کے پیش نظر ایسا کیا گیا تھا، کیونکہ یہ لوگ حرم کے رہنے والے اور کعبہ کو آباد کرنے والے تھے، اس لیے یہ گویا نبوت کی غیبی تائید اور مخالفین نبوت کے لیے ایک حسی دلیل تھی، اگر خانۂ کعبہ کا دفاع نہ کیا گیا ہوتا تو اہل حرم جو مسلمانوں کے آباء و اسلاف تھے،

---

[1] معالم السنن ج ۲ ص ۱۶۰ تا ۱۶۲

ہلاک ہو جاتے۔ دوسرے اللہ تعالیٰ کا اس سے خاص مقصد یہ تھا کہ اپنے رسول کی نبوت پر اس سے حجت قائم کردے، اور یہ در اصل ان کے اندر نبوت کے ظہور کی تمہید تھی، چنانچہ اسی سال رسول اللہؐ کی ولادت ہوئی، اہل عرب چونکہ جاہل اور علم وحکمت اور بصیرت سے محروم تھے، اس لیے وہ ان ہی باتوں کو جان سکتے تھے، جن کا حس ومشاہدہ کے ذریعہ ادراک ہو سکتا ہے، اس بنا پر اگر خانہ کعبہ کو ڈھانے والوں کو نہ روکا گیا ہوتا تو ان کے لیے نبوت کے ایسے دلائل وشواہد مہیا نہیں ہو سکتے تھے، جو ان پر پوری حجت بن سکتے، لیکن جب اللہ نے دین کو غالب، اس کا پرچم بلند اور اس کے دلائل واضح کر دیے اور اس کے اعوان وانصار کی تعداد بہت بڑھ گئی، اس وقت خانہ کعبہ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو دین کے لیے مضر اور مسلمانوں کی بصیرت کے لیے نقصان رساں ہوتی، اور یہ جو کچھ ہوا وہ اللہ کی جانب سے اس کے بندوں کا امتحان تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے صبر ومجاہدہ کو آزمانے اور ان کو اپنے مزید فضل وکرم اور مغفرت وغیرہ سے نوازنے کے لیے ایسا کیا تھا، اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے خلق وامر دونوں اسکے اختیار میں ہے، و تبارک اللہ رب العالمین۔" (ج ۲ ص ۲۱۹-۲۲۰)

طرز استدلال معالم السنن میں بحث واستدلال کا انداز نہایت دلکش اور دلنشین ہے، جس سے مسئلہ کی صحیح نوعیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، اس لیے حسن استدلال کے چند نمونے بھی تحریر کیے جاتے ہیں:

ہزیل بن شرحبیل اودی بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور سلمان بن ربیعہ کے پاس آیا اور اس نے سوال کیا کہ ایک میت کے ورثا میں ایک لڑکی، ایک پوتی اور ایک حقیقی بہن موجود ہیں، ان کے حصے کیا ہوں گے؟ ان لوگوں نے بتایا کہ لڑکی کو نصف اور بہن کو نصف ترکہ ملے گا، اور پوتی کو کچھ نہیں ملے گا، پھر سائل کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں جانے کے لیے کہا، جب اس شخص نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں اس کا وہی جواب دوں گا جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، یعنی بیٹی کو نصف اور ثلثین کی تکمیل

کے لیے ایک حصہ (تہائی) پوتی کو اور باقی ترکہ بہن کو ملے گا۔

امام خطابی اس کی توجیہ وتشریح میں لکھتے ہیں :-

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیوں کی موجودگی میں بہن عصبہ ہوتی ہے، یہی اکثر صحابہ وتابعین اور عام فقہاء کا مسلک ہے۔ صرف حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس میں عام صحابہ سے اختلاف کیا ہے، انکا خیال ہے کہ متوفی کے اگر لڑکی اور بہن موجود ہوں تو لڑکی کو نصف اور بہن کو کچھ بھی ترکہ نہیں ملے گا، جب بعض لوگوں نے ان سے عرض کیا کہ حضرت عمرؓ کا فتویٰ اور فیصلہ اسکے خلاف ہے تو انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ زیادہ واقف ہے یا یہ لوگ، اس سے اس آیت کی طرف اشارہ تھا:

ان امرؤ هلك ليس له ولد وله	اگر کوئی آدمی فوت ہوگیا اور اسکی کوئی
اخت فلها نصف ما ترك (نساء)	اولاد نہ ہو اور بہن ہو تو اسکو نصف ترکہ ملیگا،

بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہن کے وارث ہونے کے لیے اولاد کا نہ ہونا شرط ہے لیکن عام صحابہ نے اس کی تفسیر میں سنت وحدیث کے اس بیان کو پیش نظر رکھا ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں ولد کا اطلاق صرف اولاد ذکور پر کیا جائے گا، لڑکیاں اس میں شامل نہیں ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ ولد کے لفظ سے اول وہلہ میں یہی خیال بھی ہوتا ہے، گو لڑکیوں پر بھی لڑکوں کی طرح اولاد کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے، ہم نے جو بات کہی ہے قرآن مجید میں اس کے متعدد شواہد ونظائر موجود ہیں، مثلاً کفار کا ایک جگہ یہ قول نقل ہوا ہے کہ

لاوتين مالا وولدا (مریم)	مجھکو مل کر رہے گا مال اور اولاد

دوسری جگہ ہے :-

ولن تنفعكم ارحامكم ولا اولادكم (ممتحنہ)	ہرگز کام نہ آئیں گے تمھارے کنبے والے اور تمھاری اولاد

ایک اور آیت میں ہے :

انما اموالکم واولادکم فتنة (توبہ) تمہارے مال اور اولاد ہی ہیں جانچنے کو

ان آیتوں سے بداہتہً یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ولد سے مقصود و مراد اولاد ذکور ہیں اور اولاد اناث مراد نہیں ہیں، یہی عربوں کی مالوف عادت بھی ہے کہ وہ لڑکیوں کی کثرت کو فخر و عزت کا باعث نہیں بلکہ باعث شرم سمجھتے تھے اور انھیں زندہ درگور کر دیتے تھے۔

ولد کے لفظ میں ٹھیک اسی طرح کی تخصیص پائی جاتی ہے جس طرح کی تخصیص مال کے لفظ میں ہے، کیونکہ جب وہ مطلقاً بولا جاتا ہے تو عرف کے اعتبار سے اس سے محض ابل (اونٹ) مراد ہوتے ہیں اور دوسری اقسام کے مال کا اس پر اطلاق نہیں ہوتا۔

پس جب یہ ثابت ہوگیا کہ آیت زیر بحث (ان امرؤ هلك ليس له ولد وله اخت الخ) میں ولد سے صرف اولاد ذکور مراد ہیں، اور لڑکیاں اس میں شامل نہیں ہیں تو بہنوں کو لڑکیوں کی وجہ سے ترکہ سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ (ج ۴ ص ۹۴ و ۹۵)

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں متعہ کی ممانعت فرمائی ہے، امام خطابیؒ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں :۔

"متعہ کی حرمت پر مسلمانوں کا اتفاق ہے، صدر اسلام میں یہ ضرور مباح تھا لیکن حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے اس کو حرام قرار دیدیا، یہ آپ کی زندگی کے آخری دور کا واقعہ ہے، اس لیے اس کے متعلق مسلمانوں کے ائمہ میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا، بجز بعض شیعوں کے جو اس کی اباحت کے قائل ہیں، اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ بھی مضطر اور مجبور کے لیے اس کو تاویلاً مباح قرار دیتے تھے، لیکن بعد میں وہ بھی اس کا فتوی دینے سے باز آ گئے تھے، ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی شخص طویل مدت کے لیے وطن سے باہر ہو اور عسرت و مجبوری کی وجہ سے وہاں نکاح کرنا ممکن نہ ہو

تو یہ صورت اختیار کرنے میں مضائقہ نہیں ہے، سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کے فتویٰ کا اچھے انداز میں ذکر نہیں کیا جاتا تو انھوں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا، اور فرمایا کہ خدا کی قسم میرا یہ مطلب نہیں ہے، میں نے متعہ کی حلت کا صرف اس لیے حکم دیا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے مضطر اور مجبور لوگوں کے لیے اس قسم کی رخصتیں عطا کی ہیں، چنانچہ اضطرار میں مردار، سور کا گوشت اور خون کھانا مباح ہے، یہ صورت بھی بعینہٖ اسی طرح کی ہے"۔

امام خطابی نے اس رائے پر یہ نقد کیا ہے:۔

" حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے نص کے بجائے قیاس پر اعتماد کیا ہے، حالانکہ یہ قیاس صحیح نہیں ہے، کیونکہ زیر بحث مسئلہ میں ضرورت اور اضطرار اس طرح سے متحقق اور ثابت نہیں ہوتے جس طرح مردار وغیرہ کھانے میں ثابت و متحقق ہیں، کیونکہ کھانے پر زندگی کا دارومدار ہے اور نہ کھانے سے انسان مر جاتا ہے، یہاں تو صرف غلبۂ شہوت کا معاملہ ہے جس پر قابو پایا جا سکتا ہے، شریعت نے اس کے لیے روزے تجویز کیے ہیں، اور بعض طبی اشیا کے ذریعہ بھی اس کا تدارک ممکن ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں چیزوں کا حکم ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے"۔ (ج ۳ ص ۱۹۰ و ۱۹۱)

وجوہ و مصالح شریعت کے احکام و قوانین حکم و مصالح پر مبنی ہیں، چنانچہ خود بعض آیتوں اور حدیثوں میں وجوہ و علل کا ذکر ہوتا ہے اور صحابۂ کرام میں متعدد بزرگوں نے احکام کی مصلحتیں اور حکمتیں بیان کی ہیں، اور ان کے بعد لوگوں نے بھی اس کی طرف توجہ کی ہے، امام خطابی کا نام اس حیثیت سے بھی ممتاز ہے، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ شریعت کے اسرار و مصالح پر اپنی بے نظیر کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

" صحابہ کے بعد تابعین و تبع تابعین اور علمائے مجتہدین نے بھی شریعت کے احکام کی علتیں اور مصلحتیں بیان کی ہیں، اور ان کے اسرار و وجوہ کو جاننے اور سمجھنے کی کوششیں کی ہیں...... پھر امام غزالی

امام خطابی اور عزالدین بن عبدالسلام وغیرہ نے اللہ ان کی مساعی قبول فرمائے، بڑے لطیف نکتے اور عمدہ تحقیقات پیش کئے ہیں۔" (ج ۱ ص ۵)

ذیل میں معالم السنن سے اس کی چند مثالیں درج کیجاتی ہیں :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

وبالغ فی الاستنشاق خوب اچھی طرح ناک کی صفائی کرو،

امام خطابی فرماتے ہیں کہ وضو میں استنشاق کی اس قدر اہمیت اور تاکید اس لیے کی گئی ہو کہ اس سے قرآن پڑھنے میں مدد اور تلاوت کرنے میں بہت آسانی ہوتی ہے، کیونکہ سانس لینے کا راستہ جب خوب صاف ہوجاتا ہے اور ناک کی تمام کثافتیں جب زائل ہوجاتی ہیں تو مخارج اور حروف ٹھیک ٹھیک اور صحیح طور سے ادا ہوتے ہیں" (معالم السنن ج ۱ ص ۵۵)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھل کو بدوصلاح سے پہلے بیچنے سے منع کیا ہے، اس کے باوجود حکم بیان کرتے ہوئے امام خطابی لکھتے ہیں :-

"عموماً پھل بدوصلاح کے بعد آفتوں اور تباہیوں سے محفوظ و مامون رہتا ہے، لیکن بدوصلاح سے پہلے نرم اور تازہ رہنے اور گٹھلی اور بیج کے سخت نہ ہونے کی وجہ سے اس کو عوارض وآفات لاحق ہونے کا زیادہ خطرہ رہتا ہے،

بائع کو اس سے منع کرنے کی دو وجہیں ہیں، ایک یہ کہ بدوصلاح کے بعد پھل کی قیمت اور اس کا منافع بڑھ جاتا ہے، اور اس سے بائع کا مال ضائع نہیں ہوتا۔ دوسری وجہ یہ ہو کہ اس سے بائع اپنے مسلمان بھائی کی خیرخواہی کرتا ہے اور اس کے مال کو تباہی سے بچاتا ہو، مال ضائع ہونے کی صورت میں مشتری نے اگر بائع سے اپنے مال کا مطالبہ کیا تو دونوں کے درمیان اختلاف برپا ہوجانے کا اندیشہ رہتا ہے، اور اگر وہ ورع و احتیاط کی بنا پر مطالبہ

نہیں کرتا تو بائع کے لیے یہ اکل مال بالباطل ہے، اسی طرح مشتری کو روکنے کا مقصد اس کو دھوکہ اور خطرہ سے بچانا ہے، کیونکہ عموماً اس قسم کا مال آفات کی وجہ سے تلف ہوجاتا ہے، اس لیے اس بیع کی ممانعت کی وجہ اموال کی حفاظت اور بیع میں دھوکہ وغیرہ کی کراہت ہے۔" (ج ۲ ص ۸۲)

آگے چل کر بیوع غرر کی مختلف قسموں کا ذکر کرنے کے بعد ان کی ممانعت کا یہ سبب بیان کیا ہے کہ" اس قسم کی بیع سے منع کرنے کی وجہ مال کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھنا اور جھگڑے اور نزاع کا تدارک ہے۔" (ج ۳ ص ۸۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ" غصہ کی حالت میں قاضی کو دو شخصوں کے درمیان فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔" شیخ نے اس کی حکمت یہ بتائی ہے کہ" غصہ عقل کو تبدیل اور طبیعتوں کا اعتدال و توازن ختم کردیتا ہے، اسلیے آپ نے غصہ زائل ہونے تک فیصلہ کرنے میں توقف کرنے کا حکم دیا ہے، اور جو چیزیں بھی اس قبیل کی ہیں، ان کو بھی اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے، مثلاً سخت بھوک، شدید خوف اور تکلیف دہ بیماری وغیرہ، اس لیے ان حالتوں میں بھی فیصلہ کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔" (ج ۴ ص ۱۶۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ" امامت کا سب سے زیادہ مستحق وہ شخص ہے جو اقرأ یعنی کتاب اللہ کو سب سے زیادہ بہتر پڑھنے والا ہو، اس کے بعد اس شخص کا حق ہے جو سب سے زیادہ سنت سے واقف ہو، اور اس کے بعد ہجرت میں سبقت و قدامت والے کا اور اس کے بعد زیادہ عمر والے کا درجہ ہے۔" امام خطابی اس ترتیب کی حکمت میں لکھتے ہیں کہ" یہی بالکل ٹھیک اور صحیح ترتیب ہے، کیونکہ آپ نے امامت کے سب سے مقدم اور بنیادی جزء، قرأت کو مقدم قرار دیا ہے، اس میں ایک خاص نکتہ اور حکمت یہ ہے کہ عرب کے لوگ امی اور ناخواندہ تھے، اس لیے ان کا جو شخص کچھ بھی قرآن جانتا تھا وہ نہ جاننے والے کے مقابلہ میں امامت کا زیادہ مستحق تھا، کیونکہ نماز بغیر

قرأت کے ہو ہی نہیں سکتی، اور جب قرأت نماز کی اہم ضروریات اور ارکان میں ہے تو اس کو ترتیب میں دوسری خارجی چیزوں پر مقدم ہونا چاہیے، اس کے بعد سنت کا ذکر ہے، جو فقہ و بصیرت اور احکام کے متعلق رسول اللہ صلعم کے ہدایات و ضوابط کو جاننے کا نام ہے، کیونکہ اگر امام نماز کے احکام اور اس کے اندر ہونے والی بھول چوک اور کمی بیشی سے ناواقف ہوگا تو اس کو فاسد کر دیگا، اس لیے اس کو جاننے والا اور اس میں فقہ و بصیرت رکھنے والا اس کو اور اس کے احکام کو نہ جاننے والے پر مرجح ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ معرفت سنت کا قرأت کے بعد ذکر کیا ہے لیکن فقیہ و عالم بالسنۃ اگر نماز کے جواز کے بقدر قرآن پڑھ سکتا ہو تو وہ ماہر قرأت سے زیادہ امامت کا مستحق ہوگا، اس لیے کہ فقہ و احکام کے علم اور سنت کی معرفت میں اس کا درجہ کمتر ہے۔

قاری کو مقدم اور ترتیب میں پہلے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عام صحابہ کے اگر حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں وہی شخص اقرا ہوتا تھا جو شخص افقہ بھی ہوتا تھا حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جب کوئی شخص ایک سورہ یاد کر لیتا تھا تو جب تک اس سے اچھی طرح واقف اور اس کے حلال و حرام سے پوری طرح باخبر نہیں ہو جاتا تھا اس وقت تک دوسرا سورہ نہیں سیکھتا تھا، (او کما قال) البتہ صحابہ کے بعد یہ کیفیت ختم ہو گئی ہے اور اب اکثر لوگ قرآن پڑھ سکتے ہیں مگر اس کو سمجھ نہیں سکتے، اس لیے قرّا زیادہ اور فقہا و علما کم ہو گئے۔

اس کے بعد آپ نے قدیم الہجرۃ شخص کا درجہ قرار دیا ہے، گو اب ہجرت تو موقوف ہو چکی ہے، تاہم اس کی فضیلت کی حیثیت موروثی ہے، اس بنا پر مہاجرین کی اولاد یا وہ جن کے آباء و اسلاف کو ہجرت و اسلام میں شرف و تقدم حاصل تھا، ان لوگوں پر جن کے آباء و اسلاف کو اس قسم کی فضیلت و تقدم حاصل نہیں ہے، ترجیح حاصل ہو گی، اگر ان سب حیثیتوں سے

لوگ مساوی ہوں تو معمر آدمی کو بڑھایا جائے گا، کیونکہ سن و سال کی بڑائی بجائے خود ایک فضیلت ہے، دوسرے اگر کوئی شخص دوسرے لوگوں سے عمر میں زیادہ اور بڑا ہے تو اس کو اسلام میں بھی شرف و تقدم حاصل ہوگا، اس اعتبار سے اس کی حیثیت اُس شخص جیسی ہوگی جسکو ہجرت کے لحاظ سے امتیاز و سبقت حاصل ہے۔" (معالم السنن ج ۱ ص ۱۶۶ تا ۱۶۸)

بعض احکام کے مصالح نہایت دقیق ہوتے ہیں، ان کے متعلق یہ اصولی بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ مقصود شریعت کی پیروی اور اتباعِ سنت ہے، خواہ اسباب و مصالح معلوم ہوں یا نہ معلوم ہوں، چنانچہ حضرت عمرؓ نے حجر اسود کے بارہ میں فرمایا کہ" میں جانتا ہوں کہ تو محض ایک پتھر ہے، جو نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتا، اگر رسول اللہ کو میں نے تجھے چومتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں بھی تجھے نہ چومتا۔"

امام خطابی اس ضمن میں لکھتے ہیں:۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اتباع سنت مقدم و واجب ہے، خواہ احکام کی علتیں معلوم ہوں یا نہ معلوم ہوں، رہا حجر اسود کا معاملہ تو اس کی عظمت و اکرام یا برکت وغیرہ کے خیال سے اس کا بوسہ لیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے بعض پتھروں کو بعض سے افضل قرار دیا ہے، جس طرح اس نے بعض مقامات اور شہروں کو یا بعض راتوں، دنوں اور مہینوں کو فضیلت و برتری عطا کی ہے، اصل چیز تسلیم و رضا ہے، تاہم اس کو عقلاً بالکل محال اور مستبعد بھی نہیں قرار دیا جا سکتا، جیسا کہ بعض حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حجر اسود کی حیثیت دنیا میں اللہ کے یمین کی ہے، اس لیے اس کو چومنا درحقیقت اللہ تعالیٰ سے ایک طرح کا معاہدہ کرنا ہے جس طرح کہ بادشاہوں سے ان کے مقربین اور مخصوص لوگ مصافحہ یا بیعت وغیرہ کرکے یا خدام و ممالیک رؤسا اور سرداروں کے ہاتھوں کا بوسہ لیکر معاہدہ کرتے ہیں، اس لیے یہ در اصل تشبیہ و تمثیل ہے۔ واللہ اعلم۔" (ج ۲ ص ۱۹۱ - ۱۹۲)

(باقی)

عروس البلاد بمبئی کے تاریخی خط و خال

از جناب انوار احمد صاحب سوپاروی

(۳)

مسلم دورِ حکومت | ۱۴۲۹ء میں ملک التجار (ریاست بہمنی کا سپہ سالار) نے جب کوکن کی تسخیر کا قصد کیا اور اس علاقہ پر یلغار کرتے ہوئے ماہم اور سالسٹ پر مسلط ہوگیا تو احمد شاہ والیِ گجرات نے فوراً اس کی دست درازیوں کی سختی کے ساتھ روک تھام کے لیے ایک لشکر روانہ کیا اور ملک التجار کو ماہم سے راہ فرار اختیار کرنا پڑی، وہ وہاں سے شہر تھانہ کی طرف چلا گیا، جہاں اسے زبردست ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور اس طرح یہ علاقہ دوبارہ سلطان گجرات کی مملکت میں محسوب ہونے لگا۔

علاء الدین خلجی نے رام دیو کو نہ صرف اس کی ساری ریاست لوٹا دی تھی بلکہ نوساری کا علاقہ بھی اس کے سپرد کر دیا تھا، رام دیو کے بعد شنکر دیو، دیوگیری کے تخت پر رونق افروز ہوا، جس نے بادشاہ دہلی کو سالانہ خراج دینے سے انکار کرکے بادشاہ کو چراغ پا کر دیا جس پر علاء الدین نے ۱۳۱۲ء میں اس پر فوج کشی کرکے اسے قتل کر دیا، اور ہرپال دیو حکمرانی کرنے لگا، اس نے بھی کچھ عرصہ بعد بادشاہ دہلی سے بے وفائی کرکے اپنا تخت و تاج کھو دیا (۱۳۱۸ء)، ہرپال دیو کی نافرمانی، سرکشی اور اس کے عبرت انگیز انجام کے بعد ۱۳۱۸ء میں سلطان قطب الدین مبارک شاہ اول نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ علاقہ بمبئی (ماہم) کو اس کی مملکت میں شامل کر دیا جائے، اور اس خطہ کا

مرکزی شہر تھانہ قرار دیا گیا، اور ماہم میں شاہی فوج کا مستقر قائم کیا گیا۔

دہلی میں تغلق خاندان کے برسر اقتدار آنے کے بعد فیروز شاہ نے ظفر خاں نامی ایک امیر کو گجرات اور شمالی کوکن کا صوبیدار مقرر کر کے روانہ کیا، جس نے بعد میں بغاوت کا علم بلند کر کے مملکتِ گجرات کی جداگانہ بنیاد ڈالی اور مظفر شاہ اول کے نام سے حکمرانی کرنے لگا (سنہ ۱۳۹۱ء تا سنہ ۱۴۱۲ء)

ظفر خاں جب اس علاقہ کا ناظم اعلیٰ بن کر آیا تو نوساری اور ماہم میں دو گورنر مقرر تھے، جو عہد خلجی کی یادگار تھے۔ ان دونوں کو ظفر خاں نے معطل کر کے اپنے معتمد افسروں کا تقرر کیا اور اس طرح سارے علاقہ پر پوری طرح قابض ہو گیا۔ سلطان احمد شاہ (سنہ ۱۴۱۲-۴۱ء) کے عہد میں ملک اشرق کو ماہم کا ناظم مقرر کیا گیا، جس کا ایک عظیم کارنامہ تاریخی حیثیت کا حامل ہے، اس نے قابل کاشت آراضی کی از سر نو پیمائش کرا کے سرکاری آمدنی میں اضافہ کیا۔ اس عرصہ میں بھیم راج کے بھنڈاری سردار نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اور ماہم پر قبضہ کر لیا، اسکی بغاوت ابھی فرو بھی نہ ہوئی تھی کہ سلطان احمد شاہ (دکن) نے بھی شمالی کوکن کو فتح کرنے کے لیے فوج روانہ کی۔ اس خبر نے سلطان گجرات کو برہم کر دیا، چنانچہ اس نے اپنے بیٹے ظفر خاں کو اس کی گوشمالی کے لیے روانہ کیا، دکنی اور گجراتی فوجوں میں آبنائے تھانہ کے قریب تصادم ہوا، دورانِ جنگ میں دکنی فوج کو شہزادہ علاء الدین بہمنی کی کمک پہنچ گئی، اس کے باوجود گجراتی فوج ظفریاب ہوئی، اس لڑائی میں دو ہزار دکنی سپاہ اور ۲۰ امیر کام آئے، اور حسن بصری کا بھائی حسین گرفتار کر لیا گیا، اس شکست سے سلطانِ دکن انتقام کی آگ میں جلنے لگا۔

قطب خاں حاکم ماہم کی اچانک وفات کے بعد دکنی فوج بمبئی کے قرب وجوار میں آگئی، اس کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے سلطان گجرات نے دوبارہ اپنے بیٹے ظفر خاں کو روانہ کیا، اس فوج کے ساتھ افتخار الملک تھا، جو جنگجو، بہادر اور تجربہ کار جرنیل بھی تھا، اور مخلص الملک (دالبیہر)

کو حکم جاری ہوا کہ وہ جنگی جہازات سے شہزادہ کی مدد کرے، امیر البحر ستر۷۰ جنگی جہاز دیو، گوگھا اور کھمبایت کی بندرگاہوں سے لیکر ماہم کے لیے روانہ ہوا، ماہم پہنچنے کے بعد یہ طے پایا کہ شہر تھانہ پر بیک وقت تری اور خشکی دونوں جانب سے حملہ کیا جائے، اس منصوبہ کے تحت پہلے ملک سہراب کی سرکردگی میں فوج کا ایک حصہ تھانہ کی سمت روانہ ہوا جس نے تھانہ شہر کے کوتوال کو جنگ میں تین دن تک مصروف رکھا. اور اس عرصہ میں شہزادہ اور افتخار الملک ماہم سے متواتر اسے کمک بھیجتے رہے. جس کی وجہ سے کوتوال شہر کی ہمت پست ہوگئی اور اس نے جنگ کو طول دینے میں اپنی حماقت سمجھی، چنانچہ وہ وہاں سے فرار ہوگیا، اس وقت شہزادہ بذات خود شہر تھانہ کے مضافات میں ہی موجود تھا، شہر کے کوتوال کے فرار ہونے سے تھانہ پھر سے گجرات کی تحویل میں چلا گیا، اسی اثناء میں ملک التجار جو موقع کی تاک میں تھا. ماہم پر قابض ہوگیا. گجراتی شہزادہ کو اس کی اطلاع ملتے ہی وہ فوج لے کر ماہم کی طرف بڑھا اور اس کا محاصرہ ڈال کر ملک التجار کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔[1]

اب ہم مسلم عہد کو اس منزل پر چھوڑ کر بمبئی کی وجہ تسمیہ پر بحث کریں گے۔

وجہ تسمیہ بمبئی کے نام کے بارہ میں اختلاف رائے ہے، لفظ "بمبئی" یا "بمبے" یا "ممبئی" (مرہٹی) کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ اس شہر نے یہ نام کہاں سے پایا؟ بعض مقالہ نویسوں نے لکھا ہے کہ یہ دو جداجدا پرتگالی الفاظ کا مرکب ہے، یعنی 'بون' (Buon) بمعنی عمدہ اور "باہیہ" (Bahia) بندرگاہ سے مشتق ہے، یعنی عمدہ بندرگاہ، جو کثرت استعمال سے بمبئی بن گیا۔[2] مگر اصول زبان کے لحاظ سے یہ مرکب "بو باہیہ" بننا چاہیے تھا، جبکہ خود پرتگالیوں نے نہ بو باہیہ کہا

---

[1] Thana Gazetteer XIII Part I Page: 442

[2] Bombay city Gazetteer Part I Page: 19

اور نہ "بوم باہیہ" بلکہ بوم بائم (Bombaim) کہا ہے، پرتگالی دستاویزات میں بھی جن کی رو سے یہ جزائر بادشاہ انگلستان چارلس دوم کی پرتگالی ملکہ کیتھرائن کے جہیز میں دیے گئے تھے، یہی نام درج ہے،[1]

فرائر (Frayer) نے ۱۶۷۳ء میں بون بے، اور اوونگٹن (Ovington) نے ۱۶۸۹ء میں لکھا ہے کہ ابتدا میں یہ جزیرہ بون بے (Boon Bay) کہلاتا تھا، اور گروز (Grose) نے ۱۷۵۰ء میں بوم بائم (Bom baim) لکھا ہے،[2]

بعض مقالہ نویسوں کا یہ خیال ہے کہ اس شہر کو یہ نام پرتگالیوں نے ہی عطا کیا ہے، ایک غلط فہمی پر مبنی ہے جس کا کوئی تاریخی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا، کرنل ریچ ہٹلے، (Col. H Yule) کا قیاس ہے کہ یہ نام "تانہ - مائمبا" سے مشتق ہے، جو سراسر مشتبہ ہے، کیونکہ باربوس (۱۵۱۶ء) نے سرکار کوکن کے لیے "تانہ مائمبا" استعمال کیا ہے،[3]

ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ بمبئی سلطان مبارک شاہ خلجی کے نام کی مناسبت سے بنا ہے، جس نے جزائر بمبئی کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا، اور اس کا نام مبارکپور یا مبارک آباد رکھ دیا تھا، لیکن تاریخی تصریحات کی روشنی میں اس کی تصدیق نہیں ہوتی، بلاشبہ ۱۳۱۸ء میں سلطان مبارک اول (قطب الدین شاہ) کی فوج ماہم اور سالسٹ پر ایک قلیل عرصہ کے لیے قابض ہو گئی تھی، مگر تاریخ میں اس کا کہیں حوالہ نظر نہیں آتا کہ اس نے اس مقام کا کوئی نام بھی رکھا تھا، بلکہ اس دور کے تاریخی حوالوں میں ہر جگہ اسے ماہم لکھا گیا ہے،[4]

---

[1] A short Early History of B'bay. P 33 by P.B. Joshi
[2] Bombay city Gazetteer Part I P. 19
[3] The imperial Gazetteer of India. Vol III P. 74
[4] The Rise of B'bay by S. M Edwardes

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ نام لفظ "مبارک" سے بنا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ جزیرہ سب سے اول اُن عرب جہاز رانوں نے دریافت کیا تھا جو خلیج فارس کے سوپارہ، چول اور تھانہ کی طرف بحری سفر کرتے تھے۔[1]

"مرأت احمدی" میں مملکت گجرات کی پچیس ۲۵ سرکاروں کا تذکرہ ملتا ہے جن میں بمبئی بھی ایک "سرکار" تھی۔ اس کو "منبی" لکھا گیا ہے۔[2]

برگس (Burgess) رقمطراز ہے کہ جزیرہ کا ایک حصہ ماہم کے نام سے موسوم تھا، اور ایک حصہ "مامبے" کہلاتا تھا، اس لیے غور طلب یہ ہے کہ ماہم اور مائمبو (Maiambu) اور ممبئے (Mumbaye) میں کس قدر مماثلت پائی جاتی ہے، ماہم ہی دراصل پورے جزیرہ کا نام تھا، جہاں سب سے اول مسلمانوں نے ایک عالیشان قلعہ تعمیر کیا تھا، اور جب پرتگالیوں نے اس پر قبضہ کیا تو اس قلعہ میں سرکاری دفاتر کھول دیے، جہاں سالسٹ، ٹرامبے، کلیان اور بھمڑی سے آنے والے جہاز چنگی ادا کرتے تھے۔[3]

ہندوؤں کی ایک کتاب "ممبا دیوی مہاتمے" (Mumba Devi Mahatmye) میں ایک مذہبی روایت کا تذکرہ ہے کہ ممبارکھ نامی ایک دیو ان جزائر پر مسلط تھا، جسے برہما سے بڑی عقیدت تھی، برہما اس کی عبادت سے اس قدر متاثر اور خوش ہوا کہ اس نے ممبارکھ سے اس کی دلی مراد کے متعلق استفسار کیا، اس نے یہ انوکھی آرزو کی کہ اس کو حسب خواہش جاندار کی آنکھوں سے اوجھل ہونے کی قدرت حاصل ہو جائے، اس کی خواہش پر اس کو یہ قوت عطا کی گئی، لیکن اس کے بعد وہ انسانوں کو اذیت دینے کے درپے ہوگیا،

---

۱ Bombay town & Island materials. Part III. P. 644

۲ Mirat-Ahmadi By Ali Md. Khan. Translated by James Bird. P. 110

۳ "Guide To Bombay" by J. M. Maclean. P. 2-3

یہاں تک کہ ممبا دیوی نے اس کو ختم کیا، اس ممبا دیوی[1] کے نام کی مناسبت سے ان جزائر کو ممبئی یا ممبئی کہنے لگے۔[2]

پرشوتم بال کرشن جوشی رقمطراز ہیں کہ بلاشبہ شہر ممبئی نے ممبا دیوی سے یہ نام حاصل کیا، لیکن تحقیق اس امر کی متقاضی ہے کہ آخر یہ لفظ "ممبا" کہاں سے پیدا ہوا؟ جوشی کی رائے میں لفظ "ممبا" منگا (Munga) یا موگا (Muga) سے مشتق ہے۔ یہ نام غالباً اس ماہی گیر (کولی) کا رہا ہوگا جو اول اول اس دور افتادہ علاقہ میں متوطن ہوا تھا، اور اس نے ممبا دیوی کے مندر کی بنیاد ڈالی تھی، یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ یہ لفظ امبا بھوانی (Amba Bhavani) (ہندوؤں کی ایک مقدس دیوی) سے بنا ہو، کولیوں میں کالی۔ مہا کالی کی طرح امبا بھی "مہا امبا" کے نام سے معروف ہے، اور "آئی" بمعنی ماں، احتراماً تقریباً ہر ہندو دیوی کے نام کے ساتھ لگایا جاتا ہے۔ اس طرح لفظ "ممبئی" (Mumbai) بھی "مہا + امبا + آئی = ممبائی سے بنا ہے"۔[3] یہ تصریح کسی حد تک قابل قبول ہے، ایسے کئی مقامات ہیں جن کے نام مقامی دیوی کے نام سے منسوب ہیں، مثلاً (۱) وسی (بسین) یہ نام وتسلا دیوی یا وتسا سے مشتق ہے۔ وتسا + آئی = وتسئی، اور کثرت استعمال سے وسی بن گیا۔ (۲) گورئی (سالسٹ میں ایک مقام کا نام۔ گورے گاؤں) گوری + آئی = گورئی۔ (۳) جوگیشی (جوگیشوری): جوگئی + آئی = جوگ آئی = جوگئی۔

---

[1] ممبا دیوی کا مندر بوری بندر ریلوے اسٹیشن اور میونسپل کارپوریشن کے دفاتر کے قرب وجوار میں موجود تھا، جو ۱۷۶۶ء میں وہاں سے ہٹا کر پائدھونی (Pydhonie) کے مقام پر بنایا گیا۔ اس مندر کو پانڈو رنگ شیوا جی نامی ایک غریب شخص نے تعمیر کرایا تھا اور وہی اسکا پجاری بھی تھا۔" (The Origin of Bombay. P.46)

[2] Early History of The Town & Island of Bombay. by P.B. Joshi P. 39/40

[3] Short sketch of early history of Bombay. by P.B. Joshi. P.39-40

ڈی کاسٹرو (De Castro)۔ (سنہ ۱۵۳۸ء)، اس جزیرہ کو "بوا وڈا" (Boa-Vida) یعنی Good life (خجستہ حیات) کے نام سے موسوم کرتا ہے، یہ نام اس سبب پڑا کہ یہاں سامان خورد و نوش کی فراوانی تھی[۱]، دوسری جگہ اس نے بوم بائم لکھا ہے، اس کی کتاب ۱۵۳۸ء کی تصنیف ہے، ۱۵۳۴ء میں سیماؤ بوٹلہو نے بھی بوم بائم اور بون بائم لکھا ہے، اس نے ماہم کو مائم (Maym)، مزگاؤں کو Mazaguão اور والکیشور کو Valequecer لکھا ہے، لیکن لفظ بوم بائم یا بون بائم کی وضاحت نہیں کی ہے، ڈاکٹر جان فرائر لکھتا ہے کہ "چول سے جب ہم چلتے ہیں تو ساحلی جزائر میں سب سے پہلے Bombain ملتا ہے"[۲]

خافی خاں (نظام الملک) پرتگالیوں کی قلعہ بندی کے سلسلے میں اسے "منبی" (انگریزوں کا تعلقہ) ہی لکھتا ہے[۳]۔

اس طویل بحث کی روشنی میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ ممبئی اور ممبا دیوی میں تاریخی مماثلت ہی دراصل اس عروس البلاد کے نام کا باعث بنی۔

عربوں کی ساحل ہند سے دلچسپی

ظہور اسلام سے صدیوں قبل عرب ہندوستان کے مغربی ساحل سے روشناس تھے، اور Agatharcides (سنہ ۱۸۰ ق م تا سنہ ۱۴۰ ق م) کے زمانہ میں ساحل ہند کے چند مقامات پر عربوں کی کئی بستیاں موجود تھیں، اور صدیوں کے تجارتی اور ثقافتی تعلقات کی بنا پر ان عربوں کا اثر و رسوخ اسقدر بڑھ گیا تھا کہ

---

[۱] Bombay place-Names & street names. by S.T. Sheppard. P37

[۲] The Origin of B'bay. Dr. Decunha. P. 44

[۳] منتخب اللباب حصہ سوم ص ۳۵۷ ترجمہ: محمود احمد فاروقی۔

یہاں کے نچلے طبقہ کے ہندوؤں نے عربوں کا آبائی مذہب تک اختیار کرنے میں تامل نہیں کیا، [۱]
اسلامی دور میں سب سے پہلے عہد فاروقی میں کوکن کے ساحل پر عربوں نے حملہ کیا، دوسری بار ۶۳۶ء میں کھمبایت پر، ۷۶۰ء میں بھڑوچ اور ۷۷۶ء اور ۷۸۰ء میں کاٹھیاواڑ پر حملے ہوئے، اس زمانہ میں یہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد مستقل بود و باش اختیار کر چکی تھی، اور یہاں کا حکمراں خانوادہ سلہارا ان مسلمانوں پر حد درجہ مہربان تھا، انھیں ہر قسم کی سیاسی، سماجی اور تجارتی مراعات حاصل تھیں، المسعودی نے اس خاندان کے ایک فیاض اور رحمدل حکمراں جھانج کی مسلمان دوستی کا تذکرہ کیا ہے۔

بیشتر مسلمان محض تجارتی مقصد کے لیے ان مقامات میں بس گئے تھے، اور صدیوں تک پُرامن زندگی بسر کرتے رہے، ان میں بعض وہ مسلمان بھی تھے جو اپنے کو اکابر صحابۂ کرام کی اولاد بتاتے تھے،

سقوط سلطنت گجرات اور پرتگالیوں کا عروج | احمد شاہ سے لیکر بہادر شاہ کے عہد تک جزائر بمبئی (۱۴۱۱ء تا ۱۵۳۴ء) گجرات میں شامل تھے، مرأۃ احمدی میں ان جزائر کا ذکر ملتا ہے،

۱۳۴۷ء میں علاء الدین بہمنی نے رائری (رائے گڈھ) کے راجہ کو باجگذار بنا کر اس کی لڑکی سے جو "پری چہرہ" کے نام سے مشہور تھی، شادی کر لی، ۱۴۶۹ء میں بہمنی فوج کے مشہور سپہ سالار خواجہ محمود گاواں نے دابھول پر قبضہ کر لیا، ۱۴۹۰ء میں ملک احمد نامی نے احمدنگر میں نظام شاہی مملکت کی بنیاد ڈالی، اور ایک دوسرے امیر نے بیجاپور میں عادل شاہی خاندان کی نظامت کی داغ بیل ڈالی۔

ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے قیام کے وقت حکومت گجرات انتہائی عروج پر تھی،

---

[۱] Thana Gazetteer XIII Part I. P. 61

اس لیے اس وسیع وعریض مملکت پر مذکورۂ بالا ریاستوں کی حریصانہ نظریں پڑنا شروع ہوئیں۔ چنانچہ تین ہی سال کے بعد نظام شاہی نے ڈانڈا، راجپور اور شمالی کوکن کے چند مقامات پر نہایت خاموشی کے ساتھ قبضہ کر لیا۔ بہادر گیلانی نے سلطنتِ گجرات کی بندرگاہوں پر وقتاً فوقتاً دھاوا بولنا شروع کر دیا، اور کچھ دنوں کے بعد اس نے یاقوت نامی اپنے ایک حبشی غلام کو بیس جنگی جہاز کے ساتھ جزائر بمبئی کی طرف روانہ کیا، جس نے ان پر قبضہ کر لیا۔ لیکن یہ قبضہ بہت تھوڑے دنوں تک قائم رہا، اور بعد کی ایک لڑائی میں وہ خود مارا گیا۔

محمود شاہ بیگڑہ کے عہد میں پرتگالیوں کا اثر ورسوخ ساحلی مقامات پر بتدریج بڑھ رہا تھا۔ وہ سلطنت گجرات کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں رہا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے ماہم (بمبئی) میں بڑی وحشت پھیلائی اور ان کی چیرہ دستیوں سے ساحلی علاقہ کا امن وامان ختم ہو گیا۔ اس کی خبر سلطان کے کانوں تک پہنچی تو وہ بنفس نفیس ان کی سرکوبی کے لیے نکلا، مگر وہ ڈھانو تک پہنچا تھا کہ خبر ملی کہ امیر البحر ملک ایاز نے پرتگالیوں کو زبردست شکست دے دی اور ان کا سب سے بڑا جنگی جہاز تباہ کر ڈالا۔ یہ خبر ملتے ہی سلطان الٹے قدم گجرات لوٹ گیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہ فتح عارضی ہے۔ چنانچہ سلطان بہادر شاہ کے انتقال کے ساتھ ہی پرتگالی مغربی ساحل کے تمام بندرگاہوں پر قابض ہو گئے، اور ۱۵۷۲ء میں علاقہ گجرات کی اس عظیم المرتبت سلطنت کا خاتمہ ہو گیا جس نے گجرات کے چپہ چپہ پر اسلامی تہذیب وتمدن کے ایسے نقوش چھوڑے ہیں جو آج بھی ان جلیل القدر حکمرانوں کی عظمت کی نشاندہی کر رہے ہیں، اور انکے عہد کے فن تعمیر میں ہندو مسلم ذوق کے گہرے اثر سے انکی مذہبی رواداری ظاہر ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے

کہ اکبر کے حرم میں ایک پرتگالی حسینہ بھی تھی جس نے اپنی قوم کو خصوصی مراعات دلوائی تھی، یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ اکبر کو ہموار کرنے میں روڈولف اقواویہ (Rodolfo Aquaviva) کا بڑا ہاتھ تھا، جسے اکبر نے گوا سے شاہی دربار میں مدعو کیا تھا[1]، ان مراعات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر پرتگالیوں کی دست درازیاں بہت بڑھ گئیں۔

مخدوم شاہ کا مزار | یہاں سے تاریخ بمبئی کے مسلم عہد پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ گو ایک طویل مدت تک یہ علاقہ مسلمان حکمرانوں کے زیر اقتدار رہا لیکن اس سرزمین کو انھوں نے شاید قابل توجہ نہیں سمجھا، تاہم کو البتہ اپنا فوجی مستقر بنا رکھا تھا، جو جنگ میں کارآمد ثابت ہوتا تھا، اس پورے علاقہ میں صرف ماہم اس دور کی ایک پرانی یادگار مخدوم شاہ فقیہ علی کا مقبرہ باقی ہے، جو لاکھوں آدمیوں کا مرکز عقیدت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس علاقہ میں مسلمانوں کی حکمرانی برائے نام تھی، اس کے انتظامی اختیارات انھوں نے اپنے مقامی ہندو سرداروں کو دے رکھے تھے۔ ۱۴۶۴ء کے ایک سنگی کتبہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے جس کی رو سے شہر بھرٹی کے ایک ہندو سردار کو تقسیم آراضی کے حقوق حاصل تھے[2]،

جہاز آخرت | ماہم کے مقبرہ کے علاوہ بمبئی کی پرشکوہ جامع مسجد تعمیری نقطۂ نظر سے قابل دید ہے، یہ مسجد ۱۸۰۲ء (۱۲۱۷ھ) میں تعمیری مراحل سے گزری، اس کا تاریخی نام "جہاز آخرت" رکھا گیا جس سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔ ۱۸۳۷ء میں ایک کوکنی رئیس محمد علی اور گھے نے اس کی مرمت اور توسیع کرائی۔

یہ غور طلب بات ہے کہ جنگی نقطۂ نظر سے ایسے اہم ترین جزائر کی طرف مسلمان حکمرانوں نے کیوں توجہ نہ کی، اور غیر اقوام کے لیے ہندوستان میں قدم جمانے میں سہولت پیدا کر دی

---

[1] The Rise of Bombay. Page 59

[2] Thana Gazatteer. Part II Page 441

غالباً اس کی وجہ ان کی بحری قوت کی کمزوری تھی، اور ان کے مقابلہ میں بیرونی قوموں کو بحری برتری حاصل تھی،

دیو پر حملہ | ۱۵۰۸ء میں گوآ کا گورنر ڈون فرانسسکو ڈی المیڈا (Don Francisco de Almeida) انیس ۱۹ جنگی جہازوں اور سولہ سو فوجیوں کے ساتھ دیو (Diu) کی جانب بڑھا، اس کا مقصد دراصل امیر حسین کے اقتدار کو جسے سلطان مصر نے پرتگالیوں کے استیصال کے لیے ہندوستان کے ساحل پر مقرر کیا تھا ختم کرنا تھا، اس کے صرف ایک سال قبل ۱۵۰۷ء میں مصری کپتان امیر حسین نے سلطان محمود بیگڑہ کے بحریہ کی مدد سے چول کے مقام پر پرتگالیوں کو زبردست شکست دی تھی، اس لیے پرتگالی سب سے پہلے دابھول کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئے، دابھول میں مقیم شاہی فوج نے جانبازی سے ان کا مقابلہ کیا، پرتگالیوں کے حوصلے پست ہو رہے تھے کہ المیڈا نے نونو واز پریرا (Nuno Vaz Pereira) کو ایک دوسرے راستے سے دابھول پر فوجکشی کا حکم دیا، اس کا مقصد شہر کی فوج کی توجہ دوسری طرف مبذول کرانا تھا، یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی، پرتگالی شاہی فوج کو شکست دیکر شہر میں داخل ہوگئے، اور اس کو لوٹ کر تباہ کر دیا، یہاں سے ۵ جنوری ۱۵۰۹ء کو بمبئی کا رخ کیا اور ماہم (بمبئی) کی بندرگاہ میں اتر کر اس کو تاراج کیا، ماہم سے نکل کر فروری میں دیو پہنچی، یہاں ملک ایاز اور امیر حسین نے مل کر ان کا مقابلہ کیا، مگر قسمت نے یاوری نہیں کی، امیر حسین سخت زخمی ہوا، اور دیو پر پرتگالیوں نے قبضہ کر لیا، اس قبضہ سے اس کا حوصلہ بہت بڑھ گیا اور ان کو پنپنے کا موقع مل گیا۔

پرتگالی وفد | پرتگالیوں کو ایک محفوظ مقام کی ضرورت تھی، جہاں قلعہ تعمیر کرنا چاہتے تھے، اس مقصد کے لیے ان کا پہلا وفد ۱۵۱۳ء میں سلطان گجرات کے دربار میں حاضر ہوا، اور

دوسرا وفد ۱۵۱۴ء میں، دوسرے وفد نے سلطان سے احمد آباد کے مضافات میں ملاقات کی، اور اپنا مدعا بیان کیا۔ بادشاہ جزیرۂ ماہم ان کے سپرد کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ مگر یہ پرتگالی وفد دیو کے سوا دوسری جگہ کے لیے راضی نہیں ہوا۔ ڈی کہنا کی نگاہ میں دیو کی اہمیت تھی، جہاں سے وہ تجارت بھی کرسکتے تھے، اور جنگی اعتبار سے بھی دیو ساحل ہند، بحیرۂ عرب اور خلیج فارس پر نظر رکھنے کے لیے کھڑکی کا کام دیتا تھا۔[۱] اس لیے یہ دونوں سفارتیں ناکام رہیں۔

پرتگالیوں نے ہندوستان کے مغربی ساحل پر اقتدار بڑھانے کے لیے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ بڑا قابل نفرت تھا۔ لوٹ مار، وحشت انگیزی اور مکر و فریب انکے مخصوص ہتھیار تھے، حصول مقصد کے لیے انکے نزدیک ہر طریقہ جائز تھا۔ ان کے دونوں وفد کی ناکامی نے ان کے تیور بدل دیے اور انھوں نے فتنہ انگیزی شروع کردی۔

۱۵۱۶ء میں ڈوم جاؤ ڈی مونوے (Dom Joao de Monoy) آبنائے باندرہ میں اپنی بحری فوج کے ساتھ داخل ہوگیا اور حاکم ماہم کی مختصر سی فوج کو پسپائی ہوگئی۔ اسی سال چول میں پرتگالیوں نے ایک کارخانہ قائم کیا،[۲] اسی درمیان میں بحر احمر سے مسلمانوں کا ایک تجارتی جہاز ماہم کی بندرگاہ میں داخل ہورہا تھا، جو قیمتی مال تجارت سے لدا ہوا تھا۔ مونوے کی نیت میں پہلے سے فتور تھا۔ باراس (Barras) اس جہاز کو لوٹنے کے بارہ میں لکھتا ہے

"جونہی اتنی جہاز نے پرتگالی جنگی جہازوں کو دیکھا، اس کے عملہ نے اپنے جہاز کو

---

[۱] Garcia D'orta of Bombay by A. X. Soarec. P. 205 Rajoornal

[۲] Thana Gazetteer. Part II P. 449.

کمال عجلت کے ساتھ ماہم کے نزدیک لنگر انداز کر دیا، اور اپنی جان بچالی، پرتگالی
جہاز آگے بڑھے اور تمام سامان کو اپنی تحویل میں لیکر چول کی طرف چلدیے"[۱]

پرتگالی مسلمانوں کے تجارتی جہازوں کی تاک میں رہا کرتے تھے، ۱۵۲۲ء اور ۱۵۲۴ء کے درمیانی عرصہ میں جزائر بمبئی کے سمندر میں پرتگالی قزاقوں کی ٹولیاں لوٹ مار اور غارتگری کے لیے گشت لگایا کرتی تھیں، اس زمانہ میں ڈوم ڈورٹ منیزیز (Dom Duaxte de menezes) گوآ کا گورنر تھا، اس کے اشاروں پر یہ قزاق اپنی سرگرمیاں قائم رکھے ہوئے تھے، ۲۹-۱۵۲۸ء میں لوپ واز (Lop. Vaz) نے چالیس جنگی جہاز اور ایک ہزار پرتگالی سپاہ کو لےکر سلطان گجرات کے ایک بحری بیڑے کو لوٹ لیا جو چول میں ایک باغی سردار کی سرکوبی کے بعد واپس جارہا تھا، جس کی کمان کمال ملک کے بیٹے علی شاہ کے ہاتھ میں تھی،

باغی مغل شہزادہ اب آئے دن سلطان گجرات کو پرتگالیوں کی شرارتوں سے سابقہ پڑنے لگا تھا، دوسری طرف وسط ہند میں مغلوں کی حکومت استوار ہوتی جارہی تھی، اور وہ اپنی مملکت کی توسیع کی فکر میں تھے، اسی زمانہ میں ۱۵۳۳ء میں ایک تیموری باغی شہزادہ محمد زماں مرزا آگرہ سے فرار ہوکر بہادر شاہ کے دربار میں پناہ گزیں ہوا، یہ شہزادہ کئی مرتبہ علم بغاوت بلند کر چکا تھا، اور ایک مرتبہ خود ہمایوں کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی، ہمایوں کو جب معلوم ہوا کہ محمد زماں نے شاہ گجرات کے ملک میں پناہ لی ہے تو اس نے بہادر شاہ کو لکھا کہ وہ شہزادہ کو اس کے حوالہ کردے، بہادر شاہ نے اس کا نہایت توہین آمیز جواب دیا،

بہادر شاہ اور ہمایوں کے باہمی مراسلت اس واقعہ کے بعد بہادر شاہ اور ہمایوں کے درمیان جو تلخ و تند مراسلت ہوئی وہ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے، اس کا مفصل تذکرہ "مرآۃ سکندری"

۱؎ The Rise of Bombay P.66

یں موجود ہے، ہمایوں نے بہادر شاہ کو لکھا تھا کہ وہ شہزادہ محمد زماں (جو ہمایوں کی بہنوئی تھا) بابر کی بیٹی معصومہ بیگم اس سے بیاہی گئی تھی) کو دہلی روانہ کردے، یا گجرات سے نکال دے، بہادر شاہ نے اس کا نہایت سخت جواب دیا، اس کے جواب میں ہمایوں نے لکھا کہ وہ گجرات پر فوج کشی کرنے پر مجبور ہے، بہادر شاہ نے پھر جواب دیا کہ شہزادہ اس کا دوست ہے اسلیے اس کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے[1]۔

قرار نامۂ بسین اس مراسلت نے بہادر شاہ کو بڑی نازک صورت میں مبتلا کردیا، ایک طرف ہمایوں حملہ پر آمادہ تھا، دوسری طرف پرتگالیوں سے اندیشہ تھا، اس لیے بہادر شاہ نے پرتگالیوں سے صلح کرنے میں مصلحت سمجھی، حالانکہ یہ اس کی فاش غلطی تھی جس نے اس کی سلطنت کی بنیاد ہلا کر رکھ دی، اور اس کا انجام دیکھنے کے لیے وہ زندہ نہ رہ سکا، غرض ۲۳ دسمبر ۱۵۳۴ء کو قرار نامۂ بسین (Treaty of Basseen) پر دونوں کے دستخط ہو گئے[2]،

اس صلح نامہ کی رو سے بہادر شاہ شہر بسین، ماہم، بمبئی، دیو وغیرہ سے پرتگالیوں کے حق میں ہمیشہ کے لیے دستبردار ہو گیا، اس طرح پرتگالیوں کی دیو میں قلعہ تعمیر کرنے کی دیرینہ آرزو پوری ہو گئی، درحقیقت عہد نامۂ بسین گجرات کی عظیم الشان سلطنت کے تابوت میں آخری کیل تھی،

پرتگالیوں کی ناقص نظامت اتنے بڑے وسیع علاقہ پر قابض ہونے کے بعد پرتگالیوں نے اس کے انتظامی امور میں مطلق دلچسپی نہیں لی، گویا اس علاقہ سے ان کو کوئی سروکار نہیں تھا، اصل میں جو پرتگالی ہندوستان میں تھے، وہ نظام حکمرانی سے بالکل نابلد تھے، ان میں اکثریت سپاہیوں اور تاجروں کی تھی، جن کا آداب نظامت سے کوئی تعلق نہیں تھا، چنانچہ انھوں نے

---

[1] History of Gujrat, by M. S. Commissariat. P. 348-49
[2] ایضاً

جزائر بمبئی کو چند جاگیروں میں تقسیم کرکے اپنے ہم مذہبوں کی کاشتکاری میں دیدیا، ان کا سب سے بڑا مقصد اپنے مذہب کی توسیع تھا، اس کو واسکوڈی گاما نے اپنے اس تاریخی جملہ میں واضح کیا تھا،

Vimos buscar christaos e especiaria

(ہم عیسائیت کی توسیع و اشاعت اور مسالوں کی تلاش میں یہاں آئے ہیں)[1]

جزائر بمبئی کی تقسیم پرتگالیوں کے زمانہ میں مندرجۂ ذیل تھی :-

(۱) جزیرۂ بمبئی :- مسٹر ڈیگو نامی عیسائی کو ۸۵ روپیہ سالانہ ٹھیکہ پر دیا گیا تھا،

(۲) ماہم :- ایک دوسرے عیسائی کو ٹھیکہ پر دیا گیا تھا،

(۳) مانڈولی اور مجگاؤں :- یہ بھی ایک عیسائی کو ٹھیکہ پر دیے گئے تھے۔

(۴) قصبات پریل، وڈالا، شیو، اور ورلی منویل سیراؤ نامی عیسائی کو صرف ۱۵۴ روپیہ پر دیے گئے تھے۔

(۵) ٹرامبے، جیمور : جاؤ پریز کی تحویل میں تھے۔[2]

پرتگالیوں کے ابتدائی دور میں ہیئت بنشیہ (بمبئی)، سات قصبات پر مشتمل تھا۔
(۱) ماہم (۲) پریل (۳) وڈالا (وارلیا) (۴) شیو۔ یہ تمام قصبۂ ماہم اور مجگاؤں کے زیر انتظام تھے، بمبئی اور وریل (ورلی) قصبۂ بمبئی کی نظامت میں تھے، ان کے علاوہ مختلف چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں، مثلاً جزیرۂ قلابہ، نائیگاؤں، ڈونگری، ان میں قصبۂ بمبئی نسبتاً کم آباد تھا، سولہویں صدی کے نصف آخر میں یہاں چند پرتگالیوں کے

---

[1] The Gazetteer of B'bay City & Island Vol II P. 36/37

[2] Gazetteer of Bombay Vol II P. 31/32

گھرانے اور چند مقامی خاندان مقیم تھے۔[1] یہ مقامی باشندے غالباً کولیوں (ماہی گیر) اور بھنڈاریوں پر مشتمل تھے، مسلمانوں کی آبادی صرف ماہم میں تھی، جن کے بابت گارشیہ ڈا اورتا لکھتا ہے:۔

"مسلمانوں نے سب سے پہلے یہاں قدم رکھا، انھیں "نائط" (Naitias)
کہا جاتا ہے، یہ غیر ملک سے ترک سکونت کرکے یہاں آباد ہو گئے۔"[2]

یہ دراصل کوکنی مسلمان تھے، جن کے آباء و اجداد صدیوں سے ساحل ہند پر آباد تھے، نوائط نے حجاج بن یوسف کے زمانہ میں یہاں سکونت اختیار کی تھی، مسلمانوں کے علاوہ کنبی (Kunbis) اور آگری (Agarie) بھی آباد تھے، جن کا پیشہ زراعت تھا. بھنڈاری، راجہ بھیم دیو کے ساتھ بمبئی آئے تھے، ان کے علاوہ پربھو، ماہم بمبئی اور پریل میں بھی بس گئے تھے، بنیا، پارسی اور اچھوت بھی تھے،

عیسائیت کی تبلیغ جزائر بمبئی، تھانہ اور بسین پر تسلط قائم ہونے کے بعد پرتگالیوں نے مذہبی مہم میں سرگرمی شروع کردی، صرف بسین، تھانہ وغیرہ میں دس ہزار باشندوں کو جبراً عیسائی بنایا گیا، اور جو رقم (۵ ہزار لارن سالانہ) معاہدۂ بسین کی رو سے مسلمانوں کی مساجد کی مرمت وغیرہ پر خرچ کے لیے طے ہوئی تھی، وہ بند کردی گئی اور بسین اور بمبئی کے کلیساؤں پر صرف کیجانے لگی، ایک عالیشان چرچ ماہم (سینٹ مائکل) لیڈی جمشید جی روڈ کے شمالی سرے پر تعمیر کیا گیا، یہ گرجا پرتگالیوں کی بمبئی میں سب سے پہلی عبادت گاہ تھی۔[3]

34185

پرتگالیوں کی تبلیغی سرگرمیوں نے یہاں کے غیر عیسائی باشندوں کی زندگی دشوار کردی

---

[1] The Rise of B'bay. P. 72-73 [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۷۵

فرانسسکن مشن کے بعد ۱۵۴۲ء میں جیسوٹ مشن (Jesuit mission) وارد ہوا، جس کی بنیاد ۲۷ ستمبر ۱۵۴۰ء کو رکھی گئی تھی[۱] اس مشن کا قابل ذکر رکن سینٹ فرانسس زویئر تھا، جسے شاہ پرتگال جان سوم (Joao III) نے ہندوستان اور مشرقی ایشیا، میں تبلیغی کام کے لیے نامزد کیا تھا[۲] دونوں مشنوں کے مبلغین ایک دوسرے پر سبقت لیجانا چاہتے تھے، چنانچہ سینٹ انڈریو (Sh Andrew) (باندرہ) چرچ آف سیو اور آور لیڈی آف سالویشن (Our Lady of Salva-tion) (دادر) جبری مہم کی یادگاریں ہیں، ۱۵۸۵ء میں فرانسسکی مشن نے منڈاپیشور (دہیسر)، ماہم بمبئی، کرنجا اور آگاشی کے چرچ اپنی تحویل میں لے لیے، جہاں ان کے سرکاری پادری مستقلاً مقیم ہو گئے[۳]، انھیں وہ اپنی زبان میں (O Paidos christaos) کہتے تھے،

صرف مجگاؤں کا جزیرہ ایسا تھا، جہاں دونوں مشنوں کے پادریوں میں سے کسی نے مداخلت نہیں کی تھی، یہ جزیرہ ایک سند (۱۸ جنوری ۱۵۷۲ء) کی رو سے ڈی سوزا نامی گھرانے کو انعام میں ملا تھا، ایک دوسری سند (۳ جون ۱۶۳۷ء) میں رے ڈی سوزا کو اس جزیرہ کا مالک تسلیم کیا گیا تھا، اس کے علاوہ دوسرے دیہات جیسوٹ اور فرانسسکن مشن کے زیر انتظام تھے، جہاں عیسائی مبلغین مطلق العنانی کے ساتھ حکمرانی کر رہے تھے، جیسوٹ مشن کی ایک باقاعدہ مسلح فوج بھی تھی، جس نے یہاں کے غیر عیسائی باشندوں پر ظلم و استبداد کی انتہا کر دی تھی، ہندوؤں کے مندر اور مسلمانوں کی مسجدیں مسمار اور جبری تبدیل مذہب کرنا ان کا معمول بن گیا تھا[۴] اسلیے کئی غیر عیسائی خاندان یہاں سے ترک سکونت

---

[۱] History of mission in India by Julius Richter, P. 45 [۲] ایضاً ص ۴۶

[۳] Rise of Bombay P. 77 [۴] ایضاً ص ۹۰، [۵] ایڈورڈ نے اپنی تصنیف میں جیسوٹ فادر

(باقی حاشیہ ص ۴۳ پر)

کر کے بمبئی سے باہر بس گئے۔ جیسوٹ مشن کی بدسلوکی اور سختی سے خود گوا کا آرچ بشپ بھی نالاں تھا، چنانچہ اس نے شاہ پرتگال کو ایک مراسلہ (۱۶۲۹ء) میں لکھا تھا۔

"...... پرتگالی سرکار کے سب سے زیادہ خطرناک دشمن خود پرتگال کے ہی باشندے ہیں، اور ہمارے اندرونی دشمنوں میں جیسوٹ مشن کے مبلغین ہماری حکمرانی کو نہ صرف بدنام کر رہے ہیں، بلکہ وہ بے انتہا نقصان کا باعث بنے ہوئے ہیں[۱]"

۱۶۳۱ء میں گوا کے وائسرائے نے بھی ان کی شکایت کی تھی کہ یہ درپردہ مطلق العنان بنتے جا رہے ہیں[۲]۔

(باقی)

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲) فرانسسکو ڈسوزا کی کتاب Oriente Conquistado کے حوالہ سے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ:۔ ملیبار کے مسلمانوں کے دو جہاز بندرگاہ چول کے قریب سے گزر رہے تھے، فرنانڈو ڈی کاسٹرو، کپتان چول نے فوراً ان کے تعاقب میں ماتھیو گومیڈے (Matheos Gom ede) کو روانہ کیا، جو ایک جہاز کو مع اس کے عملہ اور تیئیس ۲۳ مسافروں کے حراست میں لیکر چول کے بندرگاہ میں لے آیا، کچھ قیدی قتل کر دیے گئے، چند نہایت کسمپرسی کی حالت میں جاں بحق ہو گئے، جہاز کا کپتان اور چند قیدیوں نے عیسائیت قبول کر لی اور عمر بھر حضرت مسیحؑ کے سچے اور جاں نثار سپاہی بنے رہے۔" (ص ۷۹)

(حواشی صفحہ ہذا) ۱ The Rise of B'bay. Page 79-80 ۲ ایضاً

تاریخ سندھ (جدید اڈیشن)

خلافت راشدہ کے زمانہ سے لیکر ۱۰ویں صدی ہجری تک سندھ جن جن فرمانروا خاندانوں کے تحت رہا، اس کی مکمل تاریخ۔ (زیر طبع) منیجر

محمد ظہیر الدین محمد بابر کا علمی ذوق

از

جناب مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب پھلواروی

لودھی خاندان کے بعد برِ اعظم پاک و ہند کی عنانِ حکومت "مغلیہ خاندان" میں آئی، ظہیر الدین محمد بابر اس خاندان کا بانی تھا، بابر کی فتوحات نے اس کو تاریخ میں ایک عظیم فاتح، ایک عظیم جنرل، اور ایک جانباز کشور کشا کی حیثیت سے پیش کیا،

گلبدن بیگم بنت بابر شاہ کے بیان کے مطابق حضرت صاحب قرانی (تیمور) سے لیکر فردوس مکانی کے زمانہ تک سلاطینِ ماضی میں سے کوئی بادشاہ بھی ایسا نہیں جس نے اتنی محنت کی ہو جتنی کہ میرے والد بزرگوار نے کی، یہ بابر کا تنہا عزم تھا جس نے سینکڑوں سال کی تاریخ بدل ڈالی، اور ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھدی، (ہمایوں نامہ)

بابر نہ صرف ایک عدیم المثال سپاہی، عظیم المرتبت فاتح اور اولو العزم بادشاہ تھا، بلکہ اہلِ علم نے اس کو ایک بلند پایہ اہلِ قلم اور قابلِ قدر شاعر بھی تسلیم کیا ہے، (بزم تیموری)

ابتدائی تعلیم | اگرچہ بابر صرف گیارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا، اور اس کے بعد اسے کبھی اتنی فراغت نہیں ملی، کہ وہ تحصیل علم و فن کی طرف متوجہ ہو سکتا، لیکن اس کے باوجود مورخین کے لئے یہ باعثِ حیرت ہے کہ وہ کیسی ابتدائی تعلیم و تربیت تھی، جس نے اُس کو ترکی و فارسی کا ایک اعلیٰ پایہ کا ادیب شاعر بنا دیا،

یہ ذوق بابر کو ورثہ میں ملا تھا، علم دوست باپ، شیخ مرزا نے اس کی تعلیم کے لئے شیخ مزید بیگ، بابا قلی علی، خدائی بیدی بیگ، اور مولانا قاضی عبداللہ جیسے متبحر علماء کو منتخب کیا جن کی صحبت نے بابر کی وہ فطری صلاحیتیں جو علم وادب کی طرف راغب تھیں، اجاگر کر دیں، (بزم تیموریہ و اسلامی کتب خانے)

صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے الفاظ میں بابر سال بھر کسی مقام پر چین سے نہیں بیٹھا، علم و کمال سے کچھ ازلی مناسبت تھی، مبدأ فیاض سے ذوق سلیم عطا ہوا تھا، ان ملکی ذکا وانتشارات میں بھی علم کی طرف ایک خاص توجہ رہی، ابتدائی زمانہ میں بہت کم فراغت حاصل ہوئی جو طالب علمانہ تحصیل علم کرتا لیکن متواتر توجہ نے اس کے واسطے علمی شان بھی حاصل کر لی (تذکرہ بابر)

ولیم آرسکن لکھتا ہے کہ "بابر اہل علم پر نوازش کرتا تھا، اور اپنے ساتھ رکھتا تھا، اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ اسے علم سے دلچسپی تھی، لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ بچپن سے جوانی تک اور جوانی سے موت تک برابر مصروف کار رہا، ہمیشہ کسی نہ کسی معرکہ میں رہتا، اور ایک سال سے زیادہ کبھی کسی مقام پر نہیں ٹھہرا، ایسی ہنگامہ خیز زندگی میں بھی اس نے اس کا وقت نکال لیا کہ اس دور کے تمام علوم وفنون کو حاصل کر سکا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ذہن تعلیم کی طرف کس قدر مائل تھا،

بابر کی ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں لین پول کا خیال ہے کہ "پانچ سال کی عمر میں اس بچہ (بابر) کو سمرقند لے جایا گیا تھا، اگلے چھ سال اس نے وہاں تعلیم حاصل کرنے میں گزارے ہوں گے، اور وہیں تعلیم حاصل کر لی ہوگی، کیونکہ اسکے بعد اسکو اپنی علمی صلاحیت بڑھانے کی فرصت نہیں ملی، دو زبانوں میں اسکی کامل استعداد جو اسکی تحریروں سے ظاہر ہے، بتاتی ہے کہ علم کو حاصل کرنے میں اس نے استقلال کے ساتھ محنت کی ہوگی، اوائل عمر میں اسکی تربیت کیونکر ہوئی اسکا ہمیں علم نہیں لیکن اس کی تعلیم میں اسکے خاندان کی عورتوں کا کافی دخل رہا ہوگا۔

ہیرالڈلیم بابر کے ابتدائی انیس سال کے حالات کے سلسلے میں اپنی کتاب "بابر شیر ببر" (Babur the Tiger) میں لکھتا ہے کہ بابر اپنی تعلیم کی پوری کرنے سے غافل نہیں رہا"

پہاڑوں پر جاتے وقت بھی اپنی دل پسند کتابیں ساتھ لے جاتا تھا، اپنے سادہ اور سپاہیانہ افکار کو کبھی کبھی اشعار کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتا تھا، ترکی زبان میں بھی جو عوام کی بولی تھی، اور فارسی میں بھی جو خواص کی زبان تھی۔ اس کا کوئی ندیم عشق و محبت یا عورتوں کے بارے میں گفتگو نہیں کرتا تھا۔

بابر سن شعور کو پہنچا تو آبائی مملکت کو علوم و فنون کا گہوارہ پایا، سمرقند، فرغانہ، خراسان اور خصوصاً شہر ہرات فضل و کمال کے مرکز تھے، بابر نے ان مقامات کے علماء اور شعراء سے بالواسطہ اور بلا واسطہ کسی نہ کسی طرح استفادہ ضرور کیا۔ (بزم تیموریہ)

تسیح کے وقت بابر ہرات کی عمارتوں، مدارس، مقابر، خانقاہوں اور رصد گاہوں کی سیر اور تحقیقات کرتا تھا، اس کے شوق کا اصل مرجع صاحبان علم و فن یا وہ درویش تھے جنھیں ان کی سیاحت کے دوران اپنا مہمان بناتا تھا، یا عمدہ حافظے کے لوگ جنھیں ماضی کی روایات از بر تھیں، اور آخر میں "علوم دنیا" کے جاننے والے، غرض بابر ہمیشہ اہل علم و فضل کی صحبتوں میں زندگی گذارنے کا شائق رہا۔ (بابر شیر ببر)

علمی قابلیت اور تصنیف و تالیف | بابر کی مادری زبان ترکی تھی، لیکن عربی اور فارسی زبانوں پر بھی عبور رکھتا تھا، جغرافیہ، تاریخ اور فلکیات سے بھی دلچسپی تھی، نباتات کا ماہر تھا، ادیب و صاحب قلم اور متعدد کتابوں کا مصنف تھا، ارسکن کے بیان کے مطابق اس نے ترکی زبان میں کتابیں لکھ کر اس کا پایہ بلند کر دیا۔

بابر صاحب علم اور علم دوست بادشاہ تھا، فقہ، انشا، اور فارسی و ترکی شاعری میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی، ترکی زبان میں اس نے اپنی سوانح عمری لکھی جو اسکی یادگار ہے۔

(خافی خاں۔ منتخب اللباب)

فقہ حنفی میں بابر کی مہارت کے متعلق فرشتہ کا بیان ہے کہ وہ مجتہدانہ صلاحیت رکھتا تھا، بابر خواجہ عبید اللہ احراری کا مرید تھا، اور علم معقول اور منقول میں خراسان کے شیخ الاسلام مولانا سیف الدین احمد علم کلام میں ملا شیخ حسن اور حدیث میں میر جمال الدین محدث کا قدر دان اور معترف رہا۔ (ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر)

بابر ترکی زبان کا بلند پایہ صاحب دیوان شاعر تھا، تاریخ رشیدی کا مؤلف مرزا حیدر لکھتا ہے کہ "امیر علی شیر بیگ نوائی کے سوا ترکی شاعری میں کوئی بابر کا ہمسر نہ تھا"۔

فرشتہ کا بیان ہے کہ "بابر علم موسیقی اور شاعری، علم املا اور انشا میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا، اپنے عہد کے واقعات ایسی شستہ اور فصیح ترکی زبان میں لکھے ہیں کہ اس زبان کے بڑے بڑے ماہروں نے اس کی انشا پردازی کا لوہا مان لیا"۔

ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خیال فرماتے ہیں کہ "بابر تلوار ہی کا دھنی نہیں، بلکہ قلم و زبان کا دھنی بھی تھا، ادب و شاعری اس کی فطرت میں تھی، جب وہیں نکالا ہوا اور تاشقند پہنچا تو وہاں شکار اور شاعری ہی اس کے دو بہترین مصاحب تھے، کوہ و بیابان میں تیر و تفنگ چلاتا اور اور آب رواں کے کنارے بیٹھا غزلوں سے جی بہلاتا، ایسی پر جوش طبیعت پر اس چمن کی سیر ایک اور تازیانہ تھی، وہ سودا یہاں اور بڑھا اور اپنے پرانے مشغلہ کو ہمیشہ تازہ کرتا رہا"۔ (مغل اردو)

بابر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ "ذی الحجہ ۹۳۳ھ میں دیوان مرتب کیا اس وقت تک میں نے چار مختلف اوزان میں پانچ سو شعر کہے ہیں"۔

اپنے تاثرات کا اظہار فارسی اشعار میں بھی کرتا تھا، مگر ان کی تعداد بہت کم ہے، تاہم جس قدر بھی ہے ان کو اساتذہ نے نگاہ تحسین سے دیکھا، بابر کی فارسی شاعری کے متعلق

ابو الفضل کی رائے ہے کہ " نثر بان فارسی نیز اشعار ولپسند بروارد "
نثر کے ایک متین و دلنشین طرز کا موجد ہے اور علم اصول قانون پر ایک مفید رسالہ لکھا ہے
فن عروض میں بھی ماہر تھا . ترکی کا ایک ایسا شعر کہا ہے جس کی چار پانچ اوزان میں تقطیع
ہو سکتی ہے . اس نے علم عروض پر ایک کتاب "مفصل" کے نام سے لکھی تھی " (تذکرۂ بابر)

بابر فطری طور پر مذہبی واقع ہوا تھا . اس نے ترکی میں اپنے لڑکے کامران کے لیے ایک مثنوی "مبین" لکھی جس میں مذہبی , فقہی اور اخلاقی مسائل پر دو ہزار اشعار ہیں , یہ کتاب "فقہ بابری" کے نام سے مشہور ہے ۔

بیرالڈلیم کا بیان ہے کہ اس نے ترکی زبان میں عقائد و اعمال کے علاوہ حکمرانوں کے مالی مسائل پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے , مثنوی کی طرز مولانا رومی اور صوفی شعراء سے لی ہے . فلسفیانہ افکار اور پند و موعظت کو نظم لطیف کے قالب میں ڈھال دیا ہے ، اس کے ایک حصہ کا ترجمہ روسی زبان میں کیا گیا ہے ،

بابر نے خواجہ عبید اللہ احراری کے مشہور رسالہ "والدیہ" کو بھی نظم کیا ہے ،

بابر کی سب سے اہم تصنیف " تزک بابری " ہے , جو علمی دنیا میں بہت مشہور ہے . بقول فرشتہ " بخوبی نوشتہ کہ فصحا قبول دارند "

مسٹر بیل کے بیان کے مطابق تمام عالم نے اس کی تعریف کی ہے , اور بقول ہنری ایلیٹ یہ اُن سوانح عمریوں میں ہے جو سب سے اچھی اور سب سے سچی کہی جا سکتی ہیں . ارسکن کہتا ہے کہ تزک بابری کا طرز نگارش ڈرامیہ تھا سادہ مگر جاندار ہے , بیورج کا بیان ہے کہ " اس کی سوانح حیات دنیا کے گراں قدر تاریخی ریکارڈس میں نمایاں حیثیت کی حامل ہے , اڈورڈ ڈسن کہتا ہے کہ وہ سینٹ اگسٹائن اور روسو کے خود نوشت اعترافات (Confession)

اور گبن اور نیوٹن کی حیات (Memoirs) کے ہم پلہ ہے، کنگ کے قول کے مطابق تزک بابری مشرقی سوانح حیات میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، اور الیٹ ڈاؤسن کے بیان کے مطابق اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہترین اور مثالی سوانح حیات ہے، لیبان لکھتا ہے کہ بابر کی سوانح عمری کا مقابلہ سیزر کی تاریخ سے کیا جا سکتا ہے، اور اپنے موضوع پر فی الواقع ایک بہت اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہے، الفنسٹن کے خیال میں بابر کی سوانح عمری ایشیا کی صحیح تاریخ کا ایک نادر ٹکڑا ہے۔

ہیرالڈ لیم کا بیان ہے کہ بابر نے اپنی گمنام سی مادری زبان چغتائی ترکی میں فرغانہ اور خود اپنی زندگی کے حالات لکھکر اس عہد خموشی میں اپنی آواز لوگوں کے کانوں تک پہنچا دی، چنانچہ آج بھی جبکہ اس کو لکھے ہوئے پانچ سو برس کے قریب گزر چکے ہیں، یہ داستان اس طرح ہمیں سنائی دیتی ہے کہ گویا کہنے والا رات ہوتے پڑاؤ پر پہنچا ہے، دن بھر دشمن کے تعاقب میں رہا، بلکہ زیادہ تر دشمن اس کے تعاقب میں رہے، پھر گھوڑے سے اتر کر خیمہ میں آگ کے پاس بیٹھکر اپنی روداد سنا رہا ہے، اس روداد میں ہم کو اس عہد کی تصویر نظر آتی ہو جو یورپ والوں کے زرنگار مشرق پر قبضہ جمانے سے پہلے کی کیفیت تھی۔ (مقدمۂ بابر دی ٹائگر)

بابر کے علمی اور ادبی کارناموں میں "تزک" کو بہت اونچا مقام حاصل ہے، ایشیا کی تاریخ پر یہی ایسی کتاب ہے جس کو صحیح تاریخی نمونے کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے، تاریخ نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ جن حالات میں اسے قلم بند کیا گیا ہے، اس اعتبار سے اس کتاب کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے،

"تزک بابری" کی اہمیت اس سے ظاہر ہو کہ دنیا کی تمام اہم زبانوں میں اسکے ترجمے ہوئے۔
تزک بابری میں ۹۳۶ھ / ۱۵۲۰ء تک کے واقعات ہیں، تزک بابری کا نام "واقعات بابری"

اور "بابرنامہ" بھی ہیں ،

سرگئی نکو نوف نے ایک مضمون "بابرنامہ کہاں لکھا گیا" کے عنوان سے رسالہ "طلوع" بابت اپریل ۱۹۶۷ء میں لکھا ہے ، اس میں لکھتا ہے کہ

"مشرقی ممالک کے قرون وسطیٰ کے مسلّمہ ماہر اور جواں سال تاجیک مورخ احرار مختاروف کا کہنا ہے کہ مشرقی ادب کی نا قابلِ فراموش یادگار عظیم مغل خاندان کے بانی ، افسانوی شاعر اور سپہ سالار کی خود نوشت سوانح "بابرنامہ" کے اولین صفحات وادی زرفشاں کی چٹانوں پر وجود میں آئے ، نہ کہ ہندوستان کے آراستہ و پیراستہ محلوں میں ، ان صفحات کا زمانۂ تصنیف ۱۵۱۰ء اور ۱۵۱۲ء کے درمیان ہے جب بابر ایک چھوٹا سا خود مختار شاہزادہ تھا جس کے قبضے سے سلطنت نکل چکی تھی ، اور پہاڑوں میں چھپا ہوا تھا ، قابل سائنس داں نے بابر کی داستانِ حیات کی نامعلوم حقیقتوں کو ایک کوہستانی گاؤں کے گرد و نواح کی چٹانوں پر کندہ چھ کتبوں سے دریافت کیا ہے ، کندہ کرنے والے کی تحریر اور دستخطوں کی تحقیق کے بعد مورخ کو اس کا یقین ہے کہ یہ تمام کتبے بابر کے ہاتھ کے ہیں ، (بابر نے بابرنامہ میں ایسے صرف ایک ہی کتبے کا ذکر کیا ہے)

زرفشاں کے کتبے میں قنوطیت کا رنگ ہے ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے ہونے والے شہنشاہ کو اس کی کوئی امید باقی نہ رہی تھی کہ وہ اپنے موروثی شہروں فرغانہ اور سمرقند کو دوبارہ حاصل کر سکے گا ، اس کا اظہار زیادہ تر سعدی اور حافظ کی رباعیوں کے ذریعہ کیا گیا ، بلکہ بابر نے ایک طرح سے ان عظیم شاعروں کے تخیلات کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنی بدبختی پر آنسو بہائے ہیں ۔

احرار مختاروف نے اس عبارت کو غیر معمولی ادبی صلاحیت کا حامل قرار دیا ہے ، جس نے

بعد میں بابر جیسے شاعر اور سپاہی کی تصنیف "بابرنامہ" اور اس کے دوسرے خیالات کو جلا بخشی، بابر نے ہی چغتائی (قدیم ازبک) زبان میں ادب کی بنیاد رکھی"،

گلبدن بیگم کا بیان ہے کہ "سیکری (ہندوستان) میں اس کے شاہ بابا نے جو عمارتیں بنوائی ہیں ان ہی میں سے ایک وہ بھی جہاں بیٹھ کر وہ اپنی تزک لکھا کرتا تھا،

تزک کا نسخہ | بابر کے قلم کا لکھا ہوا تزک کا نسخہ ناپید ہوچکا ہے، مگر اس کی زندگی میں اور اسکے کچھ بعد اس کی اور اس کے فارسی ترجمہ کی نقلیں کرلی گئی تھیں، جن میں سے ایک نقل خواجہ کلاں کے پاس تھی، اور ایک نسخہ میرزا حیدر دوغلات کے پاس تھا، ہمایوں نے اپنے ہاتھ سے ایک نقل کی تھی اور اس پر حواشی بھی لکھے تھے، اور باپ نے اس کے افعال پر جو نکتہ چینی کی اور دہلی کے خزانے لٹوانے کے ذکر میں بھی کوئی کمی بیشی نہیں کی، گلبدن بیگم نے بھی بابرنامہ کے فارسی نسخے سے کام لیا تھا، شاہجہاں کے کتب خانے میں اس کا مکمل نسخہ موجود تھا جس کی بہت عمدہ تذہیب و تزئین کی گئی تھی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل خاندان اس سوانحعمری کی بڑی قدر کرتے تھے، اس لیے اس کے نسخے کسی تدوین و تبویب اور تصرف کے بغیر ہم تک پہنچے، گو فارسی اور ترکی نسخوں میں لفظی اختلافات ہیں، مگر معنی و مطالب میں کوئی فرق نہیں، اور جو بیاضیں بابر نے چھوڑ دی تھیں وہ بھی بجنسہٖ ان نسخوں میں موجود ہیں، اسلیے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جو تزک بابری ہم آج پڑھتے ہیں، بجز چند مشکوک جزئیات کے وہی ہے، جسے ساڑھے چار سو برس پہلے اس نے لکھا تھا۔ (دہیراللہ لیم)

تحقیقاتی مہم | قدیم مسودات کے یوگوسلاویہ عجائب گھر کے سابق ڈائرکٹر اور اس تحقیقاتی مہم کے سربراہ، جو قدیم مسودات اور نوادر کی تلاش کرتی ہے، یوسف بیگ مخلصوف کا بیان ہے کہ ۱۹۵۵ء میں اس تحقیقاتی مہم کو چار شہر میں ظہیرالدین بابر کی ایک کتاب ملی تھی،

اس کا نسخہ خوبصورت تحریر میں "بوتانسکی" کاغذ پر سیاہ ہندوستانی روشنائی میں تحریر تھا، اور عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے گئے تھے۔ اس کتاب میں ترکی عروض کی وضاحت کی گئی ہے، یہ نسخہ کسی عثمانی ترک نے از سرِ نو لکھا تھا۔ اس لیے اس میں ترکی زبان کے عناصر خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ (حریت ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۱ء)

علی شیر نوائی کے کلام پر تنقید ایک روسی ادیب لکھتا ہے کہ "ظہیر الدین بابر مشرق کا ایک روشن خیال بادشاہ، ایک ممتاز شاعر اور علم و دانش کا پرستار تھا۔ اس نے شہرۂ آفاق "بابر نامہ" کے علاوہ بہترین اشعار اور رباعیاں لکھیں جن میں اسلام کے اصولوں کی تبلیغ کی گئی تھی، اس کے علاوہ متعدد کتابیں فوجی امور، موسیقی اور شعروادب سے متعلق لکھیں،

بابر نامہ میں ہمعصروں کے تذکرہ میں عظیم شاعر علی شیر نوائی کے ۲۴ بحروں کے ذکر میں لکھتا ہے کہ چار بحروں کی تشریح میں اس سے غلطی سرزد ہوگئی ہے، دوسرے بحروں میں بھی اس نے غلطی کی ہے، اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو نظم گوئی میں قدرت رکھتا ہے، شاعری سے متعلق بابر کی وہ کتاب محفوظ نہیں رہی جس میں بابر نے ان غلطیوں کی طرف اشارے کئے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ازبکستان کے مشہور مستشرق پروفیسر عزت سلطانوف نے علی شیر نوائی کی کتاب شائع کی ہے، اور اس پر تنقیدی دیباچہ بھی لکھا ہے، اس میں اس نے تسلیم کیا ہے کہ بابر کی تحریر کے مطابق اس نے چار غلطیوں کا پتہ لگایا ہے، جو علی شیر نوائی نے رباعیوں میں کی ہیں،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابر نے جو کچھ کہا تھا، وہ بالکل صحیح تھا، اور علی شیر نوائی جیسے عظیم شاعر اور ادبی نقاد کے کلام میں غلطی نکالنا شعروادب میں ان کی مہارت کا ثبوت ہے، اور عروض پر اس کی کتاب ترکی شاعری کی تاریخ میں ایک نئے باب کی حیثیت رکھتی ہوگی لیکن

افسوس ہے کہ یہ نادر تصنیف مشرقی علوم کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے نہیں۔

خواجہ آصفی کے کلام پر تنقید خواجہ آصفی کے کلام کی نسبت بابر نے یہ مناسب رائے دی ہے:

"شعر او از رنگ و معنی خالی نیست اگرچہ از عشق و حال خالیست"۔[۱]

کوئی بڑے سے بڑا نقاد بھی یہی رائے دے سکتا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بابر اچھا ادبی نقاد بھی تھا۔

بابر اور موسیقی بابر اپنے جمالیاتی ذوق کی بنا پر فنون لطیفہ کا دلدادہ تھا اور موسیقی کا بھی ذوق رکھتا تھا، ولیم ارسکن کا بیان ہے کہ وہ موسیقی سے واقف ہی نہ تھا، بلکہ اس میں موجد بھی تھا، اس نے موسیقی میں جو نئے سُر ایجاد کیے ہیں وہ اس کا نام اس فن میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں، معاصر موسیقاروں کے حسن و قبح پر اس نے بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے، ہیرالڈ لیم لکھتا ہے کہ بابر کے کلام میں گہرائی زیادہ ہے بہ نسبت خیالات کو نغمے کی شکل میں ادا کرنے کا اس میں قدرتی میلان تھا جب اس پر انابت کی کیفیت طاری ہوتی تو وہ خواجہ احرار کے ارشادات کو ترکی میں نظم کرتا کہ دوسرے لوگ بھی استفادہ کرسکیں،

بابر اور مصوری بابر کو مصوری سے بھی کسی قدر ذوق تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب وہ اپنی جان بچانے کے لیے سمرقند سے کابل بھاگا تھا، اس وقت بھی اس کے پاس ایسے قلمی نسخے تھے جن میں ہرات کے استادوں کی بنائی ہوئی تصویریں تھیں جنھیں بعد میں وہ ہندوستان بھی لے آیا، ان میں بعض نسخے جن پر بابر کی مہر ثبت ہے، آج بھی عجائب خانوں میں محفوظ ہیں، تزک بابری سے بھی بابر کے جمالیاتی ذوق کا پتہ چلتا ہے، اور جو رائے اس نے اپنے زمانہ کے مصوروں مثلاً بہزاد اور شاہ ظفر کے بارے میں ظاہر کی ہے، وہ مصوری میں اس کی دیدہ وری کا ثبوت ہے،

بدقسمتی سے چار پانچ سال کا وہ مختصر عرصہ جو ۱۵۲۶ء ہندوستان کی فتح سے لے کر

---

[۱] حاشیہ منتخب التواریخ، اور ترجمہ (تذکرۂ بابر)

سنہ۱۵۳۰ء وفات تک بابر کو میسر آیا سلطنت کی بنیادیں استوار کرنے میں صرف ہوا اور اس کو تمدنی و تعمیری کاموں کی مہلت ہی نہ ملی جس کا اس میں فطری مذاق تھا، بابر نامہ کا ایک قلمی نسخہ ایسا ملا ہے جس کی بابت تحقیق سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ بابر کے زمانے کا ہے، یہ نسخہ الور میں محفوظ ہے، اس میں بھی صرف عبارت بابر کے زمانے کی ہے، اور تصویریں بہت بعد کی ہیں۔(ثقافت پاکستان)

مسٹر ایم، ایس، ڈیمنڈ کا بیان ہے کہ بابر کے دربار میں جو تصویریں بنائی گئیں انکے بارے میں ہماری معلومات زیادہ نہیں ہیں، حالانکہ عربی مصادر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بادشاہ ایک عالم فلسفی، سیاح، جہاں گشت، ماہر شکاری اور فطرت کا دل دادہ ہونے کے علاوہ، فنون لطیفہ کا بھی سرپرست تھا، مگر اس کے عہد حکومت سے بہت کم تصاویر منسوب کی جاسکتی ہیں، کہنل (Kuhnel) نے بحری جنگ کی ایک تصویر اس دور سے منسوب کی ہے، یہ تصویر ایک البم میں ہے جو کسی زمانے میں شہنشاہ جہانگیر کی ملکیت میں تھا، اب برلن کے سرکاری کتب خانہ میں ہے، اس میں بہزاد اور اس کے دبستاں کا اثر صاف نظر آتا ہے، (مسلمانوں کے فنون)

خطاطی | ولیم ارسکن کا بیان ہے کہ "ادب کے ساتھ بابر کو فن خطاطی سے بھی گہری دلچسپی تھی، اور اس میں بھی اس نے مہارت حاصل کی تھی، اور نسخ و نستعلیق وغیرہ کا ماہر تھا،

منتخب التواریخ میں ہے کہ" بابر خطاطی کا بڑا قدردان اور ایک نئے خط کا موجد بھی تھا، جس کو خط بابری کہتے ہیں، بابر نے اس خط میں قرآن مجید کا ایک نسخہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر مکہ معظمہ بھیجا تھا،

یہ رسم الخط اس نے سنہ۹۱۰ھ/سنہ۱۵۰۴ء میں ایجاد کیا تھا، اس کا خط نہایت پاکیزہ تھا اور سطر اپنے ہاتھ سے بناتا تھا، (تذکرۂ بابر)

بابر اور ہندی زبان بابُر نے ۹۳۲ھ میں ہندوستان فتح کیا، دہلی اور آگرے کی تسخیر کے بعد ۹۳۳ھ میں جو فتح نامے اطراف و اکناف میں بھیجے تھے، ان میں لشکر کو "اردوئے نصرت شعار" کے لقب سے موسوم کیا ہے، (بابر نامہ طبع قازان ص ۴۱۳)

بابر کے ایک سکہ پر جو ۹۳۶ھ میں مضروب ہوا ہے، "ضرب اردو" منقوش ہے۔
(دیکھو وایٹ ہیڈ کی فہرست سکہ جات سلاطین مغلیہ پنجاب میوزیم لاہور ص۱، بحوالہ اردوئے قدیم۔ (از حکیم شمس اللہ قادری)

بابر کا ایک شعر مختلف کتابوں میں درج ہے، مولانا حکیم سید عبدالحئی نے "گل رعنا" میں اس شعر کو اسی طرح تحریر فرمایا ہے:۔

مجکا نہ ہو کچ ہوس مانک و موتی   فقرا ہلیغہ بس بولغوسید ورپانی وردتی

مولانا کا بیان ہے کہ بابر کے ترکی دیوان کا جو نسخہ نواب رامپور کے کتب خانہ میں ہے، وہ ۹۳۵ھ کا لکھا ہوا ہے اور خط نسخ میں ہے، اسی کے رسم الخط کے موافق اس شعر کو نقل کیا ہے۔
سید رفیق مارہروی صاحب اپنی کتاب "ہندوؤں میں اردو" (مطبوعہ نسیم بکڈپو لکھنو) میں لکھتے ہیں کہ "بابر کا یہ شعر ایک ترکی کتاب میں خود اسی کے ہاتھوں سے لکھا ہوا موجود ہے" یہ کتاب "رضا لائبریری" رامپور میں محفوظ ہے، جس پر اکبر، خانخاناں، اور شاہجہاں کی مہریں یا ان کے دستخط موجود ہیں،

مطالعہ اور کتابوں کے جمع کرنے کا شوق بابر کو مطالعہ کا بڑا ذوق تھا، اس لیے وہ سفر و حضر دونوں میں کتابیں اپنے ساتھ رکھتا تھا، فتوحات میں جب کوئی کتب خانہ ملتا تو اپنے بیٹوں کے پاس بھی کچھ کتابیں بھیجدیا کرتا تھا، شاہنامہ فردوسی، خمسۂ نظامی مثنوی خسرو وغیرہ اس کی پسندیدہ کتابیں تھیں۔

میدان جنگ اور سفر میں علمی مشغلہ

اسکے علمی ذوق کا یہ عالم تھا کہ میدان جنگ میں بھی جب فرصت ملتی تو بیاض نکالی اور شعر پڑھنے بیٹھ گیا، طبیعت کو موزوں پایا تو اس بیاض میں اور اضافہ کر دیا۔ (بزم تیموریہ)

سردی کی طویل راتوں میں ملک کے حالات روزنامچے میں لکھتا رہتا، یہ تحریریں پوستین کے لبادوں میں لپیٹ کر، ہوا سے جھلملاتے چراغ کی روشنی میں لکھی ہوتی تھیں (ہیر الڈلیم)

ایک شب کو بنگال سے واپسی میں باد و باراں کا طوفان اٹھا، اُس وقت بھی بابر لکھنے میں مشغول تھا، وہ لکھتا ہے کہ اس درجہ خوفناک آندھی چلی کہ مجھے کتاب کے اوراق سمیٹنے کی مہلت نہ ملی اور میرا خیمہ اکھڑ کر میرے سر پر گر پڑا، خیمہ کی رسیاں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں، میں نے بڑی مشکل سے کتاب کے اجزا اکٹھے کر کے انکو پیٹ کے ساتھ چپکا لیا، اور اوپر سے کمبل اوڑھ لیا، طوفان اسقدر سخت تھا کہ شاید ہی کوئی خیمہ اکھڑنے سے بچا ہو، دو گھڑی کے بعد طوفان رکا تو توشے خانے کا خیمہ استوار کرایا، شمع روشن کرائی، آگ جلوائی اور بھیگے ہوئے اوراق سکھائے اور رات بھر ایک لمحہ کیلئے نہیں سویا۔

بابری عہد کے ارباب کمال

لین پول کا بیان ہے کہ بابر صاحب تصنیف سپاہی تھا، اس کا مذاق اور اس کی نکتہ سنجی کم درجہ کی نہ تھی، اس کا دربار ملک کے مختلف حصوں کے عالموں سے بھرا ہوا تھا،

علامہ ابو الفضل لکھتے ہیں کہ علم و ادب کے ان بے شمار روشن سیاروں میں جو بابر کے فلک رفعت دربار میں جگمگاتے رہتے تھے، مولانا شہاب الدین معمائی حقیری، مولانا یوسف طبیب خراسانی شیخ عبدالاحد، مرزا ابراہیم ہراتی، شیخ زین الدین، مولانا بقائی اور خواجہ نظام الدین علی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

خطبۂ استقبالیہ

اجلاس آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس

(منعقدہ دار المصنفین اعظم گڈھ)

شاہ معین الدین احمد ندوی

جنابِ صدر، مہمانانِ محترم اور حاضرینِ جلسہ!

آپ جیسی صاحبِ علم شخصیتوں نے جس ویرانے میں تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی ہو، وہ اگرچہ بعض حیثیتوں سے اس صوبہ کا پسماندہ خطہ ہے لیکن شیرازِ ہند جونپور کی قربت کے اثر سے ہمیشہ سے دینی تعلیم اور اسکے اصحابِ علم و کمال کا مرکز رہا ہے، ضلع اعظم گڈھ میں عربی کے جس قدر مدارس ہیں ہندستان کے کسی ضلع میں نہیں مل سکتے۔ اس کے قصبات چریاکوٹ، گھوسی اور سرائمیر میں بڑے بڑے علماء و مشائخ پیدا ہوئے، ملا محمود جونپوری صاحبِ شمس بازغہ، مولانا عنایت رسول چریاکوٹی، استاذ العلماء مولانا فاروق چریاکوٹی، ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی، متکلم اسلام مولانا شبلی اسی آسمانِ علم کے مہروماہ تھے، ان میں مولانا شبلیؒ کی حیثیت نیرِ تاباں کی تھی، جن کی ضیاپاشی سے پورا ہندستان منور ہوا، انھوں نے پورا نظامِ شمسی قائم کر دیا تھا جو ان کی دکھائی ہوئی روشنی میں ابتک علم و فن کی خدمت میں مصروف ہے، مولانا شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلامی علوم و فنون پر تلاش و تحقیق کی نئی راہ نکالدی اور اہل علم میں اس کا ذوق پیدا کر دیا جس پر اس راہ کے رہرو آجتک گامزن ہیں، مولانا شبلی کی عظمت عرب و عجم تک میں مسلم تھی جس پر ان کی تصانیف کے عربی، فارسی اور ترکی ترجمے شاہد ہیں،

اس لیے ان کی یادگار دار المصنفین اہل علم کی توجہ کی مستحق تھی، اسی کی کشش آپ کو اس دور افتادہ خطہ میں کھینچ لائی، ورنہ کہاں اعظم گڈھ کا ویرانہ اور کہاں اہل علم کا یہ مجمع۔

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہت گل　　　نسیم صبح تیری مہربانی

ارکان دار المصنفین آپ حضرات کی اس زحمت فرمائی کے شکر گذار ہیں اور اپنی اور باشندگا اعظم گڈھ کی طرف سے آپ کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں۔

حضرات! مسلمانوں نے علم و فن کی جو خدمت کی ہے اور دینی علوم سے قطع نظر خالص دنیا علوم کو جس قدر ترقی دی، قدیم علوم کی جس طرح حفاظت کی اور ان کو دوسروں تک پہنچایا او جو نئے علوم پیدا کیے اور اپنے ایجادات و انکشافات سے دنیا کو جو فائدہ پہنچایا اور علم و فن کی ہر شاخ پر جو عظیم الشان ذخیرہ یادگار چھوڑا، اس کی تفصیل کے لیے ایک دفتر چاہیے، اس خطبہ اس کی تفصیل مقصود نہیں۔

ع :- سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

اس لیے آیندہ سطور میں صرف ہندوستانی مسلمانوں کی علمی خدمات پر سرسری نظر ڈالی جائے گی اور آیندہ کاموں کے متعلق بعض خیالات پیش کیے جائیں گے۔

حضرات! ہندوستان ایک زمانہ تک اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز رہ چکا ہے او اس کو اس سلسلہ میں بعض ایسی خصوصیات حاصل تھیں، جو کسی اسلامی ملک کو حاصل نہ تھیں، یہا کے سلاطین و امرا کی فیاضی اور قدر دانی سے مختلف اسلامی ملکوں خصوصاً وسط ایشیا کے تما علمی مرکزوں عراق و ایران سے لیکر ترکستان بلکہ حجاز تک کے علما کھنچ کھنچ کر ہندوستان میں جمع ہو گئے تھے اور دلی، جونپور، اور دوسرے پایۂ تخت رشک بغداد و قرطبہ بن گئے تھے، جن کی نظیر کسی دوسرے اسلامی ملک میں نہیں مل سکتی۔

ان علماء کی آمد کا سلسلہ ابتدا سے لے کر مغلوں کے دورِ عروج بلکہ کچھ نہ کچھ دورِ زوال تک برابر جاری رہا، اور انھوں نے ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کے بعد ان کی نسل میں علم و فن، درس و تدریس اور تالیف و تصنیف کا سلسلہ برابر قائم رہا، اور ایک ایک خاندان میں اتنے علما پیدا ہوئے جس کی نظیر کسی اسلامی ملک کے ایک خاندان میں مشکل سے ملے گی، اس کی مثال فرنگی محل اور شاہ ولی اللہ کا خاندان ہے۔

ان میں اس پایہ کے علماء پیدا ہوئے جن کی عظمت اسلامی دنیا میں بھی مسلم تھی، دینی علوم میں خصوصیت کے ساتھ ان کے بڑے کارنامے ہیں، انھوں نے اپنے بعد بہت بڑا علمی ذخیرہ یادگار چھوڑا، جو قدر و قیمت میں اسلامی دنیا کے ذخیروں سے کم نہیں، ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں، اس لیے ہر فن کے کچھ نامور علماء کے صرف نام پیش کیے جاتے ہیں:

امام حسن صغانی لاہوری، ملا محمد بن طاہر پٹنی، شیخ علی متقی برہان پوری، شیخ وجیہ الدین گجراتی، شیخ عبد اللہ تلنبی، شیخ علاء الدین مہائمی، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، ان کے صاحبزادے نور الحق، قاضی عبد المقتدر دہلوی، حضرت مجدد الف ثانیؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی، ملا محمود جونپوری، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، مفتی عبد السلام لاہوری، ملا نظام الدین اور ان کا خاندان، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، ان دونوں خاندانوں کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں، ملا نظام الدین کا درس نظامی ابتک ہندوستان کے عربی مدارس میں جاری ہے، سعد بن مسعود سلمان، امیر خسرو، شیخ فتح اللہ شیرازی، میر عبد الجلیل بلگرامی، غلام علی آزاد بلگرامی، علامہ محمد مرتضیٰ زبیدی بلگرامی، ابو الفضل، ملا عبد القادر بدایونی، شیخ عبد النبی، شیخ محمد علی تھانوی، علامہ تفضل حسین، لطف اللہ و خیر اللہ مہندس وغیرہ، ان کے خدمات سے علم و فن کا کوئی گوشہ خالی نہ تھا،

یہ موسم بہار کا منظر تھا، موسم خزاں کی بہار آفرینی بھی کچھ کم نہیں ہے، اس دور میں مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی، نواب صدیق حسن خاں، مولانا ملوک العلی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا فضل حق خیرآبادی، سرسید احمد خاں، مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا صہبائی، مولانا شبلی، مولانا سید عبدالحیٔ سابق ناظم دارالعلوم ندوۃ العلما، مولانا محمود الحسن ٹونکی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سید سلیمان ندوی جیسی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جن کی تصانیف نے مسلمانوں کی مذہبی علمی اور تمدنی تاریخ کو زندہ کردیا، جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں سید امیر علی، سید علی بلگرامی، خواجہ کمال الدین، پرنسپل محمد شفیع مرحوم، پروفیسر محمود شیرانی، پروفیسر نواب علی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، اور یہ سلسلہ بحمداللہ اب بھی قائم ہے، بلکہ اس میں بعض حیثیتوں سے اضافہ ہوگیا ہے، اور انھوں نے اسلامیات کے مختلف پہلوؤں پر انگریزی میں بھی محققانہ کتابیں لکھیں،

اس سلسلہ میں سر اقبال مرحوم کا نام نہ لینا بڑی بے انصافی ہے، گو اصلاحی معنوں میں اسلامی علوم پر انھوں نے کوئی تحقیقی کام نہیں کیا، لیکن اسلامی تعلیمات کی حکیمانہ تعبیر اور ہندوستانی مسلمانوں میں اسلامی روح پیدا کرنے اور اسلامی تہذیب و ثقافت زندہ رکھنے میں ان کی شاعری کا بڑا حصہ ہے، یہ سیکڑوں ناموں میں سے صرف چند نام ہیں،

ہندوستان کے علمی اداروں نے بھی اسلامی علوم کی بڑی خدمت انجام دی، ان میں سب سے قدیم ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ہے، جس نے مختلف فنون کی عربی اور فارسی کی بڑی اہم کتابیں شائع کیں، موجودہ اداروں میں دائرۃ المعارف حیدرآباد سب سے زیادہ خدمت انجام دے رہا ہے، اس نے قدما کی ہر علم و فن کی سیکڑوں نادر و نایاب کتابیں شائع کیں۔ اس کے خدمات اسلامی ملکوں کے کسی علمی ادارہ سے کم نہیں ہیں، ائمہ احناف اور فقہ حنفی کی قدیم اہم کتابوں کی اشاعت احیاء معارف نعمانیہ حیدرآباد کا کارنامہ ہے، مجلس علمی ڈابھیل بھی اس سلسلہ میں مفید کام کر رہی ہے،

اس سلسلہ میں نولکشور پریس کا نام لینا بھی ضروری ہے، اس نے تنہا اسلامی علوم وفنون کی اتنی کتابیں شائع کیں، جسکی مثال ہندوستان کیا اسلامی ملک میں بھی نہیں مل سکتی، گو اسکی مطبوعات صحت اور طباعت کے لحاظ سے ناقص ہیں لیکن یہ اسکا بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اس ذخیرہ کو چھاپ کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا، کلکتہ، دہلی اور لکھنؤ وغیرہ کے اور مطابع نے بھی بہت سی کتابیں شائع کیں، اس کی تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں، بمبئی کے عربی کتابوں کے تاجر بھی اپنے صرف سے اہم کتابیں چھپواتے رہتے ہیں، دارالمصنفین نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں جو بڑی علمی خدمت انجام دی ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں، اس نے اردو کے علاوہ عربی کی چند اہم کتابیں بھی شائع کیں، ابو مسلم اصفہانی معتزلی کی تفسیر اب ناپید ہے، امام رازی نے تفسیر کبیر میں جابجا اس کے جو اقتباسات نقل کیے ہیں، ان کو جمع کر کے شائع کیا، مولانا عبدالرحمن میمن کی فاضلانہ تصنیف ابو العلاء وما الیہ، امام سیوطی کا رسالہ عین الاصابہ فیما استدرکتہ السیدۃ عائشۃ علی الصحابہ، عمر خیام کے فلسفیانہ رسالے، سیرت عائشہؓ اور سوانح عمر خیام کے ساتھ شائع کیے، ہمارے ہم ردیف وہم قافیہ ندوۃ المصنفین کے خدمات سے آپ حضرات واقف ہیں۔

اس سلسلہ میں مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام دارالعلوم ندوۃ العلماء کا بھی ذکر ضروری ہے، گو اس کی عمر چند سال سے زیادہ نہیں ہے، لیکن اس مختصر مدت میں اس نے اردو، عربی اور انگریزی میں متعدد مفید کتابیں شائع کیں، ہمارے عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بھی مفید کام ہو رہا ہے، اس اجلاس کے محترم صدر جناب حکیم عبدالحمید صاحب نے جن کا قدم ہر اچھے کام میں آگے رہتا ہے اسلامیات کی تحقیقات کا ایک ادارہ قائم کیا ہے، اس مختصر جائزہ سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی علوم کی خدمت میں ہندوستان کے مسلمانوں کا کتنا بڑا حصہ ہے، موجودہ دور میں ان کاموں کی ضرورت اور زیادہ بڑھ گئی ہے، اور ابھی بہت سے کام اہل علم کی توجہ کے محتاج ہیں۔

ان میں سب سے مقدم ان اہم کتابوں کی اشاعت ہے جو ابتک نہیں چھپ سکی ہیں، مولانا

محمد ہاشم ندوی کا اہل علم کو شکرگذار ہونا چاہیے کہ انھوں نے مختلف علوم کی ان اہم اور نادر کتابوں کی جنکے قلمی نسخے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، مکمل فہرست تذکرۃ النوادر کے نام سے مرتب کرکے شائع کردی ہے۔

(۲) دور جدید نے جو سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی مسائل پیدا کردیے ہیں، اسلامی نقطۂ نظر سے اس کا حل پیش کرنے کی ضرورت ہے، جامعۂ عثمانیہ مرحوم کے شعبۂ دینیات نے اس کے بعض پہلوؤں پر تحقیقی مقالے لکھوائے تھے، ان میں سے بعض شائع بھی ہوچکے ہیں مگر

ع :۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

جماعت اسلامی نے بھی بعض مختصر کتابیں شائع کی ہیں، کچھ متفرق مضامین بھی لکھے گئے لیکن ابھی اس پر کوئی مستقل کام نہیں ہوا ہے، اور یہ مسائل اہل علم کی توجہ کے محتاج ہیں، مسلم یونیورسٹی کے اسلامیات اور دینیات کے شعبوں کو اس میں جامعۂ عثمانیہ کی قائم مقامی کرنی چاہیے۔

(۳) ہندوستان اسلامی اخلاق و روحانیت کا صحیح نمونہ صوفیائے کرام نے پیش کیا، اگر علماء نے اسلام کے جسم کو قائم رکھا تو صوفیائے کرام نے جن میں وہ علماء بھی شامل ہیں، جو شریعت و طریقت کے جامع تھے، اسکی روح کو زندہ رکھا، ان ہی کی بدولت ہندوستان میں اسلام کی اشاعت ہوئی، وہ

ع در کفے جام شریعت در کفِ سندانِ عشق

کا نمونہ تھے، ایک طرف ان کا قدم جادۂ شریعت سے باہر نہیں نکلا، دوسری طرف ان کے اخلاق و پیام محبت میں اس قدر کشش تھی کہ بلا امتیاز مذہب و ملت سب کے سر عقیدت ان کے سامنے جھکتے تھے، اور آج بھی انکے آستانوں پر خم ہوتے ہیں، اور آج بھی ان کے حالات سے بڑا سبق حاصل ہوسکتا ہے، لیکن یہ حالات کشف و کرامت کے حجاب میں گم ہیں، اس لیے ان کے صحیح حالات اور انکی زندگی کے اخلاقی و روحانی پہلوؤں کو پیش کرنے کی بڑی ضرورت ہے، اور موجودہ ہندوستان میں یہ ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے، پروفیسر خلیق احمد نظامی

نے اس سلسلہ میں کئی مفید کتابیں لکھی ہیں، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے تاریخ دعوت و عزیمت میں بعض اکابر صوفیہ کے حالات تحریر کیے ہیں، ہمارے رفیق کار سید صباح الدین عبد الرحمٰن کی بزم صوفیہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، لیکن اس سلسلہ کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مستشرقین کے خدمات آخر میں مستشرقین کے متعلق بھی کچھ کہنا ضروری ہے، ان کے خدمات کا اعتراف نہ کرنا ناسپاسی ہوگی، انھوں نے اسلامی علوم و فنون کی بڑی خدمت کی ہے، جو خود مسلمانوں سے بھی نہ ہو سکی، انھوں نے مختلف علوم و فنون کی سیکڑوں نادر و نایاب کتابیں جنکے دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں اور جن کے نام صرف کتابوں میں ملتے تھے، تلاش کرکے بڑی محنت سے تحقیق اور تصحیح و تحشیہ کے پورے اہتمام کے ساتھ شائع کیں۔

تاریخ میں تاریخ طبری، کامل ابن اثیر، مروج الذہب اور کتاب التنبیہ والاشراف مسعودی، تاریخ یعقوبی ابن واضح کاتب عباسی، اخبار الطوال ابو حنیفہ دینوری، کتاب البدا والتاریخ ابو زید بلخی، غرر اخبار ملوک الفرس ثعالبی، تاریخ ملوک الارض حمزہ اصفہانی وغیرہ۔ سفرناموں میں سفرنامہ ابن جبیر، سفرنامہ سلیمان تاجر اور سفرنامہ بزرگ بن شہریار وغیرہ۔

جغرافیہ میں کتاب البلدان یعقوبی، کتاب البلدان ابن فقیہ ہمدانی، اعلاق النفیسہ ابن رستہ، المسالک والممالک ابن خرداذبہ، احسن التقاسیم بشاری مقدسی، مسالک الامصار ابن فضل اللہ عمری، نزہۃ المشتاق ادریسی، تقویم البلدان ابو الفدا، نزہۃ القلوب حمد اللہ مستوفی وغیرہ۔

طبقات و تراجم میں طبقات ابن سعد کی ضخیم مجلدات، معجم الادبا، یاقوت حموی، تحفۃ الامرا باخبار الوزرا، ہلال بن محسن صابی، کتاب الوزرا، محمد بن عبدوس جہشیاری، کتاب الولاۃ والقضاۃ کندی، طبقات الشعرا، ابن قتیبہ، کتاب الانساب سمعانی، انساب الاشراف بلاذری وغیرہ۔

تاریخ علوم میں کتاب الہند بیرونی، طبقات الامم صاعد اندلسی، فہرست ابن ندیم وغیرہ

مستشرقین نے عربی کی مطبوعہ کتابوں کی ضخیم فہرستیں بھی مرتب کیں، اور آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا انڈکس مرتب کیا جس سے ان کی تلاش میں بڑی سہولت ہوگئی، اور دوسرے علوم کی سیکڑوں کتابیں شائع کیں۔ ان سب کا استقصا مقصود نہیں، مثلاً مختلف فنون کی چند کتابوں کے نام لکھ دیے گئے، ان میں سے بہت سی کتابیں اب مصر وغیرہ میں چھپ گئی ہیں، لیکن اولیت کا سہرا مستشرقین کے سر ہے۔

اس کے علاوہ یورپ کے کتب خانوں کے عربی و فارسی نوادر کی مکمل فہرستیں مرتب کیں جن سے وہاں کا پورا علمی ذخیرہ نگاہ کے سامنے آجاتا ہے، مسلمانوں کے علوم اور انکی تہذیب و ثقافت پر بہت سی کتابیں لکھیں، ان کے ان خدمات سے انکار ممکن نہیں، لیکن اسی کے ساتھ بعض مستشرقین نے مختلف تاریخی، سیاسی اور مذہبی اسباب کی بنا پر مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی بڑی غلط تصویر پیش کی، انگریزوں نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر اسلامی ہند کی تاریخ کو جس طرح بگاڑا اس سے ہم سب واقف ہیں، بعض ہندوستانی اہل قلم نے جن کا ذہن مسلمانوں کی طرف سے صاف نہ تھا مستشرقین کی تقلید کی، جس سے ملک کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے، ہندوستان کی آزادی سے پہلے بعض ہندو مورخین نے بہت اچھی تاریخیں لکھیں لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کے خلاف زہریلی کتابوں کا ایک مستقل سلسلہ شروع ہوگیا، جس سے نصاب کی کتابیں بھی محفوظ نہیں، اس سے تنہا مسلمانوں کو نہیں بلکہ پورے ملک کو نقصان پہنچ رہا ہے، اس لیے نہ صرف علمی و تحقیقی، بلکہ قومی و ملکی مفاد کے نقطۂ نظر سے بھی ان غلط فہمیوں کے ازالہ اور تعمیری نقطۂ نظر سے صحیح تاریخیں لکھنے کی ضرورت ہے،

علامہ شبلی نے مدتوں پہلے ان تمام ضرورتوں کو محسوس کر لیا تھا اور اس سلسلہ میں بڑے اہم مضامین لکھے اور اپنی تصنیفوں میں بھی اس کا لحاظ رکھا، انکی سب سے اہم تصنیف سیرۃ النبیؐ کی تالیف کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی محققانہ سیرت لکھی جائے جس میں مستشرقین کے اعتراضات کا

جواب بھی آجائے، اس لیے دارالمصنفین نے شروع ہی سے اس مقصد کو پیش نظر رکھا، اور اس کی بیشتر تصنیفات کا مرکزی نقطہ یہی ہوتا ہے، "خطبات مدراس" اور "عرب و ہند کے تعلقات" اس سلسلہ کی اہم کتابیں ہیں، اسی نقطۂ نظر سے دارالمصنفین نے تاریخ ہند کا ایک مستقل سلسلہ شروع کیا ہے، اس سلسلہ میں "ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک"، "عہد مغلیہ ہند و مورخین کی نظر میں" اور "ہندوستان عربوں کی نظر میں" زیادہ اہم ہیں، مذہبی غلط فہمیوں کا ازالہ کے لیے "دین رحمت" لکھی گئی۔

اس سے انکار نہیں کہ اسلامی علوم و فنون کی خالص علمی تحقیق بھی ایک بڑی علمی خدمت در مسلمانوں کا پرانا ورثہ ہے، اس لیے اس کو جاری رہنا چاہیے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر زمانہ کے مسلمان فضلا و اہل علم نے خواہ ان کا تعلق کسی علم و فن سے رہا ہو، دین کی خدمت کو مقدم رکھا، اور اپنے علم کو اس کی نصرت و حمایت میں صرف کیا، تمام اسلامی علوم دینی ضرورت ہی سے پیدا ہوئے، اور مسلمان حکما، و فلاسفہ نے عقلی علوم سے بھی دین کی حمایت کا کام لیا، جس سے اصحاب علم واقف ہیں، اور اس زمانہ کے حالات میں پہلے سے بھی زیادہ اس کی ضرورت ہے، اس لیے آج بھی اسلامی علوم کی خدمت میں مسلمان اصحاب علم کا مرکزی نقطۂ نظر یہی ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر ان میں جان نہیں پیدا ہو سکتی

چمن میں تربیت غنچہ ہو نہیں سکتی — نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریک نسیم
وہ علم کم بصری جس میں ہم کنار نہیں — تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

یہ چند موٹی موٹی باتیں جو ذہن میں تھیں پیش کر دی گئیں، اس میں جو کمی رہ گئی ہوگی وہ امید ہے کہ فاضل صدر کے خطبۂ صدارت سے پوری ہو جائے گی۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

ابنُ الہیثم کا جشن ہزار سالہ

(یکم تا دس نومبر ۱۹۶۹ء)

از جناب احمد خاں صاحب ایم۔ اے ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد

ابو علی الحسن بن الحسن ابن الہیثم مشہور زمانہ ماہر بصریات ۳۵۵ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پر ابتدائی تعلیم پائی، بچپن ہی سے حصول علم کی طرف مائل تھے، اس لیے تھوڑی ہی مدت میں فارغ ہو کر تصنیف و تالیف میں لگ گئے اور چند ہی دنوں میں اسقدر مشہور ہو گئے کہ ان کی شہرت سنکر فاطمی فرمانروا الحاکم نے مصر بلا بھیجا، باقی زندگی وہیں بسر کی اور مصر ہی میں سنہ ۴۳۰ھ کے بعد ان کا انتقال ہوا ہے۔

ابن الہیثم پہلے مسلمان ماہر طبیعیات، ہیئت داں، ریاضی داں اور طبیب تھے، بصریات میں ان کے بڑے کارنامے ہیں، انھوں نے اپنی تصنیف "کتاب المناظر" میں پہلی مرتبہ نظریۂ بصارت کی صحیح وضاحت کی ہے، مظاہر فطرت مثلاً نور، اشعۂ نور کے انعکاس و انعطاف، اغلاط بصر، شفق، قوس و قزح، ہالہ، سرابا، قوت ثقل، تحرکات، خلا، فضا، اور کثافت کے بارے میں اپنی تحقیقات سے بصریات کے فن میں وہ سنگ بنیاد رکھا ہے جس پر بعد کے سائنس دانوں نے پوری عمارت تعمیر کی ہے، اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ فلک کے سیاروں تک رسائی کی پہلی بنیاد ان ہی کے نظریات تھے،

ابن الہیثم کا اثر یورپ پر بہت زیادہ رہا ہے، چنانچہ تقریباً پانچ صدیوں (بارہویں تا

سترہویں صدی تک اس کی کتابیں و نظریات یورپ میں مقبول و رائج رہے۔ اگر یہ شخص یورپ میں پیدا ہوا ہوتا تو اب تک ہزار ہا کتابیں اس کی زندگی اور نظریات پر لکھی جا چکی ہوتیں، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل بطلیموس، کپلر، بیکن وغیرہ سے تو پوری طرح واقف ہے، مگر اپنے اسلاف کی اس کو خبر نہیں۔ وہ ابن الہیثم کی نسبت نیوٹن سے زیادہ واقف ہے۔ حالانکہ نیوٹن کے نظریات میں ابن الہیثم کے نظریات کا ایک اہم حصہ ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل سے مسلمانوں نے اس کی طرف توجہ کی اور اپنے اسلاف کے کارناموں کو سمجھنا اور کسی حد تک ان پر فخر کرنا بھی شروع کر دیا ہے، اگرچہ اس کی رفتار سست ہے، تاہم یہ بیداری خوش آیند ہے۔ چنانچہ اب تک کئی مسلم محققین اور مدبرین اور شعراء کے ہزار سالہ یا پانچ سو سالہ جشن منائے جا چکے ہیں، اُن میں ابن الہیثم بھی ہیں۔

سب سے پہلے ابن الہیثم کا جشن منانے کا خیال قاہرہ یونیورسٹی کے ایک کالج (کلیۃ الھندسۃ) کو آیا تھا، چنانچہ کالج کی مجلس نے مارچ ۱۹۳۹ء میں یہ طے کیا کہ ابن الہیثم کی وفات پر نو سو سال گذر چکے ہیں، اس لیے ابن الہیثم کی یادگار میں کالج میں اس کے متعلق تقریروں اور محاضرات کا ایک سلسلہ شروع کیا جائے، اس سلسلے کا نام انھوں نے "محاضرات ابن الہیثم التذکاریہ" رکھا۔ اس پروگرام کے تحت سب سے پہلا مقالہ مصطفٰے نظیف بک نے پیش کیا، وہ مقالہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۹ء کو شائع ہوا، اس کے بعد اور کئی مقالات ابن الہیثم کی زندگی اور اس کے نظریات کی تشریح میں لکھے گئے اور مذکورہ کالج کی طرف سے طبع ہوئے۔ ان محاضرات کے لیے مصر کے علاوہ دوسرے ملکوں کے علماء کو بھی بلایا گیا تھا۔

اسی طرح مصر کی جمعیۃ المصریۃ العلوم الریاضیہ والطبیعیۃ نے قاہرہ ہی میں ابن الہیثم کی

یاد میں ۲۱ دسمبر ۱۹۳۹ء کو ایک عظیم الشان اجتماع کرایا جس میں یونیورسٹی کے اساتذہ کے علاوہ دوسرے اہل علم نے بھی شرکت کی اور انھوں نے علوم ریاضیات، فلسفہ، طبعیات ہیئت، ہندسہ اور بصریات میں ابن الہیثم کے کارناموں پر تقریریں کیں۔ ان میں مصر کے چوٹی کے سائنسداں شامل تھے۔ اس طرح پہلی بار ابن الہیثم کے ہموطنوں نے اس کے کارناموں کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔

ابن الہیثم کے علمی کارناموں کو دنیا کے سامنے پیش کرنے میں مصطفیٰ نظیف بک کا بڑا احسان ہے۔ انھوں نے ابن الہیثم کی کتاب المناظر کے مخطوطات کو بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے مرتب کر کے ۱۹۴۲ء میں "ابن الہیثم بحوثہ وکشوفہ البصریۃ" کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا، جس میں بصریات سے متعلق ابن الہیثم کے نظریات کی پوری وضاحت کی گئی ہے۔ اس طرح انھوں نے کسی حد تک ابن الہیثم کا حق ادا کر دیا۔

پاکستان میں ہمدرد فاؤنڈیشن نے ۱۹۶۵ء میں ابن الہیثم کا ہزار سالہ جشن منانے کا جامع پروگرام بنایا تھا، مگر اچانک جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے یہ پروگرام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ۱۹۶۷ء میں عربوں پر اسرائیلی حملے نے اس کام میں مزید تعطل پیدا کر دیا، کیونکہ اس جشن میں دنیائے اسلام کے ممتاز اہل علم کو دعوت دینے کا خیال تھا۔ اس کے بعد بھی اگرچہ کچھ ضروری امور نامکمل رہ گئے مگر اس مرتبہ جشن کو مزید تاخیر میں نہیں پڑنے دیا گیا اور سال کے شروع میں دنیا کے ممتاز سائنسدانوں، ریاضی دانوں اور سائنسی علوم کی سوسائیٹیوں کو جشن میں شرکت کی دعوت دیدی گئی اور ہمدرد فاؤنڈیشن نے ابن الہیثم پر دستیاب مواد کو ہر زبان سے انگریزی اور اردو میں منتقل کرنا شروع کر دیا، اور اس کا اختصار کے ساتھ اہل علم کے پاس بھیجدیا گیا، اس سے ابن الہیثم پر لکھنے والوں کو بڑی مدد ملی۔

جشن کے پروگرام کی ابتدا یکم نومبر ۱۹۶۹ء کو کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کی، حکیم محمد سعید صدر ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن نے جشن کا تعارف کرایا اور آیندہ پروگرام کی تفصیل بیان کی۔ مسز ایل۔ اے ڈسلوا (Mrs. L. A. D'silva) نے وہ پیغامات پڑھ کر سنائے جو دنیا کے ممتاز سائنسدانوں، اعلیٰ سفارتی نمایندوں، اور بعض ملکوں کے سربراہوں کی طرف سے ہمدرد فاؤنڈیشن کو موصول ہوئے تھے۔[1]

یہ سیشن کراچی انٹرکانٹی نینٹل میں ہوا، اور اس کی صدارت پاکستان کے مشہور سائنسداں اور نیشنل سائنٹفک کونسل آف پاکستان کے سابق چیرمین جناب ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے فرمائی۔ اختتامی تقریر ڈاکٹر حافظ محمد الیاس صاحب نے کی،

دوسرا سیشن ۳ر نومبر ۱۹۶۹ء کو پشاور میں پاکستان فارسٹ انسٹی ٹیوٹ کے آڈیٹوریم میں ہوا، اس میں دو مقالے پڑھے گئے، ایک مقالہ جناب عبدالرؤف نوشہروی نے اور دوسرا ڈاکٹر ایم۔ اے خٹک نے پڑھا۔ اختتامی تقریر جسٹس شیخ عبدالحمید صاحب نے کی۔

تیسرا سیشن ۴ر نومبر ۱۹۶۹ء کو راولپنڈی کے انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں سہ پہر کو منعقد ہوا، اس میں اجلاس کی صدارت جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی وائس چانسلر اسلام آباد یونیورسٹی

---

[1] یہ پیغامات دنیا کے ہر کونے سے موصول ہوئے تھے۔ صدر پاکستان جناب آغا محمد یحییٰ اور اردن کے جناب شاہ حسین کے علاوہ جرمنی کے وزیر صحت کے پیغام شامل تھے۔ انکے علاوہ جن ممالک کی سائنسی مجلسوں یا اداروں نے پیغامات دیے، ان کے نام یہ ہیں: آسٹریلیا، آسٹریا، بلغاریہ، کنیڈا، چین، چیکوسلاواکیہ، ڈنمارک، فرانس، مغربی جرمنی، ہوائی، ہنگری، ہندوستان، ایران، جاپان، نیدرلینڈز، پولینڈ، روڈیشیا، جنوبی افریقہ، روس، انگلینڈ، اور امریکہ۔ یونیسکو کے ادارہ پیرس نے بھی ایک خاص پیغام ارسال کیا تھا، اور پاکستان سے تو بہت سے ممتاز اہل علم کے پیغامات وصول ہوئے تھے۔ ان پیغامات میں ابن الہیثم کے کارہائے نمایاں کو سراہا گیا اور ہمدرد فاؤنڈیشن کے اس اقدام پر اسے مبارکباد دی گئی۔

نے کی۔ اس میں صرف ایک مقالہ جناب محمد مسعود صاحب ریسرچ فیلو ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد نے پیش کیا۔ وقت کی قلت، جو عام طور پر ایسے اجتماعات میں ہوا کرتی ہے، یہاں بھی رہی، اس لیے مقالے کا صرف اختصار پیش کیا گیا، اختتامی کلمات مسز سعدیہ سعید نے کہے۔

اگلا اجلاس لاہور کے انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں ۶ر نومبر ۱۹۶۹ء کو زیر صدارت جناب علامہ علاءالدین صدیقی وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی منعقد ہوا۔ اختتامی تقریر ڈاکٹر محمد باقر صاحب پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور نے کی، اس سشن میں پروفیسر حمید عسکری صاحب نے ایک مقالہ پڑھا جس کا عنوان تھا "ایک عظیم مسلم ماہر طبعیات"۔

لاہور ہی میں، تا ۹ نومبر ۱۹۶۹ء یونیورسٹی سینٹ ہال میں ابن الہیثم سے متعلق مجالس مذاکرہ منعقد ہوئیں۔ ۷ نومبر کو میاں افضل حسین سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کی صدارت میں، ۸ر کو جناب ڈاکٹر محمد باقر صاحب اور ۹ر کو جناب زید اے ہاشمی سکریٹری حکومت مغربی پاکستان کی صدارت میں یہ مذاکرات ہوئے، ان میں حسب ذیل مقالے پڑھے گئے۔

۱۔ حکیم محمد سعید صاحب:۔ "ابن الہیثم کی کتاب المناظر"۔
۲۔ پروفیسر نصیر احمد ناصر، سکریٹری اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام:۔ "ابن الہیثم کا فلسفہ"۔
۳۔ پروفیسر ابوبکر غزنوی، انجینیرنگ یونیورسٹی لاہور:۔ "ابن الہیثم کی شخصیت"۔
۴۔ پروفیسر عبدالبصیر پال، صدر شعبۂ طبعیات پنجاب یونیورسٹی:۔ "ابن الہیثم"۔
۵۔ پروفیسر علی اصغر زیدی:۔ "ابن الہیثم بحیثیت ایک سائنسداں"۔
۶۔ ڈاکٹر رانا احسان الٰہی صدر شعبۂ عربی پنجاب یونیورسٹی:۔ "ابن الہیثم اور المرایا المحرقہ"۔

۷۔ پروفیسر خادم علی ہاشمی :۔ (کوئی خاص عنوان نہ تھا)

۸۔ چودھری عبد الغفور صاحب :۔ "سائنس کی تعلیم پر ابن الہیثم کا اثر"

۹۔ الحاج ذکاء الملک اور ڈاکٹر ایس۔ ایم ناموس :۔" اسلام کا ایک عظیم ماہر طبعیات"۔

۱۰۔ پروفیسر ایم۔ ایف قریشی :۔" ابن الہیثم کے مطابق دائرہ میں مساوی الاضلاع مسدس کی بناوٹ"

۱۱۔ راقم الحروف کا مقالہ۔ عنوان تھا :۔" ابن الہیثم کی تالیفی زندگی"۔

۸ر نومبر کو کراچی یونیورسٹی میں بھی ایک مجلسِ مذاکرہ منعقد ہوئی، اس مجلس کا افتتاح جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کیا اور مندرجۂ ذیل مقالات پڑھے گئے :۔

۱۔" ابن الہیثم کی سائنسی جدوجہد" :۔ ڈاکٹر ایم۔ اے۔ ایچ قادری پروفیسر علم الحیوانات کراچی یونیورسٹی۔

۲۔" علم طبعیات کے ارتقاء میں ابن الہیثم کا کردار" : ایس۔ ایم ترمذی پروفیسر طبعیات۔

۳۔" بصریاتِ ابن الہیثم" :۔ ڈاکٹر ایم۔ اسلم خاں پروفیسر طبعیات۔

۴۔" ابن الہیثم کا سائنسی اسلوب" :۔ میجر آفتاب حسن صاحب۔ کراچی یونیورسٹی۔

اس مجلس کی صدارت جناب ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی صاحب نے کی۔

آخری اجتماع ۱۵ر نومبر ۱۹۶۹ء کو ڈھاکہ انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر ایم۔ او غنی وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی نے کی۔ اس سیشن میں دو مقالات پڑھے گئے۔ ایک ڈاکٹر سراج الحق صاحب صدر شعبۂ عربی و اسلامیات ڈھاکہ یونیورسٹی نے پڑھا، دوسرا ڈاکٹر ایم۔ انیس علی صدر شعبۂ طبعیات ڈھاکہ یونیورسٹی نے۔

یہ جشن ملک گیر تھا، اس لیے پاکستان کے ہر طبقہ اور شعبہ (Department) نے اس میں حصہ لیا، اخبارات نے ابن الہیثم پر خاص مضامین شائع کئے، ریڈیو پاکستان کے مختلف اسٹیشنوں

سے اردو، انگریزی، پشتو، سندھی اور بنگالی میں ابن الہیثم پر تقریریں نشر کی گئیں، کراچی کے ریڈیو اسٹیشن نے ایک خصوصی پروگرام پیش کیا، جس میں کراچی کے ممتاز اہل علم نے حصہ لیا، لاہور اسٹیشن سے بھی بچوں کے پروگرام میں ۹ تاریخ کو پروفیسر علی ناصر زیدی نے ابن الہیثم پر تقریر کی، انکے علاوہ ہر سیشن کی مختصر روداد مقامی ریڈیو اسٹیشن روزانہ نشر کرتا رہا، ٹیلیویژن پر مختلف سیشنوں کے پروگرام دکھائے گئے، ابن الہیثم کے سائنسی طریق تحقیق کا مظاہرہ کیا گیا، ابن الہیثم پر ایک ڈرامہ بھی دکھایا گیا،

محکمۂ ڈاک نے ۱۰ نومبر کو ابن الہیثم کی یادگار میں ٹکٹ جاری کیا جس میں ابن الہیثم کی بنائی ہوئی ایک جیومیٹریکل شکل اور اس کی پیدائش اور وفات کے سنہ درج ہیں،

اس جشن کے تمام اخراجات ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن نے برداشت کیے، اس کے علاوہ ابن الہیثم کے ان رسائل کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا جو حیدرآباد دکن سے ۱۳۵۷ھ میں چھپے تھے، یہ مترجم مقالات جشن کے موقع پر ممتاز اہل علم کو تحفۃً دیے گئے، اور ابن الہیثم کی بڑی تصویریں جو سیاہ زمین پر سنکوں سے بنائی گئی تھیں، ہر مقالہ نگار اور دوسرے اہم شرکا کو پیش کی گئیں، اس جشن کے ہر سیشن کا آغاز تلاوتِ قرآن سے اور بیشتر کارروائی اردو میں ہوئی، مگر بعض مقالات انگریزی میں بھی پڑھے گئے۔

جشن کا کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے، اور جیسا کہ حکیم محمد سعید صاحب نے اپنے خطبے میں کہا ہے، اس کے بعد دنیا کے ممتاز اہل علم سے ابن الہیثم پر مقالات لکھوا کر ہمدرد فاؤنڈیشن اردو اور انگریزی دو زبانوں میں شائع کرے گا، جن میں اس یادگاری جشن کے مقالات بھی شامل ہوں گے، ابن الہیثم کی ایک مکمل ببلوگرافی بھی تیار کی جا رہی ہے، ہمدرد فاؤنڈیشن کے پروگرام میں یہ بھی ہے کہ دنیا کے کونے کونے سے ابن الہیثم کی تالیفات کے مخطوطات کے فوٹو حاصل کرکے اردو زبان میں ان کے تراجم شائع کیے جائیں، سب سے پہلے ابن الہیثم کی مشہور و معروف "کتاب المناظر" کا اردو ترجمہ شائع کرنے کا خیال ہے۔

ادبیات

غزل

از جناب علی جواد زیدی

مراحی عقل و خرد نے ہزار بار بھری — مگر ہے اب بھی وہی تشنگی و دردسری
ی لگی ہے انھیں اہلِ دل کی بات کھری — کہ عیشِ بزم سے بہتر ہے لطفِ دربدری
ٹھالیا شبِ تاریک کے جھروکوں سے — مری بلند نگاہی نے گریۂ سحری
خیال ہے اک موجِ تلخ کامیِ عشق — تری نگاہ ہے جادو نگر کی لال پری
ـب سے خار چنے جائیں گے بیاباں میں — ذرا بلند تو ہو لے مذاقِ دربدری
ریبِ دار ملی عزمِ خندہ گر کو مرے — ہر ایک آنکھ محبت کے آنسوؤں سے بھری
یں میں تاب تماشا نہیں رہی ورنہ — وہی زمانہ، وہی زندگی کی جلوہ گری
وحسن حجابوں میں رہ کے بھی بیباک — نگاہِ عشق بلاؤں میں گھر کے بھی ہے جری
سی کے جلوۂ معصوم کا عطیہ نہ ہو — وہ پہلی چوٹ کہ مدت کے بعد بھی ہے ہری
ں نگاہ کہ جس نے چبھوئے ہیں نشتر — اسی نگاہ کو پھر ہو گی فکرِ بخیہ گری
ہاں ملے گا وہ رقص و ربابِ مستی میں — دیا ہے زخمِ جگر نے جو ذوقِ نغمہ گری

یہ کون جانے گا زیدیؔ ہم اہلِ دل کے سوا
کتابِ عشق میں اکثر مقام ہیں نظری

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہرؔ بجنوری

قفس والوں کی آخر باغباں تک بات جا پہنچی
کہاں کی بات تھی لیکن کہاں تک بات جا پہنچی

شکستِ دل سے فریاد و فغاں تک بات جا پہنچی
معاذ اللہ محبت میں یہاں تک بات جا پہنچی

کہاں چھپتی کہ جب دل سے زباں تک بات جا پہنچی
وہی آخر ہوا اُس بدگماں تک بات جا پہنچی

تجھے الزام کیا دوں جب تری شانِ ستم یہ ہو
ستم تو نے کیے اور آسماں تک بات جا پہنچی

چمن والوں میں تخریبِ چمن کا ذکر جب آیا
تو رفتہ رفتہ میرے آشیاں تک بات جا پہنچی

بالآخر بن گیا دل حسن کا خود آئینہ خانہ
رموزِ عشق و سرِّ دلبراں تک بات جا پہنچی

ہوئی تعریف اول دوستوں کی دوستداری کی
مگر آخر خلوصِ دشمناں تک بات جا پہنچی

مجھے مٹنے کا اپنے غم نہیں، غم ہے تو بس یہ ہے
جو میرے بعد اُن کے امتحاں تک بات جا پہنچی

جرس کی آخری آواز نے چونکا دیا سب کو
مری واماندگی کی کارواں تک بات جا پہنچی

قفس میں ذکرِ تعمیرِ نشیمن کر نہ اے ہمدم
اگر در پردہ یہ برقِ تپاں تک بات جا پہنچی

محبت کی ہتک ہے عشق کی توہین ہے جوہرؔ
محبت میں اگر سود و زیاں تک بات جا پہنچی

نوائے عصر

جناب یحییٰ اعظمی کی قومی و ملی نظموں کا مجموعہ "نوائے حیات" عرصہ ہوا شائع ہو کر ارباب ذوق سے سندِ قبول حاصل کر چکا ہے، "نوائے عصر" ان کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے، جو ابھی ابھی شائع ہوا ہے، اس میں زیادہ تر انکی وہ نظمیں ہیں جن میں انھوں نے ملک کی حیرت انگیز تعمیری ترقیوں اور کوششوں کو اپنے مشاہدات، محسوسات اور تاثرات کی روشنی میں خراج تحسین پیش کیا ہے، شروع میں صدر جمہوریہ ہند جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے قلم سے پیش لفظ ہے۔

ضخامت ۱۰۰ صفحے۔ قیمت: تےر۔ پتہ: دارالمصنفین، اعظم گڈھ

مطبوعات جدیدہ

کتاب النفس والروح وشرح قواہما — تصنیف امام فخر الدین رازی، مرتبہ ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی
متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۲۰ مجلد

قیمت درج نہیں۔ پتہ: ادارۂ تحقیقات اسلام، اسلام آباد، پاکستان

امام فخر الدین رازی نے مختلف علوم پر سَو سے زیادہ کتابیں لکھی تھیں، جو اکثر غیر مطبوع اور نایاب ہیں، زیر نظر رسالہ کے بھی صرف ایک ہی نسخہ کا جو بعض دوسرے رسائل کے ساتھ آکسفورڈ کے ایک کتب خانہ میں تھا، ابتک پتہ چل سکا ہے، یہ نسخہ حسنِ اتفاق سے مشہور فاضل ڈاکٹر صغیر حسن معصومی کی نظر سے ان کے قیام لندن کے زمانہ میں گذرا، انھوں نے اس کا فوٹو لے لیا، اور اب اس کو تصحیح و تہذیب کے بعد شائع کیا ہے، گو تراجم و فہارس کی کتابوں میں امام رازی کی اس تصنیف کا ذکر نہیں ملتا، لیکن اس کی لوح پر ان کا نام درج تھا، اور اس کے مندرجات اور طرز بیان وغیرہ کی بنا پر ڈاکٹر صاحب نے اس کو ان ہی کی تصنیف قرار دیا ہے، اور ان کے خیال میں حاجی خلیفہ نے کتاب النفس والروح اور تفسیر کتاب الاخلاق کے نام سے دراصل اسی کتاب کا ذکر کیا ہے۔ اس کا موضوع فلسفہ اور علم الاخلاق ہے، اور یہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے میں علم الاخلاق کے اصولِ کلیہ کا ذکر، نفس و روح کی حقیقت و ماہیت اور ان کے قوی وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، اور دوسرے حصہ میں بعض رذائل وشہوات کے علاج کا بیان ہے، اس حیثیت سے اس کے مباحث امام غزالی کی احیاء العلوم سے ملتے جلتے ہیں، مصنف علام نے

عقلی و نقلی دونوں حیثیتوں سے ان مسائل پر فاضلانہ گفتگو کی ہے، فاضل مرتب نے شروع میں امام رازی کے مختصر حالات و کمالات اور اس رسالہ کے بارہ میں مفید معلومات تحریر کیے ہیں اور آخر میں ان کی ایک سو چوالیس تصنیفات کے فن وار نام، آیات و احادیث کی تخریج، اسماء و اعلام کا اشاریہ اور مضامین کی مفصل فہرست دی ہے، اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوگا، اگر حدیثوں کی تخریج میں اس کی صراحت بھی کر دی جاتی کہ وہ کن کتابوں میں ملیں گی تو زیادہ مفید ہوتا، اس نادر و نایاب کتاب کی اشاعت پر فاضل مرتب اور ادارۂ تحقیقات اسلام دونوں اصحاب علم کے شکریے اور مبارکباد کے مستحق ہیں، کتابت و طباعت بڑی معیاری اور خوشنما ہے۔

تاریخ دعوت و عزیمت (حصہ اول)۔ مرتبہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، طباعت بہتر، صفحات ۴۹۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت عـ؎ پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے تاریخ دعوت و عزیمت کے نام سے جو مفید سلسلۂ تصنیف شروع کیا تھا، اس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں، یہ سلسلہ اس قدر مقبول ہوا کہ شروع کی دو جلدیں جن کو دار المصنفین نے شائع کیا تھا، اب ختم ہو چکیں اور ان کی دوبارہ اشاعت کے لیے شائقین کا شدید اصرار تھا، اس لیے مجلس تحقیقات و نشریات نے جلد اول کا یہ دوسرا اڈیشن شائع کیا ہے، اس جلد میں شروع سے ساتویں ہجری تک کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں اور مشہور مصلحین کے علمی و عملی کمالات اور مجددانہ کارناموں کا ذکر ہے، اس اڈیشن میں بعض جزوی ترمیم کے علاوہ دو مفید اضافے بھی کیے گئے ہیں، ان میں "فتنہ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش" خصوصیت سے قابل ذکر ہے، یہ اڈیشن بہت اہتمام سے شائع کیا گیا ہے، مگر کتابت کی متعدد غلطیاں رہ گئی ہیں، فہرست میں انڈکس کا ذکر ہے لیکن ہم کو جو نسخہ ملا ہے اس میں انڈکس نہیں ہے، امید ہے یہ اڈیشن پہلے سے زیادہ مقبول ہوگا۔

جائزۂ تراجم قرآنی - مرتبہ مولانا محمد سالم قاسمی و سید عبدالرؤف و سید محبوب رضوی عثمانی
تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۵ روپیے - پتہ مجلس معارف القرآن
(اکیڈمی قرآن عظیم) دارالعلوم، دیوبند

اس کتاب میں دنیا کی پچاس زبانوں کے ۳۷۹ تراجم قرآن کی اجمالی فہرست اور بعض ہندوستانی، فارسی اور فرنچ زبانوں کے تراجم کا قدرے تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے، جن ترجموں کا تفصیلی ذکر ہے اُن کے سنہ اشاعت کی عموماً تصریح اور اردو ترجموں کے نمونے بھی دیے گئے ہیں، بعض کے خصوصیات اور سنہ تالیف و ترجمہ کا ذکر بھی ہے، اگر ہر ترجمہ کی اہم خصوصیات اور سنہ ترجمہ و تالیف کی تعیین اور مترجم کے مختصر حالات بھی دیدیے جاتے تو کتاب مزید معیاری اور تحقیقی ہوجاتی، کم ازکم اردو ترجموں کی حد تک یہ کام زیادہ مشکل نہ تھا، ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ کا سنہ اشاعت ۱۸۹۹ء صحیح نہیں ہے، انھوں نے ۱۸۹۳ء میں ترجمہ کا کام شروع کیا تھا، اور وہ ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا، صفحہ ۹۰ پر تذکرہ علمائے ہند مصنفہ محمد ایوب قادری لکھا گیا ہے، حالانکہ وہ مترجم ہیں، تراجم قرآن کے متعلق متفرق مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں، یہ غالباً اس موضوع پر پہلی باقاعدہ کتاب ہے، ظاہر ہے تراجم قران کا کوئی جائزہ اور فہرست مکمل نہیں ہوسکتی، تاہم مرتبین کی یہ کوشش و کاوش بھی قابلِ ستایش اور ایک مفید قرآنی خدمت ہے، اور وہ اس کے لیے طلبۂ قرآن کے شکریے کے مستحق ہیں۔

تعلیم کے ابتدائی اصول حصہ اول - تصنیف ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم، ترجمہ مولوی سلطین احمد بدایونی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۰۵ مجلد مع گرد پوش، قیمت صہ، پتہ: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

پاکستان کے مشہور مفکر ڈاکٹر رفیع الدین صاحب سابق ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی کراچی، جن کا

حال ہی انتقال ہوا ہے، فلسفۂ تعلیم کے ماہر تھے، اور ایک جدید نصاب نظام تعلیم کے وضع و ترتیب میں مصروف تھے، یہ مفید کتاب ان کے تعلیمی تجربات اور غور و فکر کا نچوڑ ہے، اس میں انھوں نے اس کے ابتدائی اور بنیادی اصولوں کی خالص علمی اور منطقیانہ انداز میں وضاحت کی ہے، ان کے نزدیک زندگی اور تعلیم دونوں کا ایک ہی مقصد ہے، اور خدا کے کامل یقین اور روحانی و اخلاقی قدروں پر مبنی نظام تعلیم ہی سے قوم کو بلند نصب العین مل سکتا ہے، اس موضوع پر جدید طرز کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ زیادہ تر مغربی مفکرین اور ماہرین تعلیم کے خیالات و افکار پر مشتمل ہیں، ڈاکٹر صاحب نے ان پر متوازن اور بصیرت افروز تنقید اور ان صالح اصولوں کی نشاندہی کی ہے، جن کا اسلام داعی ہے، اصل کتاب انگریزی میں تھی، مولوی سبطین احمد صاحب بدایونی نے اس کے حصہ اول کا سلیس و شگفتہ اردو میں ترجمہ کیا ہے، اور اس پر مفید حواشی بھی تحریر کیے ہیں، اس کی اشاعت سے فن تعلیم پر ایک مفید اور فکر انگیز کتاب کا اضافہ ہوا، جو اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے خاص طور سے مطالعہ کے لائق ہے۔

اردو شاعری میں منظر نگاری - مرتبہ ڈاکٹر سلام سندیلوی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت عہ، پتہ: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔

زیر نظر کتاب مصنف کی ڈی لٹ کی ڈگری کا مقالہ ہے، اب انھوں نے اس کو اضافہ و ترمیم کے بعد شائع کیا ہے، اس میں اردو شاعری میں منظر نگاری کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، یہ سات ابواب پر مشتمل ہے، شروع میں منظر نگاری کی تعریف، فطرت کا مفہوم اور اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کے اسباب بیان کیے گئے ہیں، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ اردو شعرا نے مناظر فطرت کا کن کن حیثیتوں اور پہلوؤں سے ذکر کیا ہے، ہر ایک کی مثالیں بھی دی گئی ہیں، اور انکے

محاسن و معائب ظاہر کیے گئے ہیں، اردو میں اس موضوع پر یہ پہلی مبسوط کتاب ہے جو محنت اور سلیقہ سے لکھی گئی ہے، لیکن مضامین میں جابجا تکرار ہے اور بعض جزئیات کا اس طرح استقصا کیا گیا ہو کہ طبیعت گھبرا جاتی ہے، اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی کا مصنف نے کئی جگہ شکوہ کیا ہے، اور ایک باب میں اس کے اسباب بھی لکھے ہیں، دور قدیم میں خصوصاً غزلیہ شاعری کی حد تک تو اسکو درست مانا جا سکتا ہے، لیکن نظموں اور بعض دوسرے اصناف سخن خصوصاً جدید شاعری کے بارہ میں یہ شکوہ بیجا ہے، البتہ انگریزی اور سنسکرت کی شاعری کے مقابلہ میں اردو شاعری میں منظر نگاری کی کمی بھی ہے، اور اس کا معیار بھی پست ہے، اس سے قطع نظر یہ کتاب اپنے موضوع پر بڑی جامع ہے۔

دیوان شاہ نیاز بریلوی۔ مرتبہ ڈاکٹر انوار الحسن صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۴۴، مجلد، قیمت تحریر نہیں، پتہ: راجہ رام کمار بکڈپو وارث مطبع منشی نولکشور، لکھنؤ۔

مشہور صوفی بزرگ حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی (م ۱۲۵۰ھ) صاحبِ کمال شاعر تھے، اردو، فارسی، عربی اور ہندی چاروں زبانوں میں داد سخنوری دیتے تھے، ان کے بہت سے اشعار زبان زد ہیں، اور عرس و قوالی کی محفلوں کو گرم کرتے ہیں، اردو اور فارسی دیوان کئی بار چھپنے کے باوجود کمیاب تھے، لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی کے لائق استاذ ڈاکٹر انوار الحسن نے اس کو مختلف مجموعوں اور نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کے بعد شائع کیا ہے، اس کا بڑا حصہ فارسی اور اردو کلام پر مشتمل ہے، آخر میں ہندی کلام کا بھی مختصر نمونہ ہے، غزلیات کے علاوہ قصائد، نعت و منقبت، مناجات، مثنویات و مستزاد وغیرہ بھی ہیں، مقدمہ میں مرتب کے قلم سے صاحبِ دیوان کے حالات اور شاعری پر مفصل تبصرہ ہے، تصحیح میں بعض فروگذاشتیں رہ گئی ہیں، مرتب نے ان کی کل نو تصنیفات کا ذکر کیا ہے، مگر مسعود حسین صاحب نظامی کے مضمون "تصانیف حضرت شاہ نیاز بے نیاز بریلوی" (مطبوعہ معارف مئی ۶۰ء)

میں ستّرہ تصنیفات کا ذکر ہے، حضرت شاہ نیاز کا کلام مختصر ہونے کے باوجود منتخب سوز وگداز سے معمور اور عشق حقیقی کا صحیفہ ہے اور اس حیثیت سے اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

کعبؓ بن زُہیر اور قصیدۂ بانت سعاد۔ مرتبہ و مترجمہ جناب علی محسن صدیقی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۰۴، قیمت ۴ روپیہ پیسے، ناشر مکتبہ اسماعیلیہ جونا مارکیٹ، بھول چوک، کراچی۔

حضرت کعبؓ، مشہور جاہلی شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ کے فرزند اور اپنے دور کے نامور شاعر تھے، ان کا سب سے مشہور و مقبول قصیدہ "بانت سعاد" ہے، جو اپنی ادبی حیثیت کی بنا پر عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے، کعبؓ اسلام لانے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کیا کرتے تھے، قبول اسلام کے بعد اس کی معذرت اور تلافی کے لیے ایک قصیدہ لکھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے اس کو پسند فرمایا، اور اس کے ایک شعر پر اپنی ردائے مبارک مرحمت فرمائی، اسی کی نسبت سے وہ قصیدہ بردہ مشہور ہے، یہ قصیدہ بارہا چھپ چکا ہے، اب جناب محسن صدیقی استاد تاریخ کراچی یونیورسٹی نے کئی نسخوں کی مدد سے اس کا صحیح متن سلیس اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، اور اس کے لغات کی تشریح اور نسخوں کے اختلافات کا بھی ذکر کیا ہے، شروع میں حضرت کعبؓ کے حالات، ان کی شاعری اور اس قصیدہ کی خصوصیات پر تبصرہ اور اس کی مختلف شرحوں اور دوسری زبانوں کے ترجموں کا ذکر کیا ہے، فٹ نوٹ میں متعدد جاہلی اور مخضرمین شعراء کے مختصر حالات بھی آگئے ہیں، صلح حدیبیہ کا سنہ دو جگہ ۸ھ لکھا گیا ہے، جو غلط ہے۔

"ض"

مصنفات مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

۱۔ اسوۂ صحابہ: (حصہ اول) قیمت: لے
۲۔ اسوۂ صحابہ: (حصہ دوم) ،، شے
۳۔ اسوۂ صحابیات: ،، عا
۴۔ تاریخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کے خصوصیات کی تفصیل: قیمت: عہ
۵۔ حکمائے اسلام: (حصہ اول) دوسری صدی ہجری سے لیکر خاندانِ فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، قیمت: عہ
۶۔ حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، قیمت: عہ
۷۔ شعر الہند (حصہ اول) ،، عہ
۸۔ شعر الہند (حصہ دوم) ،، لعہ
۹۔ انقلاب الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان کا ایک کتاب کا انشا پردازانہ ترجمہ قیمت: للعہ
۱۰۔ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: (زیر طبع)
۱۱۔ امام رازی: امام فخر الدین رازی کے سوانح اور اُن کی تصنیفات: قیمت شے
۱۲۔ ابن خلدون: ابن خلدون کے سوانح زندگی اور اُس کے فلسفہ کی تشریح (زیر طبع)
۱۳۔ اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات کے ساتھ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل اُن کے فلسفۂ خودی کی تشریح، اور اُن کے فارسی و اُردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت ہے

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی و فقہی تاریخی و تنقیدی و ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعراء کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر طویل تبصرے بھی کئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اُن کے مضامین کی ترتیب و اشاعت بھی دارالمصنفین کے پیش نظر ہے۔ یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زبان و ادب اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، صفحات: ۳۴۶ قیمت: عہ منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(اڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ نبی کی و مدنی زندگی میں ۲۳ برس تک مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت، بلا امتیاز نسل و رنگ و بلا لحاظ ادو بوم سرتاپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بنائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب میں انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف ابواب کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، اُن کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ پورا دینِ اسلام ہی نہیں، بلکہ اُس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے لئے آیۂ رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورتوں کا درجہ، اور اُن کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخِ اسلام میں اُن کا مرتبہ، بلا تفریق مذہب و ملت پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہلِ کتاب اور مشرکینِ عرب وغیرہ سب داخل ہیں، غیر مسلم رعایا کے حقوق، حیوانات کے حقوق اور اُن کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو بابوں میں دنیا پر دینِ اسلام کے علم بردار مسلمانوں کے علمی احسانات، اُن کے علمی کارناموں، اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت :- ۲۳۰ صفحے، قیمت :- ۵۰/ روپے

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ال ۲ (۵۲۰)

فروری سنہ ۱۹۷۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کتبہ اقبال احمد

جلد ۱۰۵ ماہ ذوقعدہ و ذوالحجہ ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۰ء عدد ۲

مضامین

شذرات

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کی وفات کے بعد دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ میں ایک رکن کی جگہ خالی ہوگئی تھی، اُس کے گذشتہ جلسہ میں اس کے لئے جناب فخرالدین علی احمد صاحب وزیر حکومت ہند کا انتخاب بالاتفاق ہوا، ان سے اس کی منظوری کی اجازت پہلے مانگی گئی تھی، تو انھوں نے ازراہ کرم لطف و کرم اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا کہ "دارالمصنفین کی جو خدمات ہیں، اس لحاظ سے اُس کی رکنیت اُن کے لئے باعثِ فخر ہوگی" اس عنایت بھری تحریر سے اُس کے کارکنوں کی نہ صرف عزت افزائی ہوئی، بلکہ اُن کے کام کرنے کے حوصلے بھی بڑھے، امید ہے کہ آیندہ وہ اس دیرینہ علمی ادارے کو اپنے مفید مشوروں سے اسی طرح مستفید فرماتے رہیں گے جس طرح ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم نوازتے رہے،

معارف پاکستان میں بڑی تعداد میں جایا کرتا تھا، لیکن جب سے دونوں ملکوں میں مالی لین دین بند ہوگئی ہے، تو وہاں اس کی طلب کے باوجود خریداروں کی تعداد گھٹتی گئی، پھر بھی اس کے وہاں بہت سے قدرداں موجود ہیں، جن کی سہولت کی خاطر یہ انتظام کیا گیا ہو کہ اس کے چندے یہاں بھیجنے کے بجائے وہیں جمع کر دیئے جائیں لیکن یہ معلوم کرکے حیرت ہوتی کہ وہاں کے تقریباً پچھتر ایسے خریدار ہیں جن کے یہاں رسالہ برسوں سے جا رہا لیکن انھوں نے اس کے چندے ادا نہیں کئے، ان کو بار بار یاد دہانی کی جا رہی ہے مگر وہ جواب تک دینے کی زحمت گوارا نہیں کرتے، اس لئے مجبوراً اُن کے نام سے رسالہ بند کر دیا گیا ہے، معارف

کے خریداروں کا حلقہ باوقار اور سنجیدہ ہے، اس لئے اُن سے اب بھی توقع ہے کہ وہ بقایا ادا کرکے اپنا اخلاقی فرض ادا کریں گے، اور اس رسالہ کو غیر معمولی مالی خسارہ سے بھی بچالیں گے، اس کے چندے جناب ڈاکٹر سید نجی احمد ہاشمی لکچرار اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سندھ کے پاس جمع ہوا کرتے ہیں،

معارف گذشتہ پچپن ۵۵ سال سے اپنے خاص مسلک اور معیار کے ساتھ نکل رہا ہے، جس سے اردو میں اسلامی علوم وفنون اور زبان وادب سے متعلق قابلِ قدر ذخیرہ کا اضافہ ہوا ہے، اب تک اس کی یک رنگی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، معلوم نہیں اسی یک رنگی کو برقرار رکھنے ہی پر اکتفا کیا جائے، یا زمانہ کی رفتار کے ساتھ اس میں کچھ نیرنگی بھی پیدا کرنے کی ضرورت آگئی ہے، اس کا فیصلہ معارف کے ناظرین ہی کرسکتے ہیں، اگر وہ اس کے مسلک ومعیار کے مطابق مفید مشورے دیں تو اُن پر غور کیا جاسکتا ہے، عام طور سے ہندوستان کے بلند پایہ اور سنجیدہ رسالوں میں یا تو مذہبی یا ادبی مضامین نکلا کرتے ہیں، لیکن معارف میں تنوع کی خاطر مذہبی مضامین کے ساتھ علمی، تاریخی اور ادبی مضامین کی بھی اشاعت ہوا کرتی ہے، معلوم نہیں ان سے ہمارے ناظرین کی تشفی پورے طور پر ہوتی ہے کہ نہیں، اس میں سیاسی مضامین قصداً شائع نہیں کئے جاتے، سائنس کے مقالات بھی اس کے دائرہ سے باہر ہیں، معاشیات، نفسیات اور عمرانیات ایسے موضوع ہیں جن پر اس میں مضامین شائع کئے جاسکتے ہیں، اگر ان کے لکھنے والے مل جائیں گو اس کے خریدار کچھ ایسے بھی ہیں جو یہ لکھکر اسکی خریداری ختم کردیتے ہیں کہ وہ اسکو ایک مذہبی رسالہ سمجھ کر منگواتے ہیں، لیکن اس میں زیادہ تر علمی، تاریخی اور ادبی مضامین شائع ہوا کرتے ہیں اور کچھ خریدار ایسے بھی ہیں، جو یہ لکھتے ہیں کہ وہ اس کو ایک بلند پایہ علمی، تاریخی اور ادبی رسالہ سمجھتے ہیں، لیکن اس میں زیادہ مذہبی مضامین نکلتے ہیں، ان اعتراضات کے باوجود یہ رسالہ اپنا تنوع برابر برقرار رکھے گا، اور اگر ضرورت ہوئی تو اس میں مزید تنوع پیدا کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ باہر کے اہلِ قلم بھی تعاون کریں،

صمصام الدولہ شاہنواز خاں کی مشہور ومعروف تصنیف مآثر الامراء کی جلد سوم کا اردو ترجمہ بھی حال میں یہاں موصول ہوا ہے جو مرکزی اردو بورڈ لاہور سے شائع ہوا ہے، اسکے لائق مترجم [illegible]

قادری ہیں، اس کتاب کی پہلی جلد کے اردو ترجمہ کا ذکر معارف میں پہلے آچکا ہے، اس دوسری جلد کا اردو ترجمہ بھی سلیس اور رواں ہے، ہم نے پورے ترجمہ کو تو نہیں لیکن جا بجا اس کو اصل سے ملا کر دیکھا تو زیادہ تر اصل کے مطابق پایا، یہ جوان ہمت اور لائق مترجم کی محنت اور کاوش کی دلیل ہے، امید ہے کہ اس کتاب کی تیسری جلد کا ترجمہ بھی علمی حلقہ میں پسند کیا جائیگا، اُن کی اشاعت سے اردو زبان میں مفید تاریخی لٹریچر کا اضافہ ہوا ہے، فارسی کی اہم کتابوں کا ترجمہ اب اسلئے اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ نئی نسل اس زبان سے بیگانہ ہوتی جارہی ہے، یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ لائق مترجم آجکل نظام الدین احمد بخشی کی طبقات اکبری کے ترجمہ میں مشغول ہیں اور اسکے بعد ابوالفضل کی مشہور و ضخیم تصنیف اکبر نامہ کی تین جلدوں کا ترجمہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، دعا ہے کہ ان کی محنت بارآور ہو، پاکستان میں عربی اور فارسی کی اہم کتابوں کے ترجمے عام طور سے ہو رہے ہیں، چنانچہ ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ، گلبدن بیگم کی ہمایوں نامہ اور جہانگیر کی تزک جہانگیری کے ترجمے بھی کتب فروشوں کے یہاں مل سکتے ہیں، لیکن اگر ان ترجموں سے بھی کوتاہیاں سرزد ہوئیں جو حیدرآباد کے دارالترجمہ کے مترجموں سے ہو چکی ہیں، تو یہ ترجمے زیادہ مفید ثابت نہ ہو سکیں گے، دارالترجمہ کے ترجموں کی اشاعت و طباعت میں کافی سرمایہ صرف ہوا لیکن اُن کے ترجمے زیادہ تر ایسے ہیں جو اصل سے اس قدر مختلف ہو گئے ہیں کہ تنہا ان ترجموں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی کئی تاریخیں انگریزی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں، راورٹی نے طبقات ناصری، مسز ایس بیوریج نے بابر نامہ ہمایوں نامہ، ایچ بیوریج نے اکبر نامہ، ایچ۔ بلاخمن نے آئین اکبری اور جارج رینکنگ نے منتخب التواریخ کے انگریزی ترجمے میں جو محنت، دیدہ ریزی اور عرق ریزی کی ہے، وہ اردو کے مترجموں کیلئے مثالی نمونے ہونے چاہئیں، ان میں بھی کہیں کہیں غلطیاں ضرور ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے وہ ستائش کے لائق ہیں، اردو کے ترجموں میں زیادہ حواشی لکھنے کا لحاظ نہیں رکھا جاتا جیسا کہ انگریز مترجم کرتے ہیں، یہ ہمارے اردو کے مترجموں کی راحت پروری اور عجلت پسندی کی دلیل ہے، جو اس دور میں سراہی نہیں جا سکتی،

مقالات

معالم السنن امام خطابی

از ضیاء الدین اصلاحی

(۳)

حقیقت پسندی | امام خطابی شافعی المذہب تھے لیکن اس میں غلو نہ تھا، چنانچہ بعض مسائل میں انھوں نے امام شافعیؒ سے اختلاف بھی کیا ہے، بلکہ بعض مواقع پر ان کے مقابلہ میں دوسرے ائمہ کے مذاہب کو مرجح اور احوط قرار دیا ہے، اس سے ان کی حقیقت پسندی، انصاف اور رواداری ظاہر ہوتی ہے، مثلاً

زیورات کی زکوٰۃ کے وجوب میں صحابہ میں اختلاف ہے، حضرت عمرؓ، ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ (رضی اللہ عنہم) سے وجوب مروی ہے لیکن جابر بن عبداللہؓ، حضرت عائشہؓ، قاسم ابن محمد، شعبہ اور ایک روایت کے بموجب حضرت ابن عمرؓ سے عدم وجوب کی روایت ہے، سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، عطاء، ابن سیرین، جابر بن زید، مجاہد، زہری، ثوری اور ابوحنیفہ (رحمہم اللہ) نے پہلے قول کو اور امام مالک، احمد اور اسحٰق بن راہویہ نے دوسرے قول کو مرجح قرار دیا ہے، امام شافعیؒ کا بھی یہی اظہر و اصح قول معلوم ہوتا ہے، جو لوگ وجوب کے قائل ہیں، ظاہر کتاب اور احادیث و آثار سے ان کی تائید ہوتی ہے، دوسرے مسلک کے ماننے والوں نے اصلاً نظر و قیاس

پر اعتماد کیا ہے۔ اور روایت سے بھی یک گونہ ان کی تائید ہوتی ہے، مگر پہلا قول زیادہ بہتر اور احوط ہے، واللہ اعلم۔[1]

ایک حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :۔

" اگر حولان حول سے ایک روز قبل بھی کسی نے اپنے اونٹوں کا دوسرے اونٹوں سے تبادلہ کر لیا تو اس کو زکوٰۃ نہیں دینی ہوگی۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی دونوں بزرگوں کا یہی مسلک ہے۔ مگر امام شافعی کے نزدیک مویشیوں کی طرح نقود میں بھی مبادلہ کرنے سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک نقود میں ساقط نہیں ہوگی یہی قول احوط اور زیادہ بہتر ہے، کیونکہ نقود اصل المال ہیں۔ اگر ان میں اس قسم کے مبادلہ کو جائز قرار دیا گیا تو یہ فقراء کے حقوق کو روکنے اور زکوٰۃ کو باطل کرنے کا ایک ذریعہ ہو جائے گا۔"[2]

جمہور فقہاء کے نزدیک محرم کے بغیر عورت حج کا سفر نہیں کر سکتی، مگر امام مالک کے نزدیک عورتوں کی جماعت اور امام شافعیؒ کے نزدیک ایک آزاد اور ثقہ مسلمان عورت کے ساتھ اس کا سفر کرنا جائز ہے۔ امام خطابی امام شافعی کے قول کی مرجحیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"آزاد اور ثقہ مسلمان عورت کی حیثیت محرم آدمی کی نہیں ہے، جبکہ نبیؐ کا ارشاد یہ ہے کہ عورت کو بلا محرم کے سفر ہی نہیں کرنا چاہیے، اس قید اور شرط سے حج کے سفر کو مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ خلاف سنت ہے، اور بغیر محرم کے عورت کا سفر کرنا معصیت ہے، اس لیے محرم کے موجود نہ ہونے کی صورت میں اس پر حج کی ادائگی فرض و لازم نہیں ہوگی، لیکن امام شافعی اور ان کے متبعین فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "استطاعت زاد و راحلہ کا نام ہے" پس اگر زاد و راحلہ میسر ہوں تو اس پر حج لازم ہو جائے گا، رہی نہی تو اس کا تعلق ان سفروں سے ہوگا جو تطوعاً کیے جاتے ہیں، اس کا اطلاق سفر واجب پر نہیں ہوگا، لیکن یہ استدلال جس

---

[1] معالم السنن ج ۲ ص ۱۰۔ [2] ایضاً ج ۲ ص ۳۲

حدیث پر مبنی ہے۔ اس کے راوی ابراہیم بن یزید خوزی محدثین کے نزدیک متروک الحدیث ہیں اور یہ روایت حسن کے طرق سے مرسلاً بھی مروی ہے، لیکن امام شافعی کے نزدیک مراسیل سے حجت قائم نہیں ہوتی۔

شوافع کا خیال ہے کہ جس طرح کافر عورت دار الحرب میں مسلمان ہو جانے کے بعد محرم کے بغیر ہجرت کر کے دار الاسلام چلی آئے گی یا کوئی مسلمان قیدی عورت اگر کفار کے قید و بند سے رہا ہو جائے تو وہ تنہا سفر کر کے مسلمانوں کے علاقہ میں چلی آئے گی کیونکہ ان دونوں صورتوں میں عورتوں کا بلا محرم سفر کرنا واجب ہے، اسی طرح حج کا سفر بھی چونکہ واجب ہے، اس لیے اس میں بھی وہ بلا محرم کے سفر کر سکتی ہے، لیکن یہ قیاس غلط ہے، اگر واقعۃً ان سب سفروں کی حیثیت بالکل یکساں ہے تو عورت کو تنہا حج کے سفر کی اجازت دینا چاہیے تھا، آزاد اور ثقہ مسلمان عورت کی معیت کی قید لگانے کی کیا ضرورت تھی، اس قید سے تو خود ثابت ہوتا ہے کہ حج کے سفر اور ان سب سفروں میں بالکل واضح اور بین فرق ہے۔[1]

فئ کے متعلق بھی اختلاف ہے، حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہے کہ غنیمت کی طرح اس میں خمس نہیں نکالا جائے گا، یہی جمہور ارباب فتویٰ کا مسلک ہے، مگر امام شافعی اس میں بھی خمس کے قائل ہیں، امام خطابی ان کے استدلال کی توضیح کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

"حضرت عمرؓ آیت کی مراد و منشا کو زیادہ بہتر جانتے تھے، اور عام فقہا نے بھی انکی متابعت کی ہے، لیکن امام شافعی نے ان کے قول کی متابعت نہیں کی ہے۔ ظاہر ہے کہ صحابی کے قول کو اختیار کرنا ہی اولیٰ و احسن ہے، حضرت عمرؓ خلیفۂ عادل تھے، اور رسول اللہؐ نے فرمایا ہے:-

اقتدوا باللذین من بعدی ابی بکرؓ و عمرؓ — میرے بعد ابو بکرؓ و عمرؓ کی اقتدا کرو

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اقتدا ضروری اور لازمی ہے۔[2]

---

[1] معالم السنن ج ۲ ص ۱۴۴ و ۱۴۵ [2] ایضاً ج ۳ ص ۱۸

روایت پسندی | اگر بعض ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے امام شافعیؒ کے مسلک کو ترجیح دینے میں انصاف سے کام نہیں لیا ہے، لیکن اس کی مثالیں کم ہیں اور عموماً انھوں نے حدیث وسنت کو ہر چیز پر مقدم قرار دیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اصلاً روایت پسند تھے، مثلاً نجاشی کی غائبانہ نماز جنازہ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

"نجاشی مسلمان تھا، رسول اللہؐ پر ایمان رکھتا تھا اور آپ کی نبوت کی تصدیق کرتا تھا، مگر اپنے ایمان کو چھپاتا تھا، اور چونکہ مسلمانوں پر دوسرے مسلمانوں کے لیے دعا کرنا اور جنازہ کی نماز پڑھنا واجب ہے، لیکن نجاشی کفار کے درمیان تھا، اور مسلمانوں کو اس کی نماز جنازہ کا موقع نہیں ملا، اس لیے رسول اللہؐ نے نماز جنازہ غائبانہ پڑھی، کیونکہ آپ نبی و ولی ہونے کی حیثیت سے اس کے زیادہ حقدار تھے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی جگہ فوت ہو جائے اور اس کی نماز جنازہ وہاں پڑھی جا چکی ہو تو دوسری جگہ کے لوگوں کو اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کی ضرورت نہیں لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کسی عائق و مانع یا کسی خاص عذر کی وجہ سے کسی مسلمان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی ہے تو اس کی نماز جنازہ ادا کرنا مسنون ہے، بُعدِ مسافت کی وجہ سے اسکو ترک نہیں کیا جا سکتا، نماز ادا کرتے وقت میت کے شہر کے بجائے قبلہ کی طرف رخ کیا جائے گا، بعض علماء نے غائبانہ نماز جنازہ کو مکروہ قرار دیا ہے، ان لوگوں کے نزدیک آپ کا یہ عمل آپ کی ذات کے لیے مخصوص تھا، جیسا کہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نجاشی کا مشاہدہ فرما رہے تھے، مگر یہ توجیہ درست نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہؐ جب شریعت کا کوئی کام انجام دیں تو مسلمانوں پر اس کی متابعت لازم ہے، اور اس کو بلا دلیل تخصیص پر محمول نہیں کرنا چاہیے، یہاں تخصیص کی دلیل نہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ آپ صحابۂ کرام کو اپنے ہمراہ لیکر نماز جنازہ ادا کرنے گئے تھے، اور سب لوگوں نے آپ کے ساتھ جنازہ کی نماز ادا کی تھی۔"[1]

---

[1] معالم السنن ج ۱ ص ۳۱۱

عمران بن حصین سے روایت ہے کہ ایک شخص کے پاس چھ غلام تھے، ان کے علاوہ اور کوئی سامان اس کی ملکیت میں نہ تھا، اس نے اپنی موت کے وقت ان کو آزاد کر دیا، رسول اللہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ناپسندیدگی ظاہر فرمائی، پھر ان غلاموں کے درمیان قرعہ انداز کر کے ایک ثلث یعنی دو غلاموں کو آزاد کر دیا، اور چار کو غلام برقرار رکھا، فقہاء کی ایک جماعت امام مالک، شافعی، احمد اور اسحٰق بن راہویہ وغیرہ کا فتویٰ اس حدیث کے بالکل ظاہر کے مطابق ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ ہر غلام کے تین حصے کیے جائیں گے، ایک حصہ آزاد اور دو حصے غلام متصور کیے جائیں گے اور، وہ ان دو حصوں کی آزادی کے لیے سعی کریں گے، صرف دو غلاموں کو آزاد کرنا اور چار کو غلام برقرار رکھنا درحقیقت ظلم اور ناانصافی ہے، کیونکہ مالک کا مقصد سب کو آزاد کرنا تھا مگر سب کو آزاد کر کے اس نے ایک ممنوع کام کیا ہے، اور اپنے ورثاء کے حق کو پامال کیا ہے، اس لیے اس کا جس قدر عمل جائز اور صحیح ہے اس میں سارے غلاموں کو شریک کرنا لازم ہے، جس طرح کہ ہبہ اور وصیت جزء میں صحیح ہے، اسی طرح عتق بھی صحیح ہوگا، لیکن جب صاحبِ شریعت کا کوئی فیصلہ اور فرمان موجود ہو تو اس پر رائے وقیاس سے اعتراض کرنا اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے اصل کو لانا صحیح نہیں ہے، بلکہ اسی کو اصل قرار دینا اور اصلی حالت پر باقی رکھنا لازم ہے، وصیت اور ہبہ کی حیثیت عتق سے جدا اور مختلف ہے کیونکہ ورثاء کو مشترک اور عام ہبہ و وصیت سے نقصان نہیں پہنچتا، لیکن اگر عتق عام و مشترک ہو تو انھیں نقصان پہنچتا ہے، پھر عتق کا مسئلہ سب کو اسی وقت شامل ہو سکتا ہے جب اس کی گنجائش ہوتی، لیکن یہاں تو خود دین کے حکم اور رسول کے عمل نے سارے غلاموں میں اس کے اجزاء کے جاری کرنے کو ممنوع کر دیا ہے، اسی لیے قرعہ اندازی کی جائے گی تاکہ ظلم و ناانصافی کا احتمال باقی نہ رہے۔ (ج ۴ ص ۷۷)

امام خطابی کی اس رائے سے اختلاف کیا سکتا ہے، لیکن درحقیقت اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک حدیث وسنت کو کس قدر اہمیت حاصل تھی، اور وہ روایت وحدیث کو ہر چیز سے مقدم خیال کرتے تھے، اکثر مسائل ومباحث کے اختتام پر ان کے اس قسم کے الفاظ ملتے ہیں۔

السنۃ احق واولیٰ ان یتبع — سنت کی اتباع کرنا زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے

حدیثوں میں تطبیق اور رفع تضاد | امام خطابیؒ نے حدیثوں کے اختلاف وتضاد کو رفع کرنے اور ان میں تطبیق دینے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ دو حدیثیں متضاد ومعارض ہوں لیکن ان میں ایک کی سندیں قوی اور دوسرے کی ضعیف ہوں، ظاہر ہے کہ اس صورت میں قوی الاسناد حدیثوں کو مقدم قرار دیا جائے گا، مثلاً حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے بابل کی سرزمین کو ملعون قرار دیا اور اس میں مجھے نماز پڑھنے سے منع کیا لیکن اس کی سندوں میں کلام ہے، اسی لیے کسی صاحب علم نے بابل میں نماز پڑھنے کو حرام نہیں قرار دیا ہے، کیونکہ اس کے برخلاف رسول اللہ کی یہ مشہور حدیث جو زیادہ صحیح اور قوی ہے، موجود ہے:۔

جعلت لی الارض مسجداً وطھوراً — ساری زمین میرے لیے مسجد اور پاک بنائی گئی ہے

اگر پہلی روایت کو صحیح وثابت مانا جائے تو اس کا یہ مفہوم ہوگا کہ آپ نے بابل میں سکونت اختیار کرنے اور اس کو وطن بنانے سے منع فرمایا ہے، اس حیثیت سے وہاں نماز پڑھنے کی ممانعت بھی ہو جائیگی، لیکن یہ نہی خصوص پر محمول کیجائے گی، جیسا کہ حضرت علیؓ کے لفظ "نہانی" (مجھے منع کیا) سے یہ تصریحاً ظاہر ہوتا ہے، دوسرا احتمال یہ ہے کہ ممکن ہے رسول اللہؐ کا مقصد حضرت علیؓ کو اس فتنہ سے خبردار کرنا رہا ہو جو آیندہ ان کو کوفہ میں پیش آنے والا تھا۔" (ج ا ص ۱۴۸)

بعض حدیثیں ناسخ اور بعض منسوخ ہوتی ہیں، چونکہ عام لوگوں کی اس پر نظر نہیں ہوتی اسلیے وہ ان کو معارض سمجھتے ہیں۔ اس کی بیشمار مثالیں ہیں، ان کو طوالت کے خوف سے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

لیکن امام خطابی نے احادیث کو نسخ پر محمول کرنے سے حتی الامکان پرہیز کیا ہے اور ان میں بھی تطبیق کی پوری کوشش کی ہے، مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کے پاس چلا گیا، پھر اس نے رسول اللہؐ سے آکر بیان کیا۔ آپ نے اس کو کفارہ کی حسب ذیل تین صورتیں بتائیں: (۱) ایک غلام آزاد کرنا، (۲) دو ماہ کے پے در پے روزے رکھنا۔ (۳) ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔ اس نے کہا مجھے ان میں سے کسی کی تعمیل کی وسعت و قدرت نہیں، اسی اثنا میں آپ کے پاس ایک زنبیل کھجوریں آئیں، آپ نے فرمایا کہ لو اسے صدقہ کر دینا، اس نے کہا اے اللہ کے رسول! مجھ سے زیادہ محتاج کون شخص ہوگا۔ اس پر آپ ہنس پڑے اور فرمایا اچھا تمھیں لے لو، اپنے اہل و عیال کو کھلا دینا"۔ اس حدیث کو بعض لوگوں نے منسوخ قرار دیا ہے، مگر امام خطابی حدیث کا صحیح مفہوم بیان کرنے کے بعد اس کی تردید کرتے ہیں۔

"ان لوگوں کے قول کی صحت کا کوئی ثبوت حدیث سے نہیں ملتا، کیونکہ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ عدم وسعت کی وجہ سے اس وقت اس شخص کے ذمہ سے کفارہ ساقط ہو گیا تھا لیکن سرے سے اس کے ساقط ہونے کا اس میں کوئی ثبوت نہیں ہے، بلکہ آئندہ وسعت ہونے کے بعد وہ اس کے ذمہ لازمی ہوگا۔ گویا اس کا معاملہ اس مفلس جیسا ہوگا جس کو قرض ادا کرنے کے لیے موقع اور مہلت دیجاتی ہے، اس لیے حدیث کے منسوخ ہونے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا"۔ (ج ۲ ص ۱۱۹)

اگر کسی حدیث کی دلالت مختلف معانی پر ہوتی ہو تو امام خطابی ان سب معنوں پر اس کو محمول کرتے ہیں، مثلاً

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ مردہ کو اس کے اہل و عیال کے رونے دھونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے، حضرت عائشہؓ نے جب یہ سنا تو فرمایا کہ اللہ ابن عمرؓ پر رحم فرمائے۔ ان کو وہم ہوگیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ آپ ایک یہودی کی قبر کے پاس سے

گذرے تو فرمایا کہ اس کو عذاب دیا جارہا ہے، درانحالیکہ اس کے متعلقین اس پر رو دھو رہے ہیں،
پھر یہ آیت پڑھی :

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (بنی اسرائیل) اور کسی پر نہیں پڑتا بوجھ دوسرے کا۔

حضرت عائشہؓ نے جو مفہوم بیان کیا ہے وہ عین ممکن ہے کیونکہ انھوں نے یہ وضاحت کی ہے کہ یہ ایک یہودی کا واقعہ تھا، اس حیثیت سے ان کی روایت مفسر ہے اور مفسر بالعموم مجمل حدیثوں کے مقابلہ میں اولیٰ اور مرجح ہوتی ہیں، نیز ان کا استدلال آیت پر بھی مبنی ہے، تاہم حضرت ابن عمرؓ کا مفہوم بھی صحیح ہوسکتا ہے اور وہ آیت کے خلاف بھی نہیں ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اہل عرب اپنے ورثا کو نوحہ وبکا کی وصیت اور تلقین کرتے تھے، اس کا ذکران کے اشعار میں بھی ملتا ہے، طرفہ کہتا ہے:

اذامت فانعینی بما انا اھلہ وشقی علی الجیب یا ام معبد

(ترجمہ) جب میں مرجاؤں تو اے ام معبد اپنے گریباں چاک کرنا اور میرے شایان شان میرا ماتم کرنا

لبید بن ربیعہ کا شعر ہے:

الی الحول ثم اسم السلام علیکما ومن یبک حولا کاملا فقد اعتذر

(ترجمہ) تم دونوں (میری قبر پر) سال بھر تک رونا اور مجلس ماتم برپا کرنا (اس کے بعد اپنے فرض سے بری الذمہ اور سبکدوش ہوجاؤ گے کیونکہ) جو شخص (میت پر) سال بھر تک رو دھولے وہ قابل معافی ہے۔

اس اعتبار سے میت کو اس وصیت اور تلقین کی پاداش میں عذاب دیا جائے گا، جو اس نے اپنی زندگی میں اپنے ورثا کو کی تھی، رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے:

ومن سن سنۃ سیئۃ فعلیہ وزرھا ووزر من عمل بھا۔ (ج ۱ ص ۲۰۲، ۲۰۳)

اور جس نے کوئی برا طریقہ ایجاد کیا اور اس پر اس کا اور ان لوگوں کا بھی جو اس برے طریقہ کو اختیار کریں گے عذاب دیا جائے گا۔

اسی طرح اگر بعض حدیثوں کی دلالت مختلف معانی پر ہوتی ہے تو وہ اس مفہوم کو اختیار کرتے ہیں، جو دوسری صحیح وثابت روایتوں کے موافق ہوتا ہے،

بعض حدیثوں میں اس لیے تضاد معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص موقع ومحل یا مخصوص شخص کے حالات کے لحاظ سے ہوتی ہیں، چونکہ ان حالات وظروف پر نگاہ نہیں ہوتی اس لیے قلت تدبر اور عدم غور کی وجہ سے ان پر اعتراض کیا جاتا ہے، مثلاً

حضرت جابر بن عبداللہؓ انصاری سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک شخص انڈے کے برابر سونے کا ایک ڈلا لایا اور کہا کہ یہ مجھے ایک کان سے ملا ہے، میرے پاس اسکے سوا اور کچھ نہیں ہے، آپ اس کو قبول فرمائیں، یہ میری طرف سے صدقہ ہے، رسول اللہؐ نے کئی بار انکار فرمایا، مگر جب اس نے مسلسل اصرار کیا تو آپ نے سونا لے لیا اور فرمایا کہ تم لوگ اپنی ساری پونجی صدقہ کردیتے ہو اور اس کے بعد محتاج اور دست نگر بن جاتے ہو، بہترین صدقہ وہ ہے جس کے بعد آدمی محتاج اور دست نگر نہ رہے، اسی مفہوم کی ایک اور حدیث ہے کہ رسول اللہؐ نے حضرت سعدؓ سے فرمایا کہ تمھارا اپنے ورثہ کو غنی اور خوشحال چھوڑنا ان کو محتاج اور دست نگر چھوڑنے سے بہتر ہے، بظاہر اس شخص کے ساتھ جس نے آپ کو سونا دیا تھا، آپنے جو طرز عمل اختیار کیا تھا، وہ آپکے اس طرز عمل سے مختلف معلوم ہوتا ہے جو آپ نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ اختیار کیا تھا، کیونکہ آپ نے ان کا سارا مال واسباب بخوشی قبول کر لیا تھا اور اس پر کسی قسم کی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں فرمایا تھا لیکن یہ درحقیقت اسی بنا پر کہ آپ کو حضرت ابوبکرؓ کی نیت کی صحت اور قوت یقین کا پورا اندازہ تھا، اس لیے آپ کو ان کے بارہ میں کسی طرح کے فتنہ کا اندیشہ نہیں تھا، اس کے برعکس اس شخص کے بارہ میں آپ کو خطرہ تھا کہ اگر وہ اپنا سب کچھ صدقہ کردیتا ہے تو اس کے بعد ممکن ہے سخت کشمکش اور الجھن میں پڑ جائے، نیز اگر سارا مال دینے کی وجہ سے اس کو افسوس اور ندامت دامنگیر

ہوئی تو اس کا سارا اجر باطل ہو جائے گا۔"

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ :

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کھانا موجود ہو اور نماز کھڑی ہو جائے تو کھانے سے پہلے نہیں اٹھنا چاہیے، اس کے برخلاف حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے یا کسی اور چیز کے لیے نماز کو مؤخر نہیں کرتے تھے،

ان دونوں حدیثوں میں جمع و تطبیق کی صورت یہ ہے کہ پہلی حدیث کا تعلق اس شخص سے ہے جس کو سخت بھوک لگی ہو اور کھانا چھوڑنے سے اس کے کشمکش اور نماز کے اندر خلل اور وسوسہ ہو جانے کا اندیشہ ہو تو کھانا آ جانے کے بعد اگر نماز کے وقت میں گنجائش ہو تو پہلے کھا لینا چاہیے تاکہ اس کا نفس مطمئن ہو جائے، اور کھانے کی خواہش و رغبت ختم ہو جائے اور وہ اطمینان سے نماز ادا کر سکے، عہد صحابہ میں یہ آسان تھا کیونکہ ان کے یہاں کھانے کی بہت سی قسمیں نہیں ہوتی تھیں اور ان کا دسترخوان تکلفات و تنوعات سے خالی ہوتا تھا، اس لیے وہ بہت جلد کھانے پینے سے فارغ ہو جاتے تھے، اس کی وجہ سے نماز میں کوئی تاخیر نہیں ہوتی تھی، حضرت جابرؓ کی حدیث کی نوعیت اس سے مختلف ہے، یہ اس شخص کے متعلق ہے جس کو نہ سخت بھوک لگی ہو اور نہ ابھی کھانا آیا ہو، اور نماز کا وقت بھی ہو گیا ہو تو اس کو پہلے نماز اور بعد میں کھانا کھانا چاہیے۔" (ج ۴ ص ۲۴۱ و ۲۴۲)

حدیث کے رد و انکار کی ایک دلیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثیں لکھنے سے منع فرمایا تھا، اس کی حقیقت ملاحظہ ہو :۔

"عبداللہ بن عمروؓ بن عاص فرماتے ہیں کہ میری عادت تھی کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتا تھا، اس کو لکھ لیتا تھا، تاکہ اچھی طرح محفوظ ہو جائے، مگر قریش نے مجھے اس سے منع کر دیا، اور کہا کہ رسول اللہ بھی انسان ہیں، آپ بعض اوقات غیظ و غضب کی حالت میں بھی کلام فرماتے ہیں، اس لیے آپ کی ہر بات

لکھا کرو، اس لیے میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ مگر جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کو بیان کیا تو آپ نے اپنی انگلی سے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لکھ لیا کرو، قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اس سے صرف حق بات ہی نکلتی ہے، دوسری روایت مطلب بن خطب سے ہے کہ حضرت زیدؓ بن ثابت نے حضرت معاویہؓ سے ایک حدیث بیان کی تو انھوں نے ایک آدمی کو اسکے لکھنے کا حکم دیا، حضرت زیدؓ نے فرمایا کہ رسول کریمؐ نے ہم کو حدیثیں لکھنے سے منع کیا ہے، چنانچہ حضرت معاویہؓ نے بھی اسے مٹا دیا،

اس اختلاف و تضاد کو رفع کرتے ہوئے امام خطابی فرماتے ہیں :۔

"ممکن ہے پہلے تحریر و کتابت کی ممانعت کا حکم رہا ہو، لیکن بعد میں آپؐ نے اسکو جائز و مباح ٹھہرایا ہو، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے ایک ہی مجموعہ میں حدیث و قرآن دونوں کے لکھنے سے منع کیا تھا، کیونکہ اس سے دونوں میں اشتباہ اور گڈمڈ ہو جانے کا اندیشہ تھا، باقی مجرد لکھنا اور علم کو قلمبند کرنا ممنوع نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود امت کو تبلیغ و دعوت کا حکم دیا ہے، چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے فرمایا فلیبلغ الشاهد الغائب (موجود لوگ غیر حاضر لوگوں کو بتادیں) ظاہر ہے آپ کے ارشادات کی تبلیغ اُن کو قلمبند کیے بغیر کس طرح ممکن تھی، اس کے بغیر امت کے آخری دور کے لوگوں کو حدیثوں سے واقفیت کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا، پھر نہ لکھنے سے علم کے ضائع ہونے کا بھی اندیشہ ہے کیونکہ نسیان تو بشریت کا اقتضا ہے، اور کس کا حافظہ غلطی سے مامون رہ سکتا ہے، اسی لیے ایک شخص سے جس نے آپ سے سوء حفظ کی شکایت کی تھی، آپؐ نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے مدد لو اور اپنے ایک خطبہ کے متعلق فرمایا کہ اسے ابوشاہ کے لیے لکھ دو، چنانچہ وہ لکھا گیا، اس کے علاوہ رسول اللہؐ نے صدقات و دیات کے احکام و فرامین لکھوائے تھے یا وہ آپ سے سنکر لکھے گئے، ان تمام باتوں سے حدیثیں لکھنے اور علم کو قلمبند کرنے کا ثبوت ملتا ہے" (ج ۴ ص ۱۸۴ و ۱۸۵)

تفسیری مباحث | معالم السنن میں قرآنی آیات کی تفسیر و تاویل بھی نہایت لطیف اور دلکش انداز میں کی گئی ہے، اس کی بعض مثالیں گذشتہ مباحث میں گذر چکی ہیں اور آیندہ بھی ضمناً ذکر کیجائیں گی، اس لیے ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ حدیث کی توضیح قرآن سے اور قرآن کی حدیث سے کرتے ہیں، مثلاً

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "اپنی بیویوں کو اپنی لونڈیوں کی طرح نہ مارو" امام خطابی فرماتے ہیں کہ اس سے مطلقاً بیویوں کو نہ مارنا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ ضرورت کے وقت عورتوں کو مارا جا سکتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی رخصت عطا کی ہے، چنانچہ فرمایا:

فعظوهن واهجروهن فی المضاجع — تو ان کو سمجھاؤ اور جدا کرو سونے میں

واضربوهن (نساء - ۶) — اور مارو!

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مذکورۂ بالا حدیث میں ضرب شدید کی ممانعت کی گئی ہے۔ (ج ۱ ص ۴۸۵)

اس مثال سے حدیث و قرآن میں تعارض کی نفی ہوتی ہے، اسی طرح اگر کسی مسئلہ کے متعلق متعدد روایات موجود ہوں تو ان میں اس حدیث کو اختیار کرنا چاہیے جو ظاہر قرآن کے موافق ہو، اس کی مثال صلوۃ الخوف سے متعلق روایات میں ملتی ہے، ایک اور روایت میں ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم لوگ جھوٹ سے بچو، کیونکہ جھوٹ فجور کی اور فجور دوزخ کی جانب لیجاتا ہے، اور سچائی اختیار کرو، کیونکہ سچائی نیکی کی طرف اور نیکی جنت کی طرف لے جانے والی ہے۔ ٹھیک یہی چیز قرآن کی اس آیت میں بیان کی گئی ہے:-

ان الابرار لفی نعیم وان الفجار — بیشک نیک لوگ بہشت میں ہیں اور

لفی جحیم (انفطار) (معالم السنن ج ۴ ص ۱۳۴) — بیشک گنہگار دوزخ میں ہیں۔

حدیث کی فنی بحثیں | امام خطابی جرح و تعدیل کے بھی امام تھے، اور معالم السنن میں اصول حدیث کے متعلق

بڑی ماہرانہ گفتگو کی ہے، یہاں اس کے بعض نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

محدثین کا ایک اصول یہ ہے کہ ثقہ راوی کی زیادتی مقبول اور صحیح روایت کا اضافہ معتبر ہوتا ہے ان کا ایک دوسرا اصول یہ ہے کہ اگر کسی روایت میں کسی مسئلہ کا اثبات ہو تو وہ اس روایت کے مقابلہ میں مرجح ہوگی جس میں نفی کا ذکر ہو، ان میں سے ایک اصول کا مندرجۂ ذیل مثال میں ذکر ہے:

"رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کے ثبوت میں جو صحیح حدیثیں ہیں وہ ابن مسعودؓ کی حدیث کے مقابلہ میں جس میں اس کی نفی کا ذکر ہے، اولیٰ ہیں، کیونکہ اثبات نفی پر مقدم ہوتا ہے ممکن ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس بارہ میں ویسے ہی سہو ہوگیا ہو جیسے کہ گھٹنوں کو رکوع میں پکڑنے کے متعلق ان سے تسامح ہوگیا ہے، اور تمام صحابہ نے ان سے اختلاف کیا ہے، اسی طرح کعبہ کے اندر رسول اللہؐ کے نماز پڑھنے کے متعلق اختلاف ہے، حضرت بلالؓ سے اثبات کی اور حضرت اسامہؓ سے نفی کی روایت ہے، مگر لوگوں نے حضرت بلالؓ کے قول کو اختیار کیا ہے، اور حضرت اسامہؓ کی روایت کو ان کے سہو پر محمول کیا ہے،

اسی طرح محدثین کے اس اصول کا بھی کئی جگہ ذکر کیا ہے کہ مفسر حدیثیں مجمل حدیثوں کے مقابلہ میں مقدم قرار دی جائیں گی، اور ثقہ کا اضافہ اور معتبر حدیث کی زیادتی مقبول ہوگی۔

ایک حدیث کی سند کے سلسلہ میں ائمۂ فن اور علمائے جرح و تعدیل کے اقوال نقل کیے ہیں، اس کی تفصیل یہ ہے:-

شعبہ نے یعلیٰ بن عطاء سے اور وہ علی بن عبداللہ بارقی سے اور وہ ابن عمرؓ سے اور عبداللہ بن عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ (صلوٰۃ اللیل والنہار مثنیٰ مثنیٰ) یعنی رات اور دن کی نماز دو دو رکعت ہے، حالانکہ ابن عمرؓ سے نافع، طاؤس اور عبداللہ بن دینار نے بھی روایت کی ہے، مگر کسی نے بھی دن کا ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ سب نے صرف رات ہی کا ذکر کیا ہے، لیکن اضافہ

مقبول ہوتا ہے، اس لیے اہل علم نے نوافل کے سلسلہ میں اسی حدیث پر عمل کیا ہے، شعبہ نے ایک اور روایت کی ہے، اس میں مطلب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بیان کیا ہے کہ (الصلوٰۃ مثنیٰ مثنیٰ) یعنی نماز دو دو رکعت ہے. مگر محدثین نے اس حدیث کے سلسلہ میں شعبہ کو مخطی قرار دیا ہے، امام بخاری فرماتے ہیں کہ انھوں نے اس میں کئی غلطیاں کی ہیں، عن انس بن ابی انس کہا ہے، حالانکہ صحیح عمران بن ابی انس ہے، پھر عن عبداللہ بن حارث کہا ہے، جو عن عبداللہ بن نافع عن ربیعہ بن الحارث ہے اور ربیعہ ابن حارث مطلب کے بیٹے ہیں، اس کے علاوہ وہ عن المطلب کہتے ہیں جبکہ حدیث فضل بن عباس کے واسطہ سے مروی ہے اور شعبہ نے فضل کا ذکر ہی نہیں کیا ہے. میں کہتا ہوں کہ اس کو لیث بن سعد نے عبداللہ بن سعید سے اور انھوں نے عمران بن انس سے اور انھوں نے عبداللہ بن نافع سے اور وہ ربیعہ بن حارث سے اور وہ فضل بن عباس سے اور فضل رسول اللہ سے بیان کرتے ہیں اور یہی صحیح ہے یعقوب بن سفیان نے بھی امام بخاری کی طرح شعبہ کو مخطی قرار دیا ہے، اور لیث بن سعد کی تصویب کی ہے، یہی محمد بن اسحٰق بن خزیمہ کا بھی خیال ہے". (ج ا ص ۲۷۸ و ۲۷۹)

فقہا کے مسالک

امام ابوسلیمان خطابی فقہ وخلافیات میں بھی ممتاز تھے، ان کی اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فقہاء کے آراء و مسالک اور مختلف مسائل و احکام میں علماء کے اختلافات کی پوری تفصیل موجود ہے، اس کی متعدد مثالیں دوسری بحثوں میں ضمناً گذر چکی ہیں، ذیل میں ان بزرگوں کے نام تحریر کیے جاتے ہیں، جن کے مسالک امام خطابی نے تحریر فرمائے ہیں:

صحابہ کرام میں حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، سعد بن وقاصؓ، عائشہؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، زید بن ثابتؓ، ابوسعید خدریؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، انس بن مالکؓ، عبداللہ بن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابن زبیرؓ، ابوہریرہؓ، جابرؓ، عبداللہ بن مغفلؓ وغیرہ، تابعین و تبع تابعین میں عمر بن عبدالعزیزؒ، سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، عروہ ابن زبیر، زہری، عطاء بن ابی رباح، سلیمان بن یسار، عمرو بن دینار، سالم، قاسم بن محمد، قاضی شریح، قتادہ، طاؤس، مکحول، مسروق، ابن جریج، مجاہد، ابن سیرین، حسن بصری، علقمہ، حماد،

ابراہیم نخعی، شعبی، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، حارث بن ہشام، ربیعہ بن عبدالرحمٰن، اور عبید بن عمیر وغیرہ، اور محدثین و فقہائے امصار میں امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد، اسحٰق بن راہویہ، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، ابن شبرمہ، اوزاعی، لیث بن سعد، عبداللہ بن مبارک، ابویوسف، محمد، یحییٰ بن قطان، محمد بن اسحٰق بن خزیمہ، ابوثور، داؤد ظاہری، ابوعبید قاسم بن سلام، عبیدہ، ابن جریر طبری، ابوالعباس بن سریج، ابوسعید اصطخری مزنی، ابوعبدالرحمٰن شافعی، ماجشون اور حکم وغیرہ،

امام خطابی نے ان حضرات کے مسالک و آراء بیان کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ انکے اختلافات میں محاکمہ بھی کیا ہے اور مرجح قول کی نشاندہی بھی کی ہے،

تفقہ و اجتہاد | اس کتاب میں امام خطابی کے فقہی و اجتہادی کمالات کے نمونے بھی ملتے ہیں، قیاس و اجتہاد کی ضرورت ملاحظہ ہو

ایک حدیث میں ہے انما النساء شقائق الرجال یعنی عورتیں مردوں کی شقیق اور نصف ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز کو اس کی نظیر اور مماثل چیزوں سے ملحق کرنا جائز ہے، اسی کا نام قیاس ہے، نیز اگر خطاب مردوں سے ہو تو عورتیں بھی اس میں شامل ہیں، تاآنکہ تخصیص کی کوئی دلیل موجود ہو۔[1]

حضرت عمرؓ نے روزہ کی حالت میں بوسہ لیا پھر رسول اللہؐ سے اس کا تذکرہ کیا، آپ نے فرمایا اگر تم کلی کرتے تو کیا ہوتا یعنی جس طرح کلی کرنے میں پانی کے حلق کے نیچے چلے جانے کا اندیشہ ہو جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اسی طرح اس میں بھی خطرہ ہے لیکن جب کلی سے روزہ نہیں ٹوٹتا تو اس سے بھی نہیں ٹوٹے گا، اس سے ایک چیز کا اسی طرح کی دوسری چیز پر قیاس و اعتبار کرنا اور ایک کے حکم میں دوسری مشابہ چیز کے حکم کو بھی شامل اور شریک کرنا ثابت ہوتا ہے (ج ۲ ص ۱۱۲)

فقہی و اجتہادی بصیرت کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:-

---

[1] ج ۱ ص ۷۹

حدیث میں ہے کہ "اگر کتا برتن میں منہ ڈال دے تو اس کو سات بار دھونا اور پہلی دفعہ مٹی سے مانجنا چاہیے" اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اشنان (یہ ایک طرح کی گھاس ہے جس کی پتیوں سے صابن کی طرح کپڑے دھوئے جاتے ہیں) اور اسی طرح کی ان تمام چیزوں کو بھی جو صاف ستھرا اور جلا پیدا کرنے والی ہوں استعمال کیا جاسکتا ہے، یعنی اگر مٹی کے بجائے ان سے برتن مانجا جائے تو کوئی حرج نہیں۔" (ج ۱ ص ۴۰)

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خون آلودہ کپڑے کو نمک حل کر کے اس سے کپڑا صاف کرنے کا حکم دیا" امام خطابی فرماتے ہیں کہ نمک کھائی جانے والی چیزوں میں ہے، اور جب رسول اللہؐ نے کپڑا دھونے اور خون صاف کرنے کے لیے اس کے استعمال کا حکم دیا ہے اور صابون سے ریشمی کپڑا دھونے میں اس کے خراب ہوجانے کا اندیشہ ہے، اس لیے شہد سے کپڑا دھونا بھی جائز ہوگا، اور داغ دھبا اور روشنائی کا نشان زائل کرنے کے لیے سرکہ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، علی ہذا القیاس لوبیا، کدو، اور خربوزے کے آٹے اور بھوسی سے ہاتھوں کو دھونا اور رگڑنا بھی درست ہے، غرض جن چیزوں سے صفائی اور جلا ہوسکتی ہو، ان کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" (ج ۱ ص ۹۶)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہؐ اور صحابہ کرام پہلے بیت المقدس کیجانب رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، مگر جب یہ آیت اتری کہ (فول وجهك شطر المسجد الحرام) تو خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے، اس کے بعد قبیلہ بنو سلمہ کے ایک شخص نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ بیت المقدس کی جانب رخ کر کے فجر کی نماز پڑھ رہے ہیں، تو اس نے دو بار زور سے کہا کہ قبلہ تبدیل ہوگیا ہے، یہ سنکر ان لوگوں نے رکوع کے اندر ہی اپنا رخ خانہ کعبہ کی طرف کرلیا" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتک جو نمازیں بیت المقدس کی جانب رخ کر کے پڑھی گئی تھیں

وہ سب ادا ہوگئیں، یہانتک کہ اگر نماز شروع کرنے سے پہلے بھی کسی کو اس کا علم نہ رہا ہو اور نماز کے اندر علم ہو جائے تو وہ اپنی ہیئت تبدیل کرلے گا اور اس وقت تک جتنی رکعتیں پڑھ چکا ہے وہ ادا ہو جائیں گی، اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں، امام خطابی اس پر قیاس کرکے فرماتے ہیں کہ

"عبادات کی طرح معاملات میں بھی یہ صورت ہوسکتی ہے، مثلاً کسی نے کسی کو بیع و شراء کا وکیل بنایا، پھر چند روز بعد اس کو الگ کر دیا تو وکیل نے معزولی کی اطلاع سے پہلے جتنے عقود و معاملات کیے ہیں وہ سب درست سمجھے جائیں گے۔" (ج ۱ ص ۲۲۱ و ۲۲۲)

صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو جو قبیلۂ بنو خزاعہ کا تھا مکہ بھیجا کہ وہ قریش کے بارہ میں آپ کو اطلاعات بہم پہنچائے۔ امام خطابی فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر ہونے کے باوجود اس آدمی کو جاسوس بنایا اور اس کی باتوں کی تصدیق بھی فرمائی تو امراض کی تشخیص اور علاج کے لیے کافر حکماء و اطباء پر اعتماد کرنا اور ان کے مشورے ماننا بھی درست ہے بشرطیکہ وہ اپنے فن میں بدنام اور متہم نہ ہوں۔ (ج ۱ ص ۳۲۹)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے ایک طویل حدیث مروی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض صحابۂ کرام نے ایک مریض کو سورۂ فاتحہ پڑھکر دم کیا، وہ شفایاب ہوگیا، صحابہ نے اس سے علاج کا معاوضہ لیا"، اس حدیث سے فقہاء نے تعلیم قرآن کی اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے، مگر امام خطابی کے مجتہدانہ ذوق نے اس سے اطباء اور ڈاکٹروں کے فیس لینے کا جواز بھی ثابت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں صورتوں میں بالکل یکسانیت ہے، اس لیے ان کے احکام بھی یکساں ہوں گے۔ (ج ۳ ص ۱۰۱)

ایک شخص اجرت لیکر وزن کرتا تھا، رسول اللہ صلعم نے فرمایا "وزن کرو اور اس میں ذرا بڑھا دیا کرو"۔ امام خطابی فرماتے ہیں کہ جس طرح ناپنے اور تولنے کی اجرت لیجا سکتی ہے، اسی طرح تقسیم کرنے اور حساب کتاب کرنے کی بھی لیجا سکتی ہے۔ (ج ۳ ص ۹۰)

آپ نے روزہ دار کو استنشاق سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس سے دماغ تک پانی پہنچنے کا اندیشہ ہے، اس پر قیاس کرکے ہر وہ چیز روزہ دار کے لیے ممنوع ہوگی جس کے جوف تک پہنچنے کا اندیشہ ہو مثلاً ایما وغیرہ۔ (ج ۲ ص ۱۰۸)

لغت وعربیت | امام خطابی ادب، انشا پردازی اور شعر وسخن میں بھی یگانہ تھے، عربی زبان وادب پر ان کی نظر نہایت وسیع اور گہری تھی، اس لیے معالم السنن ادبی ولغوی حیثیت سے بھی معلومات افزا کتاب ہے، اگر اس کی لغوی، ادبی اور نحوی تحقیقات کو جمع کیا جائے تو ایک رسالہ مرتب ہو سکتا ہے، خطابی نے الفاظ کی تحقیق میں اعراب، اوزان، اشتقاق، تذکیر وتانیث، واحد، تثنیہ اور جمع کی تصریح، مختلف قبائل کی زبانوں کے اختلاف اور مترادف الفاظ کے دقیق معنوی فرق کی توضیح، موقع ومحل کی رعایت سے معنی کی تعیین، شرعی واصطلاحی الفاظ کی تشریح، الفاظ کی اپنے معنی سے حقیقی یا مجازی مناسبت، مشکل جملوں، محاوروں، ضرب الامثال، طرز ادا اور اسالیب کلام کی وضاحت، نحوی وصرفی مباحث اور معانی وبیان کے نکات، غرض مختلف پہلوؤں سے جامع اور محققانہ بحثیں کی ہیں، اور قرآن مجید، احادیث اور شعرائے عرب کے کلام سے شواہد ونظائر پیش کیے ہیں، ان سب خصوصیات کی تفصیل دکھانا بہت دشوار ہے، اسلیے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مترادف الفاظ کا فرق | عربی نہایت وسیع زبان ہے، اس کے ذخیرۂ لغت میں معمولی فرق کے لیے جدا جدا الفاظ پائے جاتے ہیں، اس کا اندازہ مترادف لفظوں کے ان معنوی فرق سے ظاہر ہے،

"ظن" کی ابتدا حسبان (گمان) اور آخر علم ویقین ہے، اسی لیے عرب کبھی ظن کو حسبان اور کبھی علم ویقین کے موقع پر استعمال کرتے ہیں، کیونکہ اس کے کنارے دونوں لفظوں سے ملے ہوئے ہیں، علم کا آغاز بھی ظن سے اور خاتمہ یقین پر ہوتا ہے، قرآن مجید میں ہے (الَّذین یظنون انھم ملاقوا ربھم) یہاں یظنون، یوقنون کے معنی میں ہے۔ (ج ۱ ص ۶۲)

نہ دینے اور روکنے کے مفہوم کے لیے شح، بخل سے زیادہ بلیغ لفظ ہے، شح بمنزلہ جنس اور بخل بمنزلہ نوع کے ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بخل یہ ہے کہ آدمی اپنے مال کے بارہ میں بخل کرے اور شح یہ ہے کہ اپنے مال و معروف دونوں کے بارہ میں بخل سے کام لے۔ (ج ۲ ص ۸۳ و ۸۴)

رفاہ کے معنی کثرت آرائش اور زیادہ بناؤ سنگار کرنے کے ہیں، یہ دراصل رفہ سے نکلا ہے، جس کے معنی اونٹ کا روز آنہ گھاٹ پر پانی پینے کے لیے آنا ہے، اگر وہ ایک روز ناغہ سے آئے تو اس کو غب کہا جاتا ہے، اور جب کئی روز کے ناغہ سے آئے تو ظما کہا جاتا ہے۔ (ج ۴ ص ۲۰۸)

طرز ادا اور اسلوب کلام کی توضیح عربوں کے کلام میں کنایہ کا استعمال بہت عام ہے، اور الفاظ کے انتخاب میں ان کا ذوق اتنا بلند ہے کہ وہ اپنی زبان کو ایسے الفاظ سے آلودہ کرنا پسند نہیں کرتے جو سماعت اور بصارت پر گراں گذریں۔ (ج ۱ ص ۱۵)

ایک حدیث کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے (انما انا لکم بمنزلۃ الوالد) اس طرز تخاطب کی خوبی اور بلاغت اس طرح ظاہر کرتے ہیں: "یہ کلام کی تمہید کا طریقہ اور مخاطب کو مانوس کرنے کا انداز ہے تاکہ اس کی وحشت و اجنبیت دور ہو جائے اور اور دین کے معاملہ میں اس کو جو دشواری پیش آئے، اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنے میں شرم و جھجک نہ محسوس کرے جس طرح لڑکا اپنے باپ سے کوئی بات دریافت کرنے میں شرماتا اور جھجکتا نہیں۔" (ج ۱ ص ۱۴)

اہل عرب کے کلام کی تین صورتیں ہیں (۱) ایجاز و اختصار (۲) عدل و کفاف (اس کو مساوات بھی کہتے ہیں، یعنی بقدر ضرورت الفاظ لائے جائیں، نہ کم نہ زیادہ) (۳) اشباع و زیادتی، (اس کو اطناب بھی کہا جاتا ہے) اطناب کی مثال یہ ہے "فصیام ثلثۃ ایام فی الحج وسبعۃ اذا رجعتم کے بعد "تلک عشرۃ کاملۃ"۔ حالانکہ سات اور تین کے مجموعہ کا دس ہونا بالکل واضح تھا،

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشہر حرم کے ذکر میں فرمایا "ورجب مضر الذی بین جمادی وشعبان"
اطناب کا مقصد کسی چیز کی تعریف وتاکید اور مکمل وضاحت ہے، کیونکہ تکرار اور کثرت بیان سے کامل معرفت
اور بات پوری طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہر تکرار و اطناب عیوب کلام میں داخل نہیں ہے۔
ایک حدیث میں ہے (أینقص الرطب اذا یبس) یعنی کیا ہرے کھجور خشک ہونے کے بعد کم ہو جاتے ہیں؟
ظاہر ہے یہاں استفہام سوال کے لیے نہیں ہے، کیونکہ اتنی واضح بات آپ سے مخفی نہیں ہو سکتی تھی، بلکہ یہ
استفہام تقریر و اثبات کے لیے ہے۔ اس سے آپ لوگوں کو حکم کی علت اور نکتہ سے آگاہ فرمانا چاہتے
تھے، تاکہ وہ دوسرے امور میں بھی ان کا اعتبار کریں، جریر کا شعر ہے:۔

ألستم خیر من رکب المطایا　　　واندی العالمین بطون راح

(ترجمہ) تم لوگ سب سے بہترین سوار اور سب سے زیادہ سخی ہو۔

اگر یہاں استفہام کو سوالیہ مانا جائے تو اس میں مدح کی کوئی بات نہیں رہ جائیگی۔ (ج سوم)،
"عصرین" سے عصر اور فجر کی نمازیں مراد ہیں، اہل عرب دو ناموں کو اسی طرح ملا دیا کرتے ہیں،
جیسے عمرین (ابوبکرؓ و عمرؓ) اسودین (کھجور اور پانی) اور اذانین (اذان واقامت) وغیرہ۔ عصرین
کے اصلی معنی شب و روز کے ہیں، حمید بن ثور کہتا ہے۔

ولن یلبث العصران یوم ولیلۃ　　　اذا طلبا ان یدرکا ما تیمما

عصران یعنی روز وشب ہرگز رکتے اور ٹھہرتے نہیں، چنانچہ اگر انکو پانے کی کوشش کیجائے تو نہیں پایا جاسکتا،
عصر وفجر کو عصرین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ رات و دن کے کناروں پر ادا کیجاتی ہیں، اس طریقۂ ادا
کا فائدہ حذف و اختصار ہے، کیونکہ دو ناموں کو الگ الگ ذکر کرنے کے مقابلہ میں یہ مختصر اور آسان
صورت ہے (ج ۱ ص ۳۴۳ و ۲۷۷)

بعض اہل لغت کی تردید | الفاظ و لغات کا غلط مفہوم بیان کرنے والوں کی جابجا تردید بھی کی ہے،

مثلاً ایک حدیث (انا الرحمن وھی الرحم شققت لھا من اسمی) کے ضمن میں لکھتے ہیں :-

" ان لوگوں کا خیال صحیح ہے جو لغوی ناموں کے اشتقاق کے قائل ہیں لیکن بعض لوگ اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام اسماء وضعی ہیں، لیکن اس حدیث سے ان کے قول کا غلط ہونا بالکل ظاہر ہے، اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رحمٰن عربی زبان کا لفظ اور رحمت سے مشتق ہے لیکن بعض مفسرین نے اس کو عبرانی قرار دیا ہے، جو صحیح نہیں ہے، رحمان فعلان کے وزن پر ہے اور یہ ان صفات میں ہے جو مبالغہ کے لیے آتی ہیں، جیسے غضبان اس شخص کو کہا جاتا ہے جو غصہ سے بھرا ہوا ہو لیکن اگر کوئی غصہ میں ہو مگر غصہ اس پر پوری طرح مستولی اور غالب نہ ہوا ہو تو ضجر وحرد وغیرہ کہیں گے۔ اسی طرح سکران نشہ اور مستی میں سرشار شخص کو کہا جاتا ہے اور اس سے کم درجہ کی سکر کی کیفیتوں کے اظہار کے لیے طرب اور ثمل وغیرہ الفاظ بولے جاتے ہیں، اسی لیے رحمٰن سے صرف اللہ تعالیٰ ہی کو موسوم کیا جاتا ہے اور اسکی تثنیہ اور جمع نہیں آتی۔ (ج ۱ ص ۳۳)

مشہور حدیث الولد للفراش وللعاہر الحجر کے ضمن میں لکھتے ہیں ؛" اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں حجر کے معنی رجم کے ہیں، جو صحیح نہیں ہے، کیونکہ ہر زانی کو سنگسار نہیں کیا جاتا، دراصل یہ محرومی اور گھاٹے کی ایک بلیغ تعبیر ہے، یہ ایسی ہی ہے جیسے تم کسی کی ناکامی و نامرادی ظاہر کرنے کے لیے اس سے کہتے ہو مالک غیر التراب اور مالی یدک غیر الحجر، ایک روایت میں ہے کہ اگر کتے کا مالک تم سے اس کی قیمت مانگے تو اس کی ہتھیلی میں مٹی بھر دو یعنی اسے کچھ نہ دو۔ (ج ۳ ص ۲۸۱)

امام خطابی کے بعض مسامحات گو امام خطابی گوناگوں کمالات کے جامع تھے، مگر احادیث کی تشریح مسائل کے استنباط، تنقید و استدلال، اجتہاد و قیاس اور لغات کی تحقیق وغیرہ میں ان سے بعض فروگذاشتیں بھی ہوگئی ہیں، خصوصاً فقہاء احناف کے مسلک کی تردید میں ان کے بعض دلائل محل نظر ہیں، اختصار کی وجہ سے ان کی صرف چند فروگذاشتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ایک جگہ انھوں نے حاملہ اور مرضعہ کو شیخ فانی پر قیاس کرکے لکھا ہے:

"گو حاملہ و مرضعہ کے لیے روزہ کی رخصت ثابت ہے لیکن ان پر قضاء کے ساتھ اطعام (کفارہ) بھی لازم ہوگا کیونکہ ان کو دوسروں یعنی بچوں پر شفقت اور ان کی جان کے تحفظ و بقا کے خیال سے رخصت ملی ہے، اور شیخ فانی کو روزہ نہ رکھنے کی رخصت محض اس کی ذات کی وجہ سے دی گئی ہے، اس لیے جب شیخ فانی پر اطعام لازم ہے تو ان دونوں پر تو بدرجہ اولیٰ لازم ہوگا کیونکہ ان کو دوسروں کی وجہ سے رخصت ملی ہے۔" (ج ۲ ص ۲۹)

لیکن یہ قیاس صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ شیخ فانی پر کفارہ اور ان دونوں پر قضا لازم ہے، اس سے ان کی نوعیتوں کا فرق صاف ظاہر ہے، اس لیے حاملہ و مرضعہ پر قضا کے ساتھ کفارہ بھی عائد ہونے کا کوئی سوال نہیں، اسی لیے یہی جمہور فقہاء امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام اوزاعی، اور سفیان ثوری اور تابعین میں حسن، عطا، نخعی اور زہری رحمہم اللہ وغیرہ کا مسلک بھی ہے، البتہ امام شافعی اور امام احمد کا وہ مذہب ہے جس کو امام خطابی نے ترجیح دی ہے، مجاہدؒ سے بھی اس کی روایت کی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اس روایت اذا شک احدکم فی صلوتہ فلیتحر الصواب ولیتم علیہ کی تفسیر انھوں نے ابوسعید خدریؓ کی اس روایت اذا شک احدکم فی صلوتہ فلیلق الشک ولیبن علی الیقین سے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "تحری کی حقیقت دو چیزوں میں سے انسب و اولیٰ اور صحیح و صواب کو اختیار کرنا ہے، اور ابوسعیدؓ کی حدیث میں اولیٰ و احری کا ذکر بنا علی الیقین سے کیا گیا ہے، اس طرح تحری کے معنی یقین بھی ہیں، اس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے فمن اسلم فاولئک تحروا رشدا۔" (ج ۱ ص ۲۳۹ و ۲۴۰)

لیکن تحری کے معنی یقین لینا صحیح نہیں ہے، شوافع اور امام خطابی کے نزدیک مسئلہ کی ..

صورت یہ ہے کہ اگر کسی کو شک ہو گیا کہ اس نے دو رکعتیں پڑھی ہیں یا تین تو چونکہ دو رکعت پڑھنے کا قطعی یقین ہے، اس لیے اسی پر بنا کیا جائے گا، اس کے برخلاف احناف کے نزدیک دو یا تین میں جس کی صحت کا زیادہ یقین ہو اس کو اختیار کیا جائے گا، غرض دونوں کے نزدیک تحری کے معنی طلب احری و اولیٰ ہی ہیں، البتہ ایک نے ظن غالب کو اور دوسرے نے بناء علی الیقین کو یہاں احری قرار دیا ہے، اس سے تحری کے معنی یقین نہیں ثابت ہوتا، اور نہ آیت قرآنی میں یہ مفہوم مراد ہے، واللہ اعلم۔

ایک حدیث میں عنق گروہ اور جماعت کے معنی میں آیا ہے، امام خطابی نے اس کی نظیر میں یہ آیت پیش کی ہے (فظلت اعناقھم لھا خاضعین) اور لکھا ہے کہ اگر یہاں عنق سے گردنیں مراد ہوتیں تو خاضعات آتا[1]، واللہ اعلم۔ حالانکہ عنق جھنڈ کے معنی میں مجازاً اور کنایۃً آتا ہے، اور جب تک اصل معنی لینے میں کوئی خاص قباحت نہ ہو اس وقت تک اس سے عدول وانحراف صحیح نہیں ہے، اسی لیے مفسرین نے امام خطابی کے مفہوم کو مرجوح قول کی حیثیت سے ذکر کیا ہے، عنق کے معنی رؤسا کے بھی لیے گئے ہیں، لیکن یہ بھی مرجوح قول ہے (کشاف ج ۲ ص ۹۰۸) البتہ خاضعین یا تو مضاف الیہ کی رعایت سے کہا گیا ہے جس کی مثالیں عربی زبان میں عام ہیں، یا دوسری انسب صورت یہ ہے کہ ظلت یہاں فعل ناقص کے بجائے فعل تام ہے اور خاضعین اعناقھم میں ضمیر سے حال واقع ہے، اور مجرور سے حال واقع ہونے کی مثالیں کلام عرب میں ملتی ہیں، سورۂ ق میں ہے (یوم تشقق الارض عنھم سراعا) یہاں "سراعا" "عنھم" میں ضمیر مجرور سے حال واقع ہے۔

---

[1] ج ۲ ص ۲۹۳

عروس البلاد بمبئی کی تاریخی سرگذشت

از جناب انور احمد صاحب سوپاروی

(۳)

انگلستان کی نظر ہندوستان پر پرتگالیوں کی غیر دانشمندانہ اور وحشیانہ پالیسی اور اس کے عبرتناک واقعات یورپ کے سنجیدہ طبقہ کے ذہن کو جھنجھوڑ رہے تھے، اور ان کے عوام ان واقعات سے بہت متاثر تھے، ہندوستان میں سب سے پہلا برطانوی باشندہ طامس اسٹیفن تھا[۱]، جو گوا کے ایک کالج (College of Margao) کا ناظم تھا، اس نے اپنے باپ کو ایک خط لکھا کہ ہندوستان کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کیے جائیں، اس کا باپ لندن کا ایک متمول تاجر تھا، چنانچہ ۱۵۸۳ء میں تین تاجر (۱) رالف فچ (Ralph Fitch) (۲) جان نیوبری (John Newbery) اور اسٹوری ہندوستان کی طرف نکل پڑے، ان کے ساتھ لیڈز (Leeds) نامی ایک جوہری بھی تھا، وہ جب ارمز کی بندرگاہ پر اترے تو انھیں پرتگالی حکام نے حراست میں لے لیا، اور قیدی بنا کر گوا میں پہنچا دیا، آخر میں تھامس اسٹیفنز کے اثر و رسوخ سے انھیں رہا کر دیا گیا، ان میں سے فچ، بنگال، برما اور سیلون کی سیاحت کے بعد ۱۵۹۱ء میں اپنے وطن پہنچا، لیڈز نے سلطنت مغلیہ کی ملازمت اختیار کر لی، اور باقی دونوں ہندوستان میں مستقلاً متوطن ہو گئے[۲]

---

[۱] British Beginning in Western India. by H. G. Rawlinson P. 22

[۲] Historical Geography of India. by P. E. Roberts vol VII Part I P. 21-22

دراصل سولھویں صدی کے آغاز میں یورپ کی مختلف قومیں ہندوستان سے تجارتی روابط قائم کرنے میں کوشاں تھیں، کیونکہ ان ممالک میں ہندوستان کی دولت و ثروت سے متعلق عجیب وغریب پُراسرار داستانیں زبان زد خاص و عام تھیں، جو ایک حد تک صحیح تھیں، ہندوستان میں ہر جگہ سونے، چاندی اور قیمتی پتھروں کی ایسی فراوانی تھی کہ اجنبی لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہوجاتی تھیں. اسی دولت کی ہوس میں پہلے پرتگالی، پھر ڈچ اور پھر انگریز آئے۔[1]

۱۵۸۸ء میں آرمیڈا (Armada) کی تاریخی شکست کے بعد انگلستان بحری قوت میں یورپ کے تمام ملکوں سے بازی لے گیا جس سے وہاں کے عوام کے حوصلے بھی بلند ہوگئے. اسی عرصہ میں چند برطانوی سوداگروں نے "کانسل آف لارڈز" میں ایک عرضداشت پیش کی جس میں ہندوستان اور چین کی معروف زمانہ بندرگاہوں سے تجارت کی اجازت طلب کی گئی تھی، یہ عرضداشت ملکۂ انگلستان نے منظور کرلی، اور ۱۵۹۱ء میں کپتان ریمونڈ (Raymond) کو تین عدد تجارتی جہازوں[2] کے ساتھ روانہ کیا گیا. مگر صرف جیمز لنکاسٹر (James Lancaster) اپنا جہاز لیکر راس کماری تک صحیح سلامت پہنچ سکا، اور ریمونڈ کا جہاز راستہ میں تباہ ہوگیا، ۱۵۹۶ء میں تین جہازوں کا دوسرا قافلہ سر رابرٹ ڈوڈلے نے کمانڈر بنجامن ووڈ کے زیر قیادت روانہ کیا، جو ایسا گم ہوا کہ کسی نے اس کے متعلق کچھ نہیں سنا۔[3]

انگریزوں کے لیے ایک بڑی دشواری یہ تھی کہ پرتگالی ارمز (Ormuz) کی بندرگاہ پر اور ہسپانی جبرالٹر پر قابض تھے، جو اس بحری راستہ کے اہم ترین بندرگاہ تھے، برطانوی تاجروں کی

---

[1] India at The Death of Akbar. By W. H. Moreland. P. 222

[2] ان جہازات کے نام یہ ہیں:- (1) The Penelope (2) Merchant (3) Edward Bonaventure

[3] Historical Geography of India. P. 22

نوزائیدہ کمپنی کو متواتر دو خساروں نے مالی حیثیت سے کمزور کر دیا تھا، اس سے چند برسوں کے لیے انگریز سوداگروں کے حوصلے پست ہوگئے، تاہم ہندوستان کے ذائقہ دار مسالوں اور دولت و ثروت کے ہوش ربا قصوں کی کشش انھیں پھر کشاں کشاں مشرق کی جانب کھینچ رہی تھی، چنانچہ ۲۲ ستمبر ۱۵۹۹ء کو ایک تجارتی ادارہ قائم ہوا، جس کا مقصد ہندوستان اور مشرق بعید کے ساتھ تجارتی تعلقات کا آغاز تھا۔ اس کی پہلی نشست میں اراکین نے ملکۂ انگلستان سے سرکاری فرمان حاصل کرنے کی تجویز پاس کی، یہ فرمان ۱۶ اکتوبر کو جاری ہوا۔ اور ان کا پہلا تجارتی جہاز ۱۳ فروری ۱۶۰۱ء کو ہندوستان کی طرف روانہ ہوا، اتفاق سے اس کے کپتان کا نام بھی لنکا سٹر ہی تھا، یہ جہاز ۱۱ ستمبر ۱۶۰۳ء کو انگلستان واپس گیا، جو ان کی مہم جو طبیعت کی اولین کامیابی تھی، جس نے ان کے ارادوں میں بہت تقویت پہنچائی۔ اس کے بعد تجارتی جہازوں کا دوسرا بحری قافلہ ہاکنز (Hawkins) کے زیر قیادت روانہ ہوا۔ ہاکنز سورت کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا، اور وہاں سے آگرہ روانہ ہوگیا، اس کے پاس بادشاہ جیمز کا ایک شاہی مراسلہ شہنشاہ ہند کے نام تھا، مگر اس کو مغلیہ دربار سے سورت میں کارخانہ[1] قائم کرنے کی اجازت نہیں ملی[2]۔ اور وہ ۱۶۱۲ء میں اپنے وطن لوٹ گیا، وہ بھی یہاں کی دولت خصوصاً چاندی کی فراوانی سے بہت متاثر تھا، اس نے لکھا ہے کہ "ہندوستان چاندی کا ملک ہے، جہاں ہر ملک کے تاجروں کے ذریعہ چاندی کے سکے آتے ہیں اور اسی سرزمین کی حدود میں مقید ہو جاتے ہیں"۔ آخر میں کپتان بیسٹ (Capt. Best) کی کوششیں بارآور ہوئیں

---

[1] یورپین اقوام نے تجارتی مرکز کے لیے لفظ (Factory) استعمال کرکے تاریخ پڑھنے والوں کو غلط فہمی کا شکار بنا دیا ہے، یہاں (Factory) کے معنی وہ نہیں ہیں جو اب سمجھے جاتے ہیں، بلکہ اس سے مراد تجارتی مرکز ہے، ان کارخانوں یا تجارتی مرکزوں میں انکے تجارتی نمائندے مقیم ہوا کرتے تھے۔

[2] India at The Death of Akbar. P. 226. by Moreland

اور مغل دربار سے انھیں سورت میں تجارتی مرکز قائم کرنے کا اجازت نامہ مل گیا، جنوری ۱۶۱۵ء میں سوالی[1] کے مقام پر انگریزوں اور پرتگالیوں کے درمیان سمندری لڑائی ہوئی جس میں انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی، یہ فتح ہندوستان کے ساحل پر ان کے قبضہ کا پہلا قدم تھا[2]، اب انگریزوں نے ڈچ کو اپنی طرف کر لیا تھا، اور ان کی نظریں بار بار جزائر بمبئی کی جانب اٹھ رہی تھیں، اور وہ بمبئی کو حاصل کرنے کی تدابیر پر غور کرنے لگے۔

قلابہ کی خونی چٹان اسی زمانہ میں انتونیو بوکارو (Antonio Bocarro) نے جزائر بمبئی کی سیاحت کی، وہ لکھتا ہے کہ سمندر کی راہ سے بمبئی میں داخل ہونے کے لیے ہمیں شمال مشرق کی طرف سے آنا پڑتا ہے، اس راستہ میں جہاز رانوں کو جزیرۂ کندیل (قلابہ بمبئی) کی خونی چٹان سے چابکدستی اور ہوشیاری کے ساتھ بچ کر نکلنا چاہیے۔ یہ چٹان نصف لیگ تک سمندر کے سینے میں چلی گئی ہے، جس کی سطح بہت سخت اور خطرناک طور پر ابھری ہوئی ہے، جس سے اگر کوئی جہاز ٹکرا جائے تو پاش پاش ہو جانے کا اندیشہ ہے، اور چونکہ یہ ہمیشہ پانی میں ڈوبی رہتی ہے، اس لیے نظر کو دھوکہ ہوتا ہے[3]، جزیرۂ قلابہ میں لارڈ اور دوسرے فوجی افسروں

---

[1] دسمبر ۱۶۱۴ء کو پرتگالی وائسرائے گوآ سے سولہ جہاز لیکر سورت کی طرف روانہ ہوا، جہاں انگریزوں کے چار جہاز لنگر انداز تھے، ۲۳ دسمبر کو پرتگالی جہاز سورت پہنچے، اور انگریزوں کے جہاز اور سورت کی بندرگاہ کے درمیان میں لنگر انداز ہو گئے، ۲۷ اور ۲۸ دسمبر کو معمولی جھڑپیں ہوئیں، اس وقت انگریزوں کو پرتگالی وائسرائے کی بدنیتی کا علم ہوا، چنانچہ وہ کچھ دور ہٹ کر سوالی کے مقام پر لنگر انداز ہوا، نئے سال کے آغاز میں پرتگالیوں کو تین مزید جہازوں کی کمک پہنچ گئی اور انھوں نے انگریزوں سے ایک فیصلہ کن جنگ کی، اس جنگ میں پرتگالیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا،

[2] India at The Death of Akbar. P. 226 By Moreland

[3] جان فرائر (John Fryer) جس نے مغربی ہندوستان اور فارس کی (۱۶۷۲ تا ۱۶۸۱) کے درمیان

(باقی حاشیہ ص ۱۱۲ پر)

کے مکانات ہیں، اور حفاظت کے لیے ایک برج ہے جس پر چار توپیں نصب کی گئی ہیں، مگر کوئی حفاظتی دستہ مقرر نہیں ہے۔[1]

بمبئی پر نظر ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے بعد سے اس کے ڈائرکٹروں نے جزائر بمبئی پر قبضہ کرنے کا نہ صرف خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا بلکہ اس کی کئی بار کوشش بھی کی تھی۔ سوالی کے مقام پر ان کی کامیابی نے پرتگالیوں کو چوکنا کر دیا تھا، اس لیے ۱۶۲۵ء میں انگریزوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ کمپنی کے بقا اور تجارتی وسائل کی توسیع کے لیے بمبئی کو حاصل کرنا ناگزیر ہے، اور ۱۶۲۶ء میں سورت میں مقیم کمپنی کے صدر نے ڈچ کمپنی کے افسروں سے اپنی تجویز کا اظہار کیا، مگر انھوں نے اس سے کوئی دلچسپی نہیں لی، ۱۶۴۰ء میں سورت کی کونسل نے بمبئی اور بسین کو خریدنے کی تجویز پاس کی، اور ۱۶۵۴ء میں انگلستان کے وزیر اعظم کرامول کے نام ایک عرضداشت بھیجی جس میں بمبئی اور بسین کی اہمیت کا تذکرہ کیا تھا،[2]

کیتھرائن کی شادی ۱۶۶۱ء میں شاہ پرتگال نے اپنی بہن کیتھرائن کی شادی میں جزیرہ بمبئی اس کے جہیز میں دیدیا، گویا سلطنت ہندوستان کی کلید برطانیہ کے دربار میں دو سال قبل پہنچ چکی تھی، اس طرح جون ۱۶۶۱ء کے قرارنامہ کے رو سے بمبئی کا جزیرہ شاہ انگلستان کی ملکیت میں منتقل ہو گیا اور جزیرہ کی حفاظت کے لئے جو فوج تعینات تھی اس کے کل مصارف کا ذمہ دار ہو گیا، کمپنی کو صرف تجارتی ضرورت کے لیے اس کے استعمال کرنے کا اختیار رہ گیا،[3]

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۱) سیاحت کی تھی، اس نے بھی اس خطرناک چٹان کا ذکر کیا ہے جس کی زد میں اس کا جہاز آگیا تھا جب وہ گوا سے سورت کی جانب سفر کر رہا تھا۔ ملاحظہ ہو:- A new account of East India & Persia. By J. Fryer P. 87/88 Vol II

[1] The Rise of Bombay. P. 82/83

[2] How Bombay was ceded. By J. H. Gense; P. 6

[3] ایضاً ص ۱۱

یہ شادی اس سیاسی مصلحت سے ہوئی تھی کہ پرتگال کو اسپین کی دست درازیوں اور ہالینڈ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بچاؤ کا صرف یہی راستہ تھا، کہ انگلستان کے ساتھ تعلقات میں خوشگواری پیدا کی جائے، اور انگریزوں کی اعانت سے ان دونوں ملکوں کا مقابلہ کیا جا سکے، سلطان محمود شاہ بیگڑہ بھی کم و بیش اسی قسم کے حالات سے نپٹنے کے لیے عہد نامہ بسین میں پرتگالیوں سے صلح کرنے پر مجبور ہوا تھا، جب اس کو ہمایوں کے حملہ کا خوف تھا،

<u>بمبئی کی سپردگی میں حیلے</u> | مارچ ۱۶۶۲ء میں پانچ انگریز ارل آف ماربرو (Earl of Morlborough) کی قیادت میں بمبئی کی طرف روانہ ہوئے، ان کے ساتھ چار سو نفوس پر مشتمل ایک فوج بھی تھی، بمبئی کے ساحل پر پہنچنے کے بعد انھوں نے پرتگالیوں سے جزائر بمبئی سے دست بردار ہونے کا مطالبہ کیا، انھوں نے حیلے بہانے شروع کیے، وہ صرف بمبئی ان کے سپرد کرنے پر آمادہ تھے، کیونکہ اس وقت تک ان کو ان کی حکومت کی طرف سے اس کا واضح حکم نامہ نہیں ملا تھا، اس لیے انگریزوں کا یہ قافلہ مایوس ہو کر کاروار کے ساحل پر انجدیو (Anjdiu) نامی ایک غیر معروف اور غیر آباد جزیرہ پر سکونت پذیر ہو گیا، یہاں وہ دو سال انتہائی خستہ اور غریب الوطنی کی حالت میں پڑا رہا، اس درمیان میں چار سو فوجیوں میں سے تین سو کے قریب فوجی اور ایک افسر لقمۂ اجل ہو گئے، مرنے والوں میں سر ابراہم شپ من (Sir Abraham ship man) بھی تھا، جو بمبئی کا پہلا گورنر نامزد ہو کر آیا تھا،

<u>سچی پیشین گوئی</u> | عہد نامۂ بمبئی سے لندن کے عوام نے مطلق خوشی کا اظہار نہیں کیا، مگر پرتگال کے باشندے اپنے بادشاہ کی فیاضی سے بہت مسرور تھے، ان کا خیال تھا کہ انگریز اس خطہ کو پانے کے بعد پرتگالیوں کی پوری طرفداری کریں گے، مگر ہندوستان میں مقیم پرتگالی حکام بالکل ناخوش تھے،

On The B'bay Coast & Deccan. By W. A. Brown P. 70

جنوری ۱۶۶۵ء میں گوا کے وائسرائے نے اپنی رپورٹ میں جو اس نے شاہ پرتگال کے پاس بھیجی تھی، کھلے طور پر بمبئی سے دستبرداری کے ہولناک نتائج کی پیشین گوئی کی تھی، اس نے لکھا تھا:۔

"میں بحیثیت ایک ادنیٰ غلام کے آپ کے حکم کی تعمیل کے سوا کچھ نہیں کرسکتا، اور یہی میرا فرض بھی ہے، البتہ ایک اندیشے سے اپنے محبوب آقا کو آگاہ کرنا بھی میرا ہی فرض ہے کہ جس روز برطانوی قوم کا بمبئی پر تصرف ہوگیا، ہندوستان ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پرتگالیوں کے ہاتھوں سے نکل گیا"۔[1]

جب جزائر بمبئی انگریزوں کی تحویل میں دینے کا قطعی فیصلہ ہوگیا تو انجذیو سے صرف ایک سو انیس افراد نے ۱۸ فروری ۱۶۶۵ء کو قلابہ کی سرزمین پر قدم رکھا، اس سے قبل ۱۶۵۹ء میں ڈچ نے سیلون سے پرتگالیوں کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا، اور اب ان کی نظریں گوا پر پڑ رہی تھیں، اگر ان کی کوششیں کامیاب ہوجاتیں اور گوا ان کے قبضہ میں چلا جاتا تو دیو ان کے قدموں میں ہوتا، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان میں جمنے کے تمام مواقع ختم ہوجاتے۔

یکم ستمبر ۱۶۶۸ء میں کونسٹن ٹنوپل جہاز سورت کی بندرگاہ پر پہنچا جس میں حکومت انگلستان کا وہ حکم نامہ تھا جس کی رو سے بمبئی کو کمپنی کو دس پونڈ سالانہ پر کرایہ پر دیا گیا تھا۔[2] جس وقت کمپنی نے بمبئی کو اپنی تحویل میں لیا اُس وقت وہاں کی آبادی صرف دس ہزار افراد پر مشتمل تھی، جو ۱۶۷۵ء میں بڑھکر ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی۔[3]

مرہٹوں کی اقبالمندی یہ مرہٹوں کے عروج اور سیاسی عظمت کا زمانہ تھا، چھترپتی شیواجی مرہٹوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے میں کامیاب ہوچکا تھا، اور مہاراشٹر میں انکی سلطنت

---

[1] On The B'bay Coast & Deccan. by W. A. Brown. P.72

[2] Bombay. By S.T. Sheppard. P. 17

[3] The rise of B'bay P. 90

قائم ہو چکی تھی اور وہ مغلوں کی طاقت سے ٹکر لے رہے تھے۔ ۱۶۶۶ء میں شیواجی نے دہلی سے فرار ہوتے ہی اپنی مملکت میں توسیع کی مہم جاری کر دی تھی، اور شمالی کوکن کے اکثر قلعوں پر مرہٹوں کا قبضہ ہو چکا تھا، اور شیواجی کی نظر بمبئی کی جانب اٹھنے لگی تھی۔ چنانچہ ۱۶۷۹ء میں جزیرۂ بمبئی کے قریب جزیرہ کھانڈیری پر مرہٹوں نے قبضہ کر لیا، جس کے انگریز اور پرتگالی دونوں دعویدار تھے، یہ قبضہ صرف جنجیرہ کے سدیوں کی مخالفت کے لیے تھا؛ اس لیے سدی قاسم نے مرہٹوں کے مقابلہ کے لیے اندیری کے ٹاپو پر ۱۶۸۰ء میں قبضہ کر کے مورچہ قائم کر لیا۔

شیواجی کے زمانۂ عروج میں سہیادری کا مغربی علاقہ بیرونی طاقتوں سے کسی حد تک محفوظ تھا۔ شیواجی نے گجرات سے ڈچ قوم کو بالکل بے دخل کر رکھا تھا، انھیں صرف وینگرلا (رتناگیری) میں سالانہ خراج کے عوض تجارت کرنے کی اجازت دی گئی تھی، اور بسین، چول وغیرہ مرہٹوں کے زیر انتظام تھے، پنول اور ایلی فنٹا (پوری) میں تحفظ کے سامان مکمل تھے، بلکہ شیواجی ایک مرتبہ بھیس بدل کر جزیرۂ بمبئی میں بھی آیا تھا، اور مالابار ہل کے کسی ایک غار میں سکونت پذیر تھا،[۵]

۵ اپریل ۱۶۸۰ء میں شیواجی فوت ہو گیا اور اس کا بڑا بیٹا سمبھاجی تخت نشین ہوا۔ جس نے شہزادہ اکبر کو اپنی پناہ میں لیکر اورنگ زیب سے دشمنی مول لی، اور مرہٹوں اور مغلوں میں ازسرنو جنگ کا سلسلہ چل پڑا جس سے داخلی فتنوں کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی گئیں، اور بیرونی طاقتوں سے زور آزمائی کی پہلی سی سرگرمی باقی نہ رہی۔ اس زمانہ میں خود ایسٹ انڈیا کمپنی اس قدر کمزور تھی کہ بمبئی کی سلامتی خطرہ میں پڑ گئی تھی۔[۶] اس لیے سورت سے سرجان چائلڈ بمبئی پہنچا تھا، اور حفاظتی انتظام میں مصروف ہو گیا۔ لیکن اس کو ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، اسی نا امیدی اور یاس کے عالم میں ۴ فروری ۱۶۹۰ء میں مر گیا۔

---

۵ Legends of The Konkan. By Arthur Crowford. P. 87/88.

۶ The Rise of Bombay. P. 134

شاہی جہاز کی انگریز قزاقوں کے ہاتھوں تباہی سر جالمڈ بمبئی کی حفاظت کی طرف اس لیے متوجہ ہوا تھا کہ مرہٹوں اور سدیوں کی باہمی دشمنی اور جنگ وجدال کے باعث بمبئی کی سالمیت خطرہ میں تھی، ۱۱۰۵ھ (۱۶۹۳ء) میں شاہی جہاز (گنج سوائی) کو انگریزوں نے لوٹ لیا تھا،[1] اس سے بڑا جہاز بندرگاہ سورت میں کوئی نہیں تھا، اس میں اسّی توپیں نصب تھیں، جہاز پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے اس کا کل سامان لوٹ لیا اور بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کے ساتھ بڑا نازیبا سلوک کیا، بندر سورت کے نامہ نگار نے اورنگزیب کو خبر لکھکر بھیجی، وہ بہت غضبناک ہوا۔ اور اعتماد خاں (سورت کا متصدی) اور سدی یاقوت خاں کو لکھا کہ سورت میں انگریزوں کے جو گماشتے تجارت کرتے ہیں انھیں گرفتار کرلیا جائے، اور بمبئی کی تسخیر کیجائے۔[2]

---

[1] ایس، ایم ایڈورڈز نے بھی اپنی کتاب "دی رائز آف بامبے" میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، مگر جہاز کو لوٹنے کا الزام یورپین قزاقوں کے سر تھوپا ہے، جس کی پاداش میں کمپنی کے چند عہدیدار مقیم سورت گرفتار کر لیے گئے تھے، (ص ۱۳۳/۳۴)

لیکن خافی خاں نے گنج سوائی کو لوٹنے کا الزام صرف انگریزوں پر رکھا ہے، اور جس کی شکایت اس نے بمبئی کے گورنر سے ملاقات کے وقت کی تھی،

بمبئی میں خافی خاں کا شاندار استقبال کیا گیا تھا۔ اس نے انگریز گورنر سے کہا تھا: "تمھارے آدمیوں نے جو نازیبا حرکت کی ہے وہ انتہائی احمقانہ ہے، اس لیے تم اس کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لیتے ہو، مگر یہ ایسا ہی ہو کہ ساری دنیا میں سورج چمک رہا ہو اور کوئی عقلمند یہ پوچھے کہ دھوپ کہاں ہے؟

اس جہاز میں میرے جاننے والوں کی ایک جماعت تھی جن کے زبانی پتہ چلا کہ حملہ آور کے چہروں اور ہاتھوں پر زخم کے نشان تھے جو اپنی زبان سے کہہ رہے تھے کہ یہ وہ داغ ہیں جو سدی یاقوت خاں کے محاصرہ کے وقت انکو پہنچے تھے،

اور آج اس کا داغ ہمارے دل سے نکل گیا یعنی ہم نے بدلہ لے لیا۔" (منتخب اللباب جلد ۳ ص ۴۰۹)

[2] تاریخ ہند جلد ہشتم ص ۱۲ ۴ - ۱۱۴)

سر چائلڈ مغلوں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کے حق میں تھا، اس کو مغلوں کی عظیم الشان طاقت اور ہمہ گیر نظامت کا مطلق اندازہ نہ تھا، وہ ایک ایسا خواب دیکھ رہا تھا جس کی تعبیر اس زمانہ میں انگریزوں کی تباہی کے مترادف تھی، مغلوں کی سلطنت کی حدود میں رہ کر ان سے دشمنی مول لینا خود انگریزوں کی تجارت اور قومی ساکھ کو مجروح کرنا تھا[1]، اگر اورنگ زیب چاہتا تو سرزمین ہند سے انگریزوں کا صفایا کر سکتا تھا، مگر اس نے ان کے ساتھ نیک برتاؤ کیا۔

اورنگ زیب کا عتاب اورنگ زیب کے فرمان میں انگریزوں کو صرف تجارتی سرگرمیوں تک محدود رہنے کی ہدایت تھی، اور سر چائلڈ کی برطرفی کا مطالبہ بھی تھا، جو تمام فسادات کی جڑ تھا، اس سے ایک سال قبل (۱۶ فروری ۱۶۸۹ء) سدیوں کے بحریہ نے ممبئی پر حملہ کر کے ماہم، مجگاؤں اور سیو کو زیر کر لیا تھا، جو ۲۰ جون ۱۶۹۰ء تک قائم رہا، ایک روایت کے مطابق انگریزوں کے قلعہ کے سوا پورے جزیرہ ممبئی پر سدیوں کا تسلط تھا[2]، اور خافی خاں کا بیان ہے کہ سیدی یاقوت خاں قلعہ منبی (ممبئی) کو فتح کرنے ہی والا تھا کہ شاہی حکم کی تعمیل میں اس مہم کو ادھورا چھوڑنا پڑا[3]، یہ انگریزوں کے لیے نازک ترین زمانہ تھا، اگر مغل سردار مختار خاں، سدیوں سے پرخاش نہ رکھتا تو بلاشبہ سدی پورے علاقہ کو زیر کر لیتے[4]، اور انگریز ہندوستان کے ساحل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھاگ چکے ہوتے، اور اس کی تاریخ کا نقشہ کچھ اور ہوتا، ممبئی کے انگریز سدیوں کی موجودگی سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ ہر صورت میں ان سے نجات پانا چاہتے تھے[5]۔

---

۱. History of Aurangzeb. vol V By J. Sarkar. P 386

۲. Hoydn's Dectionary of Dates. By Benjamin Vincent P. 115

۳. منتخب اللباب ج ۲ ص ۲۱۵

۴. Thana Gazetteer. Part II P 491

۵. Bombay and The Sidis. By D.R. Banaji. P 50

اورنگ زیب کے فرمان میں سر چائلڈ کو نو مہینے کے اندر ہندوستان چھوڑ دینے کا حکم بھی تھا، لیکن فروری ۱۶۹۰ء میں اس کی موت نے اس مسئلہ کو حل کر دیا۔ بادشاہ نے اپنا سابق حکم منسوخ کرکے انگریزوں (ایسٹ انڈیا کمپنی) کو ایک موقع اور دیدیا، اس حکم پر سدی قاسم ۸ رجون ۱۶۹۰ء کو بمبئی سے روانہ ہوگیا، اُس وقت انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا، اس مہم میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تقریباً چار لاکھ سولہ ہزار پونڈ صرف ہوئے جو سراسر چائلڈ کی جلد بازی کا نتیجہ تھا[1]۔

سازگار حالات | جزائر بمبئی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار اور تجارتی ترقی مقامی طاقتوں کی مرہون منت تھی، پرتگالیوں سے ان کی پرانی عداوت تھی جس سے دونوں میں چپقلش کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا، مگر اب پرتگالیوں کا طالع روبہ تنزل تھا، علاقہ بسین میں ان کا اقتدار گھٹتا جارہا تھا، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران کو "شرانگیز ہمسایہ" تصور کرتے تھے[2]۔ ۱۶ رمئی ۱۷۳۹ء میں بسین کا خطہ ان کے ہاتھوں سے نکل کر مرہٹوں کے قبضہ میں جا چکا تھا۔ ان کے بعد کمپنی کو مرہٹوں کی منظم طاقت سے خدشہ پیدا ہوچلا تھا۔ اس لیے انھوں نے مرہٹوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنے ایک سردار کپتان انچ برڈ (Capt. Inchbird) کو مرہٹہ سردار چیماجی اپا (پیشوا باجی راؤ اول کا بھائی) کی خدمت میں اور کپتان گورڈن کو ستارا کے راجہ کے پاس بھیجا، ان کے ساتھ تحائف بھی تھے، مرہٹوں کے دونوں فریق نے وفد کو یقین دلایا کہ وہ جزائر بمبئی پر فوجکشی کرنے سے اجتناب کریں گے[3]۔

۱۷۳۱ء میں کانوجی آنگریہ کا انتقال ہوگیا، ۱۷۳۴ء میں جنجیرہ کے یعقوب خاں نے دار فانی سے کوچ کیا، ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے تاریخی میدان میں مرہٹوں کو عبرت ناک

---

[1] Bombay and The Sidis. By D.R Banaji. P. 52

[2] Thana Gazetteer. Part II. P. 495 [3] The Rise of Bbay. P. 132

شکست ہوئی جس سے ان کی طاقت کا شیرازہ ایسا منتشر ہوا کہ پھر وہ سنبھل نہ سکے، یہ واقعات جہاں اندرونی کمزوریوں کا پیش خیمہ تھے، وہاں انگریزوں کی سلامتی اور سیاسی استحکام کا ذریعہ ثابت ہوئے۔ اس عرصہ میں بمبئی کی آبادی میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا تھا، تجارت عروج پر تھی، ۱۶۶۱ء میں یہاں کی آبادی صرف دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی، اور ۱۷۴۴ء میں ستر ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

سدیوں اور آنگریہ کی بحری طاقت میں ضعف پیدا ہوتے ہی انگریز مغربی ساحل کے گویا مالک بن بیٹھے، ان کے مقابل اب کوئی طاقت باقی نہ رہ گئی تھی، اور ۱۷۷۶ء میں وہ اس قدر طاقتور بن چکے تھے کہ انھوں نے مرہٹوں کے خلاف سدیوں کا ساتھ دیا تاکہ مرہٹوں کی رہی سہی قوت کا بھی خاتمہ ہو جائے، ان سے سالسٹ اور بسین کے علاقے طلب کیے مگر مادھو راؤ کے ریجنٹ راگھوناتھ راؤ نے صرف سدیوں کی آزاد مملکت کو تسلیم کیا اور بسین اور سالسٹ سے دستبردار ہونے سے انکار کر دیا۔[1]

نیوبھر اور فاربس بمبئی میں اسی زمانہ میں نیوبھر نے بمبئی کی سیاحت کی، وہ لکھتا ہے :- "شہر صاف و ستھرا ہے، پیداوار میں چاول، ناریل اور نمک کی افراط ہے، پرانا قلعہ مضبوط نہیں ہے، مگر شہر پناہ کافی مضبوط ہے جو شہر کے تحفظ کی ضمانت ہے"[2]

۱۷۶۶ء میں فاربس لکھتا ہے کہ بمبئی کی آب و ہوا خوشگوار اور صحت افزا ہے، زمین کے چند قطعے سمندری پانی میں اکثر غرق رہتے ہیں، اس لیے نقل و حرکت میں دقت پیش آتی ہے، یہاں کے سوداگر دنیا کے مختلف ممالک سے تجارت کرتے ہیں، اور یہاں کے بازار بارونق اور تجارتی اشیاء سے بھرے پڑے ہیں، شہر کی لمبائی دو میل ہے۔[3]

---

[1] Thana Gazetteer. Part II P. 498　[2] ایضاً ص ۴۹۹　[3] ایضاً ص ۵۰۰

بسین اور سالسٹ پر حملہ

بمبئی کی روز افزوں آبادی اور تجارتی ترقی کے پیش نظر کورٹ آف ڈائرکٹرز سالسٹ اور بسین پر کمپنی کا تسلط ناگزیر سمجھتے تھے، اس کے لیے ۱۷۷۱ء میں ایک وفد پونہ روانہ کیا گیا۔ مگر مرہٹوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ بلکہ تھانہ کی عسکری قوت میں اضافہ کر دیا، مرہٹے انگریزوں کی فطرت سے واقف تھے۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا انھیں اندیشہ تھا۔ یعنی ۱۲ دسمبر ۱۷۷۴ء کو جنرل گارڈن کے زیر قیادت ایک فوج تھانہ کی طرف بڑھی، مرہٹوں کی فوج نے انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مگر ان کی قسمت کا ستارہ گردش میں تھا، اس لیے شکست ہوئی۔ اور ۲۸ دسمبر کو تھانہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ فوج کے دوسرے حصہ نے ورسوا پر قبضہ کر لیا۔ پھر کرنجا، ایلی فنٹا اور ہاگ کے جزیرہ پر بھی ان کا تسلط ہو گیا، اور جنوری ۱۷۷۵ء میں پورا جزیرۂ سالسٹ اور بسین انگریزوں کے زیر نگیں ہو گئے، مگر یہ قبضہ عارضی تھا۔

عہد نامۂ بسین

رگھوناتھ راؤ پیشوا اور نانا فرد نویس میں تخت کی وراثت پر سنگین تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا، اس کشمکش میں رگھوناتھ راؤ کو پونہ سے فرار ہونا پڑا، اور وہ گجرات میں پناہ گزیں ہو کر انگریزوں سے امداد کا طالب ہوا، معاہدۂ سورت کے مطابق انگریزوں نے اس شرط پر امداد کی ذمہ داری لی کہ وہ سالسٹ، کرنجا، ہاگ اور کھانڈیری پر انگریزوں کی حکومت مستقلاً تسلیم کرلے۔

۱۸ ویں صدی کے نصف آخر سے انگریز بسین پر قابض ہونے کی تدابیر کر رہے تھے۔ آخر کار اس کا موقع بھی آگیا اور انگریزوں کی حکومت کے پورے ملک پر قائم ہونے کے لیے حالات خود بخود ساز گار ہو گئے۔ ۱۸۰۲ء میں یشونت راؤ ہولکر کو فتح حاصل ہوئی، اور باجی راؤ پیشوا مہاڈ نامی ایک قصبہ میں روپوش ہو گیا، یہاں بھی ہولکر کی فوجوں نے اس کا تعاقب کیا۔ پیشوا چول، سالسٹ سے ہوتے ہوئے بسین پہنچ گیا۔ جہاں انگریزوں کے ایجنٹ برائے پونہ کرنل کلوز نے اس سے ملاقات کی، دونوں میں دسمبر ۱۸۰۲ء میں ایک معاہدہ ہو گیا، اس کی رو سے

انگریز پیشوا کے مقبوضات کے محافظ بن گئے. اور انھیں پونہ میں اپنی فوج تعینات کا اختیار حاصل ہو گیا،

صلح نامۂ بسین تاریخ ہند میں بڑی اہمیت رکھتا ہے جس سے نہ صرف جنوب مغربی ہندوستان میں انگریزوں کا اقتدار مضبوط ہو گیا، بلکہ مرہٹوں کی رہی سہی طاقت کا بھی کلی طور پر خاتمہ ہو گیا. جن سے انگریزوں کی ہندوستان میں قدم جمانے میں خطرہ تھا، اس سے بمبئی کی قسمت چمکنے کے آثار پیدا ہو گئے. اور یہ سنسان اور ویران خطہ رفتہ رفتہ اپنی جغرافیائی ہیئت بدلنے لگا، تجارت پیشہ اور ہنرمند لوگ جوق درجوق بمبئی میں آکر بسنے لگے. تجارت اور صنعت و حرفت کو فروغ ہوتا گیا، اور بمبئی کی آبادی تیزی کے ساتھ بڑھنے لگی، ۱۸۱۲ء میں یہاں بیس ہزار رہائشی مکانات تھے اور آبادی دو لاکھ پینتیس ہزار پر مشتمل تھی بمبئی کے قلعہ کے اندر دس ہزار آٹھ سو ایک (۱۰۸۰۱) آدمی بستے تھے،

| بمبئی میں آتش زدگی | قسمت کی یاوری اور ملک کی طوائف الملوکی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو

ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک کی نظامت بخش دی اور بتدریج ان کی حکومت کا دائرہ وسیع ہونے لگا، ۱۸ ویں صدی میں بمبئی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ریاستی حکومت قائم ہو چکی تھی اور انگریز بمبئی کی آبادکاری پر خاص توجہ دینے لگے، اور ان کی بدولت بمبئی کی سماجی زندگی کے تمام شعبوں میں نئی لہر پیدا ہو گئی، ان کے لباس، وضع قطع، کھانے پینے اور رہن سہن کے طور طریقے کی دلکشی نے مقامی باشندوں خصوصاً پارسیوں کو متاثر کیا، انتظامی امور کیلئے بورڈ آف ڈائرکٹرز نے حکومت بمبئی کو چار محکمے قائم کرنے کا حکم جاری کیا،

(۱) مجلس شوریٰ (۲) مجلس محصولات (۳) مجلس عسکریات (۴) مجلس تجارت

ف Shells from The Sands of B'bay. by sir D.E Wacha
P. 412

شہر بمبئی کی از سر نو آبادکاری کا مسئلہ ابھی زیر غور ہی تھا کہ ۱۷ فروری ۱۸۰۳ء میں اس کے شمالی حصہ میں آگ لگ گئی۔ اس آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرتے تھے۔ اور جوناتھن ۱؎ کے بقول اس آگ پر اگر قابو نہیں پا لیا جاتا تو سارا شہر اور قلعہ اس کی لپیٹ میں آکر خاک بنجاتا۔ سرکاری بیان کے مطابق ۴۷۱ رہائشی مکانات نذر آتش ہو گئے۔ اس تاریخی آگ سے جہاں لاکھوں کا نقصان ہوا۔ وہاں اس سے بمبئی شہر کی صورت گری کو فائدہ پہنچا، اور تخریب سے تعمیر کی شکل نکل آئی۔ چنانچہ شہر کو از سر نو بسانے کا نقشہ بنایا گیا جس میں وسیع کشادہ سڑکوں کا خیال رکھا گیا، اور آہستہ آہستہ شہر کی شکل و صورت میں بڑی تبدیلی پیدا ہو گئی۔

باجی راؤ کا فرار | عہد نامۂ بسین کے وقت انگریزوں نے باجی راؤ پیشوا کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس کو جلد پونا کی گدی پر بٹھائیں گے۔ چنانچہ باجی راؤ ۱۳ مئی ۱۸۰۳ء کو پونہ کے تخت پر بیٹھا، اور ۱۸۱۷ء تک انگریزوں کا وفادار رہا، مگر رفتہ رفتہ انگریز باجی راؤ سے بدگمان ہو گئے اور اس پر الزام لگایا کہ اس نے انگریزوں کی طاقت کو توڑنے کے لیے ہولکر، سندھیا وغیرہ کے ساتھ سازش کی ہے۔ جس کی کوئی اصلیت نہ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریز بہر صورت دکن سے مرہٹوں کی طاقت کو ختم کر کے ہندوستان کی سیاسی بساط پر چھا جانا چاہتے تھے، اس لیے اس نام نہاد سازش کی اطلاع ملتے ہی بمبئی سے ایک فوج پونہ کی جانب بڑھی، ۵ نومبر ۱۸۱۷ء کو کھڑکی مقام پر جنگ اور مرہٹوں کو شکست ہوئی۔ باجی راؤ کو میدان جنگ سے بھاگنا پڑا، مگر ایک عرصہ کے بعد اس نے اپنے کو سر جان مالکم کے سپرد کر دیا، اس طرح سارا دکن انگریزوں کے زیر نگیں ہو گیا۔

بمبئی کے خط و خال بدلنے لگے | مرہٹوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد انگریزوں نے جزائر بمبئی کو

۱؎ Shell from the Sands of B'bay. P. 444/45.

ترقی کی طرف توجہ کی، اور ۱۸۳۸ء میں جزیرہ قلابہ کو جزیرہ بمبئی سے ایک سڑک کے ذریعہ ملا کر قلابہ کو فوجی مستقر بنایا، اپالو بندر میں توسیع کی گئی اور مسافر بردار جہازوں کے لنگرانداز ہونے کا معقول انتظام کیا گیا۔ آبادی میں اضافہ سے ان تمام جزائر کو ایک دوسرے سے ملانے کا مسئلہ سامنے آگیا۔ یوں تو یہ جزائر سمندر کے چڑھاؤ کے وقت جدا ہو جاتے تھے، اگر اتار کے وقت لوگ ایک جزیرہ سے دوسرے جزیرہ تک آسانی سے پیدل پہنچ جاتے تھے۔ اس لیے ان کو ایک دوسرے سے ملانے کا کام شروع کیا گیا۔

۱۸۵۰ء میں سب سے پہلے ریلوے کے کام کی ابتدا ہوئی، اور ۱۶/ اپریل ۱۸۵۳ء کو فورٹ جارج سے شہر تھانہ تک ہندوستان کی پہلی ریل پٹریوں پر دوڑنے لگی، جسے لوگوں نے استعجاب کی نظروں سے دیکھا۔ ۱۸۴۰ء میں بمبئی میں سب سے پہلے بینک آف بمبئی کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۴۲ء میں اورنٹیل بینکنگ کارپوریشن کی ایک شاخ قائم ہوئی۔ ان کے علاوہ مختلف بینک اور تجارتی ادارے قائم ہوئے۔ جن کی عمارتیں شہر کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہی تھیں،

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بمبئی میں

بمبئی ابھی سنور ہی رہا تھا کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بمبئی کی سیاحت کی۔ ان کے "سفرنامۂ حجاز" سے متعلقہ باب کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، جس سے بمبئی کا ایک سو اکتیس سال پرانا نقشہ سامنے آجائے گا:

"۱۳/ ربیع الثانی ۱۲۵۴ھ (مطابق ۶/ مئی ۱۸۳۸ء) کو گہر بندر (گھوڑبندر) قیام کیا، اور ۱۴/ ربیع الثانی کی دوپہر کے وقت ماہم پہنچے، بمبئی ماہم سے تین کوس ہے، ماہم کو باب بمبئی کہتے ہیں۔ فقیہ علی مصنف تفسیر رحمانی کا مزار یہاں پر ہے،

یہ بزرگ مولانا عبدالرحمٰن جامی کے ہمعصر تھے ۔

میں تمام سامان مہائم چھوڑ کر بمبئی چلا گیا، اور ایک دن ایک رات کے بعد ۱۵ ربیع الثانی کو شام کے وقت واپس آیا، چونکہ قلعہ و شہر کے مکانات کا صحن عنقا ہے اور میں وسعتِ صحن کا خوگر ہوں اس لیے کھیت باڑی میں جو کہ بیرون شہر ہے اور متصل شہر بھی ایک دلکش باغ اور مصفا و منقش مکان منتخب کر لیا گیا۔ تین روز ترتیب مکان کے انتظار میں مہائم میں ٹھہرنا ہوا۔ مہائم سے بمبئی تک اگرچہ دوکان اور بازار فروشندہ و خریدار نہیں لیکن محلات دلپذیر اور باغات خوش انداز و خوشنما جلوہ گر ہیں ۔

شہر بمبئی کے کیا کہنے ہیں ۔ اس کے بازار کشادہ ہیں، ہر جنس کی فراوانی ہے، ہمہ اقسام کی اشیاء بکثرت دستیاب ہیں ۔ اگر بمبئی کے تمام خصوصیات کا ذکر مفصل ہو تو کہنے والا بدحواس ہو جائے اور سننے والا تھک جائے، بہتر ہے کہ اس کا جامع و مانع وصف بیان کیا جائے، اور یہ کہ سوائے اس کے کہ یہاں کی آب و ہوا اچھی نہیں ہے۔ باقی ہر خوبی موجود ہے ۔

جز ایں قدر نتواں گفت در جمال تو عیب
کہ خال مہر و وفا نیست روئے زیبا را[۱]

---

[۱] "الفرقان" ص ۲۳ ماہ ذیقعدہ ۱۳۷۸ھ مطابق جون ۱۹۵۹ء ج ۲۶ شمارہ ۱۱ "نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم کا سفرنامۂ حجاز" از مولانا نسیم صاحب

خطبۂ صدارت

آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس

اجلاس ششم منعقدہ دارالمصنفین، ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ء

از جناب حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی

فضلاء و علمائے کرام!

معلوم نہیں آپ جیسے فضلائے کرام اور ماہرین مطالعات اسلامیہ نے مجھ جیسے محض ایک طبیب کو، جسے اسلام کی مذہبی زبان عربی اور اس کی ثقافتی زبان فارسی کا بھی بس ابتدائی علم ہو، اپنی اس معزز کانفرنس کا صدر کیوں بنایا ہے۔ آپ کی کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں جو اکتوبر ۱۹۶۷ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں مشہور فاضل اور محقق مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، میں صرف اس کے افتتاحی جلسہ میں شرکت کی عزت حاصل کر سکا تھا، اسکے دو روزہ مذاکرات اور اسکی اختتامیہ نشست میں بھی، میں اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے حاضر نہیں ہو سکا تھا تیسرے دن مجھے "خارجاً مسموع" ہوا کہ آپ حضرات نے اپنے آئندہ اجلاس کی صدارت کی عزت بھی مجھے بخش دی، شائد اس عزت افزائی کی وجہ میری اسلامیات سے دلچسپی ہے، جس کے کچھ مظاہر آپ کبھی کبھی دیکھتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ بھی نہیں کہ مجھے اسلامی علوم و فنون کی تاریخ اور بعض عملی مسائل سے گہری دلچسپی ہے اور میں ان کی توسیع و ترقی کی لگن بھی دل میں رکھتا ہوں۔

اس صدارت سے آپ کو کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، مجھے یہ سعادت ضرور حاصل ہو گئی کہ اس بہانے

ے اعظم گڈھ حاضر ہونے کا موقعہ مل گیا جو علوم اسلامیہ کی تحقیق کا ایک پرانا اور اہم مرکز ہے، جو علامہ شبلی نعمانی جیسے فاضل روزگار کا وطن اور ان کی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کا ایک میدان رہا ہے اور جو دارالمصنفین جیسے ادارہ کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ جسے مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے خون سے سینچا ہے اور جو اب بھی بہت سے علما اور فضلا کا مرکز ہے۔ مجھے دارالمصنفین میں حاضری سے اس لیے بھی خوشی ہوئی ہے کہ اس کی مطبوعات سے مجھے ۱۹۲۳ء سے ہی دلچسپی رہی ہے، معارف کے پرانے پرچے میں نے اسی سال یہاں سے منگوا کر مجلد کرائے تھے، اور اس وقت سے اب تک میرا اس ادارہ سے تعلق ہے، اس چھوٹے سے شہر اعظم گڈھ اور اس کے اطراف کے لوگوں نے دین اور علم و ادب کی جو خدمت کی ہے، وہ ہمارے بڑے بڑے شہروں میں بھی نہ ہو سکی، علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے علاوہ اس خطے سے حریا کوٹ، مبارک پور، محمد آباد اور ولید پور کے مشاہیر اور مولانا حمید الدین فراہی، مولانا عبد السلام ندوی، اور اقبال سہیل جیسے عالم اور ادیب ابھرے۔ ان علماء کے فیوض اب تک اعظم گڈھ اور اسکے اطراف کے مدرسوں کی صورت میں جاری ہیں، ہمیں اس وقت مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اور مئوناتھ بھنجن کے مفتاح العلوم، دار العلوم اور مدرسہ فیض عام اپنی گرانقدر علمی خدمات کی وجہ سے خاص طور پر یاد آرہے ہیں، لادینیت کے پھیلتے ہوئے اندھیرے میں یہ مدرسے آج بھی ایک وسیع دائرے کو اپنی دینی و علمی خدمت سے روشن کیے ہوئے ہیں۔

حضرات! اس قسم کے اجتماعات کے ناموں میں، جیسا کہ آج یہ ہمارا ہے، پہلے ریسرچ یا تحقیق کا لفظ کسی نہ کسی طرح ضرور شامل ہوتا تھا لیکن اب یہ متروک ہوتا جا رہا ہے، اس کی جگہ اسٹڈیز، مطالعات یا دراسات وغیرہ الفاظ نے لے لی ہے، الفاظ کے ساتھ اس قسم کے اونچ نیچ کے معاملات ہوتے ہی رہتے ہیں، جہاں ایک لفظ میں کچھ ناپسندیدہ مفہوم شامل ہوا یا وہ کسی وجہ سے بدنام ہوا تو اس کی جگہ زیادہ خوبصورت اور پہلو دار لفظ اختیار کر لیا جاتا ہے، برتھ کنٹرول یا ضبط تولید سے

جب لوگ بدکنے لگے تو ان کی جگہ فیملی پلاننگ یا خاندانی منصوبہ بندی کے دلفریب لفظ نے لے لی،

اقوام مغرب کی مشرقیات اور اسلامیات سے دلچسپی بھی خاصی پرانی ہے، اور ان کے بڑے بڑے فاضلوں نے مشرق کے علوم و فنون میں تحقیق کے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں، بہت سے علوم، جو اپنی جائے پیدائش سے ہی معدوم ہو گئے تھے، وہ ان کی محنتوں کی وجہ سے زندہ ہو گئے، بہت سے نئے علوم ان کی گہری دلچسپیوں کی وجہ سے عالم وجود میں آئے، اور بہت سے علوم کی شکل و صورت ہی ان کی "چابکدستی" سے بدل بھی گئی۔ غرض مستشرقین کرام نے واقعی بہت سے کرم ہم مشرقیوں اور مشرقیات پر کیے ہیں جن کے لیے ہم کو ان کا ہر لحاظ سے بہت ہی شکرگزار ہونا چاہیے۔

ہمارے ملک میں علمی و تحقیقی کام کرنے والے یوں تو ہر دور میں بکثرت ہوئے ہیں لیکن تنقید و تحقیق کے جدید اصول کو اپنانے والے علماء ان یوروپی مستشرقین کے رہین منت ہیں، جنھوں نے ہندوستان آکر اپنے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ اپنی ان تھک علمی سرگرمیوں کے ذریعہ ہندوستانیوں کو مشرقی علوم پر کام کرنے کی نئی راہیں دکھائیں، ان مستشرقین میں سرفہرست سر ولیم جونز کا نام ہے جنھوں نے ۱۷۸۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال قائم کرکے مطالعۂ علوم مشرقی کو نئی روح بخشی۔ اس ادارے کے مجلہ کے ابتدائی سو برس کے پرچوں پر ایک نظر ڈال لینا ہی انگریز افسران کے علمی لگاؤ اور ان کی ناقابل فراموش تحقیقی خدمات کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہوگا، اس مجلہ کے علاوہ، جو ابتک باقاعدگی سے نکل رہا ہے اور تحقیقی کام کرنے والوں کے مقالے شائع کر رہا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے سینکڑوں اہم عربی و فارسی کتابوں کے متن اور ان میں سے بہتوں کے انگریزی ترجمے بڑے اہتمام و کاوش سے شائع کیے، یہ متون اتنے اہم ہیں کہ ان کو امہات کتب کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔ آپ سب صاحبان کو ان کتابوں کی اہمیت اور افادیت کا پوری طرح علم ہے، اگر یہ کتابیں آج ہمارے سامنے موجود نہ ہوتیں تو تحقیقی کام

کرنے والوں کو کس قدر دشواریاں پیش آتیں اور مشرقی علوم کو کیا نقصان عظیم پہنچا ہوتا،

سر ولیم جونز کے قائم کیے ہوئے ادارہ کے ٹھیک سولہ برس بعد دوسرا ادارہ وجود میں آیا، جس کی عظمت بھی کچھ کم قابلِ ذکر نہیں، یہ تھا فورٹ ولیم کالج جو ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا، اس ادارہ نے عربی، فارسی، اور بالخصوص اردو کی بیسیوں کتابیں اور ترجمے شائع کرکے جو خدمات انجام دی ہیں وہ بھی ہمیشہ یاد رہیں گی، اس ادارے میں کام کرنے والے ابتداءً انگریز تھے لیکن جلد ہی دہلی اور اسکے اطراف سے ہندوستانی علما و ادبا بھی اس میں آ گئے، اور اس طرح ان میں تحقیق کا ولولہ پیدا ہوا، ان دونوں اداروں ہی کی بدولت ہندوستان میں علوم مشرقی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا، ہمارے محققین نے آہستہ آہستہ مشرقی علوم کے تمام شعبوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی اور موجودہ صدی کے اوائل میں وہ علمی میدان میں تحقیق و تدقیق کے اعلیٰ معیار پر پوری طرح کاربند اور پیش پیش نظر آنے لگے۔

ان بے شمار یوروپی مستشرقین کے ناموں میں جن کی کاوشوں نے ہماری علمی راہوں میں نئے چراغ روشن کیے، ایک نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، یعنی چارلس ولکنس کا، جنھوں نے اپنے دوسرے علمی کارناموں کے علاوہ ہندوستان میں سب سے پہلے مقامی زبانوں میں مواد شائع کرنے کے لیے پریس قائم کیا، علوم و فنون کی ترویج میں ان کا یہی ایک کارنامہ ایسا ہے جو ہمیشہ انکی یاد کو تازہ رکھے گا، جس کانفرنس میں آپ اور ہم آج جمع ہوئے ہیں وہ اور اسی قسم کی ہندوستان میں وقتاً فوقتاً منعقد ہونے والی دوسری کانفرنسیں، مثلاً آل انڈیا اورینٹل کانفرنس، انڈین ہسٹری کانگریس، انڈین فلاسوفیکل کانگریس، وغیرہ بھی مستشرقین کی دین ہیں، اس قسم کی کانفرنسوں کا ایک بڑا مقصد تحقیق کرنے والوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر تبادلۂ خیال کا موقع فراہم کرنا اور ان میں ربط و تعلق پیدا کرنا ہے، اور یہ علمی و تحقیقی کاموں کے لیے بڑا ضروری ہے، آج کی علوم و فنون کی تیز رفتار ترقی نے تبادلۂ خیال کو اور بھی

لازم کر دیا ہے اور اب یہ ناممکن سا ہو گیا ہے کہ کوئی محقق تبادلۂ خیال کے بغیر کما حقہ تحقیقی کام کر سکے، تبادلۂ خیال کے علاوہ ایسے اجتماعات کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ محققین کو ایک دوسرے کی علمی سرگرمیوں کا علم ہو جاتا ہے، اور اس طرح کام کی تکرار کم ہو جاتی ہے،

حضرات! اسلامی علوم و فنون اور ان کی تحقیق سے دلچسپی اب ایک یا چند گنے چنے ملکوں یا شخصوں تک محدود نہیں رہی ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہر ترقی یافتہ ملک بلکہ بہت سے ترقی پذیر ممالک بھی مختلف وجوہ سے اسلام اور مسلمانوں سے دلچسپی لے رہے ہیں، اور اپنی تعلیم گاہوں اور تحقیقی مرکزوں میں ان کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجائش نکال رہے ہیں، خود اپنے ملک میں فی الحال ہم کو اسلامی علوم و فنون سے غفلت اور بے پروائی کی بجا شکایت ہو سکتی ہے، اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے کہ بعض سیاسی حالات کی وجہ سے جو کام پہلے چل رہے تھے اُن میں بھی رخنہ پڑا ہے اور بعض صورتوں میں عمداً اسلامی علوم و فنون کو پس پشت ڈالا گیا ہے، لیکن آپ دیکھیں گے کہ سیاسی مطلع ذرا صاف ہوتے ہی اس ملک کو بھی اسلام اور اسلامی علوم و فنون سے گہری دلچسپی لینی ہی پڑے گی، جب وہ ممالک جن کا اسلام اور مسلمانوں سے کوئی خاص تعلق بھی نہیں ہے، اسلامی علوم و فنون سے دلچسپی لے رہے ہیں تو ہندوستان کیسے ان سے مستقل طور پر غفلت برت سکتا ہے جس کا اسلام اور مسلمانوں سے صدیوں سے اتنا گہرا تعلق رہا ہے، اور اس تعلق نے جو اثرات ان دونوں پر چھوڑے ہیں وہ خود ایک ایسا تحقیقی موضوع ہے جس کی ندرت کی نظیر مشکل ہی سے کسی اور جگہ مل سکے گی۔

ہم اپنے متعلق اور اپنے علوم و فنون کے متعلق دوسروں کی عدم دلچسپی اور بے پروائیوں کی شکایت تو کرتے رہتے ہیں، لیکن کیا ہم نے بھی کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈالا ہے کہ اسلامی علوم و فنون اور عظیم مسلم تہذیب و تمدن پر ہم نے تحقیق کے کون سے کارنامے انجام دیے ہیں، ریسرچ اور علمی تحقیق کے معاملہ میں مسلمانوں کا علمی مزاج بھی ایک عجیب و غریب موضوع ہے، جس پر ریسرچ برائے ریسرچ کے علمبردار بھی خوب

وادِ تحقیق دے سکتے ہیں، آج سے دس گیارہ سال پہلے جب میں کلیاتِ طب کے مسئلہ مزاج، طبیعت مدبرۂ بدن، عدل، تعدیل اور اعتدالِ طبعی اور جسم و روح کے تعلق پر ریسرچ کا خاکہ بنا رہا تھا، تو میری توجہ ہندوستانی اور خصوصاً مسلمانوں کے ملی مزاج پر ٹک گئی تھی اور میں نے محسوس کر لیا تھا کہ جدت و قدامت کی آویزش اور مسئلۂ ارتقاء کے متعلق ہمارا ذہن بالکل صاف نہیں ہے، بلکہ اس میں ایک عجیب سا تضاد بھی ہے، جس نے ہماری عملی قوتوں کو شل کر کے رکھ دیا ہے، اور کسی کام کو منظم (سسٹمیٹک) طور پر کرنے کی ہم میں صلاحیت نہیں رہی ہے۔ اس موقع پر ادارۂ تاریخ و تحقیقِ طب کی طرف سے تین سوال نامے دنیا کے بہت سے مفکرین اور مورخین اور مصلحین وغیرہ کو بھیجے گئے تھے، ان میں سے پہلا سوال نامہ غیر طبی اور عمومی یا تمہیدی نوعیت کا تھا جس پر بہت سے جوابات بھی موصول ہوئے ہیں، اس موقع پر ان سوالات و جوابات کا خلاصہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اس سوال کے جواب میں کہ مشرق میں تحریک ہائے احیائے مغرب میں نشاۃِ ثانیہ سے کن باتوں میں مختلف ہیں، زیادہ تر لوگوں نے کہا کہ مشرق میں تحریک احیاء روایت پسندی پر مبنی ہے، جبکہ مغرب میں نشاۃِ ثانیہ کی بنیاد روایت سے ہٹ کر سائنس اور ٹکنالوجی پر پڑی، اس طرح دونوں نقطہ ہائے نظر میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔

ایک اور سوال یہ کہ کیا مذہبی اقدار یا کسی مخصوص فلسفہ کے ماتحت علوم و فنون کا مطالعہ سائنٹفک کہا جا سکتا ہے، تمام جوابات نفی میں آئے، اس کا بھی جواب بالاتفاق نفی میں تھا کہ کیا کسی علم یا فن کو "شدہ" رکھتے ہوئے سائنٹفک بنایا جا سکتا ہے۔

ایک نہایت اہم سوال یہ تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض قومیں مثلاً یونانی، رومی، عرب اور ایرانی وغیرہ جنھوں نے کسی خاص علم یا فن کو جنم دیا اور انھیں فروغ بخشا، اب ان ہی علوم و فنون کی ترقی و احیاء سے یکسر غافل نظر آتی ہیں، لیکن بعض قومیں جن میں ہندوستان اور چین شامل ہیں،

اپنے پرانے اور مردہ یا نیم مردہ علوم و فنون سے کسی قیمت پر علیحدہ ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں، ظاہر ہے کہ یہ سوال نہایت غور و فکر چاہتا ہے اور بذاتِ خود ایک تحقیقی موضوع ہے، غالباً یہی وجہ ہو کہ اس سوال کے جواب میں زیادہ طبع آزمائی نہیں دکھائی گئی اور جو چند جواب آئے وہ بھی ایک دوسرے کے ضد تھے، اور گویا یہ ظاہر کر رہے تھے کہ اس پیچیدہ اور اختلافی مسئلے پر بڑی کاوش سے تحقیق کی ضرورت ہے۔

اگر آپ ان سوالات کا تجزیہ کریں تو دیکھیں گے کہ بنیادی مسئلہ صرف ایک ہی ہے جسے صرف دو لفظوں میں پیش کیا جاسکتا ہے، جدّت و قدامت۔ یہ مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ ہر زمانے میں روایت پسند اور روایت شکن لوگوں میں تصادم رہا ہے، اور اگر غور کیجئے تو کارل مارکس کی یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ تمام ترقی مختلف مکتب ہائے خیال اور متنوع نظام کار میں اختلاف و امتزاج کی پیداوار ہے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ آج جدّت کے معنی وہ نہیں ہیں جو اٹھارہویں صدی سے پہلے تھے، پہلے جدّت کا مطلب پرانی قدروں اور عقیدوں سے بائسبب یا بے سبب احتراز تھا۔ اب جدت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر خیال اور ہر عقیدے کو قبول کرنے سے پہلے اسے عقل و دانش کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ اگر کوئی خیال، کوئی عقیدہ اس کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تو وہ جدت کے زمرے سے خارج ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں وہ اَن سائنٹفک ہے اور قدیم یا دقیانوسی ہے۔ جدت و قدامت کی پرانی آویزش اور مسلمانوں پر اس کے احساس نے بھی مجھے اس وقت دور تک پہنچا دیا تھا اور اس مسئلے کی گہری تحقیق کا ایک خاکہ میں نے بنایا تھا، جو میرے کاغذات میں محفوظ ہے، جنوری ۱۹۵۹ء کا یہ نوٹ میں یہاں نقل کر رہا ہوں۔ ممکن ہے اب وہ کسی من چلے کی توجہ کا مرکز بن جائے اور یہ اہم کام جو میں اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے ابتک نہیں کرسکا، وہ اس طرح پورا ہو جائے۔

مسئلۂ جدّت و قدامت

جدت و قدامت کے مسائل پر ہماری معلومات محدود ہیں۔ ضرورت ہو کہ انکا وسیع طور پر مطالعہ کیا جائے:۔

توضیح | (۱) قدامت اور جدت دونوں انسانی فطرت کے تقاضے ہیں۔ غالباً اس کی سب سے بڑی شاہد یہ حقیقت ہے کہ

بڑے سے بڑا جدت پسند قدامت سے بالکلیہ الگ نہیں رہ سکتا اور نہ کوئی کٹر سے کٹر قدامت پسند جدت سے اپنا دامن بچائے رکھ سکتا ہے۔

(۲) قدامت اور جدت کی آویزش ہمیشہ سے چلی آرہی ہے اور غالباً ہمیشہ رہے گی۔

(۳) جدت تبدیلی کی دلدادہ ہے، لیکن اس کے بھی قوانین ہیں۔

(۴) افراد اور جماعتوں کی معاشی اور معاشرتی جدوجہد اور علوم و فنون کی بحثوں کی طوالت، خصوصاً سائنس اور مذہب کی معرکہ آرائیاں، یہ سب جدت و قدامت کی آویزش کی مختلف صورتیں ہیں۔

حدود مطالعہ | (۱) قدامت و جدت کی آویزش کی تاریخ۔

(۲) قدامت و جدت کا نفسیاتی اور فلسفیانہ جائزہ۔

(۳) مختلف مذہبی، نسلی اور ملکی جماعتوں اور گروہوں میں قدامت اور جدت کی آویزش کا مطالعہ

(۴) قدامت اور جدت کی آویزش اور مسلمانوں کے ملی مزاج پر جامع تحقیق۔

(۵) قدامت اور جدت کی آویزش اور ہندوؤں کا قومی مزاج اور اسکی بعض نمایاں خصوصیات کا مطالعہ۔

(۶) برصغیر کے مسلمان اور قدامت اور جدت کی آویزش۔

(۷) برصغیر کے مسلمانوں کے مذہبی اور غیر مذہبی علوم و فنون اور انکی آویزش کی تاریخ کا مطالعہ۔

بعض نکات | (۱) ماضی، حال اور مستقبل کے باہمی رشتے۔

(۲) حال کے تعین میں ماضی مفید ہو سکتا ہے، لیکن کیا مستقبل میں افادیت کی امید میں ماضی کی حفاظت ضروری ہے؟

(۳) یونان، روم اور ایران قدیم کا بحیثیت قوم خاتمہ، لیکن ہندو "قوم" کا بچے رہنا (عقیدۂ تناسخ سے اس کا رشتہ)

(۴) شاندار موت اور اہم و عالمگیر انسانی "چندہ" (کنڑی بیوشن) یا طویل العمری اور تھوڑا تھوڑا

اہم یا غیر اہم مقامی چندہ ؟

(۵) مسلمانوں کا ملی مزاج ماضی سے قطعی بے تعلقی کو برداشت نہیں کرسکتا ۔

(۶) ماضی سے چمٹے رہنا، اس سے بالکل بے پروائی بلکہ اس کی مٹی پلید کرتے رہنا بھی مسلمانوں کے ملی مزاج کی ایک خصوصیت ہے ۔

---

(۱) کیا جدت و قدامت کے مسئلہ کے حل کے لیے ایک یا چند عمومی کلیات وضع کیے جاسکتے ہیں؟

(۲) کیا کسی ملک یا قوم کے لیے جدت و قدامت کے مسئلہ کے حل کے طور پر ایک یا چند عمومی کلیات وضع کیے جاسکتے ہیں ؟

(۳) کسی علم و فن کے لیے جدت و قدامت کے مسئلہ کے حل کے طور پر ایک یا چند عمومی کلیات وضع کیے جاسکتے ہیں ؟

آپ کو معلوم ہی ہے کہ اسلامی ریسرچ اور مطالعات کا ایک ادارہ دہلی میں چھے سے قائم ہے، ۱۹۶۴ء میں ایک اسکیم بھی انٹرنیشنل کانگریس آف اورینٹلسٹ کے چھبیسویں اجلاس منعقدہ دہلی کے موقع پر پیش کی گئی تھی، ادارہ موجودہ محدود جگہ میں اپنا کام کر رہا ہے، لیکن پوری اسکیم پر اس وجہ سے عمل نہیں کیا جاسکا کہ انسٹی ٹیوٹ کے لیے مستقل زمین کا مسئلہ ابتک طے نہیں ہوسکا، دفتری لیت و لعل اور تاخیر کے اسباب سے کون ہے جو ناواقف ہے، بہر انسٹی ٹیوٹ کی بڑی جدوجہد کا نتیجہ آخر کار اچھا ہی نکلا ہے اور دہلی اڈمنسٹریشن نے حکومت کی وزارت تعلیم کی سفارش سے انسٹی ٹیوٹ کو تین ایکڑ زمین رعایتی نرخ پر دینے کا فیصلہ کیا ہے، جو عنقریب اس کو ملنے والی ہے ، یہ قطعۂ زمین شہر دہلی سے بارہ میل دور تغلق آباد میں واقع

جہاں انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ کا کیمپس بھی ہے، اور جس کی مین بلڈنگ کا افتتاح ۸ رفروری ۱۹۷۰ء کو ہو رہا ہے۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے ۱۹۶۲ء کی اسکیم ایک بار پھر دنیا بھر کے ماہرینِ اسلامیات اور بعض اصحابِ فکر کو تنقید اور نظرِ ثانی کے لیے بھیجی دی گئی ہے، ان جوابات کی روشنی میں نظرِ ثانی اور اصلاح کا کام بلا تاخیر کر لیا جائے گا، اور اس انسٹی ٹیوٹ کی مین بلڈنگ کا جو میوزیم اور لائبریری پر مشتمل ہوگی، سنگِ بنیاد بھی بہت جلد رکھ دیا جائے گا۔

انسٹی ٹیوٹ کی توجہ آج کل مجوزہ لائبریری کے کلاسیفکیشن سسٹم کی طرف ہے، تمام سسٹمز کا گہرا مطالعہ کیا جا رہا ہے لیکن کوئی ایسا سسٹم جو مجوزہ متنوع اور وسیع لائبریری کے لیے موزوں ہو، ابتک سامنے نہیں آیا ہے۔ ماہرین کے ابتک جوابات بھی اس مسئلے کا کوئی حل پیش نہیں کر سکے ہیں، اسی طرح مجوزہ میوزیم اور اس کے مختلف شعبوں کی ترتیب و تنظیم کا مسئلہ بھی مختلف قسم کی عملی دشواریاں پیش کر رہا ہے، بہرحال ان مشکلات کا کوئی نہ کوئی حل نکلے گا ہی، اور کام انشاء اللہ پورا ہی ہوگا۔ اس اسکیم کی تکمیل میں اور جذبات کے علاوہ جو جذبہ کام کر رہا ہے اسے اُن بزرگوں کی زبانی جو اس سرزمین میں آرام فرما رہے ہیں، ذرا ترمیم کے ساتھ اس طرح ظاہر کیا جا سکتا ہے،

ہمیں یک نقطہ از ریسرچ، اصل مدعا باشد کہ ایں سر رشتۂ تحقیقِ ما، در دستِ ما باشد

اسلامی ریسرچ اور اس کے مقاصد پر بہت سی بحثیں ہوئی ہیں اور مزید ہو سکتی ہیں ۔ مقصدِ تحقیق اسلامیہ پر ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کا مضمون جو ان کے رسالہ اسلامک ایجوکیشن میں گذشتہ برس قسط وار "اسلام اینڈ سائنس" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا، ممکن ہوا تو میں اسے دوبارہ بھی پڑھوں گا، ہر کلمہ گو یہی چاہے گا کہ سائنس اور تمام علوم و فنون کو بھی کلمہ پڑھوا دیا جائے اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تمام مذاہبِ عالم میں اگر کوئی مذہب سائنس کے ہاتھ میں تسبیح پکڑا سکتا ہے

تو وہ اسلام ہی ہے، خدا کرے ڈاکٹر صاحب مرحوم کا خواب جلد پورا ہو اور ایسے اسباب بھی مہیا ہوں جو اس تخیل کو عملی جامہ پہنا سکیں، فی الحال تو اس کی ضرورت ہے کہ اسلام، مسلمانوں اور اسلامی علوم و فنون کے متعلق ہر قسم کا ڈیٹا ایک جگہ جمع ہو جائے، تحقیقی ذوق والوں کے لیے ایک مرکز مہیا ہو جائے جو ہر قسم کی اور جدید ترین سہولتوں کا حامل ہو، اس کام کے اسباب تو پیدا ہو ہی چکے ہیں، خدا نے چاہا تو اس کی تکمیل بھی ہو ہی جائے گی۔

حضرات: آپ تو متوقع ہوں گے کہ کسی موضوع یا مطالعات اسلامیہ پر ہی سہی، کوئی فلسفیانہ اور فنی بحثیں سنیں گے، یہاں محض چھوٹی موٹی باتیں سن سن کر آپ اکتا بھی رہے ہوں گے، میں بھی مجبور ہوں، مجھے تو سیدھی سادی باتیں ہی آتی ہیں، میں تو بس اتنا ہی پڑھتا ہوں جتنا مجھے عمل کے لیے ضروری ہوتا ہے، اتنی ہی دور دیکھتا ہوں جہاں سے منزل صاف دکھائی دے رہی ہو، اور اتنا ہی چلتا ہوں جو قطعِ منزل کے لیے ضروری ہے، اس سے کم نہ زیادہ۔

آخر میں، میں پھر آپ سب حضرات کا اور کانفرنس کے منتظمین کا اور دعوت دینے والوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے یہ عزت بخشی اور میری باتوں کو صبر و سکون سے سنا، سب سے آخر میں، میں آپ کو نئے سال کی مبارک باد بھی پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ آنے والا سال ہم سب کے لیے فلاح و ترقی کا سال ہو، اور جو مشکلات ہمارے ملک کو اور ہماری قوم کو درپیش ہیں، وہ دور ہوں اور اقوامِ عالم میں ہمیں سرخروئی حاصل ہو۔ آمین۔

دار المصنفین میں اسلامک اسٹڈیز کانفرنس
کا
چھٹا اجلاس

از سید صباح الدین عبد الرحمن

آج سے بارہ برس پہلے آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کی بنیاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اسلامیات کی طرف سے جناب ڈاکٹر عبد العلیم کی کوششوں سے پڑی، جو اس وقت اس شعبہ کے صدر تھے، اس کا اجلاس ہر دو سال کے بعد ہوا کرتا ہے، شروع کے غالباً تین اجلاس مسلم یونیورسٹی ہی میں ہوئے، پھر یونیورسٹی سے باہر نکلی تو اس کی حیثیت کل ہند کی ہوگئی، اس کا ایک اجلاس حیدرآباد اور ایک جامعہ ملیہ دہلی میں ہوا، اس کا چھٹا اجلاس دار المصنفین کی دعوت پر اعظم گڈھ میں ۳۰ و ۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ء کو ہوا،

دار المصنفین کے انتظامی فرائض میرے ہی سپرد ہیں، پھر کانفرنس کے عہدیداروں نے مجھکو اس کا لوکل سکریٹری بھی بنادیا، اس لیے اس کی تیاری میں میری ذمہ داری دہری ہوگئی ہیں، ۸ر اکتوبر ۱۹۶۹ء کو دار المصنفین کے کام سے پاکستان چلا گیا، خیال تھا کہ ایک مہینہ کے اندر واپسی ہوجائے گی، لیکن وہاں بعض مجبوریوں سے دو مہینے رکنا پڑا، اس سفر میں یہ خلش برابر رہی کہ واپسی میں دیر ہوگی تو کانفرنس کی تیاریاں خاطر خواہ نہ ہوسکیں گی، پاکستان سے واپسی میں علی گڑھ اتر کر کانفرنس کے عہدیداروں سے ضروری ہدایتیں لیں، ۱۰ر دسمبر کو دار المصنفین واپس ہوا تو تیاریاں شروع کردی گئیں، جہاں اور انتظامات ہوئے وہاں ایک علمی نمائش بھی ترتیب دی گئی۔

گمان تھا کہ اعظم گڈھ جیسی دور افتادہ جگہ میں کانفرنس کے زیادہ نمایندوں کا آنا ممکن نہ ہوسکے گا لیکن توقع کے خلاف ۲۰ر دسمبر ہی سے معزز مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی، سب سے پہلے ڈاکٹر جی۔ آر عبد اللہ ریڈر شعبہ تعلیم

کشمیر یونیورسٹی، سرینگر سے پہنچے، آتے ہی کہا کہ صرف کانفرنس کی شرکت کے خیال سے نہیں آیا ہوں بلکہ وہ زیادہ پہلے دارالمصنفین سے استفادہ کرنے کی غرض سے بھی آگیا ہوں، کشمیر یونیورسٹی ہی میں پروفیسر عبدالقادر سروری شعبۂ اردو کے صدر ہیں، وہ سرینگر سے حیدرآباد گئے اور وہاں سے اعظم گڈھ تشریف لائے تو فرمایا کہ دارالمصنفین دیکھنے کی بڑی دیرینہ آرزو تھی جو الحمد للہ اب پوری ہوئی، مدراس یونیورسٹی کے عربی، فارسی اور اردو کے صدر جناب افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری صاحب بھی طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے آئے، دارالمصنفین ان کا شروع سے علمی قبلہ رہا ہے، اس لیے یہاں سراپا عجز و نیاز بن کر آئے، انسٹیٹیوٹ آف اڈوانسڈ اسٹڈی شملہ کی نمایندگی ڈاکٹر مشیر الحق نے کی، جناب مسعود حسن صاحب صدر شعبۂ عربی کلکتہ یونیورسٹی دارالمصنفین کے بڑے قدردان ہیں، وہ غالباً کانفرنس کے پہلے کسی اور اجلاس میں شریک نہیں ہوئے، دارالمصنفین کی کشش ان کو یہاں کھینچ لائی، جناب عطا کریم برق صاحب صدر شعبۂ فارسی کلکتہ یونیورسٹی، جدید فارسی کے بڑے ماہر ہیں، ان کو بھی دارالمصنفین سے گہرا لگاؤ ہے، وہ یہاں آئے تو کانفرنس سے زیادہ یہاں کی تمام چیزوں سے زیادہ دلچسپی لی، ڈاکٹر محمد صابر خاں ڈی۔ فل (آکسن) مغربی بنگال کے مختلف سرکاری کالجوں کے پرنسپل رہ چکے ہیں، برسوں سے دارالمصنفین آنے کا ارادہ کر رہے تھے، کانفرنس میں شرکت کرکے اس ارادہ کو بھی پورا کیا، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے عبدالسبحان صاحب کے خطوط سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کانفرنس میں شرکت کرنے اور دارالمصنفین دیکھنے کے لیے بے چین ہیں، مولانا حافظ محبوب الرحمن ازہری صاحب نے کلکتہ مدرسہ کی نمایندگی کی، وہ بھی دارالمصنفین کے پرانے پرستاروں میں ہیں، بہار کے بہت سے علمی خدمت گذار اس ادارہ میں رہ چکے ہیں جس سے بہار والوں کو اس سے بڑا قلبی تعلق ہے، اسلیے وہاں کے اہل علم کانفرنس میں شرکت کرکے علمی مے دو آتشہ کا جام پینے کو آئے، پروفیسر عطاء الرحمن کاکوی سابق ڈائرکٹر فارسی و عربی انسٹیٹیوٹ پٹنہ اکتوبر میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے شعبۂ اسلامیات کی صدارت کلکتہ میں کی ہے، وہ بھی آئے اور ان کے ساتھ مولوی عزالدین ندوی بھی آئے، پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر سید حسن پر انکی یونیورسٹی کو ان کے بہت سے کمالات پر فخر ہے، وہ مجھ سے دلی تعلق رکھتے ہیں؛

اس لیے دارالمصنفین میں کانفرنس کی شرکت کے لیے بہت شوق سے آئے، ان کے جلو میں جناب نیر حیدر رضا صاحب ڈائرکٹر فارسی وعربی انسٹیٹیوٹ پٹنہ اور ڈاکٹر محمد مظفر لکچرار فارسی گدھ یونیورسٹی بھی تھے، بنارس ہندو یونیورسٹی سے جناب ابن الحسن اور جناب سید سلیمان عباس آئے، وہ نہ آتے تو اپنے پڑوسی ضلع کا حق ادا نہ کرتے، الہ آباد یونیورسٹی کے جناب عبد اللطیف الہندی، اسلامیات کے سلسلہ کی کسی کانفرنس کو نہیں چھوڑتے، اسلیے یہاں آکر بھی اپنی وضعداری کو قائم رکھا، مجیدیہ انٹر کالج کے ہر دلعزیز پرنسپل جناب ریاض الدین صاحب باضابطہ نمایندہ بنکر آئے، مسلم یونیورسٹی والوں پر تو کانفرنس کا حق ہے، اس لیے وہاں سے کافی نمایندے آئے، دارالمصنفین کی طلائی جوبلی میں ڈاکٹر عبد العلیم نہ آسکے تھے، اسلیے جوبلی کی عدم شرکت کی تلافی اس کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہوکر کی، ان کا خوبیاں ہوکر دارالمصنفین سے ان کا تعلق چالیس سال سے ہے، وہ اب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہیں، اس لیے ان کی تشریف آوری سے کانفرنس میں وزن پیدا ہوا، کانفرنس کے قائم مقام جنرل سکریٹری ڈاکٹر سید مقبول احمد صدر شعبۂ ویسٹ ایشین اسٹڈیز کا تو آنا لازمی تھا کیونکہ ان ہی کو کانفرنس کی کارروائیوں کو قاعدے اور ضابطے کے مطابق عمل میں لانا تھا، ان کے ساتھ ڈاکٹر اقبال احمد انصاری ریڈر شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی بھی تھے، جو کانفرنس کے ٹریزرر بھی ہیں، ان کو کانفرنس کی کارروائیوں کو حسن وخوبی سے انجام دینے کا بڑا تجربہ حاصل ہوگیا ہے، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کی نمایندگی اس کے فاضل اور لائق صدر جناب مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے کی، جو ایک مشہور مصنف اور خطیب بھی ہیں، انکی معیت میں جناب فضل الرحمٰن گنوری بھی تھے، جو جس کانفرنس میں شریک ہوتے ہیں اپنے راسخ عقیدے کا نقش چھوڑ جاتے ہیں، مفتی رضا انصاری صاحب فرنگی محلی اب مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات سے وابستہ ہوگئے ہیں، وہ بھی آئے، اس یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کی نمایندگی جناب ڈاکٹر نبی حیدر اور جناب وحید اشرف صاحب نے کی، اس کے شعبۂ اسلامیات کی طرف سے جناب محمد راشد ندوی لکچرار، ڈاکٹر محمود الحق لکچرار اور احتشام بن حسن ریسرچ اسکالر آئے، مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ کی نمایندگی جناب وقار الزماں نے کی، دہلی سے کانفرنس کے صدر جناب حکیم عبد الحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ اجلاس کی زینت بنکر تشریف لائے۔

ان کے ساتھ مولانا سجاد حسین پرنسپل مدرسہ فتحپوری بھی تھے، جو اپنی نجی صحبت میں ہمیشہ باغ و بہار بنے رہتے ہیں، حکیم صاحب موصوف کے ساتھ جناب اوصاف علی صاحب بھی تھے، جو دہلی کے اسلامک انسٹیٹیوٹ کے سکریٹری ہونے کی حیثیت سے مفید خدمات انجام دے رہے ہیں، ڈاکٹر امیر حسن عابدی صدر شعبۂ فارسی و عربی دہلی یونیورسٹی بھی آئے، جو اندو پرشین لٹریچر کی خدمات کی بنا پر نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران اور افغانستان میں شہرت حاصل کر رہے ہیں، وہ فارسی میں سبک ہندی کے بڑے حامی ہیں، ان کے ساتھ ڈاکٹر مقبول احمد استاد فارسی دہلی یونیورسٹی اور ڈاکٹر نور الحسن انصاری بھی تھے، جناب عابد رضا بیدار صاحب ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ سے اپنے بے قرار بلکہ بیدار ذہن کے ساتھ آئے، جامعہ ملیہ کی نمائندگی مولانا عبد السلام قدوائی صدر شعبۂ تاریخ اسلام، ڈاکٹر عبد الحلیم خاں صدر شعبۂ عربی اور جناب عبد اللطیف اعظمی نے کی، ادارۂ اسلام اور عصر جدید جامعہ نگر دہلی کی طرف سے ڈاکٹر محمود الحسن آئے، دار المصنفین میزبان تھا، اس لیے اس کی مجلس انتظامیہ کے اراکین میں اس کانفرنس میں شرکت کے لیے مولانا عبد الماجد دریابادی، نواب عبید الرحمن خاں شروانی (علی گڑھ)، مولانا ابو الحسن علی ندوی (لکھنؤ)، مولانا عمران خاں ندوی (بھوپال)، جناب سید انصاری (جامعہ ملیہ) آئے، مولانا ابو الحسن علی صاحب ندوی کے ساتھ مولانا رابع ندوی بھی تھے، جو اس وقت ہندوستان میں عربی کے قابل قدر انشا پرداز ہیں، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ کی نمائندگی وہاں کے ایک کمسن اور ہونہار طالب العلم عبد العظیم نے کی۔ ان مہمانوں کی آمد سے دار المصنفین اسلامیات کے قدیم و جدید دونوں گروہوں کا ایک سنگم بن گیا تھا، ان کے قیام و طعام کے اہتمام میں دار المصنفین کے لوگوں کے ساتھ جناب نیاز احمد صاحب وکیل نائب صدر مجلس انتظامیہ شبلی کالج، جناب امتیاز احمد صاحب وکیل سکریٹری شبلی کالج، جناب شوکت سلطان صاحب پرنسپل شبلی کالج، جناب محمد مزمل صاحب سابق وائس پرنسپل شبلی کالج اور کالج کے اساتذہ برابر شریک رہے اور ہر قسم کا تعاون کیا، جناب عبد المجید زبیری صاحب صدر شعبہ سیاسیات تو اہتمام کے سلسلہ میں تین رات جاگتے رہے، مہمانوں کی پیشوائی کے لیے شاہ گنج اسٹیشن ایک بس پہلے ہی بھیجدی گئی تھی، راستہ میں ان مہمانوں کا خیر مقدم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں کیا گیا، اور ان کے اعزاز میں ایک پر تکلف عصرانہ دیا گیا جس میں مدرسہ کے

منتظمین کے ساتھ شاہ غلام خالد رضا کمیل کی حسب خوش سلیقگی کو بھی بڑا دخل تھا، مدرسہ میں مولانا حمید الدین فراہی کے قلم کے تفسیری مسودوں کی نمائش بھی کی گئی تھی، مدرسہ کے ناظم مولانا بدرالدین اصلاحی نے مدرسہ کے مقاصد اور کاموں کا تعارف کرایا، اس کے جواب میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے ایک تقریر کی جو بہت پسند کی گئی، یہ تمام مہمان مغرب کے بعد دارالمصنفین پہنچے، یہاں کی عمارتیں بہت سادہ ہیں لیکن کشادہ مقامات واقع ہیں، گل مہر، شمشاد، املتاس، آم کے درختوں اور پھولوں کے چمن سے گھری ہوئی ہیں اور صاف ستھری رکھی جاتی ہیں، اس لیے بیرونی مہمانوں کو بھلی معلوم ہوئیں، ڈاکٹر مقبول احمد پروفیسر عطاء الرحمن اور پروفیسر سید حسن نے ان کی تعریف کی تو میں نے ان سے کہا کہ آپ لوگ چونکہ اپنائیت کے جذبے سے ان کو دیکھ رہے ہیں اسی لیے بھلی معلوم ہو رہی ہیں ورنہ یونیورسٹیوں کی عمارتوں کے مقابلہ میں ان کی کیا حیثیت ہے،

۳۰ دسمبر کی صبح سے کانفرنس کی کارروائی شروع ہوگئی، مہمانوں نے فجر کی نماز کے بعد مولانا شبلی اور اس احاطہ کے دوسرے آسودگانِ خاک مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کے مزاروں پر فاتحہ پڑھی، نو بجے جناب حکیم عبدالحمید صاحب نے دارالمصنفین کی علمی نمائش کا افتتاح کیا، اس میں مولانا شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی مطبوعہ تصانیف کے مسودے، تقریباً چار سو مخطوطات، مشاہیر کے خطوط، مولانا شبلی کے لکڑی کا ایک پاؤں، ان کے کچھ کپڑے، اور مولانا سید سلیمان ندوی کی میز پر ان کے دوات و قلم بھی رکھے ہوئے تھے، مہمانوں نے سرسید، اکبر الہ آبادی، عماد الملک، عبدالحلیم شرر، ڈاکٹر اقبال، نادر شاہ بادشاہ افغانستان، گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے خطوط کو بہت دلچسپی سے دیکھے لیکن زیادہ جمگھٹا مولانا شبلی کی سیرۃ النبی، شعر العجم، موازنۂ انیس و دبیر، مضامین عالمگیر کے مسودوں کے پاس رہا، ان کی مشہور تصنیف سیرۃ النبی کے پہلے حصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا ذکر مبارک ظہور قدسی کے عنوان سے ہے، جس میں ان کی

انشا پردازی کا پورا جوہر دکھائی دیتا ہے، اور یہ بہت سے لوگوں کو زبانی یاد ہے، اس کو لکھتے وقت انھوں نے اپنے مسودہ میں جو کاٹ چھانٹ کی تھی، وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ انھوں نے پہلے اس کی سرخی "شہنشاہ دو عالم کا کوکبۂ ورود" رکھی تھی، پھر اس کو بدل کر "شہنشاہ کونین کا اقبالِ ورود" کر دیا، اس کو بھی بدل دیا اور صرف ولادت سرخی رکھی، لیکن آخر میں ولادت کو بدل کر "ظہورِ قدسی" کر دیا، اس کے تحت جو کچھ لکھا ہے، اس میں بہت حک و اصلاح کی ہے، جس کے بعد ایک کاتب سے اس کا مسودہ صاف کرایا ہے، اور اس میں پہلے یہ عبارت تھی :۔

"چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آ چکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سر و سامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں، مشاطۂ بہار نے گاہ گاہ شاہدانِ چمن کو اس رعنائی سے آراستہ کیا ہے کہ کشورکتا یانِ جمال نے ذوق تماشا کی نذریں پیش کی ہیں، عروج اقبال کا کوکبِ بلند، کبھی اس قدر اونچا ہو گیا ہے کہ اجرام فلکی اس کے سامنے ذرے بن کر رہ گئے ہیں، سعادت کا ابرِ کرم کبھی کبھی اس فیاض دلی سے برسا ہے کہ ایک ایک خار و خس خیر و برکت کا سنبلستان بن گیا ہے، عدل و انصاف کی حکومت کبھی کبھی اس قدر وسیع ہو گئی ہے کہ دنیا کا ایک ذرہ اس کی عالمگیری سے بے اثر نہیں رہا، خرابۂ عالم جو نظر اٹھا کر دیکھنے کے بھی قابل نہیں، اس میں کبھی کبھی مہمان نوازی ابراہیم، صبر ایوب، جمال یوسف، معجز طرازی موسیٰ، اعجاز نوازی مسیح، اقبال سکندر، شوکت جم اور اوجِ کیخسرو کے حیرت انگیز مناظر دکھائے ہیں۔

لیکن ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیرکہن سالِ دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے تھے، سیارگانِ فلک اسی دن کے انتظار میں ہمہ تن چشم براہ تھے، چرخ گرداں مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا،

کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالمِ قدس کے انفاس پاک، اخلاق انسانی کے مدارج عروج سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارزِ شاہنشاہِ کونینؐ کے دربار میں کام آئیں گے۔"

مولانا نے آخری نظر ثانی میں مندرجۂ بالا عبارت کی بہت سی سطریں نکال دی ہیں، حالانکہ وہ بھی انشاء پردازی کے نمونے اور سچے جذبات کے اعلیٰ مظاہر تھے۔ پھر بھی انھوں نے اپنے اعلیٰ ذوق سے کام لیکر آخر میں جو سطریں تحبیذ کے لیے دیں وہ یہ ہیں، ناظرین خود ملالیں کہ دونوں میں کیا فرق پیدا ہوگیا ہے۔

"چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سرو سامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں، لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سالِ دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیے، سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخِ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیمؑ، جمال یوسفؑ، معجز طرازی موسیٰؑ، جاں نوازی مسیحؑ سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارزِ شاہنشاہ کونینؐ کے دربار میں کام آئیں گے۔"

مولانا سید سلیمانؒ ندوی کی سیرتِ عائشہؓ، خیام اور حیاتِ شبلیؒ کے سودوں سے زیادہ دلچسپی لی گئی، مولانا عبدالسلام ندوی کی شعر الہند کے سودے کو بھی غور سے دیکھا گیا، ایک دوسری

میز پر دار المصنفین کی ۱۴۸ مطبوعات اور معارف کی ۴۰ جلدیں رکھی ہوئی تھیں، اسی پر سیرۃ النبیؐ کے ترکی، پشتو، فارسی اور تامل ترجمے، الفاروق اور شعر العجم کے فارسی ترجمے اور سیرۃ عائشہؓ کے فارسی اور ترکی ترجمے بھی تھے، وہ کتابیں بھی تھیں جن پر ہندوستانی اکیڈمی، ساہتیہ اکیڈمی اور یوپی کی حکومت کی طرف سے انعام ملے ہیں، ایسی کتابوں کی تعداد سات تھی، دوسرے کمرہ میں فارسی اور ع. ل کے تقریباً چار سو مخطوطات میز پر سجائے گئے تھے، جن میں حسب ذیل نوادر خاص طور پر دیکھے گئے۔

(۱) مونس الارواح مصنفہ جہان آرا بیگم بنت شاہجہاں، مکتوبہ ۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۷ء، یہ مطلا اور مذہب نسخہ شہزادی کے مطالعۂ خاص میں رہا (۲) اپنشد جلد اوّل و دوم مصنفہ داراشکوہ، مکتوبہ ۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۶ء یہ نسخہ داراشکوہ کے پاس رہا (۳) انیس الحاج از معین صفی بن ولی قزوینی یہ شہزادی زیب النساءؔ کے استاد کا سفر نامۂ حج ہے، یہ نسخہ مصور اور عالمگیر کے عہد کا ہے، اس سے اس دور کی مصوری کے نمونوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے، (۴) اکبر نامہ از ابوالفضل، اس مصور نسخہ میں مغلوں کی مصوری کے آرٹ کے بہت عمدہ نمونے ملتے ہیں، اس میں کتابت کا سنہ نہیں درج ہے، اہلِ نظر کی رائے میں اختلاف ہوگیا ہے، کوئی کہتا ہے کہ اس کی مصوری جہانگیری عہد کی ہے، اور کوئی اس نسخہ کو محمد شاہی عہد کا بتاتا ہے، (۵) کلیات کلیم مکتوبہ ۱۰۷۶ھ / ۱۶۶۶ء بڑا خوشخط نسخہ ہے، شاید ابو طالب کلیم کے ذاتی استعمال میں رہا، (۶) فرہنگ جہانگیری از جمال الدین حسین انجو اس پر عالمگیری عہد کے امیر لطف اللہ بن سعد اللہ کی مہر ثبت ہے، اور ۱۰۴۳ھ مرقوم ہے، (۷) مؤید الفضلا از محمد بن لاد دہلوی، یہ دسویں صدی ہجری کی تصنیف ہے لیکن نسخہ بارہویں صدی کا ہے، (۸) فقہ بابری از نور الدین بن قطب الدین مکتوبہ گیارہویں صدی ہجری، یہ نسخہ غیر مطبوعہ ہے، اور ہندوستان میں اس کے شاید دو تین ہی نسخے ہیں، (۹) مرآۃ العالم از بختاور خاں، مصنف عالمگیر کے امراء میں سے تھا، یہ نسخہ

کے قریب عہد کا ہے، (۹) رسالہ حق نما از دارا شکوہ، اس پر کتابت کا سال درج نہیں، (۱۰) جوامع الحکایات ولوامع الروایات از محمد سدید الدین عوفی، بڑا ضخیم نسخہ ہے، اس پر بھی کتابت کا سال درج نہیں لیکن شان خط سے اس کی قدامت کا اظہار ہوتا ہے، (۱۱) حکایات سلطان محمود غزنوی، مصنف کا نام اور سال کتابت درج نہیں، (۱۲) تذکرہ مخزن الغرائب از احمد علی ہاشمی، سندیلوی مکتوبہ ۱۲۲۰ھ (۱۳) شرح نہج البلاغہ از عزالدین بن عبد الحمید مدائنی المتوفی ۶۵۵ھ اس پر شاہان گولکنڈہ کی مہریں ہیں، (۱۴) تفسیر مواہب از ملا حسین واعظ کاشفی المتوفی ۹۱۰ھ یہ نسخہ ۹۴۶ھ میں یعنی مصنف کی وفات کے صرف ۳۶ سال بعد لکھا گیا، بہت عمدہ کتابت کا نمونہ ہے، (۱۵) کتاب الجمل از ابو القاسم عبد الرحمٰن زجاجی نحوی المتوفی ۳۳۹ء مکتوبہ ۶۰۱ھ، یہ دار المصنفین کے مخطوطات کے ذخیرے کا قدیم ترین نسخہ ہے،

ٹھیک گیارہ بجے کانفرنس کا پہلا اجلاس شبلی کالج کے کانووکیشن ہال میں شروع ہوا، جو حاضرین سے پُر تھا، مولانا ضیاء احق ندوی ناظر کتب خانہ دار المصنفین نے تلاوت کلام پاک کی، اس کے بعد جناب شاہ معین الدین احمد ندوی نے اپنا خطبۂ استقبالیہ پڑھا، جو معارف کے ناظرین کی نظر سے گذشتہ مہینہ گذر چکا ہے، جناب شاہ صاحب نے اپنے مختصر خطبہ میں بہت سی باتیں قصداً چھوڑ دی ہیں، تاکہ یہ خطبۂ صدارت کے برابر نہ ہونے پائے، پھر بھی عام طور سے پسند کیا گیا،

خطبۂ استقبالیہ کے بعد مولانا ابو الحسن علی ندوی نے اجلاس کا افتتاح کیا، وہ اس وقت اپنی غیر معمولی مذہبی بصیرت اور فکری و نظری گہرائی کی وجہ سے اسلامی دنیا کی ممتاز ترین شخصیتوں میں شمار کئے جاتے ہیں، اور وہاں کے اہلِ ذوق اُن کو بہترین خطیب بھی سمجھتے ہیں، جلسہ میں قدیم وجدید اہل علم کا بڑا اچھا اجتماع تھا، مولانا نے اُن کو مخاطب کرکے ایک بڑی دلنشین تقریر کی جس کا خلاصہ یہ ہے:-

"آٹھویں صدی کے بعد علمی وفکری اعتبار سے عالمِ اسلام پر ایک اضمحلال ساطاری ہوگیا، اس دور میں دماغ تھکے تھکے اور دل بجھے بجھے نظر آتے ہیں، فن کار میں کوئی جدت، اچھوتا پن، اور مصنف میں کوئی نیا خیال یا ابداع یا ابتکار عام طور سے نظر نہیں آتا، مقدمۂ ابن خلدون کے علاوہ کوئی ایسی تصنیف نہیں ملتی جس میں اجتہادی شان ہو، اور جدتِ فکر اور ندرتِ خیال نمایاں ہو، ہاں حدیث کا فن جو اس وقت کے مسلمانوں کا محبوب ترین موضوع تھا، اس سے مستثنیٰ ہے، اس فن میں فتح الباری جیسی عظیم ترین تصنیف اسی دور کی ہے، اس صدی میں یہ اضمحلال کیوں طاری رہا، اس پر بھی کام کرنے کی ضرورت ہے، ہندوستان میں آٹھویں صدی کے بعد کچھ ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جن کے یہاں جدتِ فکر بلکہ جرأت اندیشہ پائی جاتی ہے، ملا محمود جونپوری، شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ اسماعیل شہید اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے یہاں نئے مضامین ملتے ہیں، اور جہاں تک معارف وحقائق عمیق و دقیق علوم، اور لطیف مضامین کا تعلق ہے شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے مکتوبات کی نظیر پورے اسلامی کتب خانہ میں نہیں ملتی، ہندوستانی علماء کی یہ جرأت قابلِ داد ہے، کہ انھوں نے عربی لغت میں بھی اپنی قابلیت اور اپنے تفوق کا ثبوت دیا، عربی معاجم کے ابتدائی ماخذ میں العباب الزاخر بھی ہے، جو ایک ہندی علامہ صغانی لاہوری کی تصنیف ہے، علامہ مرتضیٰ بلگرامی الملقب بہ زبیدی نے عربی کی مشہور اور مستند لغت القاموس کی شرح تاج العروس کے نام سے دس جلدوں میں لکھی جو پانچ ہزار صفحات پر مشتمل ہے، علوم بلاغت میں ملا محمود جونپوری کی کتاب الفرائد اور آخر میں

مولانا حمید الدین فراہی کی کتاب جمہرۃ البلاغۃ میں نئے خیالات ملتے ہیں، اور مجتہدانہ فکر نظر آتا ہے جسٹس کرامت حسین کی کتاب فقہ اللسان ادبائے عرب کی نگاہ میں بھی وقعت رکھتی ہے، ہندوستان میں ایک آدمی نے وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پوری اکیڈمی کرتی ہے، معجم المصنفین ایک فرد واحد مولانا محمود حسن خاں ٹونکی کا عظیم تصنیفی کارنامہ ہے، یہ ساٹھ جلدوں میں اور بیس ہزار صفحات پر مشتمل ہے، اور اس میں چالیس ہزار اشخاص کا تذکرہ ہے، اسلام اسلامیات سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اس موضوع کے ساتھ اس وقت تک انصاف نہیں کیا جا سکتا جب تک اس کے سرچشمہ کو نہ سمجھ لیا جائے، اور اس سے کسی درجہ میں تعلق نہ ہو، جس سے اسلامیات کی ابتدا ہوئی ہے، اور جس سے اس موضوع میں معنویت قدروقیمت، اور آفاقیت پیدا ہوتی ہے، اور اسی نسبت اور تعلق کی بنا پر یہ ساری دنیا کا مرکز توجہ بن گیا ہے، یہاں تک کہ مستشرقین کو بھی اس پر اپنی توجہ مرکوز کرنی پڑی، میری مراد اس محبوب اور عہد آفریں شخصیت سے ہے جس کا نام نامی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

اسلامیات پر کوئی مؤثر تصنیف اس وقت تک نہیں لکھی جا سکتی جب تک کہ اسلامیات کے اصل سرچشمہ سے کسی حد تک اعتقادی، اور کسی درجہ میں جذباتی تعلق نہ ہو، اور وہ کیفیات طاری نہ ہو جائیں، جو ایک عقیدہ، اور جذبہ رکھنے والے انسان پر طاری ہوتی ہیں، اگر یہ نہیں تو سب کاغذی پھول ہوں گے،

... ... فکر و نظر تحقیق اور جستجو بے حکمت

اور بے معنی ہے، اگر حقیقت کا ادراک نہ ہو، اور ان علمی کاوشوں میں زندگی کا کوئی پیغام نہ ہو، اقبال نے کہا ہے،

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن   جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو   جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

اقبال ہی کا یہ شعر بھی ہے،

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر   نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

مولانا کی تقریر بڑے غور سے سُنی گئی، اور بہت پسند کی گئی،

اس کے بعد حکیم عبد الحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ نے اپنا صدارتی خطبہ پڑھا، جو معارف کی اسی اشاعت میں درج کیا جارہا ہے، حکیم صاحب موصوف کے اس خطبہ سے اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف طب میں کامل مہارت رکھتے ہیں، بلکہ علمی نظر و فکر کے بھی حامل ہیں، اور علمی مجلس کو اپنے مفید مشوروں سے نواز سکتے ہیں،

اس خطبہ کے بعد کانفرنس کے سکریٹری ڈاکٹر مقبول احمد نے اس کی زبانی رپورٹ پیش کی، جس میں کانفرنس کے اغراض و مقاصد اور اس کی تاریخ بتائی، اور پھر مولانا ابو الحسن علی ندوی کو اطمینان دلایا، کہ انھوں نے جس حقیقت کے ادراک کی طرف توجہ دلائی ہے، اس سے کانفرنس کے نمایندوں میں کم و بیش وابستگی ضرور پائی جاتی ہے،

میں خود میزبان کی حیثیت سے کانفرنس کے شاندار اجتماع سے محظوظ ہو رہا تھا، اس کی کارروائی کے درمیان سوچ رہا تھا، کہ دار المصنفین کی دعوت پر ہندوستان کے اسلامیات کے تمام سیارے اس وقت یہاں آکر جمع ہو گئے ہیں، ان میں کوئی آفتاب ہے تو کوئی ماہتاب، کوئی عطارد ہے تو کوئی مشتری، ہم میں متاثر ہو کر اس وقت اعظم گڈھ کی فضا کو بہت ہی رنگین حسین اور بہار آفریں

پار ہا تھا، مجھ کو خیال آیا کہ استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی فرمایا کرتے تھے کہ اعظم گڈھ جیسے دور افتادہ شہر کے سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے جو بھی دارالمصنفین آتا ہے، اس کو محبت کا مجسمہ اور اور اخلاص کا پیکر سمجھنا چاہئے"، اس خیال کے آتے ہی میرا بس چلتا تو محبت کے ان مجسموں، اور اخلاص کے ان پیکروں کے گلے میں دارالمصنفین کی طرف سے بھی محبت اور اخلاص کا مرصع نگار مینا کار نولکھا ہار پہنا تا، اور جب میں اُن کا شکریہ ادا کرنے کو اٹھا تو جذبات سے کچھ ایسا مغلوب تھا کہ میں یہ سب کچھ کہنا چاہتا تھا معلوم نہیں میری قوت گویائی میرے جذبات کا ساتھ دے سکی یا نہیں، شاید نہیں،

اسی روز ۳ بجے مقالہ خوانی کا اجلاس حکیم عبدالحمید صاحب کی صدارت میں شروع ہوا، لوکل سکریٹری کی حیثیت سے مجھ ہی کو جلسہ کی کارروائی کنڈاکٹ کرنے کو کہا گیا، کانفرنس کے لئے ۴۳ مقالات وصول ہوئے تھے، پہلی نشست میں پانچ مقالات پڑھے گئے، جن میں تین تو انگریزی اور دو اردو میں تھے، اُن کے عنوانات یہ تھے، (۱) ہندوستان کی اسلامی تعلیمات کے موجودہ رجحانات (انگریزی) از ڈاکٹر جی۔ آر۔ عبداللہ، کشمیر یونیورسٹی، (۲) سید محمد گیسو دراز اور وحدت الوجود (انگریزی) از ڈاکٹر سید وحید اشرف، شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی) (۳) شیخ محمد عبدہ کے تعلیمی افکار (اردو) از جناب محمد راشد صاحب ندوی شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی (۴) ذاکر حسین، شخصیت و افکار (اردو) از جناب عابد رضا بیدار صاحب دہلی، (۵) اسلام اور سائنس، (انگریزی) از ڈاکٹر محمد مظفر گڈھ یونیورسٹی ڈاکٹر جی۔ آر عبداللہ اپنا مقالہ پڑھتے وقت کہہ گئے کہ سرسید نے جس طرح سیاست میں انگریزوں سے وفاداری کی تعلیم دی، اسی طرح مسلم یونیورسٹی کی طرز تعلیم میں بھی یہی وفاداری کا رنگ پیدا کیا لیکن دیوبند کے طرز تعلیم میں یہ وفاداری کا رنگ نہیں پایا جاتا، جس کو سُن کر علی گڈھ کا پورا گروپ بپھر اٹھا، جس کے بعد مقالہ نگار کو اُن کے زغہ

سے کافی مشکل ہوگیا، ما بعض بیار صاحب اپنا مقالہ اسلامی ممالک کے موجودہ رجحانات" پڑھنے والے تھے، مگر معلوم نہیں کیوں اس کے بجائے اپنی ایک مطبوعہ کتاب کا کچھ حصہ پڑھ کر سنانے لگے، جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم پر بہت کچھ چھینٹے تھے، جامعہ ملیہ کے جناب سعید انصاری نے آ ز ر د ہ ہوکر صدر سے کہا کہ ایسے مقالے اس مجلس میں نہ پڑھے جائیں، اور مقالات دلچسپی سے سنے گئے،

اس نشست کے بعد تمام نمایندے بلریا گنج کے مدرسۃ جامعۃ الفلاح میں ایک پر تکلف چائے پر مدعو تھے، یہ چھوٹا سا قصبہ اعظم گڈھ سے آٹھ میل دور ہے، وہاں بھی مولانا ابو الحسن علی ندوی کی ایک تقریر ہوئی، واپسی کے بعد مقالہ خوانی کی دوسری نشست ہوئی، جو آٹھ بجے رات تک جاری رہی، اس کی صدارت پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی نے کی جس میں حسب ذیل مقالات پڑھے گئے، (۱) تاریخ بنگالہ فارسی کی ایک غیر مطبوعہ تاریخ (انگریزی) ڈاکٹر عطا کریم برق، (۲) ریاض الافکار (فارسی نثر نگاروں کا ایک تذکرہ) از ڈاکٹر نور الحسن انصاری (۳) مولانا کرامت علی جونپوری از حافظ مجیب اللہ ندوی، (۴) آل بویہ کی فوجی جاگیرداری کا مطالعہ (انگریزی) ڈاکٹر سید محمد صابر خاں (۵) ریاض حسن خاں خیال از سید علی حیدر نیر، (۶) داراشکوہ کی ایک نئی تصنیف از پروفیسر عبد القادر سروری (۷) علامہ شبلی کے دو خواب از عبد اللطیف اعظمی (۸) عربی غزل از ڈاکٹر عبد الحلیم ندوی، (۹) فرقہ اسماعیلیہ کے مبلغ، شاعر و مصنف ناصر خسرو کے سفرنامہ کا پہلا فارسی مقدمہ از پروفیسر سید حسن، یہ آخری مقالہ جدید فارسی میں لکھا گیا تھا، جس کو سن کر جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی ناظم دار المصنفین نے فرمایا مسرت ہے کہ ہندوستان میں ایسے لوگ موجود ہیں، جو ایسی عمدہ فارسی لکھ لیتے ہیں،

ڈاکٹر نور الحسن انصاری نے اپنے مضمون میں جہانگیری دور کے امیر مہابت خان کے کچھ خطوط کے ایسے ٹکڑے سنائے، جو اس نے ملکۂ نورجہاں کو لکھے تھے، ان میں نورجہاں کو صیغۂ واحد حاضر میں مخاطب کیا

گیا ہے، یہ مغلوں کے عہد کی مکتوب نگاری کے آداب کے خلاف ہے، اس لئے ان مکاتیب کے متعلق شبہات پیدا ہوئے، پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنے مقالہ میں داراشکوہ کے کچھ ایسے صاف اور سلیس اردو اشعار سنائے کہ کچھ لوگوں کو خیال ہوا کہ یہ اشعار داراشکوہ کے نہیں، بلکہ اس کی طرف منسوب کر دیئے گئے ہیں، اس لئے اس کی تصنیف کے متعلق بھی شکوک پیدا ہوئے، جناب عبداللطیف اعظمی صاحب نے اپنے مختصر مقالہ میں یہ بتایا کہ مولانا شبلی کے دو خواب میں ایک خواب یہ تھا کہ ایسے علماء تیار کئے جائیں، جو قدیم و جدید دونوں کے تقاضوں اور مطالبوں سے واقف ہوں، اور ان کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، ان کا دوسرا خواب یہ تھا کہ تاریخ اسلام از سر نو سائنٹفک طریقے سے مرتب کی جائے، مقالہ نگار نے ان دونوں مقاصد کی تکمیل کے سلسلہ میں دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء کی کوششوں کا اعتراف کیا، لیکن ان دونوں کاموں کو اور بڑھانے پر زور دیا، جناب عبدالحلیم ندوی صاحب نے اپنے مقالہ میں عربی غزلوں کے کچھ ایسے اشعار سنائے، جو فاسقانہ رنگ کے تھے، اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ عربی غزلوں میں اسی قسم کا سرمایہ ہے، وہ عربی غزلوں کے عارفانہ رنگ کے اشعار بھی سناتے، تو یہ غلط فہمی دور ہو جاتی،

مقالہ خوانی کی اس نشست کے بعد دارالمصنفین کی طرف سے ایک پُر تکلف ڈنر بھی تھا جس میں نمائندوں کے علاوہ شہر کے دو سو معززین بھی شریک تھے، ۱۳ر دسمبر کی مقالہ خوانی کی نشست مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی صدارت میں شروع ہوئی، جو ۹ بجے دن سے شروع ہو کر ۱ بجے ختم ہوئی، بیچ میں آدھ گھنٹہ چائے کے لئے وقفہ ہوا، ان دو نشستوں میں حسب ذیل مقالات پڑھے گئے، (۱) حیاتی گیلانی، حیاتی کاشی اور تغلق نامۂ امیر خسرو از ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی (۲) عربی کے مدحیہ قصائد از ڈاکٹر بدر رحمن عابدی (۳) تقسیم کے بعد ہندوستان میں مسلم اقلیت کا سیاسی رجحان از جناب اخلاق احمد صاحب (۴) اسلام کا معروضی مطالعہ از مولانا سعید احمد اکبرآبادی (۵) تذکرہ علمائے

پھلواری شریف، از شاہ عون الدین ندوی (۶) اسلام میں ایشیائی عظمت و شرف از جناب شاہ معین الدین احمد ندوی (۷) فتوی نویسی میں عصری تقاضوں کا مقام از ڈاکٹر بشیر الحق (۸) احیاء الخلافۃ العباسیہ بالقاہرہ (عربی) از جناب سعود الرحمن خاں ندوی (۹) آل نانڈ کے مذہبی لٹریچر پر ایک تبصرہ، از جناب محمد یوسف کوکن صاحب (۱۰) فقہ میں ابن رشد کا مقام از عبد العظیم اصلاحی (۱۱) اجتہاد کے سماجی عوامل از جناب فضل الرحمن صاحب (۱۲) مولانا وکیل احمد جونپوری، از مفتی رضا انصاری (۱۳) پندرہویں صدی عیسوی میں غرناطہ کا کلچر، درما شیرہ (۱۴) ابن اثیر مورخ کی حیثیت سے از ڈاکٹر محمود الحسن (۱۵) علامہ محدث ابن حبان از جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب (۱۶) اہمیت رکھنے والے مقامات جن کے ناموں میں تبدیلی ہوگئی ہے، از جناب محمد رابع ندوی صاحب (۱۷) بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں اسلامیات کا مطالعہ (انگریزی) از محمد عبد السبحان،

یہ تمام مقالات بڑی دلچسپی سے سُنے گئے، اور ان پر سوال و جواب بھی ہوتے رہے، مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے اپنا مقالہ "اسلام کا معروضی مطالعہ" خطیبانہ انداز میں پڑھا، جس سے اثر پیدا ہوا لیکن انھوں نے ایک جگہ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کی جو تفسیر بتائی، اس سے کچھ اختلاف پیدا ہوگیا، ان کا خیال ہے کہ اس آیت سے خداوند تعالیٰ کی آزردگی ظاہر ہوتی ہے، . . . . اور اسی حالت میں فرمایا کہ جاؤ تم کو تمہارا دین مبارک ہو اور ہم کو ہمارا دین لیکن مولانا سجاد حسین اور جناب بدر الحسن نے اس سے اتفاق نہیں کیا، اسی طرح انھوں نے یہ فرمایا کہ ہندوستان میں اسلام آیا تو جن چیزوں سے اس کو نقصان پہونچا، ان میں ایک تصوف بھی ہے، اس پر کچھ لوگ معترض ہوئے مولانا نے بڑی فراخدلی سے فرمایا کہ اگر اس سے اختلاف ہے، تو میں اس رائے میں ترمیم کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن انھوں نے عجمی افکار سے آزاد ہو کر قرآن پاک کے مطالعہ پر زور دیا، جناب فضل الرحمن صاحب نے اپنے مقالہ میں اجتہاد کے لئے یہ شرائط لازمی قرار دئیے۔ (۱) انسانی سماج کی تغیر پذیری (۲) تغیرات کا اعتراف (۳) بنیادی

اصولوں کا وجود (۴) اصولوں سے رہنمائی حاصل کرنے کی خواہش، انھوں نے اپنے اسی مقالہ میں اجتہاد کی حسبِ ذیل رکاوٹوں کی طرف ذہن منتقل کرایا، (۱) اسکاد (۲) اباحیت (۳) مداہنت اور نااہلیت، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اسلام کی بقا، اجتہاد پر ہے لیکن اجتہاد کے لئے جس ڈھانچہ کی ضرورت ہے وہ اس وقت موجود نہیں، سماجی ڈھانچہ کو بدلنے کی ضرورت ہے، نقطۂ نظر کے درمیان ہندو یونیورسٹی کے جناب سید سلیمان عباس صاحب نے ایک عجیب تقریر کی جس میں ان کے بعض فقروں سے سامعین بہت محظوظ ہوئے، انھوں نے ایک جگہ کہا کہ آج کل کے محققین اسکی تلاش و جستجو میں تو ضرور لگے رہتے ہیں کہ ملا صدرا کے بول و براز کی کونسی جگہ تھی لیکن ملا صدرا نے کیا پیش کیا اس سے وہ بالکل بے خبر ہوتے ہیں، ڈاکٹر مشیر الحق ندوی کا مقالہ دلچسپی سے سنا گیا، انھوں نے عہد جدید میں فتوی نویسی کے ضروری شرائط کی نشاندہی کی، انھوں نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے فتووں کی مثالوں سے ثابت کیا کہ مفتی کے لئے زمانہ کی معاشی اور سماجی ضرورتوں اور تقاضوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، اس مضمون میں بعض جگہ جو طنز سے کام لیا گیا تھا، وہ نہ ہوتا تو اچھا تھا، مولانا شاہ معین الدین ندوی نے اپنے مقالہ میں یہ بتایا کہ انسان کی عظمت و شہرت اسلام ہی نے قائم کیا، اور یہ انسان کو جس بلند مقام پر لیجاتا ہے، اس کی مثال دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی، اور یہ ایسی حقیقت ہے جو زمان و مکان کی قید سے باہر ہے، مولانا محمد رابع ندوی نے بعض ان مقامات کی نشاندہی کی جن کے نام سیرت نبوی کے واقعات میں بار بار آتے ہیں لیکن وہ اب دوسرے ناموں سے مشہور ہیں، اس مضمون سے بھی دلچسپی لی گئی،

جو مقالات وقت کی قلت کی وجہ سے نہ پڑھے جا سکے، وہ یہ ہیں، (۱) عربوں کی تمدنی تاریخ کے اہم ماخذ از شاہ معین الدین احمد ندوی (۲) ہندوستان میں وحدت الوجود سے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ، (۳) غالب کی فارسی شاعری: ہندوستان اور ایران کے نقادوں کی نظر میں، از سید صباح الدین عبدالرحمن (۴) مجدالدین محمد بن یعقوب فیروزآبادی از مولانا عبدالسلام قدوائی،

جو مقالات موصول ہوئے لیکن مقالہ نگار خود نہ آسکے، ان کے نام یہ ہیں (۱) احادیث کے اثنا عشرے

از ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کلکتہ (۲) ابن خلدون کا تنقیدی نظریہ، از سید احتشام احمد ندوی، از کالیکٹ یونیورسٹی، (۳) وسط ایشیا کا ترکی لٹریچر، از ڈاکٹر اکمل ایوبی مسلم یونیورسٹی، (۴) اسلام میں انسان کا تخیل، از ڈاکٹر عبدالحق انصاری، شانتی نکیتن (۵) موجودہ دور کے مسلمانوں کے نصب العین کی فروگذاشتیں، از جناب عبدالعلی صاحب، حیدرآباد، (۶) شاہانِ مغلیہ کا ذوقِ علمی، از ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی (۷) مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور ان کی فرحۃ المدرسین، از ڈاکٹر عبدالعلیم خاں شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی (۸) اسلام میں خلافت کا نظام اور خلافت راشدہ، از جناب سید ریاست علی ندوی صاحب، گیا، (۹) مذہب اور سیاست سے متعلق اسلامی نظریہ اور عمل از پروفیسر ام۔ ایس۔ اگوانی، دہلی،

مقالہ خوانی کے جلسوں کی خاص بات یہ تھی کہ جس کمرہ میں یہ مقالے پڑھے گئے، وہ ہر وقت بھرا رہا، بہت سے سامعین کو باہر کھڑا رہنا پڑا، اُن کو مقالوں سے ایسی دلچسپی رہی کہ اُن میں سے کوئی نہ کوئی ہر مقالہ پر کوئی دلچسپ فقرہ ضرور کہتا جس سے مقالہ خوانی کی خشکی جاتی رہی،

مقالہ خوانی کے بعد کانفرنس کے نمائندوں کا ایک مخصوص جلسہ ہوا جس میں حسب ذیل دانشوروں اور عالموں کی وفات پر تعزیتی تجویزیں منظور ہوئیں، ڈاکٹر ذاکر حسین پروفیسر ہمایوں کبیر، ڈاکٹر محمد نظام الدین، ڈاکٹر محمد اسحاق، پروفیسر اجمل خاں، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، مولانا رئیس احمد جعفری ندوی، (پاکستان) پروفیسر پور داؤد (ایران) پروفیسر صورت گر (ایران) پروفیسر اے۔ جے۔ آربری (انگلستان) پروفیسر جوزف شاخت،

آیندہ دو سال کے لئے کانفرنس کی حسب ذیل جدید مجلس عاملہ کا انتخاب ہوا (۱) ڈاکٹر عبدالعلیم وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی صدر، (۲) شاہ معین الدین احمد ندوی، ناظم دارالمصنفین، نائب صدر (۳) ڈاکٹر مقبول احمد مسلم یونیورسٹی، سکریٹری (۴) ڈاکٹر حافظ غلام مصطفیٰ صاحب مسلم یونیورسٹی، جوائنٹ سکریٹری (۵) ڈاکٹر محمد اقبال انصاری (ٹریژرر) اراکین: (۱) سید صباح الدین عبدالرحمن دارالمصنفین (۲)

پروفیسر سید حسن پٹنہ یونیورسٹی، (۳) پروفیسر عطا کریم برق کلکتہ یونیورسٹی، (۴) جناب اوصاف علی (دہلی) (۵) جناب عبداللطیف السندی الہ آباد یونیورسٹی، (۶) جناب عابد رضا بیدار صاحب (دہلی) (۷) مولانا فضل الرحمن گنوری مسلم یونیورسٹی (۸) مولانا محمد رابع ندوی (ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مولانا ابو الحسن علی ندوی نے کانفرنس کو آئندہ اجلاس کے لئے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مدعو کیا جو دو سال کے بعد ۱۹۷۲ء میں ہوگا، اس نشست کے بعد ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کی ایک تقریر ہوئی جس کے سننے کے لئے تمام لوگ مشتاق تھے، ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں کانفرنس کے اغراض و مقاصد بتاتے ہوئے کہا کہ اسلامی عقائد اور علوم کو پیش کرنے کا ایک طریقہ تو جذباتی اور تبلیغی ہوتا ہے اس کی افادیت سے انکار نہیں، اس طریقہ کار کے مواقع آتے رہتے ہیں، اور اس کی بھی ضرورت ہے، دوسرا طریقہ اسلامی عقائد اور علوم کو ٹھنڈے اور ... جذباتی طور پر پیش کرنا ہے اس کے بھی مواقع آتے رہتے ہیں، اس کی ضرورت سے بھی اختلاف نہیں، اس کی تفصیل پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ کانفرنس کا بنیادی مقصد اسلامیات کو ٹھنڈے طریقہ سے پیش کرکے دوسروں کو اپنے خیالات سے قریب کرنا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی کہا کہ اسلامیات کو دین سے جدا نہیں کیا جا سکتا، انھوں نے ہندوستانی علما اور اسلامیات پر ہندوستان میں کئے جانے والے کاموں کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت بھی بتائی، اسلامی علوم کے قدیم طریقہ تعلیم پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اس میں اصلاحات کی ضرورت ہے لیکن اس کو ایسا ناکارہ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا، اس کا بھی مقام ہے، اور اس کو بھی باقی رہنا چاہئے، ڈاکٹر صاحب کی تقریر کچھ ایسی ٹھنڈی اور غیر جذباتی اور متوازن تھی کہ اس کو تمام لوگوں نے پسند کیا، انہیں جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی اور مولانا ابو الحسن علی ندوی بھی تھے،

اس تقریر کے بعد مجھ کو تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کرنا پڑا، میں اس کی مجموعی کامیابی سے کچھ

ایسا متاثر تھا کہ مجھ سے زیادہ کچھ کہا نہ جاسکا لیکن جب کھڑا ہوا تو زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے،

"شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھ پر وہی کیفیت طاری ہے جو وصال یار کے بعد فراق یار کے وقت ہوا کرتی ہے، یہ تین دن کیسے اچھے گذرے ہم دارالمصنفین والے اپنے مہمانوں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے کہ ع

یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں　　جگرؔ

اور ہم دارالمصنفین والوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم نے شراب شوق پی لی ہے اور

اچھل رہی ہے چھلک رہی ہے، پیے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں　　جگرؔ

دارالمصنفین والے اس کانفرنس کی یاد کا ایک قلعۂ معلیٰ بنائیں گے، اور بہت دنوں تک اس میں آباد رہیں گے"

میں نے اپنے مہمانوں کو آخر میں آتشؔ کے ان مصرعوں کے ساتھ الوداع کہا

ع : ہمارے پاس سے جاؤ تو پھر کر دیکھتے جاؤ

اور یہ بھی

ع : تڑپتا ہے تمہارا کشتہ کیونکر دیکھتے جاؤ

آخر میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور ڈاکٹر مقبول احمد نے اراکین دارالمصنفین اور کالج کے اساتذہ کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے اُن کے بیان کے مطابق خاطر مدارات، میزبانی اور خدمتگذاری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، ڈاکٹر مقبول احمد تو یہاں تک کہ گئے کہ یہ کانفرنس دارالمصنفین کے اجلاس میں [illegible] ہوگئی ہے، کانفرنس کے خاتمہ پر شبلی کالج کی انتظامیہ کمیٹی کی طرف سے ایک شاندار ایٹ ہوم دیا گیا، جس میں مرزا نیاز احمد بیگ وکیل نائب سکریٹری نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا، اس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے پھر ایک بار تقریر کی، اور فرمایا کہ میں اس کانفرنس کی شرکت

سے بہت مسرور ہوں میری بہت سی غلط فہمیاں دور ہوگئیں، اور آیندہ اس کی کامیابی کیلئے دعائیں کیں
کانفرنس کے خاتمہ پر جناب عابد رضا بیدار صاحب کی کوششوں سے ایک مذاکرہ ہوا جس میں مولانا
سعید احمد اکبرآبادی، ڈاکٹر مقبول احمد، پروفیسر یوسف کوکن، مولانا فضل الرحمٰن گنوری، ڈاکٹر صابر خاں،
ڈاکٹر وحید اشرف، حافظ مجیب اللہ ندوی، مولانا محمد رابع ندوی نے حصہ لیا، زیادہ زور اس پر تھا کہ عربی
مدارس کا نصاب جامد ہے، اس میں تبدیلی ہونی چاہئے تاکہ وہ زندگی سے مطابقت رکھے، آخر میں
مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی ایک مدلل تقریر ہوئی، جس میں انھوں نے فرمایا کہ یہ کہنا کہ عربی
نصاب تعلیم جامد رہا ہے، صحیح نہیں، ہر زمانہ میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ہوتی رہیں، اگر اس نصاب
سے مفید نتائج برآمد نہیں ہوئے، تو یہ نصاب کا نقص نہیں ہے، بلکہ یہ اس ذہن کی کجی کا نتیجہ ہے
جس میں ساری دنیا اس وقت مبتلا ہے، ذہن کی یہی کجی کسی نصاب تعلیم سے استفادہ ہونے نہیں
دیتی، خواہ وہ عربی کا قدیم نصاب ہو، یا ترمیم شدہ نصاب ہو یا یورپ کی یونیورسٹیوں کا
نصاب ہی کیوں نہ ہو، انھوں نے یہ بھی فرمایا، کہ اس وقت یورپ کی تمام یونیورسٹیوں کا نصاب
وہاں کے لوگوں کی زندگی کا ساتھ نہیں دے رہا ہے، اس آخری نکتہ کو انھوں نے کچھ ایسی وضاحت
سے بیان کیا کہ تمام مذاکرین نے اس سے اتفاق کیا،

اس کانفرنس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ قدیم اور جدید دونوں طرز فکر کے علما اور دانشور
پہلی دفعہ اس کے پنڈال میں جمع ہوئے، قدامت اور جدت میں جو ٹکراؤ ہے اس میں یہاں مفاہمت
کی فضا پیدا ہوتی رہی، اسلامیت پر دلچسپی رکھنے والا قدیم گروہ تو دین کے احکام و مسائل اور
شریعت کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف ہے لیکن وہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات پر
وہ بصیرت نہیں رکھتا، جو رکھنا چاہئے، اسلامیت پر کام کرنے والوں کا ایک دوسرا گروہ دنیا
کی رفتار پر اچھی نظر رکھتا ہے، اور اسلام کو ان بدلے ہوئے حالات میں ترقی پذیر دیکھنا چاہتا ہے،

لیکن وہ دین کے احکام اور شریعت کے اسرار سے واقف نہیں اگر یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور دونوں فراخ دلی سے اپنے طرز فکر میں مفاہمت بھی پیدا کرتے رہیں تو اسلام کے ابدی حقائق کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے، اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا پلیٹ فارم اس مقصد کی تکمیل کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے، مولانا ابو الحسن علی ندوی کا یہ فرمانا کہ اس کانفرنس کی شرکت سے میری بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئیں، اور ڈاکٹر عبد العلیم صاحب کا یہ کہنا کہ اسلامیات کو دین سے جدا نہیں کیا جا سکتا، کانفرنس کی آیندہ زندگی کے لئے بشارت ہے کہ اس کے ذریعہ سے بعد المشرقین میں بھی قرآن السعدین ہو سکتا ہے، اس قران السعدین ہی کی طلب کانفرنس کے نمائندوں میں پائی جاتی تھی،

دار المصنفین والے خوش تھے کہ یہ ادارہ کانفرنس کے ذریعہ قدیم و جدید دونوں گروہوں کا ایک سنگم بن گیا تھا،

(دار المصنفین کی نئی کتاب)

اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں

مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب مرحوم نے عربی میں الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند کے نام سے ہندوستانی علماء و مصنفین کی تصانیف کی ایک فہرست مرتب کی تھی، جو شام کے مشہور علمی ادارے المجمع العلمی العربی، دمشق کی جانب سے شائع ہو چکی ہے، یہ اس کتاب کا ترجمہ ہے، جس میں ہندوستانی علماء کی تصانیف کے ساتھ ضمناً ہندوستانی مسلمانوں کی مکمل علمی، تعلیمی اور تہذیبی و فکری تاریخ بھی آگئی ہے،

از مولانا ابو العرفان صاحب ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو

قیمت: عے "منیجر"

مطبوعات جدیدہ

قرآن شریف ہندی ترجمہ وتفسیر | مترجمہ جناب نند کمار اوستھی صاحب بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت، وطباعت بہتر صفحات ۱۰۳۲ مجلد، مع گرد پوش قیمت ۳۵ روپیہ، پتہ بھون وانی، ۱۰۹، رانی کٹرہ، لکھنؤ نمبر ۳،

ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی میں اسلامی علوم کا ذخیرہ ابھی بہت کم ہے، کچھ لوگوں نے انفرادی حیثیت سے اور خصوصیت سے جماعت اسلامی ہند نے اس کی جانب توجہ کی ہے، چند سال پہلے اس کی کوششوں سے قرآن مجید کا ہندی ترجمہ شائع ہوا تھا، اب یہ نیا ہندی ترجمہ ایک ہندو فاضل نند کمار اوستھی صاحب نے کیا ہے، جو اُن کی مینٌ سالہ محنت وکاوش کا ثمرہ اور تشریحی وتفسیری حواشی سے مزین ہے، ہر سورہ کے شروع میں اُس کی آیات، رکوع، حروف و الفاظ کی تعداد بھی درج ہے، ترجمہ وتشریح کی صحت کے لئے یہ سند کافی ہے کہ اس میں حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ سے زیادہ مدد لی گئی ہے، اور تشریحی نوٹوں پر قاری مفتی محمد صدیق صاحب دارالمبلغین لکھنؤ نے اصلاح وترمیم اور نظر ثانی کی ہے. مترجم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے، کہ انھوں نے قرآن مجید کا عربی متن دیوناگری رسم الخط میں اس طرح تحریر کیا ہے، کہ صحیح عربی تلفظ ٹھیک ادا ہو جائے، اور مزید احتیاط کی ہے کہ اُس کے ساتھ اصل عربی متن عربی رسم خط میں بھی دیدیا ہے، اور وصل، فصل، قلب، ادغام، رکوع و سجدہ اور وقف کی علامتوں کا ذکر. اور ہندی میں عربی لہجہ کے مطابق تلاوت کرنے کے قاعدے، مخارج، ادغام اور وصل وفصل کے طریقے بھی تحریر کر دیئے گئے ہیں

لیکن ہندی اتنی صاف اور آسان ہے بلکہ اردو کے قریب ہوگئی ہے، اوستھی جی کی یہ عظیم الشان قرآنی خدمت لائق تبریک وتحسین ہے، انھوں نے ہندوؤں کی طرح نئی نسل کے ان مسلمانوں کو بھی اللہ کے کلام اور پیغام سے واقف ہونے کا موقع دیا ہے، جو صرف ہندی سے واقف ہیں، اُمید ہے کہ یہ ترجمہ مقبول ہوگا، اس کی خوبیوں اور مترجم کی محنت وجانفشانی کی صحیح داد ہندی زبان کے ماہرین ہی دے سکتے ہیں،

نوائے عصر از جناب یحییٰ اعظمی صاحب تقطیع خورد کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۱۲۸
قیمت: سعہ، پتہ: - دارالمصنفین - اعظم گڈھ

جناب یحییٰ اعظمی دبستان شبلی وسہیل کے مشہور خوش فکر وخوشگو شاعر ہیں، اُن کے کلام کا ایک مجموعہ اس سے پہلے نوائے حیات کے نام سے شائع ہو چکا ہے، یہ ان کا دوسرا مجموعہ کلام ہے اُن کو اپنے استاذ مولانا سہیل مرحوم کی طرح نظموں سے زیادہ مناسبت ہے، یہ مجموعہ منظومات ہی پر مشتمل ہے، اس میں آزادی کے بعد کے حالات ورجحانات کی عکاسی اور آلام و ہندستان کے عظیم الشان تعمیری وفلاحی منصوبوں، درخشاں مستقبل، شان وشکوہ اور اُس کی ممتاز ومایہ ناز شخصیتوں کی عظمت اور اُن کے کارناموں کا ولولہ انداز میں ذکر کیا گیا ہے، انھوں نے علم وادب اور سیاست کے بعض مشاہیر کے مرثیے بھی کہے ہیں، جو شدت تاثر اور جوشِ عقیدت سے معمور ہونے کے علاوہ نوجوانوں کے لئے درس وپیام بھی ہیں، یہ پورا مجموعہ ستھرے ذوق، گہرے مشاہدے، قوتِ تخیل، طرز ادا کی لطافت، مشق سخن اور پختگیِ کلام کا دلکش نمونہ اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

غالب کی کہانی مرتبہ جناب شفیع الدین نیر صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت نہایت عمدہ، صفحات ۱۲۸، قیمت: - عہ، پتہ: - نیر کتاب گھر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

غالب پر بہت لکھا جا چکا ہے لیکن بچوں کے لائق کوئی کتاب نہیں ہے، مرحوم صدر جمہوریہ ڈاکٹر

ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم کے ایما سے جن کو بچوں کے ادب و لٹریچر سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، جامعہ کے پہلے استاذ اور بچوں کے مشہور و محبوب شاعر و ادیب جناب شفیع الدین نیر نے یہ دلچسپ کتاب لکھی ہے، اس میں غالب کے خاندانی حالات، پیدائش سے وفات تک کے واقعات، اخلاق و عادات، شاعرانہ کمالات، انشاء پردازی اور خطوط نگاری کا مختصر مگر جامع طور سے تذکرہ کیا گیا ہے، غالب کی کہانی مرتب کرنے میں بچوں کے ذوق و استعداد کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، زبان سادہ اور عام فہم، پیرایہ دلکش اور دلچسپ، اور انداز سلیس و شگفتہ ہے، نیر صاحب کا نام ہی اس کی خوبی کی پوری ضمانت ہے، اور غالباً اس خدمت کا ان سے زیادہ بہتر حق بھی کوئی ادا نہیں کر سکتا تھا، یہ کتاب اگرچہ بچوں کے لئے لکھی گئی ہے، مگر بڑے لوگوں کے لئے بھی پرلطف اور معلومات افزا ہے،

سہل تجوید، مرتبہ ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۹۶ قیمت ۔ ۸ محصول پتہ :- قاری امیر احمد علی صاحب، استاذ دار القرآت والدینیات الکلیمیہ قریب محلہ لیدیہ، بازار نور خاں حیدرآباد دکن نمبر ۲۴،

قرآن مجید کو پڑھنے کے لئے قرأت و تجوید کے فن سے واقف ہونا ضروری ہے، لائق و فاضل مؤلف نے جو اس فن کے خاص ماہر ہیں، اس مفید کتابچہ میں تجوید کے اہم اور ضروری قاعدے عام فہم اور سلیس زبان اور آسان طرز بیان میں لکھے ہیں، اور ہر فصل کے آخر میں مشقی سوالات بھی دئے ہیں، یہ کتابچہ مکاتب و مدارس کے نصاب میں شامل کئے جانے کے لائق ہے۔

(ض)

مصنفاتِ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

۱۔ اسوۂ صحابہ: (حصۂ اول) قیمت: ؎

۲۔ اسوۂ صحابہ: (حصۂ دوم) " ؎

۳۔ اسوۂ صحابیات: " عا

۴۔ تاریخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کے خصوصیات کی تفصیل: قیمت: غلہ

۵۔ حکمائے اسلام: (حصۂ اول) دوسری صدی ہجری سے لیکر خاندانِ فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، قیمت: غلہ

۶۔ حکمائے اسلام: (حصۂ دوم) متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، قیمت: ؎

۷۔ شعر الہند (حصۂ اول) " غلہ

۸۔ شعر الہند (حصۂ دوم) " للعہ

۹۔ انقلاب الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان کا ایک کتاب کا انشاپردازانہ ترجمہ قیمت: للعہ

۱۰۔ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: (زیر طبع)

۱۱۔ امام رازی: امام فخرالدین رازی کے سوانح اور اُن کی تصنیفات: قیمت ؎

۱۲۔ ابنِ خلدون: ابنِ خلدون کے سوانحِ زندگی اور اُس کے فلسفہ کی تشریح (زیر طبع)

۱۳۔ اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانحِ حیات کے ساتھ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل، اُن کے فلسفۂ خودی کی تشریح، اور اُن کے فارسی و اُردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت ؎

مقالاتِ عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات، تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی، فقہی، تاریخی، تنقیدی، ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعراء کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر طویل تبصرے بھی کئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اُن کے مضامین کی ترتیب و اشاعت بھی دارالمصنفین کے پیش نظر ہے۔ یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زبان و ادب و شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، صفحات: ۲۲۶ قیمت: عہ منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(اڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارمِ اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ اپنی مکی و مدنی زندگی میں ۲۳ برس تک مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت، بلا امتیاز نسل ورنگ وبلا لحاظ زادو بوم سراپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب میں انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن وحدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف ابواب کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، اُن کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ پورا دین اسلام ہی نہیں، بلکہ اُس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے لئے آیۂ رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورتوں کا درجہ، اور اُن کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخ اسلام میں اُن کا مرتبہ، بلا تفریق مذہب و ملت پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہل کتاب اور مشرکین حربی وغیرہ سب داخل ہیں، غیر مسلم رعایا کے حقوق حیوانات کے حقوق اور اُن کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو بابوں میں دنیا پر دینِ اسلام کے علمبردار مسلمانوں کے علمی احسانات، اُن کے علمی کارناموں، اور مختلف علوم و فنون میں اُن کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت :۔ ۲۳۰ صفحے، قیمت :۔ ۵۰/ روپے

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)   مارچ سنہ ۱۹۷۰ء

معارف

مجلس دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنّفین اعظم گڈھ

جلد ۱۰۵ - ماہ محرم الحرام ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۰ء - عدد ۳

مضامین

شذرات

آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے گذشتہ اجلاس کے خطبۂ استقبالیہ میں راقم نے مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات اور شعبۂ دینیات کو اسلامی موضوعات خصوصاً جدید مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے مقالات لکھانے کی طرف توجہ دلائی تھی، گذشتہ مہینہ علی گڑھ کے سفر میں یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ ہمارے فاضل دوست اور شعبۂ دینیات کے لائق صدر مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی اس کام کو پہلے سے انجام دے رہے ہیں اور اس وقت تک ان کی نگرانی میں حسب ذیل مقالات لکھے جا چکے ہیں اور ان پر ڈگری بھی مل چکی اور بعض زیر تکمیل ہیں۔

---

(۱) مولانا انور شاہ کشمیری، ان کی زندگی اور علمی کارنامے (۲) حضرت شیخ الہند اور انکے کارنامے (۳) مولانا قاسم نانوتوی اور انکے کارنامے (۴) حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور انکی فقہ (۵) امام اوزاعی اور انکی فقہ (۶) امام بخاری اور انکی صحیح (۷) قرآن مجید کا منہج استدلال (۸) التربیۃ فی القرآن (۹) تصوریات قرآن اور فن حیاتیات کی نظر میں تقابلی مطالعہ (۱۰) العرف فی الفقہ (۱۱) مسلمانوں کا معاشی فکر کتاب الخراج اور کتاب الاموال کی روشنی میں۔

ان میں سے چوتھا مقالہ جو کتابی صورت میں چھپ چکا ہے، ہماری نظر سے بھی گذرا تھا، اس پر معارف میں ریویو بھی ہوا تھا، شعبۂ اسلامیات میں بھی کچھ مقالے لکھے گئے ہیں، مگر انکی تفصیل نہیں معلوم، اگر ان دونوں شعبوں میں اس قسم کے مسائل پر تحقیقات کا سلسلہ جاری رہے تو اسلامیات پر بہت اچھا ذخیرہ جمع ہو جائے گا، اور یہ ان شعبوں کا ایک کارنامہ ہوگا، اس سلسلہ میں یہ اطلاع دیدینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دار المصنفین اپنے رفقاء مصنفین کے علاوہ دوسرے اہل قلم کی تصانیف بھی جو اسکے دائرہ کی اور اسکے معیار کے مطابق ہوں، شائع کرتا ہے اور اس کا معاوضہ بھی دیتا ہے۔

اسلیے جو مصنفین اپنی تصانیف کی طباعت و اشاعت کا سامان نہیں کر سکتے وہ دار المصنفین سے معاملت کر سکتے ہیں۔

اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کو جو مسائل درپیش ہیں ان میں ان کے بچوں کی ابتدائی مذہبی تعلیم کا مسئلہ سب سے اہم ہے، دینی تعلیمی کونسل نے اس سلسلہ میں ایک عام بیداری پیدا کر دی ہے اور اس راہ کی بہت سی رکاوٹیں دور کر دی ہیں، ابتدا میں یہ تحریک بڑے زور سے چلی اور اس صوبہ میں ہزاروں مکاتب قائم ہو گئے، لیکن ادھر کچھ دنوں سے اس کام میں سستی آگئی تھی، اسلیے اس سلسلہ میں جتنا کام ہو چکا ہے اسکا جائزہ لینے اور آئندہ اسکے کارکنوں میں سرگرمی پیدا کرنے کے لیے گذشتہ ۹، ۱۰ فروری کو لکھنؤ میں دینی تعلیمی کونسل کا جلسہ ہوا تھا جس میں کونسل کے ممبران اور مختلف اضلاع کے نمایندے اور کارکن شریک ہوئے اور اپنے کاموں کی روداد اور مشکلات پیش کیں، ان پر اور تعلیم سے متعلق دوسرے مسائل پر غور کیا گیا اور اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے مفید تجویزیں منظور ہوئیں، مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کا مسئلہ مسلمانوں کی ملی موت و حیات کا مسئلہ ہے، اور اس کا انتظام مسلمانوں کا سب سے اہم فریضہ ہے، اگر وہ توجہ سے کام لیں تو یہ کوئی دشوار کام نہیں ہے اور نہ اس کے لیے کسی بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے، اگر ہر جگہ مقامی لوگ مستعد ہو جائیں تو آسانی سے ہو سکتا ہے اور اگر مسلمان اتنا بھی نہیں کر سکتے تو تنہا حکومت کا شکوہ بے نتیجہ ہے۔

ہر کلام کے صحیح مفہوم و منشا کو سمجھنے کے لیے اسکے اسلوب بیان اور طرز ادا سے واقفیت ضروری ہے، کلام مجید بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، وہ نحو کے قوانین کا پابند نہیں ہے اور اسکا اسلوب بیان قدیم کلام عرب کے مطابق ہے لیکن وہ تمامتر پابند اسکا بھی نہیں ہے، بلکہ اس کا اپنا مخصوص اسلوب ہے، معانی و بیان کی متداول درسی کتابیں نحو کے قواعد کی روشنی میں لکھی گئی ہیں، اس لیے وہ کلام مجید کے معجزانہ اسلوب بیان کو پوری طرح سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہیں، اسی لیے بعض اوقات ان کو تاویل سے کام لینا پڑتا ہے، عبد القاہر جرجانی کی دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ اس سے مستثنیٰ ہیں، ان میں بڑی حد تک معانی و بیان کے مسائل پر صحیح نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے، ترجمان القرآن مولانا

حمیدالدین فراہیؒ کی نگاہ جن کو اللہ تعالیٰ نے کلام مجید کے فہم کا خاص ملکہ عطا کیا تھا، اس کے اسلوب بیان پر بھی بڑی عمیق تھی، وہ اس پر ایک مستقل کتاب لکھنا چاہتے تھے، اور اس کے متعلق نوٹ اور اشارات قلمبند کیے تھے، جن کو مرتب کرنے کا موقع نہ مل سکا، مگر یہ نوٹ اور اشارات بھی فائدہ سے خالی نہ تھے، اس لئے مولانا بدرالدین صاحب اصلاحی نے ان کو مرتب کرکے اسالیب القرآن کے نام سے شائع کردیا ہے، اگرچہ یہ کوئی مرتب کتاب نہیں ہے، لیکن مصنف کی دوسری کتابوں کی طرح اس میں بھی بڑی جدت وندرت ہے اور اس سے کلام مجید کے اسلوب بیان کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اور اس کا ذوق رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے۔　　دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڈھ سے ملے گی۔

اسلامی علوم کی خدمت میں ہندوستانی مسلمانوں کا قدم کسی اسلامی ملک سے پیچھے نہیں رہا، انکی تصانیف کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے، ان میں ایسی کتابیں بھی ہیں جو ائمۂ اسلام کی تصانیف کے ہم پایہ ہیں، مگر ابن ندیم، کشف الظنون اور مفتاح السعادت کے طرز کی ان کی کوئی فہرست نہیں تھی جس سے پورا ذخیرہ نگاہوں کے سامنے آجائے، مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء نے عربی میں ایک جامع فہرست الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند کے نام سے مرتب کی تھی جو برسوں مسودہ کی شکل میں پڑی رہی، ۱۹۵۸ء میں دمشق کی مشہور اکیڈمی المجمع العلمی نے اس کو شائع کیا، یہ تنہا کتابوں کی فہرست نہیں بلکہ ان علوم، ہندوستان میں انکی آمد، ان کی تعلیم اور اس کے نصاب کی عہد بعہد تبدیلیوں کی تاریخ بھی ہے، جس سے ہندوستانی مسلمانوں کی علمی و تعلیمی تاریخ کا کوئی مورخ بے نیاز نہیں ہو سکتا، لیکن یہ کتاب عربی میں اور ہندوستان میں نایاب ہے، اس لیے دارالمصنفین نے عام افادہ کے لیے اس کا اردو میں ترجمہ شائع کیا ہے،

ضخامت ۴۴۴ صفحے، قیمت:- دس روپئے

مقالات

ہندوستان میں وحدت الوجود کے مسئلہ سے متعلق

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

ہم[1] اس مقالہ میں ہندوستان میں وحدۃ الوجود کے مسئلہ کی نوعیت کو کسی لمبی تمہید کے بغیر پیش کرنا چاہتے ہیں، اس لیے اس میں یہ بحث نہیں آئی ہے کہ وحدت الوجود کی ابتدا کب ہوئی، کن اثرات کی بنا پر یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا، اس کا فلسفہ یہودیت، ہندویت اور عیسائیت کے ذریعہ اسلام میں روشناس ہوا، یا خود اس کا اپنا فلسفہ ہے، اس مقالہ میں صرف یہ دکھانا ہے کہ ہندوستان کے اکابر صوفیائے کرام نے اس کو کس روشنی میں پیش کیا اور یہ کن مدارج سے گذرا،

ہندوستان میں تصوف پر سب سے پہلی کتاب کشف المحجوب لکھی گئی جو شیخ علی ہجویری (المتوفی ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) کی تصنیف ہے۔ یہ اس ملک میں اسلامی تصوف کی انجیل سمجھی جاتی ہے، اور تصوف پر اس سے بہتر کتاب بیان اب تک نہیں لکھی گئی، اس میں وحدت الوجود کی اصطلاح کے ساتھ تو بحث نہیں ملتی لیکن وحدت الوجود کے سلسلہ میں جو بحثیں بعد میں اٹھیں، ان کا مواد اس کتاب میں تلاش کیا جا سکتا ہے،

---

[1] یہ مقالہ آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے چھٹے اجلاس میں جو دار المصنفین میں ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ء میں ہوا، پیش کیا گیا، اس میں مزید اضافہ کر کے معارف میں شائع کیا جا رہا ہے۔

وحدت الوجود کی خاص خاص اصطلاحوں کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو سادے اور عام الفاظ میں اس کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ بندہ اپنے کو فنا کر کے خدا کی ذات میں متحد ہو سکتا ہے، اس میں حلول کر سکتا ہے، اس کے بعد وہ جو کچھ سنتا ہے تو خدا سے، جو کچھ دیکھتا ہے تو خدا کو، کچھ لیتا ہے تو خدا سے اور کچھ کہتا ہے تو خدا سے، اس کو ہر چیز میں خدا ہی خدا نظر آتا ہے، وہ پھولوں کی رنگینی، سبزہ کی شادابی، حسن کی رعنائی، نغمہ کی دلآویزی، دریا کی روانی، سمندر کی طغیانی، سیلاب کی تباہ کاری، زلزلہ کی غارتگری، انسانوں کی تباہی، آبادی کی بربادی وغیرہ سب چیزوں میں خدا ہی خدا دیکھتا ہے، اور اس کی نظر میں خالق، خلق، تخلیق اور مخلوق وغیرہ سب ایک ہیں، وجود یعنی ہستی حقیقی ایک ہے، مگر ایک وجود ظاہر ہے اور ایک باطن، باطن خود ایک نور ہے، جو عالم کے لیے ایک جان کی طرح ہے، اسی نور باطن کا عکس وجود ظاہر ہے، ہر اسم و صفت و فعل جو کہ اس عالم ظاہر میں ہے اُن سب کا اصل وہی وصف باطن ہے، اس کثرت کی حقیقت در اصل وہی وحدت ہے۔

اب اس مقالہ میں یہی دکھانا ہے کہ ہندوستان کے اکابر صوفیائے کرام نے ان دلآویز تخیلات اور تصورات کو کس روشنی میں دیکھا ہے، شیخ علی ہجویری کے یہاں فنا و بقا، جمع و تفرقہ اور حلول و مزج کے جو مباحث ہیں اُن سے ان خیالات کا پتہ چلے گا، جن کا اظہار بعد کے اکابر صوفیہ وحدت الوجود کی اصطلاح کے ساتھ کرتے رہے، شیخ ہجویری فرماتے ہیں کہ صوفیوں میں ایسا گروہ بھی ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ فنا سے اپنی ذات اور وجود کو مٹایا جا سکتا ہے، اور فنا کے بعد بقا حاصل کر کے خدا کی ذات سے اتحاد حاصل کیا جا سکتا ہے، شیخ ہجویری اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انسانی ذات اور وجود کا نیست ہو کر خدا سے متحد ہونا محال ہے، کیونکہ حادث قدیم سے، مصنوع صانع سے، اور مخلوق خالق سے متحد اور ممتزج نہیں ہو سکتا، اگر کوئی فنا حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ شہوات و لذات ترک کر کے خصائص بشریت سے

اس طرح علیحدہ ہو جائے کہ پھر محبت و عداوت، قرب و بعد، وصل و فراق اور صحو و سکر میں اس کو کوئی تمیز باقی نہ رہے، اور جب یہ مقصود حاصل ہو جائے تو یہی بقا ہے۔ (کشف المحجوب بحث فنا و بقا فرقہ خرازی)

حضرت شیخ ہجویریؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ مجاہدہ سے بندہ اگر خداوند تعالیٰ کی تجلیات کو دیکھتا ہے تو وہ اپنے استغراق میں خداوند تعالیٰ کی عنایت اور مہربانی سے سرفراز ہوتا ہے، وہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا ہے کہ اسکی ذات خدا کی ذات میں حلول کر گئی، ایسا دعویٰ کفر اور زندقہ ہے، اور یہ مسلک دین اور توحید کے خلاف ہے، جو کسی حال میں تصوف نہیں کہا جاسکتا، بندہ کی سعادت یہ ہے کہ وہ اپنے استغراق اور مجاہدہ کو ہدایت خداوندی کے پہلو میں نفی کردے۔ (کشف المحجوب بحث جمع و تفرقہ)

شیخ ہجویریؒ نے معرفت الٰہی اور توحید پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ معرفت حاصل کرنے والا بندہ یہ محسوس کرتا ہے کہ مخلوق کی تمام حرکات و سکنات خدا کی طرف سے ہیں، کسی کو خدا کی اجازت کے بغیر اس کے ملک میں تصرف نہیں ہے، ہر چیز کی ذات اس کی ذات سے ہے، ہر چیز کا اثر اس کے اثر سے ہے، ہر شے کی صفت اس کی صفت سے ہے، متحرک اس سے متحرک ہے اور ساکن اس سے ساکن ہے، بندہ کا فعل محض مجازاً ہے، ورنہ درحقیقت وہ فعل خداوند عالم کا ہے، اس طرح اس کا قلب خدا کی دوستی کا محل، آنکھیں اس کے دیدار کا محل اور جان عبرت کا محل ہو جاتا ہے، لیکن ان تمام مدارج کے باوجود بندہ کے دل میں فرمان الٰہی کی تعظیم بڑھتی جاتی ہے، کیونکہ معرفت شوق اور محبت کا نام ہے، شوق اور محبت کی علامت طاعت الٰہی ہے۔ (کشف المحجوب بحث معرفت)

اسی لیے شیخ ہجویریؒ نے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو ہر حال میں ضروری قرار دیا ہے، کیونکہ ان چیزوں سے خوف الٰہی اور بھی زیادہ حاصل ہوتا ہے، مثلاً نماز بندہ کو خدا کے راستہ پر پہنچاتی ہے، اور اس پر اس راہ کے تمام مقامات کھل جاتے ہیں، نماز میں قیام نفس کا مجاہدہ ہے، قرأت ذکر الٰہی ہے، رکوع تواضع ہے، سجدہ نفس کی معرفت ہے، قعدہ محبت کا مقام ہے اور

سلام مقامات سے باہر آتا ہے۔ (کشف المحجوب، ذکر نماز)

روزہ سے نفس میں فتادگی، دل میں عاجزی اور روشنی اور جان میں صفائی پیدا ہوتی ہے، جو معرفت الٰہی کے حصول میں ناگزیر ہیں۔ (کشف المحجوب ذکر روزہ) زکوٰۃ کی حقیقت نعمت کی شکرگذاری ہے، اگر بندہ کے پاس کچھ بھی نہ ہو تو وہ اپنے باطن کو ایک نعمت سمجھے، اسکی زکوٰۃ عرفان حاصل کرنا ہے۔ (کشف المحجوب ذکر زکوٰۃ) اسی طرح حج میں احرام باندھنا، انسانی عادتوں سے علیحدہ ہونا، عرفات میں قیام کرنا، مشاہدہ کا کشف حاصل کرنا، مزدلفہ جانا، نفسانی مرادوں کو ترک کرنا، طواف کرنا، خداوند تعالیٰ کے جمال باکمال کو دیکھنا، صفا اور مروہ میں دوڑنا، دل کی صفائی اور اس میں مروت حاصل کرنا، منیٰ میں آنا، آرزوؤں کو ساقط کرنا۔ قربانی کرنا گویا نفسانی خواہشوں کو ذبح کرنا اور کنکریاں پھینکنا برے ساتھیوں کو دور کرنا ہے۔ (کشف المحجوب ذکر حج) شیخ ہجویریؒ کے بیانات سے یہ ظاہر ہے کہ معرفت الٰہی ہو یا عشق الٰہی ہو، یا درجۂ حقیقت ہو، ہر حال میں شریعت کی پابندی ضروری ہے۔

ہندوستان کے تمام اکابر صوفیہ کا عمل ان ہی تعلیمات پر رہا، اس ملک میں چشتیہ سلسلہ سب سے زیادہ مقبول رہا، اس کے اکابر عبادت الٰہی پر زیادہ زور دیتے رہے، وہ کشتگان خنجر تسلیم بن کر اپنے ہر بنِ موے عشق الٰہی کا اظہار کرنے ہی میں لذت محسوس کرتے لیکن اس عشق الٰہی میں خشیت الٰہی کو معرفت الٰہی کا تنہا ذریعہ سمجھتے رہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ المتوفی ۶۲۷ھ/۱۲۲۹ء فرماتے ہیں کہ عارف عشق الٰہی میں ایسا کھو جاتا ہے کہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اسی کی قدرت کاملہ میں محو اور متحیر رہتا ہے، اور وہ ایک قدم بڑھا کر عرش سے حجاب عظمت اور حجاب عظمت سے حجاب کبریا تک پہنچ جاتا ہے، اور دوسرے قدم میں واپس آجاتا ہے، یہ تو عارف کا کمترین درجہ ہے، ایک عارف کامل کہاں تک پہنچ جاتا ہے، وہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ (دلیل العارفین ص ۹)

لیکن ان مقامات کو حاصل کرنے کے لیے چودہ شرطیں مقرر کی ہیں، ان میں پہلی دو تو بہ اور عبادت ہے، وہ حبِّ رسول پر بھی برابر زور دیتے رہے اور فرماتے افسوس ہے اُس شخص پر جو قیامت کے دن آپ سے شرمندہ ہوگا، اس کی جگہ کہاں ہوگی، جو آپ سے شرمندہ ہوگا، وہ کہاں جائے گا، یہ کہہ کے ہائے ہائے کرکے رونے لگتے۔ (دلیل العارفین مجلس دوم)

خواجگانِ چشت کے ملفوظات میں عشق الٰہی کے جابجا ذکر میں وحدت الوجود کے رموز و نکات تو تلاش کیے جا سکتے ہیں، لیکن وہ ان کی عبادت و ریاضت، توبۂ دل، توبۂ چشم، توبۂ زبان، توبۂ گوش، توبۂ پا، توبۂ نفس، مجاہدۂ نفس، حبِ رسول اور پابندی شریعت وغیرہ کی تعلیمات میں دبے ہوئے ہیں،

آگے چل کر جب عشق الٰہی کا غلبہ زیادہ ہوگیا تو وحدت الوجود پر فلسفیانہ اور عارفانہ بحث ہونے لگی اور سب سے پہلے اس پر علمی بحث حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ، المتوفی ۷۸۲ھ ۱۳۸۰ء کے مکتوبات میں ملتی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مجاہدہ اور ریاضت سے یہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ فاعلِ حقیقی اللہ ہی کی ایک ذات ہے، یہ توحید عارفانہ ہے جس کو مقام ہمہ از دست سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن اس کے بعد مجاہدہ اور ریاضت کی کثرت سے سالک ایسا مستغرق ہوجاتا ہے کہ ساری ہستیاں اس کی نظر میں گم ہوجاتی ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ اور نہیں دیکھتا، اس پر فنائیت طاری رہتی ہے، اس کو فنا فی التوحید یعنی ہمہ اوست کہتے ہیں، فنا فی التوحید کے بعد بھی ایک مقام آتا ہے جس کا نام الفنا عن الفنا ہے، یہاں پہنچکر وہ خدا کے جلال اور جمال میں کوئی تمیز نہیں کرتا ہے، کیونکہ یہ تمیز باقی رہ جاتی ہے تو یہ تفرقہ کی دلیل ہے، عین الجمع اور جمع الجمع کا مقام اسی وقت حاصل ہوتا ہے، جب سالک اپنے اور کل کائنات کو خدا کے دریائے نور میں غرق کر دیتا ہے، اور اس کو خبر نہیں ہوتی ہے کہ کون اور کیا غرق ہوا، اس مقام تفرید میں

پہنچکر سالک کو وحدت الوجود کی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، اور وہ ایسا محو ہو جاتا ہے کہ اس کو اسم و رسم، وجود و عدم، عبارت و اشارت، عرش و فرش اور اثر و خبر سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی ہے، اس مقام کے سوا کہیں اور جلوہ گر نہیں ہوتا، یہاں کے سوا اس کا نشان کہیں اور ظاہر نہیں ہوتا، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے اس کی تاکید خاص طور پر کی ہے کہ توحید وجودی علم کے درجہ میں ہو یا شہود کے ابتدائی درجہ سے انتہائی درجہ میں ہو، ہر درجہ میں بندہ بندہ ہے۔ اس لیے انا الحق و سبحانی (میں خدا ہوں، میں پاک ہوں) کہنا مناسب نہیں کیونکہ

ہر آنکہ در خدا گم شد خدا نیست (مکتوبات سہ صدی ص۹)

وہ حب اللہ میں اتباع شریعت کو لازمی سمجھتے تھے، اسی لیے فرماتے

با شرع بہوش باش و باخدا دیوانہ   با عشق آشنا باش و با عقل بیگانہ

انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ شریعت کے بغیر طریقت صرف ہلاکت ہے، شریعت کے بغیر راہ طریقت میں غرور، جہل، پندار اور حمق پیدا ہو جاتا ہے جس کے بعد شیطان ورغلا کرکے ایمان برباد کر دیتا ہے،

(مکتوبات سہ صدی ص ۶۴)

یہ بھی فرمایا کہ بعض گروہ کا خیال ہے کہ حقیقت کا جب کشف ہو جاتا ہے تو شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، تو ایسے اعتقاد پر لعنت ہو، حقیقت بغیر شریعت کے زندقہ ہے، کتاب، سنت اور اجماع امت کی تقلید ہر حال میں ضروری ہے۔ (مکتوبات سہ صدی ص ۳۷، ۴۲)

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ ہی کے زمانہ میں ایک بزرگ احمد بہاری تھے، جو فیروز شاہ تغلق کے عہد میں بہار سے دہلی آکر سکونت پذیر ہو گئے، فیروز شاہ کا بیان فتوحات فیروز شاہی میں ہے کہ ان کے مریدین دہریے تھے جو احمد بہاری کو خدا سمجھتے اور کہا کرتے کہ دہلی میں خدا طلوع ہوا ہے، اور خود احمد بہاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ باتیں کرتے تھے۔ اسی لیے

فیروز شاہ نے ان کے پاؤں میں زنجیر ڈلوا کر اپنے سامنے بلوایا اور قید کر دیا۔ ان کے مریدین کو اِدھر اُدھر مختلف شہروں میں بھیجکر منتشر کر دیا۔ ان کے ایک دوست شیخ عزّ کاکوی بھی تھے۔ ان پر بھی شطحیات کا الزام آیا۔ (فتوحات فیروز شاہی ص ۸۰ علی گڑھ ایڈیشن)

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ احمد بہاری اور شیخ عزّ کاکوری دونوں قتل کر دیے گئے، جس سے اُن کو بڑا دکھ ہوا۔ وہ دونوں کو توحید کے اسرار و رموز کا واقف کار اور ترک و تجرید کا حامل سمجھتے تھے، اس لیے ان کا خیال تھا کہ ان کی باتوں کو عالمِ دیوانگی پر محمول کرنا چاہیے تھا۔ (مکتوبات بست و ہشت ص ۴۷ - ۳۴۶)

لیکن علمائے ظاہر اس قسم کی توحید وجودی کو پسند نہیں کرتے جس سے دیوانگی پیدا ہو، اور دیوانگی کے بعد گمراہی کے احتمالات اور خطرات بھی پیدا ہو جائیں۔ فیروز شاہی کے عہد میں عین الملک ماہرو کا ایک غلام صوفی بن گیا تھا۔ اس نے اپنے مریدوں کو تاکید کی کہ میں انا الحق کہوں تو تم سب بلند آواز سے توئی توئی کہو۔ اس کو بھی علماء کے فتوے پر سخت سزا دی گئی۔ (فتوحات فیروز شاہی ص ۱۰)

وحدت الوجود کے اسی قسم کے حامیوں کی وجہ سے علمائے ظاہر اس مسئلہ سے بدظن ہوتے گئے۔ اکابر صوفیہ علماء کے اس سوءِ ظن کو دور کرنے میں لگے رہے۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث لطائف اشرفی میں ملتی ہے جس میں چشتیہ سلسلہ کے بزرگ حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ المتوفی ۸۰۸ھ ۱۴۰۵ء کے خیالات بہت ہی مبسوط طریقہ پر پیش کیے گئے ہیں۔ وہ وحدت الوجود کے بڑے حامی تھے لیکن جب وہ اپنی سیاحت کے دوران میں بخارا پہنچے تو ان کو معلوم ہوا کہ وہاں کے علماء و فضلا وحدت وجود کے منکر ہیں۔ ان کو اعتراض تھا کہ اس فلسفہ کے بانی مبانی شیخ ابن العربی نے حق کو وجود مطلق کہا ہے، جو محض ایک رسوائی کی بات ہے، اس سے بہتر تو دہریوں کے عقائد ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں نے شیخ ابن العربی

کے فلسفہ کو سمجھنے میں غلطیاں کی ہیں۔ اسی لیے ان کے عقائد سے بھی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، وہ وحدت کو کثرت میں ثابت کرنا چاہتے تھے یعنی مخلوقات کی کثرت سے وحدت حق میں کوئی زیادتی یا کمی نہیں ہوئی، اس لیے ذات باری کو وجود مطلق قرار دیا، ان کا مقصد محض اثبات وحدانیت اور کمالِ حق کو ظاہر کرنا تھا،

حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے اپنے دعوی کو اس حکایت سے مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے کہ دو بزرگوں میں بحث ہو رہی تھی، تو ایک نے کہا میں اس خدا سے بیزار ہوں جو کتے اور بلی میں ظاہر ہو، دوسرے نے کہا کہ میں اس خدا سے بیزار ہوں جو کتے اور بلی میں ظاہر نہ ہو، حاضرین مجلس نے کہا کہ ان دونوں میں سے ایک تو کافر ضرور ہے، مگر ایک کامل نے توجیہ کی کہ جس شخص نے کتے اور بلی میں خدا کے ظہور سے انکار کیا، وہ ان جانوروں کی ناپاکی کے سبب سے تھا، بس اس کا مقصود خدائے ناقص سے بیزاری ہے، اور جس شخص نے کتے اور بلی میں خدا کے ظہور پر اصرار کیا وہ اس بنیاد پر تھا کہ خدا کا فیض ناقص اور کم نہیں ہو سکتا، بس اس کی بھی بیزاری خدائے ناقص سے ہے، ظاہر ہے کہ ناقص خدا ہونے کے قابل نہیں، لہذا ان دونوں میں سے کوئی خدا سے بیزار نہیں ہے، اور کافر نہیں ہے۔ (لطائف اشرفی جلد دوم لطیفہ ۲۷ و ۱۱)

حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے فلسفیانہ طریقہ پر وحدت کی دو قسمیں بتائی ہیں:

(۱) وحدتِ مطلقہ من حیث الذات والصفات (۲) وحدت مقیدہ من حیث الصفات لا من حیث الذات۔

وحدت مطلقہ میں غیر کا وجود بالکل معدوم ہو جاتا ہے، اور وحدت مقیدہ میں مثل کا وجود معدوم ہو جاتا ہے، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا عقیدہ یہ تھا کہ جو کچھ ہے خدا ہے، ہمہ اوست، اس کو آیاتِ قرآنی سے اور احادیث نبوی سے ثابت بھی کیا ہے، لیکن ان کو یہ خیال رہا کہ اس قسم

کے مباحث میں گمرہی بھی پیدا ہوسکتی ہے، اس لیے اپنی تعلیمات میں اس کی وضاحت کی کہ اولیاء اللہ کی خواہ کوئی قسم بھی ہو، خواہ وہ غوث ہوں یا اوتاد یا ابدال یا اخیار، جو کچھ بھی ہوں وہ فنا فی اللہ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتے، جب تک کہ ظاہراً باطناً، قولاً، فعلاً اور حالاً محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع نہ ہوں۔ (لطائف اشرفی جلد اول ص ۳۵)

وحدتِ وجود کے بہت بڑے حامی حضرت عبدالقدوس گنگوہی (المتوفی ۹۴۳ھ ۱۵۳۷ء) بھی تھے لیکن اس حمایت کے ساتھ ان میں شریعت کی بھی بڑی پابندی تھی، وہ اپنے تقوی میں ان تمام چیزوں سے پرہیز کرتے جن کی شرعی حیثیت ذرہ بھی مشکوک ہوتی، وہ ایسے قصابوں کا ذبیحہ نہ کھاتے تھے، جو نمازی نہ ہوتے تھے، اسی کے ساتھ ان پر اس کا اتنا غلبہ ہوا کہ وہ اس کو جزو ایمان سمجھنے لگے، اسی غلبہ میں وہ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:-

"یہ کیسا شور ہے اور کیسا غوغا پھیلا ہوا ہے کہ کوئی مومن ہے، کوئی کافر ہے، کوئی اطاعت کرنے والا ہے، کوئی گنہ گار ہے، کوئی صحیح راستہ پر ہے، کوئی غلط راہ پر چل رہا ہے، کوئی مسلم ہے کوئی پارسا ہے، کوئی ملحد ہے کوئی ترسا ہے، سب ایک ہی لڑی کے موتی ہیں"۔

(مکتوبات عبدالقدوس گنگوہی ص ۴۵)

ان فقروں میں انسانی محبت، اخوت اور وحدت کا بڑا درد بھرا ہوا ہے لیکن راہ سلوک کی منزلوں کو طے کرکے جس مقام پر حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ پہنچ گئے تھے، وہاں سے یہ درد بھری آواز نکل کر فضا میں گونجی، تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی، حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کی طرح ایسی صدا اٹھانے والے وحدت الوجود کے حامیوں کو پہلے ان ہی کی طرح کتاب، سنت اور شریعت کا پابند بھی ہونا چاہیے،

لیکن اس کے باوجود حضرت عبدالقدوسؒ کو یہ خیال رہا کہ اس قسم کی باتوں کا اظہار

مناسب نہیں، اپنے رسالہ غرائب الفوائد میں لکھتے ہیں :-

"اہل شریعت کے نزدیک خداوند تعالیٰ اور عالم کی نسبت وہی ہے جو کاتب اور حروف و کلمات کی ہوتی ہے، اہل حکمت کے نزدیک یہ نسبت وہی ہے جو تخم کی نسبت درخت سے ہوتی ہے لیکن اہل وحدت کے نزدیک یہ نسبت وہی ہے جو سیاہی کی نسبت حروف سے ہوتی ہے، حروف سیاہی سے نکلتے ہیں، بلکہ یہ عین سیاہی ہیں، لیکن حروف کو سیاہی نہیں کہیں گے، اگر کوئی ایسا کہتا ہے تو یہ اُس کی غلطی کہی جائے گی. کیونکہ ان کی ظاہری شکل و صورت مختلف ہے لیکن یہ دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے کہ حروف درحقیقت عین سیاہی ہیں، دیکھ کر سمجھنا تو درست ہے لیکن زبان شرع کی غلام ہے. زبان پر وہی بات لانی چاہیے جو شرع کے مطابق ہے، دل حق کا غلام ہے جو حقیقت ہے، اس کو جاننا چاہیے لیکن کہنا نہ چاہیے، جو چیز دانستنی اور دیدنی ہے، وہ گفتنی نہیں ہے، اگر کوئی کہدے تو یہ کفر ہوگا، کیونکہ یہ ربوبیت کے راز کا افشاء کرنا ہے، اور ربوبیت کے راز کا افشا کرنا کفر ہے. وحدت کا راز یہ ہے کہ سالک صفائی حاصل کرے اور مقام فنا میں پہنچ جائے، اور اپنے اور کل کائنات کو نہ دیکھے، اس کے مشاہدہ میں حق کے سوا کچھ اور نہ ہو، لیکن اگر وہ پھر اپنے آپے میں ہو جائے اور اس راز کو ظاہر کرے تو یہ سب کے نزدیک کفر ہوگا. وہ اپنے حال کے غلبہ اور نور شہود کے سطوت سے مغلوب ہو جاتا ہے اور اپنے آپے میں نہیں رہتا ہے، اسوقت وہ معذور ہو جاتا ہے ، اس وقت وہ جو کچھ کہے اس کی گرفت نہ کی جائے ،

ہرچہ از دیوانہ آید در وجود عفو فرمایند از دیوانہ زود"

لیکن کچھ صوفیہ ایسے بھی ہیں جنھوں نے اس دیوانگی کے جذب و کیفیت کو مستقل ایک مسلک بنا کر تصوف کا رخ ہی موڑ دینے کی کوشش کی. وہ کہتے ہیں کہ جب ہم وحدت سے نکل کر کثرت میں آتے ہیں اور کثرت سے وحدت میں گم ہو جائیں گے تو عذاب و ثواب کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس طرح وہ مذہب وملت، خیروشر، ایمان وکفر کی تفریق مٹا دینے کی کوشش کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جب وہ وحدت میں گم ہو جاتے ہیں تو انا الحق کا نعرہ لگاتے ہیں، ایسی حالت میں اگر ان کے مریدین ان کو سجدہ کریں تو ناجائز نہیں، اسی افراتفری میں وہ حسین وجمیل صورتوں کو پسند کرتے اور کہتے کہ حسن وجمال واجب الوجود سے مستعار ہے، اسی لیے حسینوں کی صحبت رسائی حق کی راہ ہے، وہ سادہ رخوں کے رنگ میں اللہ ہی کے ایسا رنگ دیکھتے، حسینوں کے غمزوں اور عشووں کے ذریعہ مجازی عشق سے عشق حقیقی تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے،

حضرت عبد القدوسؒ اس افراتفری کو پسند نہیں کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کی ذات میں تو وحدت ہے، لیکن اس کی صفات میں کثرت ہے، اس کثرت میں تضاد بھی پیدا ہو سکتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ ہادی بھی ہے اور مضل بھی ہے، اس میں جمال بھی ہے اور جلال بھی، ہادی کی حیثیت سے وہ ہدایت کر سکتا ہے، اور مضل کی حیثیت سے ضلالت کی راہ پر ڈال سکتا ہے، اس کے جمال کے مظاہرے خیر وثواب ہیں، اور جلال کے مظاہرے سزا وعذاب ہیں، لیکن اس صفات کی کثرت سے اس کے وجود کی وحدت میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، (غرائب الفوائد ص ۴۲)

مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو وحدت الوجود کے ساتھ کفر واسلام، امر ونہی، ثواب وعذاب، لطف وقہر اور نبوت کے قائل ہیں، وہ تو صوفیہ ہیں اور جو ان چیزوں کے قائل نہیں ہیں وہ سوفسطائیہ ہیں، (غرائب الفوائد ص ۴۴)

علماء سوفسطائیوں کو بالکل خارج از اسلام سمجھتے اور وحدت لا الہ الا اللہ کے ماننے والے کو مسلمان سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، جب تک کہ وہ محمد رسول اللہ کے بھی قائل نہ ہوتے، وہ توحید اور رسالت دونوں پر یقین کامل رکھنے ہی میں عقیدہ اور ایمان کی سلامتی سمجھتے اور کہتے کہ صوری اور معنوی اخلاق کی درستگی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ سرورِ عالم

صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل متابعت نہ ہو۔ اسی متابعت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی قربت کا حاصل ہونا ممکن ہے۔ وہ انا الحق کے کہنے والوں کو مرتد و بے دین سمجھتے، اسی لیے ان کے خلاف ہنگامہ کرتے اور سلاطینِ وقت سے مل کر ان کو قتل یا جلا وطن کروا دیتے۔

علما، کبیر داس کی تعلیمات سے بھی چوکنا ہوئے، جو وحدت الوجود کے بہت بڑے علمبردار تھے، کبیر کہتے کہ خالق مخلوق میں ہے، اور مخلوق خالق ہے، یہ دونوں الگ الگ نہیں ہیں، اودیا اور اگیان نے دوئی کا پردہ ڈال رکھا ہے، اگر جہالت کے بادل چھٹ جائیں اور اہنکار (خودی) کی تاریکی دور ہو جائے تو چشم بینا کو ہمہ اوست کی حقیقت نظر آنے لگے۔ کہتے ہیں:۔

کھالک کھلک میں کھالک

سب گھٹ رہو سمائے

(خالق ہے خلق میں اور خلق ہے خالق میں، سبھوں میں وہ سمایا ہوا ہے)

کبیر داس کی ہمہ اوست کی تعلیم کچھ ایسی دل آویز تھی کہ ایک مذہبی گروہ کبیر پنتھی کے نام سے قائم ہو گیا جس کا مسلک یہ تھا کہ نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان،

کہے کبیر اک رام جپو رے ہندو ترک نہ کوئی

ظاہر ہے کہ علما، ایسے مسلک کو کسی حال میں پسند نہیں کر سکتے تھے، جس میں نہ کوئی ہندو رہے، نہ مسلمان۔

آگے چل کر اکبر کا دین الٰہی بھی وحدت الوجود ہی کا کرشمہ تھا جس کی تعلیم و تلقین سے نہ صرف علما بلکہ مسلمان خواص و عوام بھی چیخ اٹھے، اور اکبر سے برگشتہ ہو گئے، وحدت الوجود کے ایسے حامیوں کے نمونے دیکھ کر علما، وحدت الوجود کے منکر ہو جاتے اور اس کو کفر اور مذہبی انارکی سمجھنے لگے۔

لیکن ایسے اسلامی مفکرین جو علماء اور صوفیہ دونوں کی صفوں میں شامل تھے، وحدت الوجود کو کفر اور رسوائی سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے، خصوصاً جب ان کے سامنے حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ اور حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے نمونے موجود تھے، جو عملی طور پر شریعت کی پابندی میں سر مو تجاوز کرنا پسند نہ کرتے، اور اسی کے ساتھ وحدت الوجود کے بھی قائل رہے،

خود حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ (المتوفی ۱۶۲۴ء) شروع میں توحید وجودی کے قائل تھے، اور انھوں نے یہ دو بیت اپنے مرشد حضرت خواجہ عبید اللہؒ کو لکھ بھیجے تھے۔

اے دریغا کیں شریعت ملت اعمائی است	ملت ما کافری و ملت ترسائی است

کفر و ایماں زلف و روئے آں پری زیبائی است	کفر و ایماں ہر دو اندر راہ ما یکتائی است

لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ بیت سراسر حالتِ سکر میں قلبند ہوئے تھے، چند مدتوں تک قائم رہی لیکن بعد میں ان کو معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کسی چیز سے متحد نہیں ہے، خدا خدا ہے اور عالم عالم، حق تعالیٰ بے چون و بے چگون ہے، بیچون کو چوں کا عین نہیں کر سکتے، واجب ممکن کا عین اور قدیم حادث کا عین ہرگز نہیں ہو سکتا، اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ توحید وجودی کے مشرب کے مخالف علوم و معارف کے حاصل ہونے کے وقت یہ فقیر بہت بیقرار رہا کیونکہ اس توحید سے بڑھ کر اور کوئی اعلیٰ امر نہ جانتا تھا، اور عاجزی و زاری سے دعا کرتا تھا کہ یہ معرفت زائل نہ ہو جائے، لیکن رفتہ رفتہ سارے حجابات سامنے سے زائل ہو گئے، اور کما حقہ حقیقت منکشف ہو گئی اور معلوم ہوا کہ عالم ہرچند صفاتی کمالات کا آئینہ اور اسمائے ظہورات کا جلوہ گاہ ہے لیکن مظہر ظاہر کا عین اور ظل اصل کا عین نہیں، جیسا کہ توحید وجودی کا مذہب ہے، پھر وہ یہ لکھتے ہیں کہ محبوب کے سوا کچھ نہ دکھائی دینا تو یہ محبت کا غلبہ ہے، لیکن یہ حقیقت نہیں ہے (مکتوب نمبر ۳۱ جلد اول)

حضرت مجدد کے خیالات کا خلاصہ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ جس مقام پر صوفیوں کو وحدت وجود محسوس ہوتی ہے وہ سلوک کی آخری منزل نہیں بلکہ درمیانی منزلوں کی واردات ہیں، جہاں سالک کو محسوس ہوتا ہے کہ وجود ایک ہے، اس ایک ذات کے سوا کچھ موجود نہیں، لیکن جب وہ اس منزل سے آگے بڑھتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض وحدت شہود ہے یعنی اس کو ایسا نظر آتا ہے، وحدت وجود نہیں یعنی واقع میں ایسا نہیں ہے، اس وحدت شہود کے مقام کے بعد عبدیت کا مقام آتا ہے، جہاں خالق اور مخلوق کی جداگانہ حقیقتیں روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہیں۔

ان ہی باتوں کو حضرت مجددؒ نے مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے، فرماتے ہیں کہ توحید وجودی علم الیقین ہے، اور توحید شہودی عین الیقین ہے، مثلاً کسی کو آفتاب کا علم ہے تو یہ علم ستاروں کے وجود کو بے وجود نہیں کر سکتا، اور جو عین آفتاب کو دیکھتا ہے اس کی نگاہ حق الیقین میں بھی ستاروں کا وجود نیست و نابود ہو جانا ضروری نہیں، مقام عین الیقین سے حق الیقین میں پہنچنا کوئی تضاد نہیں اور یہ عین علم شریعت ہے، (مکتوبات امام ربانی جلد اول نمبر ۴۳)

حضرت مجدد الف ثانیؒ سے ان کے ایک مرید نے پوچھا کہ صوفیہ وحدت وجود کے قائل ہیں، اور علماء اس کو کفر و زندقہ جانتے ہیں، اس معاملہ کی حقیقت کیا ہے، اس کے جواب میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے توحید وجودی کے ماننے والوں کے خیالات کی تردید نہیں کی ہے، بلکہ ان کے تصورات کی وضاحت بڑی خوبی سے کی ہے، فرماتے ہیں کہ جو لوگ وحدت وجود کے قائل ہیں اور اشیاء کو عین حق جانتے ہیں اور ہمہ اوست کہتے ہیں، اس سے ان کی یہ مراد نہیں کہ اشیاء حق تعالیٰ کے ساتھ متحد ہیں، اگر ان میں سے کوئی ایسا سمجھتا ہے تو یہ کفر، الحاد، زندقہ اور گمراہی ہے، کیونکہ واجب ممکن نہیں ہو سکتا اور ممکن واجب نہیں ہو سکتا، ہمہ اوست کے معنی یہ ہیں کہ اشیاء نہیں ہیں حق تعالیٰ موجود ہے، منصور نے

جو انا الحق کہا اس کی مراد یہ نہیں کہ میں حق ہوں اور حق کے ساتھ متحد ہوں ، یہ کہنا کفر ہے، اور اس سے قتل واجب ہو جاتا ہے، منصور کے قول کے یہ معنی ہیں کہ میں نہیں ہوں حق تعالیٰ موجود ہے' صوفیہ در اصل اشیاء کو حق تعالیٰ کے ظہورات جانتے ہیں، اور ان کو حق تعالیٰ کے اسماء اور صفات سمجھتے ہیں، اشیاء حق تعالیٰ سے وہی نسبت رکھتے ہیں جو آدمی کے ساتھ اس کا سایہ رکھتا ہے، کسی آدمی کے سایہ کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آدمی کے ساتھ متحد ہے، سایہ آدمی کی اصل کو بدلتا نہیں ہے، وہ محض آدمی کا ظہور ہے، اسی طرح صوفیہ کے نزدیک اشیاء حق تعالیٰ کے ظہورات ہیں نہ کہ عین حق ہیں ، اسی لیے ہمہ اوست کے معنی ہمہ از وست ہیں، جیسے سایہ آدمی سے ہے نہ کہ عین آدمی ہے، ہمہ از وست کو علماء بھی تسلیم کرتے ہیں، اس صورت میں صوفیہ اور علماء میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا، (مکتوبات امام ربانی ج ۲ نمبر ۴۴)

ان مباحث سے اندازہ ہوگا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ بنیادی طور پر وحدت الوجود کے منکر نہیں، اس کی غلط تعبیر کو غلط سمجھتے ہیں، اسی لیے انھوں نے غلط تعبیر کی غلطیوں کو واضح کرنے کی کوشش کی، انھوں نے شیخ ابن عربی کے بعض خیالات سے اختلاف ضرور کیا ہے' مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں، شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متبعین کہتے ہیں کہ اسماء وصفات حق تعالیٰ کے عین ذات ہیں، اسی لیے ذات وصفات کو ایک سمجھ کر وہ ہمہ اوست کے قائل ہیں ، لیکن حضرت مجدد ذات وصفات کے حلول و اتحاد کے قائل نہیں، وہ اسماء وصفات کو خالق کا مخلوق قرار دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جب کسی شخص کے سایہ کو عین شخص نہیں کہہ سکتے تو مخلوق کو خالق کے ساتھ کیسے ملا سکتے ہیں، یا مخلوق کا خالق کے ساتھ حلول و اتحاد کیسے قائم کر سکتے ہیں، ذات قدیم ہے، صفات حادث ہیں، قدیم اور حادث دونوں ایک کیسے ہو سکتے ہیں ، خالق واجب ہے اور مخلوق ممکن ہے، واجب اور ممکن دونوں کو ایک کہنا حق سے بہت دور ہے

خالق باقی ہے، مخلوق فانی ہے، دونوں کو ایک جاننا نادانی ہے۔ (جلد دوم مکتوب نمبر۱)

اسی خط میں وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ واجب سراسر خیر ہے، اور ممکن ہر نقصان و شر سے پر ہے، اس لیے خیر و شر کا لا ثانی ہونا صحیح نہیں،

وہ رسول اللہ کی محبت میں سرشار رہے لیکن وہ آپ کو حادث اور ممکن ہی سمجھتے رہے، اور آپ کو ذات واجب الوجود اور مقام الوہیت میں شریک دار بنانے کے بالکل قائل نہیں، چنانچہ لکھتے ہیں کہ شیخ محی الدین ابن عربی نے حقیقت محمدی اور تمام حقائق کو اعیان ثابت کیا ہے تو میں نہیں جانتا کہ ان کو وجوب کا حکم کیسے دیا، ان کا یہ کہنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم کے خلاف ہے،

وہ ایک دوسرے مکتوب (جلد دوم نمبر ۵۴) میں پھر لکھتے ہیں کہ ذات صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے، اس کی ذات سے صفات اور تمام عالم قائم ہیں، اسی سلسلہ میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے جو یہ کہا ہے کہ تمام عالم آن واحد میں معدوم ہو جاتا ہے اور آن واحد میں موجود ہو جاتا ہے، تو یہ حال شہودی ہے، جو سلوک کی راہ میں پیش آتا ہے، سالک جب لوازم فنا صادر ہوتے ہیں تو اسکے علم میں جہان نیست و نابود ہو جاتا ہے، اور جب وقت حالت فنا دور ہو جاتی ہے تو عالم کو موجود پاتا ہے، جب فنا کمال کو پہنچ جاتی ہے تو کل عالم اور ذات حق کو باقی پاتا ہے، اور پھر جب وہ مقام فنا سے مقام بقا میں آتا ہے تو پھر وجود عالم بھی دیکھتا ہے اور کبھی معدوم پاتا ہے، اور جب مقام بقا کی تکمیل ہو جاتی ہے تو تمام عالم کو ظل قائم پاتا ہے، یہ فنا و بقا خود سالک کے علم کی فنا و بقا ہے، اور نہ حقیقۃً جہان کی یعنی وہ محسوس کرتا رہتا ہے، ممکن مع اپنے اجزا کے ممکن ہے، ممکن کی حقیقت کے لیے کبھی وجوبی تعین ہو سکتا، اللہ تعالیٰ شیخ محی الدین رحمۃ اللہ علیہ کو معاف فرمائے کہ انھوں نے ممکن کو بھی قدیم لیا ہے، اصل میں اللہ تعالیٰ کا کوئی ظل نہیں، کیونکہ ظل سے مثل پیدا ہونے کا وہم ہوتا ہے۔
(دفتر سوم مکتوب نمبر ۱۳۲)

حضرت مجدد، شیخ ابن عربی سے اختلاف ضرور کرتے ہیں لیکن ان کے ذکر میں ادب کا لحاظ رکھتے ہیں، ان کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ بھی لکھتے ہیں، بلکہ ایک مکتوب میں ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مسئلۂ توحید متقدمین صوفیہ میں صاف اور واضح نہیں ہوا۔ ان میں جو کوئی مغلوب الحال ہو جاتا تھا، اس سے اتحاد نما توحیدی کلمات سرزد ہو جاتے تھے، اور غلبۂ سکر کے باعث اسکے سرکو نہ پا سکتے تھے، اور حلول و اتحاد کی آمیزش کو پھیر نہ سکتے تھے، جب شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ تک نوبت پہنچی تو انھوں نے کمال معرفت سے اس دقیق مسئلہ کی شرح کی، اس کو بابوں اور فصلوں میں تقسیم کرکے صرف و نحو کی طرح جمع کیا، اس کے باوجود اس طائفہ میں کچھ لوگوں نے ان کی مراد کو نہ سمجھ کر اس کو ان کی خطا قرار دیا، اور ان پر طعن و ملامت کی لیکن اس مسئلہ کی اکثر تحقیقات میں شیخ حق پر ہیں، اور ان پر طعنہ کرنے والے دور از صواب ہیں، اس مسئلہ کی تحقیق سے شیخ کی بزرگی اور ان کے علم کی زیادتی معلوم ہوتی ہے، ان کا رد نہ کرنا چاہیے اور نہ ان پر طعن کرنا چاہیے۔" (مکتوبات جلد سوم نمبر ۸۹)

حضرت مجدد الف ثانیؒ نفس وحدت الوجود کے مسئلہ سے نہیں بلکہ اس کے ان مدارج سے اختلاف کرتے ہیں جن میں شریعت کا دامن چھوٹ جانے کا احتمال یا خطرہ پیدا ہوتا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک اصل چیز شریعت ہے، وہ ایسے تصوف کو ضلالت سے تعبیر کرتے جس میں شریعت کی خلاف ورزی ہوتی، اور ایسے احوال و کیفیات کو جو نامشروع طریقے پر مترتب ہوتے ہیں، استدراج کہتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ شریعت کو اپنی جگہ پر قائم رکھ کر حقیقت کو طلب کرنا بہادروں کا کام ہے، (جلد اول مکتوب ۴۳)

حضرت مجددؒ کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے علماء کو تو یہ سمجھایا کہ اگر وحدت الوجود کی تصریح صحیح طور پر کی جائے، تو یہ گمراہی نہیں، اور صوفیہ کو یہ سمجھایا کہ اگر علوم لدنیہ کی مطابقت علوم شرعیہ

سے نہیں، تو ایسے تمام علوم کا حاصل کرنا الحاد اور بے دینی ہے، جو شخص باطن کو درست کرتا ہے اور ظاہر کو یوں ہی چھوڑ دیتا ہے، تو وہ قابلِ تقلید نہیں، اور جو عارف شرعی احکام کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتا وہ جاہل ہے۔ (جلد اول، مکتوب ۳۴-۳۵، ۳۶، ۳۸، ۴۰، ۴۱)

شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ (المتوفی ۱۰۵۸ھ) بھی وحدت الوجود کے قائل تھے، انھوں نے شیخ ابن عربی کی فصوص الحکم کی شرحیں فارسی اور عربی دونوں میں لکھیں، اس میں وہ لکھتے ہیں کہ شیخ ابن عربی شریعت محمدی کے پابند رہے، کیونکہ شیخ ابن عربی فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ مجھکو اُن لوگوں میں شامل کرے جن کے قدموں کو امواج شریعت مطہر محمدی نے زنجیروں میں مقید کر رکھا ہے، اور وہ کسی حال میں شریعت سے باہر نہیں ہوتے ہیں، اس قول کو نقل کرکے شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ قدس سرہٗ کے اس قول سے ظاہر ہے کہ وہ شریعت کی خلاف ورزی نہیں کرتے تھے، اور نہ کوئی بات اس کے خلاف کہی ہے، فصوص الحکم میں بھی انھوں نے کوئی بات شریعت کے خلاف نہیں کہی ہے، اگر کوئی محجوب اس سے واقف نہیں ہے اور وہ اسکے سمجھنے سے محروم رہتا ہے تو

محجوب راز شیخ چراغ نصیب نیست

پھر شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے سمعاً و طاعۃً شریعت کو قبول کیا ہے اور دوسروں کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رتبہ، جلال اور کمال کو بتاکر شریعت کی طہارت و پاکیزگی سے آگاہ کیا ہے، اور ان کو خبث نفس اور خواہشاتِ نفسانی سے نجات دلائی ہے۔ (افادات شاہ محب اللہ الہ آبادی، الہ آباد اڈیشن ص ۱۷-۲۰)

خود شیخ محب اللہ الہ آبادی شریعت کے بڑے پابند رہے، ان کا شمار صرف صوفیہ کے گروہ ہی میں نہیں، بلکہ جید علماء میں بھی کیا جاتا ہے، چنانچہ تذکرۂ علمائے ہند کے مصنف نے لکھا ہے کہ

"دانشمند تبحر از مشاہیر علمائے صوفیہ در علوم ظاہر و باطن نخل اشتال و اقران خود بود" (۱)

مآثر الامرا کے مصنف نے بھی ان کے بارے میں لکھا ہے کہ

عالم است تعلیم ظاہر و باطن

لیکن علمائے ظاہر مسئلۂ وجود کو شک کی نظر سے دیکھنے کے عادی تھے۔ اس لیے شیخ محب اللہ الٰہ آبادی کے رسالہ تسویہ کی بعض عبارتوں پر معترض ہوئے، ان کے وصال کے بعد اورنگزیب عالمگیر کی توجہ ایسی عبارتوں کی طرف دلائی گئی جو اسلامی عقائد کے خلاف تھیں، شیخ محب اللہ کے دو مرید پایہ تخت دہلی میں موجود تھے، ان ہی میں ایک شیخ محمدی تھے، اورنگزیب نے ان کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر آپ شیخ محب اللہ الٰہ آبادی کی مریدی کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان کے رسالہ کے مقدمات کو شرعی احکام کے مطابق بنائیں، ورنہ ان کی مریدی سے استغفار کریں اور کتاب کو آگ میں ڈال دیں، شیخ محمدی نے جواب دیا کہ مجھکو حضرت شیخ کی مریدی سے استغفار کی ضرورت نہیں لیکن جس مقام سے شیخ نے گفتگو کی ہے، مجھے وہاں تک رسائی حاصل نہیں، جس وقت میں اس رتبہ پر پہنچ جاؤں گا تو آپ کے کہنے کے بموجب اس کی شرح لکھ بھیجوں گا۔ اگر آپ نے اس رسالہ کو جلانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اس فقیر کے گھر سے کہیں زیادہ شاہی مطبخ میں آگ موجود ہے۔ اورنگزیب اس جواب کو سنکر خاموش ہو گیا، (مآثر الامراء جلد سوم ص ۶۰۷-۶۰۶)

داراشکوہ شیخ محب اللہ الٰہ آبادی کا بڑا معتقد رہا، اور انھوں نے اس کو یہ نصیحت کی تھی کہ رفاہیت خلق خدا کے بارے میں حکام کو تفریق نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ مومن کافر سب ہی خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں، یہ ایک نصیحت ہے، جس کا تعلق مذہبی عقیدہ یا توحید وجودی سے نہیں، لیکن داراشکوہ نے توحید وجودی کو ایک دوسرے رنگ میں پیش کرنا شروع کیا، اس نے اپنے رسالہ حسنات العارفین میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ توحید معرفت کے منازل و مدارج

میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جبکہ ایک سالک شریعت، کفر، ایمان، خیروشر، عبد ومعبود سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے، اور بے خودی میں اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہیں، یا اس سے ایسے حرکات سرزد ہوتے ہیں جو بظاہر شریعت و ایمان کے منافی ہوتے ہیں، لیکن وہ قابلِ مواخذ نہیں، حضرت عبدالقدوس گنگوہی کے یہاں بھی اسی قسم کے بیانات کا ذکر پہلے آچکا ہے لیکن دارا بھی کی طرح شریعت کا پابند ہو کر اپنی زندگی گذار دیتا تو شاید وہ بھی اولیاء اللہ میں شمار کر لیا جاتا، لیکن اس نے وحدت الوجود ہی کے نشہ میں سرشار ہو کر اپنے کو بشسٹ اور رام چندر کا چیلہ قرار دیکر اسلام اور ہندو مذہب کا ایک مجمع البحرین تیار کرنے کی کوشش کی ظاہر ہے کہ وہ علماء جو کتاب وسنت کی جامد تقلید کے قائل ہیں، ایسی باتوں کو کسی حال میں پسند نہیں کر سکتے ہیں۔

حضرت سرمد (المتوفی ۱۰۶۹ھ ۱۶۵۸ء) کی ذات میں بڑی دلآویزی ہے، ان کی رباعیاں آج بھی شوق سے پڑھی جاتی ہیں، وہ بھی وحدت الوجود کے قائل تھے، وہ جب کلمہ پڑھتے تو اس کا صرف ایک جزء یعنی لاالٰہ پڑھتے تھے اور علماء معترض ہوئے، ان کو اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں طلب کر کے کلمہ پڑھنے کو کہا گیا، تو حسب عادت صرف ایک جزء یعنی لاالٰہ پڑھا، جب اس کا دوسرا جزء محمد رسول اللہ پڑھنے کو کہا گیا تو انھوں نے کہا کہ میں ابھی نفی میں مستغرق ہوں، مرتبۂ اثبات پر نہیں پہنچا ہوں، پھر جھوٹ کیسے کہوں، علماء نے کہا، ایسا کہنا کفر ہے، اگر کہنے والا توبہ نہ کرے تو واجب القتل ہے، اور ان کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا گیا، علماء کا خیال ہے کہ اگر محمد رسول اللہ سے کسی کو انکار ہے تو وہ اسلام کی بنیاد پر ضرب کاری لگاتا ہے، اسی لیے وہ وحدت الوجود کے حامیوں سے بدظن رہے کہ ان سے کتاب وسنت کا دامن چھوٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

عالمگیری عہد میں برہان پور میں ایک بزرگ شیخ برہان تھے، ان کے مریدین وحدت الوجود کے نشہ میں سرشار ہو کر ان کو خدا کہتے رہتے، لیکن شیخ برہان عالم باعمل تھے، اس لیے وہ اپنے

ایسے مریدوں کو فاسد سمجھتے، ان کو توبہ کرنے کو کہتے، ان پر شرعی احکام جاری کرتے، اور وہ توبہ کر کے باز نہ آتے تو شریعت کے بموجب ان کو قتل کرا دیتے۔ (منتخب اللباب جلد ۲ ص ۵۵۴)

علما، وحدت الوجود کے ایسے حامیوں پر لعنت بھیجتے، اور اس مسئلہ کا روشن پہلو بھی سننے کیلئے تیار نہ ہوتے، شاہ ولی اللہ کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم (المتوفی ۱۱۳۱ھ ۱۷۱۸ء) بھی وحدت الوجود کے حامی تھے، انھوں نے فصوص الحکم کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اور اس کو قرآنی آیتوں اور حدیثوں کے مطابق قرار دیتے تھے، لیکن یہ بھی فرماتے کہ اس مسئلہ کو جو لوگ صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے ہیں، وہ الحاد و زندقہ کے بھنور میں ڈوب جاتے ہیں، اور وہ کسی حال میں یہ پسند نہ کرتے کہ وحدت الوجود کے قائل ہونے کے بعد شریعت کی پابندی نہ کیجائے، اور خود انھوں نے اس کا عملی نمونہ بھی پیش کیا، شریعت محمدی کا اتباع انکی جبلی عادت ہو گئی تھی، انکی نماز با جماعت فوت نہیں ہوئی، اللہ اور اس کے رسول کا دامن ہر شکل میں تھامے رہتے۔ (انفاس العارفین)

شاہ ولی اللہ (المتوفی ۱۱۷۶ھ ۱۷۶۲ء) نے اپنے والد بزرگوار کے خیالات سے متاثر ہو کر وجود و شہود پر بڑی اچھی بحث کی ہے، جس میں یہ بتایا ہے کہ شیخ محی الدین ابن اکبر کا وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کا وحدت الشہود ایک ہی شے کے دو نام ہیں، وجود و شہود محض نزاع لفظی ہے، ان میں مطابقت ہے، مخالفت نہیں، شاہ ولی اللہ اپنے مکتوب مدنی میں وحدت الوجود اور وحدت شہود کو پہلے اس طرح سمجھاتے ہیں (ماخوذ از مکتوب مدنی شائع کردہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور)

وحدت وجود اور وحدت شہود دو لفظ ہیں جن کا اطلاق در اصل مختلف معانی پر ہوتا ہے کبھی ان کا استعمال سیر الی اللہ کے مباحث میں ہوتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں سالک وحدت الوجود کے مقام پر فائز ہے اور فلاں وحدت شہود پر جاگزیں ہے، اس سیاق میں وحدت الوجود کے معنی ایسے شخص کے ہوں گے جو حقیقت وجات کی تلاش و عرفان میں گم اور مستغرق ہو، استغراق کا یہ وہ مقام ہے، جہاں یہ عالم رنگ و بو اپنے تمام امتیازات کے ساتھ فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے،

اور تفرقہ و امتیاز کے وہ سارے احکام ساقط ہو جاتے ہیں کہ جن پر خیر و شر کی معرفت کا دار و مدار ہے اور شرع و عقل جن کی پوری پوری نشاندہی کرتی ہے، سیر و سلوک کا یہ مقام محض عارضی ہوتا ہے، سالک چندے یہاں ٹھہرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی دستگیری اور توفیق اس کو جلد ہی اس مقام سے نکال لے جاتی ہے، اس طرح وحدت شہود کے معنی اس سیاق میں یہ ہوں گے کہ سالک ایسے مقام پر متمکن ہے جہاں احکام جمع و تفرقہ کے ڈانڈے باہم ملے ہوتے ہیں، یعنی سالک اس حقیقت کو پا لینے میں کامیاب ہو گیا ہے کہ اشیاء میں جو وحدت سی نظر آتی ہے من وجہٍ ہے اور کثرت جو اس کے متبائن محسوس ہوتی ہی ہے، وہ بھی من وجہٍ ہے، معرفت و سلوک کا یہ مقام پہلے مقام سے نسبتہً زیادہ اونچا ہے،

اس کے بعد شاہ ولی اللہ اس کی بحث کرتے ہیں کہ آخر وحدت وجود اور وحدت شہود میں قدیم و حادث کا ربط و تعلق کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ وحدت وجود کے ماننے والے تو یہ کہتے ہیں کہ اس عالم کی تہ میں ایک ہی حقیقت جاری و ساری ہے، مثلاً موم سے انسان، گھوڑے اور گدھے کی صورتیں بنائی جائیں تو یہ سب اگرچہ رنگ و روپ میں مختلف ہوں، مگر اصل کے لحاظ سے ایک ہی قرار دیا جائے گا۔ وحدت شہود کے ماننے والے اس عالم کو خداوند تعالیٰ کی صفات کا عکس اور سایہ سمجھتے ہیں، جو اس کے آئینہ میں ارتسام پذیر ہوتے ہیں، اس کے بعد شاہ ولی اللہ یہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ وحدت شہود کی اس توجیہ کی تائید شیخ ابن العربی کے اقوال سے نہیں ہو پاتی لیکن شاہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ سراسر سہو ہے، وحدت شہود کے ماننے والے وجود حقیقی کے ساتھ وجود امکانی کو بھی تسلیم کرتے ہیں، اور وحدت وجود کے ماننے والے وجود حقیقی کے قائل ہیں، وجود امکانی میں ضعف اور نقص ہوتا ہے اور وجود حقیقی کامل اور قوی ہے اس لیے وجود امکانی عدم ہو کر وجود حقیقی کا جز ہو جاتا ہے، پھر یہ کہنا کہ حقائق ممکنات در اصل

عکوس و ظلال ہیں جو اعدام متقابلہ میں ارتسام پذیر ہوتے ہیں، کسی طرح بھی شیخ ابن العربی کی تصریحات کے خلاف نہیں، پھر شاہ ولی اللہ یہ کہتے ہیں کہ باقی رہی یہ بات کہ حضرت مجدد نے شیخ ابن العربی اور اس کے بعض اتباع کے اقوال کو اپنے وجدان کے خلاف محسوس کیا ہے، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، یہ ایک ایسی لغزش ہے جس کا کشف کی لغزش سے کوئی تعلق نہیں، اور پھر جہاں تک اس طرح کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں کا تعلق ہے، ان سے محفوظ بھی کون رہ سکتا ہے۔ اس لیے ان لوگوں کے مقام بلند میں ہرگز کوئی فرق نہیں پڑتا۔

شاہ ولی اللہ وحدت وجود اور وحدت شہود کو ایک ہی چیز سمجھتے تھے، اس لیے وہ اپنے چچا شاہ ابوالرضا کو جہاں وحدت الوجود کا شہسوار کہا ہے، وہاں ان کو امام ارباب معرفت وشہود بھی لکھا ہے۔ شاہ ابوالرضا، وجود وشہود کے قائل ہونے کے ساتھ ہی شریعت کے بھی بڑے پابند رہے، اور اپنے تمام چھوٹے بڑے کاموں میں اس کا پورا لحاظ رکھتے، حتیٰ کہ سنت نبوی کی پیروی میں جب مسجد کے قریب پہنچتے تو کھڑے ہو جاتے۔ پہلے بایاں پاؤں جوتے سے نکالتے، پھر دایاں پانوں بڑھا کر مسجد میں داخل ہوتے۔

شاہ ولی اللہ انفاس العارفین میں ان کے بہت سے ملفوظات کفر وشرک درج کیے ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ وحدت الوجود کے قائل ہونے کے ساتھ ہی کفر وایمان عذاب وثواب خیر وشر کی تفریق کا مٹانا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ دنیا کے فسق وفجور اور نجاستوں کو اوصاف عالم سمجھتے اور ان کو عالم کے تعینات اور صور مبدلہ قرار دیتے، وجود حقیقی کو ان سے منزہ تصور کرتے۔

شیخ ابوالرضا نے یہ بھی فرمایا کہ جاہل صوفی باکمال صوفیوں کی باتیں سمجھ نہیں پاتے تو ان کے معنی کچھ اور بتاتے رہتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ (المتوفی ۱۲۳۹ھ) بھی وحدت الوجود کے قائل رہے، ان کے زمانہ میں علاقہ سرسہ حصار کے مولانا نور محمد نے قائلین توحید وجودی پر کفر کا فتویٰ دیا، توحید وجودی کے حامیوں نے اس کا جواب دیا، آخر میں شاہ عبدالعزیزؒ کو حکم بنایا گیا کہ وہ اپنا فیصلہ دیں، ان کا فیصلہ ایک رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے، جس کے آخر میں وہی ساری باتیں ہیں جو شاہ ولی اللہؒ کے مکتوب مدنی میں ہے، اس کے اقتباس سے مطلب کچھ اور واضح ہو جائے گا، اس لیے ہم اس کو ذیل میں درج کرتے ہیں:

"جمہور حضرات صوفیائے کرام وحدت الوجود کے اس وجہ سے قائل ہیں کہ چشم باطنی اور نظر کشفی سے ان کو یہی تحقیق ہوا ہے کہ وجود حقیقی ایک ہی ہے اور وہی واجب الوجود ہے، اس کے ماسوا جو کچھ دنیا میں ہے وہ اس کے ظلال اور عکوس ہیں، اور اس کشف وجود حقیقی کے واحد ہونے میں کسی بزرگ کو اولیاء اللہ میں سے خواہ کسی خاندان میں سے ہوں اختلاف نہیں، ...... وجود ایک ہی ہے، اس کے سوا جو کچھ ہے، وہ عدم ہے، تمام ممکنات فی نفس الامر نظر کشفی اولیائے کرام میں اعدام ہیں، مگر بوجہ کمال صفت حضرت رب العزت یہ اعدام گویا شیشے ہیں، جن میں آفتاب وجود حضرت رب معبود کا عکس نمایاں ہے، جو شیشہ صاف اور پاک ہے اور سیدھا ہے، عکس صحیح نظر آتا ہے، اور اگر شیشہ میلا ہے یا ٹیڑھا ہے یا بالکل تاریک ہے، اسی کے موافق حق کا ظہور اس میں ہے، اور اس عکس کا صحیح نظر آنا دو امر پر موقوف ہے، پہلے قلب کے تصفیہ پر کہ دل کو ماسوا اللہ سے تعلق نہ رہے اور طالب عاشق اللہ کے ذکر میں ایسا مصروف ہو کہ اپنے آپ کو بھول جائے، دوام حضور حاصل ہو جائے، دوسرے نفس کا تزکیہ یعنی اخلاق رذیلہ اور عادات قبیحہ سے نفس پاک ہو جائے اور ترقی کر کے مقامات فنا اور مراتب بقا کو طے کرے، اور یہ دونوں امر تصفیہ اور تزکیہ، ریاضت شاقہ اور کامل مجاہدہ

پر موقوف ہیں، فرمایا، اللہ کریم نے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا یعنی جو اشخاص ہمارے راستہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان پر اپنے راستے کھول دیتے ہیں، ریاضت اور مجاہدہ مورث مشاہدہ اور موجب نجات سرمدیہ اور باعث حصول ابدیہ اُسی وقت ہو سکتا ہے کہ شرع شریعت کے اتباع کے موافق کیا جائے، اگر معاذ اللہ اتباع ظاہری و باطنی شرع شریف میں لاپرواہی ہے تو پھر دھوکا ہے، لہذا طالب خدا کو ریاضت موافق اتباع شریعت و طریقت اختیار کر کے کشود کار کا امید وار رہنا چاہیے،

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست   با کریماں کارہا دشوار نیست

طالب کو ابتدا میں نام خدا لینے سے ذوق اور حلاوت دل میں پیدا ہونی شروع ہوتی ہے، پھر اگر توفیق ایزدی رفیق حال اس کے ہے اور مرشد کامل کا سایہ سر پر اس کے ہے تو ذوق کے بعد شوق اور شوق کے پیچھے محبت اور محبت کمال پر پہنچنے سے عشق کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے، عشق کی تعریف میں لکھا ہے کہ عشق ایک آگ ہے کہ مطلوب کے سوا اور تمام اشیاء کو جلا دیتی ہے، اسی آگ کے شعلہ زن ہونے پر توحید کا مقام کھلتا ہے، اور مطلوب ہی مطلوب نظر آتا ہے۔"

(رسالہ فیصلہ شاہ صاحب دہلوی۔ محمود پریس، حیدر آباد دکن، ص ۲۲ - ۱۹)

شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان والوں نے وحدت وجود اور وحدت شہود کے جھگڑے کو مٹا دینے کی کوشش کی لیکن آگے چل کر کچھ ایسے صوفیہ بھی ہوئے جو شاہ ولی اللہ کی تطبیق سے مطمئن نہ تھے، ان ہی میں مرزا مظہر جانجاناں اور ان کے مریدین تھے، مرزا مظہر جانجاناں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نظریے کے حامی تھے، اور انھوں نے کلمات طیبات میں ان کے بہت سے اشکال کو صاف کرنے کی کوشش کی ہے (کلمات طیبات مکتوب ششم ص ۲۰، مکتوب ہفتم ص ۲۸، مکتوب ہشتم ص ۲۹، مکتوب نہم ص ۳۰)

ان کے مرید غلام یحییٰ نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی حمایت میں ایک رسالہ کلمات الحق لکھا جس پر حضرت میرزا مظہر جان جاناں نے ایک تقریظ بھی لکھی، اس میں غلام یحییٰ لکھتے ہیں کہ وحدت وجود اور وحدت شہود کے درمیان کوئی تطابق ممکن نہیں، کیونکہ وحدت وجود کی بنیاد عالم اور موجد عالم کے مابین عینیت پر ہے۔ اور وحدت شہود کی رو سے واجب اور ممکن کے درمیان غیریت محض ہے۔

میر درد نے بھی واردات درد میں وحدت وجود اور وحدت شہود پر بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ کل من عند اللہ کے مطابق ہمہ از دست کی تصدیق وحی سے ہوتی ہے، اسلئے ہمہ اوست غلط ہے اور ہمہ از دست صحیح ہے، نتیجہ یہ ہے کہ وحدت الوجود کا عقیدہ نفس الامر کے اعتبار سے باطل ہے۔ وحدت شہود حق ہے، لیکن کیفیت اور حال کے اعتبار سے دونوں کا مقصد ایک ہی ہے، یعنی قلب کا ماسوا کی گرفتاری سے آزاد کرنا۔

مولانا حاجی شاہ امداد اللہ چشتی صابریؒ (المتوفی ۱۳۱۷ھ) بھی وحدت الوجود کے قائل تھے، اور فرماتے کہ اس مسئلہ کو جس وضاحت کے ساتھ شیخ ابن عربی قدس اللہ سرہٗ نے سمجھایا، اس کا احسان موحدوں پر قیامت تک رہے گا، لیکن ان کو سمجھنے میں جو خطرات پیدا ہوتے ہیں، اس کا ذکر بھی ایک روایت بیان کرکے کیا ہے، جو یہ ہے کہ شیخ ابن عربی کے معاصر اور ہم وطن شیخ شہاب الدین سہروردیؒ بھی تھے، ان سے لوگوں نے شیخ ابن عربی کے بارہ میں پوچھا تو فرمایا کہ وہ زندیق ہیں، لوگوں کو ان کی صحبت سے احتراز کرنا چاہیے، لیکن جب شیخ ابن عربی کی وفات ہوئی تو لوگوں نے شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے ان کی آخرت کے متعلق دریافت کیا، تو فرمایا کہ قطب الوقت کا انتقال ہو گیا، جو ولی اللہ تھے۔ یہ سنکر لوگوں کو تعجب ہوا، اور کہا کہ آپ نے تو ان کو زندیق قرار دیا تھا، اور ہم لوگوں کو ان سے استفادہ کرنے میں محروم رکھا، یہ سنکر حضرت شیخ شہاب الدین

سہروردیؒ نے فرمایا، وہ ولی اور واصل بحق ضرور تھے لیکن جذبہ قوی رکھتے تھے، وہ مقرب بارگاہ بھی تھے لیکن قابل اتباع نہ تھے، اپنے آخر زمانے میں مجذوب ہو گئے تھے، انکی زبان افشائے اسرار میں بے اختیار ہو گئی تھی، اگر تم لوگ ان کی صحبت میں پہنچ جاتے تو گمراہ ہو جاتے، کیونکہ وہ غلبۂ حال میں کچھ ایسی باتیں کہہ جاتے تھے، جو تمھاری سمجھ میں نہیں آتیں، عوام کو ان سے نقصان پہنچتا۔

(رسالہ در بیان وحدت الوجود از مولانا امداد اللہ فاروقی چشتی، صابری ص ۲)

وحدت وجود اور وحدت شہود کی بحثیں ضرور ہوتی رہیں لیکن ان کا تعلق دراصل کشف و وجدان، غلبۂ احوال اور محبت الہٰی کے مدارج سے رہا، وجود یا شہود کا احساس محض ایک کیفیت ہے، ایک حال ہے، اس کو اصلیت سے ہٹا کر مسلک یا عقیدہ بنانا صحیح نہیں، اور یہی تمام اکابر کا بھی مسلک رہا، ان پر ان کے ذوق و وجدان سے عشق الہٰی کا جتنا غلبہ اور استیلاء ہوتا اتنا ہی وہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے تصور سے مست رہتے لیکن اس شدت عشق میں ایمان و کفر، ہدایت و ضلالت، نیکی و بدی، ثواب و عذاب کی تفریق مٹا دینے کے قائل نہ تھے، وحدت الشہود کے علاوہ وحدت الوجود کے اکابر صوفیہ کا بھی یہ مسلک رہا کہ کتاب و سنت اور شریعت کی خلاف ورزی کسی حال میں بھی نہ ہو، اگر کوئی ان کے کسی فعل کو غیر شرعی سمجھتا تو یہ اس کی فہم کا قصور ہوتا، اور اگر کسی وحدت الوجود کے حامی کا کوئی فعل واقعی غیر شرعی ہو جاتا تو پھر اس کا مسلک غیر اسلامی وحدت الوجود کا ہو جاتا، اس کا وحدت الوجود اسلامی باقی نہیں رہتا، اسلامی وحدت الوجود کو ہر حال میں اسلامی رہنا ضروری ہے۔

صاحب المثنوی

اسلام کے مشہور صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی کی مفصل محققانہ سوانح عمری۔

حافظ وکیع بن الجراح الرُّؤاسی

از مولوی حافظ محمد نعیم صاحب ندوی صدیقی رفیق دار المصنفین

دوسری صدی ہجری میں جن ممتاز اتباع تابعین نے علم و عمل کے چراغ روشن کیے ان میں امام وکیع ابن الجراح کو نمایاں حیثیت حاصل ہے، اگرچہ ان کی تصانیف کی عدم شہرت اور نایابی کی بنا پر ان کی شخصیت اہل علم کی توجہات کا مرکز نہ بن سکی، لیکن علم و فضل، زہد و ورع، ذہانت و فطانت اور قوت حافظہ میں ان کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ امام وکیع کے علوئے مرتبت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ابن مبارک، ابن معین اور ابن مدینی جیسے فضلائے روزگار انہی کے دامن تربیت کے پروردہ ہیں،

نام و نسب وکیع نام اور ابو سفیان الرواسی کنیت تھی[5]، پورا سلسلہ نسب یہ ہے: وکیع بن الجراح ابن ملیح بن عدی بن الفرس بن سفیان بن الحارث بن عمر بن عبید بن رواس بن کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ[2]۔ قبیلہ قیس عیلان کی ایک شاخ رواس کی نسبت سے رواسی کہلاتے ہیں[3]۔

نشو و نما امام وکیع ۱۲۹ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے[4]، گر بغدادی نے بسند امام وکیع کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ آپ کی ولادت کب ہوئی؟ تو فرمایا

ولدت سنۃ ثمان وعشرین ومائۃ ۱۲۸ھ میری ولادت ۱۲۸ھ میں ہوئی۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۶۶ و الفہرست لابن ندیم ص ۳۱۷ [2] الطبقات الکبیر لابن سعد ج ۶ ص ۲۷۵ [3] الاعلام ج ۳ ص ۱۱۳۶ و المستطرفہ ص ۳۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۰ [4] صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۱۰۳ و الانساب للسمعانی ج ۶ ص ۱۸۲ (جدید اڈیشن حیدرآباد) [5] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۶۶

اکثر محققین کی رائے ہے کہ آپ اصلاً کوفی تھے، مگر بعض کا خیال ہے کہ آپ کے مولد ہونے کا شرف نیشاپور کے استوا و نامی ایک گاؤں کو حاصل ہے[1]، بیشتر شواہد اور دلائل اول الذکر ہی کو مرجح قرار دیتے ہیں، ممکن ہے کوفہ میں ولادت کے بعد استوا، میں منتقل ہو گئے ہوں۔

امام وکیع نے کوفہ ہی میں نشو و نما پائی، وہاں ان کے والد بیت المال کی نگرانی کا فریضہ انجام دیتے تھے[2]، خود فرماتے ہیں:-

کان ابی علی بیت المال[3] میرے والد بیت المال کے نگراں تھے۔

تحصیل علم امام وکیع نے اپنے وقت کے تقریباً سبھی علمی سرچشموں سے اپنی علمی تشنگی فرو کی، ان کے زمانہ تک علم سینہ بسینہ رائج تھا، اسی بنا پر تحصیل علم میں جو مشقت اور تکلیفیں علمائے سلف نے اٹھائیں وہ اہل کی نظر سے مخفی نہیں، ان حالات میں جب ہم امام وکیع کے اساتذہ کی طویل فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے علم کی تحصیل کے لیے کتنی مشقت جھیلی ہوگی، مگر اسی سچی لگن اور جذبۂ صادق نے انھیں علوئے مرتبت کے اس مقام پر فائز کیا کہ زبان خلق نے انکو امام المسلمین، احد ائمۃ الاسلام اور محدث العراق کے خطابات سے نوازا۔

امام وکیع کے فطری جوہر طالب علمی ہی کے زمانہ میں نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب وہ امام اعمش کے پاس کسب فیض کے لیے گئے تو انھوں نے نام دریافت کرنے کے بعد فرمایا:

ما احسب لا سیکون لک نبأ[4] میرا خیال ہو کہ تمہارا مستقبل شاندار ہوگا۔

یحییٰ بن یمان امام وکیع کے عہد طالب علمی کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ

---

[1] کتاب الجمع بین رجال الصحیحین ج ۲ ص ۵۴۶ [2] الاعلام ج ۳ ص ۱۱۳۶ [3] الانساب للسمعانی ج ۱ ص ۱۸۱ (طبع جدید) [4] ایضاً

نظر سفیان الیٰ عینی وکیع فقال	سفیان نے امام وکیع کی آنکھوں میں
ترون ھذا الرواسی، لایموت	دیکھکر فرمایا کہ تم لوگ اس رواسی کو دیکھ
حتی یکون لہ شان[1]	رہے ہو، موت سے پہلے اسکی بڑی منزلت ہوگی

اپنے شاگرد کے بارے میں استاذ کی یہ پیشینگوئی پوری ہوئی،

شیوخ امام وکیع نے مختلف ملکوں کے نامور فضلاء سے فیض حاصل کیا، ان میں سے نمایاں اساتذہ کے نام یہ ہیں:۔

اسماعیل بن ابی خالد، ہشام بن عروہ، سلیمان الاعمش، عبداللہ بن عون، ابن جریج، اوزاعی، سفیان ثوری[2]، ایمن بن نابل، عکرمہ بن عمار، ثور بن ابی صدقہ، جریر بن حازم، عبداللہ بن سعید بن ابی ہند، معروف بن خربوذ، عبدالرحمٰن بن الغسیل، ابی خلدہ، خالد ابن دینار، سلمہ بن نبیط، عیسیٰ بن طہمان، مصعب بن سلیم، مسعر بن حبیب، عبدالمجید بن وہب العقیلی، اسامہ بن زید اللیثی، اسماعیل بن مسلم العبدی، البختری بن المختار، بدر بن عثمان، جعفر بن برقان، حاجب بن عمر، حریث بن ابی مطر، حنظلہ بن ابی سفیان، علی بن صالح بن حی، زکریا بن اسحاق، زکریا بن ابی زائدہ، سعید بن عبید، طلحہ بن یحییٰ، عبدالحمید بن جعفر، عذرہ بن ثابت، علی بن المبارک، عمر بن ذر، عمران بن حدیر، معاویہ بن ابی مزرد، معروف بن واصل، نافع بن عمر الجمحی، موسیٰ بن علی بن رباح، یزید بن ابراہیم التستری، فضیل بن غزوان، مالک بن مغول، ابن ابی ذئب، ابن ابی لیلیٰ، محمد بن قیس الاسدی، مساور الوراق، ہشام الاستوائی، ہشام بن سعد، یعلی بن الحارث، ابی سنان الشیبانی، افلح بن حمید، حماد ابن سلمہ، حماد بن نجیح، زمعہ بن صالح، صالح بن اوس العبسی، سعید بن عبدالعزیز التنوخی،

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۶۹ [2] ایضاً ص ۴۶۶

سلیمان بن المغیرہ، صالح بن ابی الاخضر، عبد اللہ بن عمر العمری، عبد العزیز بن ابی رواد، فضیل ابن مرزوق، قرہ بن خالد، مبارک بن فضالہ، موسیٰ بن عبیدہ الربذی، ہمام بن یحییٰ، یونس ابن ابی اسحاق، ابی ہلال الراسبی، یزید بن زیاد۔[1]

ایک روایت کے مطابق امام وکیع نے امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے ارشد تلامذہ امام ابویوسف اور امام زفر سے بھی سماعت حدیث کی تھی۔[2] بغدادی نے بھی لکھا ہے کہ وکیع نے امام ابوحنیفہ سے بھی سماع کیا تھا، وکان قد سمع منہ شیئاً کثیراً۔[3] صیمری نے بھی ان کا شمار امام اعظم کے تلامذہ کے ساتھ کیا ہے۔[4]

درس حدیث | ان جلیل القدر اساتذہ کے فیض نے ان کو آسمانِ علم کا نیر تاباں بنا دیا اور ان کے فضل و کمال کی شہرت دور دور تک پھیل گئی، اور مختلف ملکوں کے طلبہ اس منبع علم سے فیضیاب ہونے کے لیے امڈ پڑے، امام وکیع کے حلقۂ درس سے جو فضلا نکلے اُن میں یحییٰ بن آدم، ابن معین اور ابن مدینی جیسی یگانۂ وقت ہستیاں شامل ہیں، اور عبد اللہ بن مبارک جیسے جلیل القدر بزرگ جنھوں نے امام ابوحنیفہ، امام مالک اور حمید الطویل جیسے ائمہ سے فیض حاصل کیا تھا، وہ بھی وکیع سے فخریہ روایت کرتے تھے۔

امام وکیع نے اپنے شیخ سفیان ثوری کی رحلت کے بعد مسند درس کو زینت دی۔[5] مشہور امام جرح و تعدیل عبد الرحمٰن بن مہدی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ۲۵ سال کی عمر میں درس حدیث دینا شروع کر دیا تھا، لیکن ابراہیم حربی کا بیان ہے کہ "حدث وکیع وھو ثلاث وثلاثین سنۃ" یعنی وکیع نے ۳۳ سال کی عمر میں درس کا آغاز کیا تھا۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۲۳-۱۲۴ [2] الفوائد البہیہ ص ۲۲۱ [3] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۷۱ [4] الجواہر المضیئہ ج ۲ ص ۲۰۸ [5] صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۱۰۴ و تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۶۸

وہ جہاں بھی جاتے ان کا حلقۂ درس مرجعِ خلائق بن جاتا، اور دوسرے تمام حلقہائے درس ویران نظر آنے لگتے تھے، ابو ہشام رفاعی کہتے ہیں:-

دخلت المسجد الحرام فاذا عبید اللہ	ایک مرتبہ میں مسجد حرام میں گیا تو عبید اللہ
بن موسی یحدث والناس حولہ	ابن موسیٰ کو حدیث کا درس دیتے دیکھا اُن
کثیر قال فطفت اسبوعاً ثم	کے ارد گرد طلبہ کا ہجوم تھا، پھر ایک ہفتہ
جئت فاذا عبید اللہ قاعد	طواف کے بعد جو آکر دیکھا تو عبید اللہ تن
وحدہ فقلت ما ھذا فقال	تنہا بیٹھے ہوئے ہیں، میں نے پوچھا کیا ہوا،
قدم التنین فاخذ ھم یعنی	انھوں نے کہا ایک اژدہا آگیا ہے جو پورے حلقہ
وکیعاً [1]	کو نگل گیا، ان کی مراد امام وکیع سے تھی،

خطیب نے بھی اس واقعہ کو مزید تفصیل سے لکھا ہے، [2]

اس کے علاوہ بھی مسجد حرام کے کئی حلقہائے درس امام وکیع کے مکہ آجانے کے بعد ویران ہوگئے، جن کی تفصیل خطیب نے بیان کی ہے۔

تلامذہ | امام وکیع کے تلامذہ کی فہرست بھی بہت طویل ہے، مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:-
احمد بن حنبل، ابن المدینی، یحییٰ بن آدم، قتیبہ بن سعید، یحییٰ بن معین، ابو خیثمہ زہیر [3] ابن حرب، ابوبکر بن ابی شیبہ، احمد بن جعفر الوکیعی، عباس بن غالب الوراق، یعقوب الدورقی، عبید اللہ بن ہاشم، ابراہیم بن عبد اللہ القصار [4]، احمد بن منیع حسن بن عرفہ [5] اسحاق الحنظلی۔

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۲۹ [2] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۹۹ [3] الانساب للسمعانی ج ۶ ص ۱۸۱ و تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۹۶ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۰ [5] خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ج ۳ ص ۱۵۴

محمد بن نمیر، عبد اللہ الحمیدی، محمد بن سلام، یحیٰی بن جعفر، یحیٰی بن موسیٰ، محمد بن مقاتل، ابو سعید الاشج، نصر بن علی، سعید بن ازہر، ابن ابی عمر، علی بن خشرم[1]، یحیٰی بن یحیٰی نیسا پوری، محمد بن صباح الدولابی، ابراہیم بن سعد الجوہری،[2]

حافظ ابن حجر نے ابراہیم بن عبد اللہ القصار کو امام وکیع کا آخری شاگرد بتایا ہے، مذکورہ تلامذہ کے علاوہ امام وکیع کے بعض اُن مشاہیر ائمہ نے بھی روایت حدیث کی ہے جو وکیع کے استاذ ہیں یا شیوخ کی صف کے بزرگ ہیں، جیسے امام سفیان بن عیینہ اور عبد الرحمٰن بن مہدی۔

فضل وکمال| امام وکیع کا فضل وکمال ان کے دور کے علماء میں مسلّم تھا، اور وہ سب ان کے کمالات کے معترف تھے،

امام احمد فرماتے ہیں کہ

ما رأیت رجلاً قط مثل وکیع فی العلم والحفظ والاسناد والابواب مع خشوع وورع	میں نے علم، حفظ، اسناد اور ساتھ ہی ساتھ ورع وتقوی میں امام وکیع بن جراح کا مثل کسی کو نہیں دیکھا،

انہی کا دوسرا قول ہے :-

ما رأت عینی مثله قط یحفظ الحدیث جیداً ویذاکر بالفقه فیحسن مع ورع واجتهاد[3]	میری آنکھوں نے امام وکیع کا مثل نہیں دیکھا، وہ حدیث کے بڑے اچھے حافظ تھے، فقہ بھی بہتر پڑھاتے تھے، تقویٰ اور اجتہاد میں ممتاز تھے،

---

[1] کتاب الجمع بین رجال الصحیحین ج ۲ ص ۵۴۶ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۲۵

[3] صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۱۰۲

ابن عماد کہتے ہیں:

ما کان بالکوفۃ فی زمان وکیع افقہ ولا اعلم بالحدیث کان وکیع جھبذا[1]	وکیع کے زمانہ میں کوفہ میں ان سے بڑا فقیہ اور حدیث کو ان سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں تھا، امام وکیع عبقری وقت تھے،

یحییٰ بن معین بیان فرماتے ہیں

کان وکیع فی زمانہ کالاوزاعی فی زمانہ[2]	امام وکیع کی انکے زمانہ میں وہی حیثیت تھی جو امام اوزاعی کی انکے وقت میں تھی،

ابن ناصر الدین کا قول ہے

ابوسفیان (وکیع) محدث العراق ثقۃ متقن ورع[3]	امام ابوسفیان وکیع محدث عراق ثقہ اور متقی ہیں،

ابن سعد نے انھیں ثقہ، بلند مرتبہ عالم، مامون، کثیر الحدیث اور حجۃ لکھا ہے[4]، ان کمالات کی بنا پر وہ امام کوفہ اور محدث عراق کے خطابات سے یاد کیے جاتے تھے،

ذہانت وقوت حافظہ مبدأ فیاض نے امام صاحب کو غیر معمولی قوت حافظہ سے نوازا تھا، ان کی ذکاوت و فطانت کے جوہر صغر سنی ہی میں کھلنے لگے تھے، طالب علمی کے زمانہ میں انھوں نے جو حدیث کسی شیخ سے سنی تھی، وہ عمر بھر ان کے حافظہ میں محفوظ رہی، ان کی اس خصوصیت پر ائمۂ وقت رشک کرتے تھے، قاسم حربی بیان کرتے ہیں کہ سفیان ثوری امام وکیع کو بلا کر پوچھتے کہ رواسی تم نے کونسی حدیث سنا ہے، وہ پوری سند کے ساتھ اس کو بیان کر دیتے کہ مجھ سے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۵۰۴ [2] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۵۰ و کتاب الانساب للسمعانی ص ۲۶۱

[3] صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۱۰۲ [4] طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۷۵

فلاں شخص نے اس طرح حدیث روایت کی ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ سفیان ثوری اپنے شاگرد کی یہ حاضر دماغی دیکھکر مسکراتے اور تعجب وحیرت کا اظہار کرتے،[1]

اپنی قوت حافظہ کے بارہ میں خود وکیع کا بیان ہے کہ

ما نظرت فی کتاب منذ خمس	میں نے گذشتہ پندرہ (۱۵) سال کے عرصہ میں
عشرۃ سنۃ الا فی صحیفۃ یوماً	سوائے ایک دن کے کبھی کتاب کھولکر
فنظرت فی طرف منہ ثم اعدتہ	نہیں دیکھی اور اس ایک مرتبہ میں بھی بہت
علی مکانہ،[2]	سرسری طور سے دیکھا اور کتاب کو پھر رکھ دیا

اسی قوت حافظہ کا یہ نتیجہ تھا کہ درس کے وقت کتاب سامنے نہیں رکھتے تھے، بلکہ زبانی حدیث کا درس دیتے تھے، اور طلبہ کو اثنائے درس میں یا اس کے بعد قلمبند کرتے تھے، طالب علمی کے زمانہ میں بھی انھوں نے درس کے وقت کبھی حدیثوں کو قلمبند نہیں کیا، بلکہ درس کے بعد آکر لکھتے تھے،

ما کتبت عن سفیان الثوری	میں نے سفیان ثوری کے درس کے وقت کبھی
حدیثاً قط کنت احفظہ فاذا	حدیث لکھی نہیں بلکہ اس کو دماغ میں محفوظ
رجعت الی المنزل کتبتہ[3]	کر لیا تھا، پھر گھر واپس آکر لکھتا تھا،

اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگوں کا حافظہ تو بتکلف ہے اور امام وکیع فطری حافظ تھے[4]، امام وکیع کے لڑکے کا بیان ہے کہ میں نے اپنے والد کے ہاتھ میں کبھی کوئی کتاب اور کاغذ کا ٹکڑا نہیں دیکھا،[5]

امام موصوف کے نزدیک قوتِ حافظہ کا سب سے بڑا نسخہ معاصی سے اجتناب ہے، اللہ تعالے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۲۸، [2] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۵۰۷، [3] ایضاً [4] کتاب الانساب للسمعانی ص ۲۶۱ [5] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۵۰۹

ہر انسان کو حفظ و فہم کی دولت سے نوازتا ہے، مگر خباثت اور معاصی کی کثرت اس کو کند کر دیتی ہے، علی بن خشرم کہتے ہیں کہ میں نے امام وکیع کے ہاتھ میں کبھی کوئی کتاب نہیں دیکھی، وہ صرف اپنے حافظہ سے درس دیتے۔ ان کی حیرت انگیز قوت حافظہ دیکھکر میں نے ان سے کوئی ایسی دوا پوچھی جس سے حافظہ اچھا ہو جائے۔ امام صاحب نے فرمایا

ترک المعاصی ماجربت مثله للحفظ [1] — معاصی سے اجتناب سے بڑھکر قوت حافظہ کے لیے کوئی چیز میرے تجربہ میں نہیں آئی،

ایک دفعہ کسی شخص نے سوء حافظہ کی شکایت کی، امام وکیع نے اس کو معاصی سے اجتناب کا مشورہ دیا اور فرمایا علم خداوند قدوس کا نور ہے، وہ کسی گناہ گار اور عاصی کو عطا نہیں کیا جاتا، درج ذیل اشعار میں اسی واقعہ کا ذکر ہے۔

شکوت الی وکیع سوء حفظی — فاوصانی الی ترک المعاصی

وعلله بان العلم فضل — وفضل الله لا یعطیه لعاصی [2]

اخلاقی فضائل علمی کمالات کے ساتھ اخلاقی فضائل سے بھی آراستہ تھے، دنیاوی دولت اور جاہ و ثروت کی آپ کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں تھی اور ہمیشہ اس سے دامن بچاتے رہے۔ خلیفہ ہارون رشید نے آپ کے سامنے منصب قضا کی پیشکش کی، آپ نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، [3]

ایک مرتبہ محمد بن عامر مصیصی نے امام احمد سے دریافت کیا کہ آپ وکیع سے زیادہ محبت رکھتے ہیں یا یحییٰ بن سعید سے۔ امام احمد نے جواب دیا، میں وکیع کو یحییٰ سے افضل سمجھتا ہوں، انھوں نے حفص بن غیاث کی طرح عہدۂ قضا کو قبول کرنے سے گریز کیا تھا، اور یحییٰ نے معاذ بن جبل کی طرح اپنے کو اس منصب کی آزمائشوں میں گرفتار کر لیا، [4]

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۲۹ [2] مرآۃ الجنان للیافعی ج ۱ ص ۵۸ [3] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۹۷ والاعلام ج ۳ ص ۱۳۶ [4] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۲۵

ان کی والدہ نے انتقال کے وقت تقریباً ایک لاکھ نقد یا اتنی قیمت کی جائداد وراثت میں چھوڑی تھی، وکیع نے کبھی اپنے حصہ کا مطالبہ نہیں کیا، گھر میں جو کھانا اور کپڑا مل جاتا اسی پر قانع وشاکر رہتے تھے، نہ مزید کے لیے مطالبہ کرتے اور نہ اس بارے میں کوئی گفتگو ہی کرتے۔[1]

ایک مرتبہ ایک شخص آپ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ امام اعمش کے حلقۂ درس میں آپ نے میری دوات کی روشنائی استعمال کی تھی، اس کی قیمت ادا کیجئے۔ راوی کا بیان ہے کہ امام موصوف نے کسی بحث وتحقیق کے بغیر دینار کی ایک تھیلی لاکر اس شخص کو دیدی اور فرمایا کہ مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔[2]

خوف وخشیت کا یہ عالم تھا کہ ابن معین کا بیان ہے کہ میں نے وکیع کو اکثر یہ کہتے سنا "أی یوم لنا من الموت"؟

داؤد بن یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ ولی کون لوگ ہوتے ہیں" ؟ ارشاد فرمایا "جو لوگ اپنے ہاتھ سے کسی کو ضرر نہیں پہنچاتے، اور بلاشبہ وکیع انہی میں سے ایک ہیں"۔

دولت مند ہونے کے باوجود نہایت سادہ اور معمولی زندگی بسر کرتے تھے، پھر بھی اس خوف سے لرزاں رہتے کہ کہیں خداوند قدوس کے یہاں اس "تعیش" کی بازپرس نہ ہو، ان کی جسمانی تروتازگی کی وجہ سے بعض لوگوں کو غلط فہمی تھی کہ وہ عیش وتنعم کی زندگی بسر کرتے ہیں، ایک مرتبہ جب وہ مکہ گئے تو حضرت فضیل بن عیاض نے جو مشہور زاہد ہیں، انھیں دیکھکر کہا کہ آپ تو عراق کے راہب ہیں، یہ موٹاپا کیسا؟ فرمایا کہ هذا فرحی بالاسلام۔ یعنی یہ چیز درحقیقت نعمت اسلام سے بہرہ ور ہونے کی خوشی اور مسرت کا نتیجہ ہے۔[3]

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۹۶ [2] ایضاً [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۱ و تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۳۰

عبادت | ان کی عبادت کی کثرت، رقت قلب اور گریہ پر ان کے معاصر ائمہ واخیلہ تک رشک اور اسکی تمنا کرتے تھے، ابراہیم بن شماس کہتے ہیں کہ اگر میں کوئی آرزو کرتا تو وکیع کی عبادت اور رقت کی تمنا کرتا[1]

قاضی یحییٰ بن اکثم امام وکیع کا سفر و حضر میں بارہا ساتھ رہا ہے، ان کا بیان ہے کہ وکیع ہر شب میں قرآن ختم کرتے تھے، اور ہمیشہ روزہ رکھتے تھے[2]، ایک دوسرے معاصر یحییٰ بن ایوب بیان کرتے ہیں کہ وہ رات میں ثلث قرآن پڑھنے سے قبل نہیں سوتے تھے، اور پھر رات کے آخری حصہ میں بیدار ہو جاتے تھے[3]،

ان کی شب بیداری اور عبادت گذاری کا رنگ پورے گھر پر چڑھا ہوا تھا، اور گھر کا ہر ہر فرد حتی کہ ملازم تک تہجد کے پابند تھے، ابراہیم بن وکیع فرماتے ہیں

کان ابی یصلی اللیل فلا یبقی	میرے والد جب رات میں نماز پڑھتے تھے
فی دارنا احد الا صلی حتی	تو ہمارے گھر میں کوئی شخص ایسا نہیں باقی
ان جاریة لنا سوداء لتصلی[4]	رہتا تھا جو نماز نہ پڑھتا ہو حتی کہ ہماری
	سیاہ فام لونڈی بھی نماز پڑھتی تھی،

معمولات | سفیان بن وکیع اپنے والد کے شب و روز کے معمولات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"میرے والد صائم الدہر تھے، صبح سویرے بیدار ہو جاتے، فجر کی نماز کے بعد مجلس درس شروع ہو جاتی، دن نکلنے تک اس میں مشغول رہتے، پھر گھر جا کر ظہر کی نماز تک قیلولہ فرماتے، اس کے بعد ظہر کی نماز ادا کرتے اور پھر عصر تک طلبہ کو قرآن کا درس دیتے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۲۸ [2] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۵۰ [3] سمعانی ج ۱ ص ۲۶۶ و صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۱۰۳
[4] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۷۱

اور پھر مسجد آکر عصر کی نماز پڑھتے اور اس سے فارغ ہوکر پھر درس قرآن شروع ہوتا اور شام تک مذاکرہ میں منہمک رہتے، پھر مکان تشریف لاکر افطار فرماتے، اس سے فارغ ہوکر نماز پڑھتے تھے"[1]

مسلک امام وکیع گرچہ منصب امامت و اجتہاد پر فائز تھے، لیکن فتوی مسلک حنفیہ کے مطابق دیتے تھے، اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ حنفی مسلک کی طرف مائل تھے۔

یحیی بن معین فرماتے ہیں:۔

کان وکیع ..... یفتی بقول ابی حنیفة وکان قد سمع منه شیئاً کثیراً[2]	امام وکیع ..... ابوحنیفہ کے قول کے مطابق فتوی دیتے تھے اور انھوں نے امام صاحب سے کافی سماعت بھی کی تھی،

علالت اور وفات ۱۹۶ھ کے اواخر میں زیارت حرمین کے لیے تشریف لے گئے، حج سے فراغت کے بعد اسہال کی شکایت ہوگئی، اس لیے وطن کا قصد کیا، لیکن مرض شدت اختیار کرتا گیا، اور کوفہ اور مکہ کے درمیان مقام فید میں پہنچے تھے کہ پیام اجل آگیا، اور علم وفضل کا یہ پیکر اپنے پروردگار کے حضور میں حاضر ہوگیا[3]، اس وقت عمر ۶۸ سال کی تھی،

تصنیفات متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام وکیع نے درس وتدریس کے ساتھ تالیف وتصنیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا، امام احمد فرماتے ہیں: علیکم بمصنفات وکیع[4] امام ابن جوزی کا بیان ہے کہ

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۷۱ [2] ایضاً [3] العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۳۴۵ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۹ و تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۲۶ و تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۷۶

صنف التصانیف الکثیرۃ[۱] انھوں نے بکثرت کتابیں تصنیف کیں۔

لیکن ان تصنیفات کی کوئی تصریح نہیں ہے، خیر الدین زرکلی نے لکھا ہے کہ

لہ مصنف فی الفقہ والسنن[۲] مگر صراحت کے ساتھ صرف دو کتابوں کے نام ملتے ہیں

۱۔ مصنف ابی سفیان[۳] (وکیع بن الجراح)

۲۔ کتاب السنن[۴]

مگر آج ان کی کسی تصنیف کی موجودگی کا پتہ نہیں چلتا، یہی وجہ ہے کہ خلیفہ چلپی اور صاحب المعجم نے امام وکیع کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں کیا ہے۔

۱؎ صفوۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۰۴ ۲؎ الاعلام ج ۹ ص ۱۱۳۶ ۳؎ المستطرفہ ص ۳۵ ۴؎ الفہرست ص ۳۱۷

تبع تابعین

(جلد اوّل)

علم و عمل اور مذہب، اخلاق میں جس طرح صحابہ کرام کے جانشین اور تربیت یافتہ تابعین عظام تھے، بالکل اسی طرح تابعین کرام کے جانشین اور ان کے فیض یافتہ تبع تابعین تھے، صحابہ کرام اور تابعین کی طرح تبع تابعین کی زندگی بھی امت کے لیے اسوہ اور نمونۂ عمل ہے، اس میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر تلامذہ امام ابو یوسف، امام محمد شیبانی، امام زفر کے علاوہ امام اوزاعی، ابن جریج، یحییٰ بن آدم اور فضیل بن عیاض وغیرہ کے سوانح اور ان کے علمی و مذہبی و اخلاقی کارناموں اور مجتہدات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کے دوسرے حصہ میں جو زیر ترتیب ہے، ائمہ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ وغیرہ کے حالات اور ان کے اجتہادات اور کارناموں کی تفصیل ہوگی۔

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی سابق رفیق دار المصنفین۔ قیمت ۸/

منیجر

شوقی اور اُن کی شاعری

(۱۸۶۹ء — ۱۹۳۲ء)

از جناب مولوی مقتدیٰ حسن صاحب اعظمی فاضل الازہر یونیورسٹی قاہرہ

جدید عربی ادب کی تاریخ میں شوقیؔ کا نام سب سے زیادہ نمایاں اور ان کے فنی کارنامے سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہیں، اپنے سحر آفریں نغمات سے انھوں نے عرب دنیا کو اس طرح متاثر کیا کہ زندگی ہی میں انھیں "امیر الشعراء" کے لقب سے نوازا گیا، ادبا و ناقدین فن اپنی شہرت و مقبولیت کے لیے شوقیؔ کے فن کی تعریف یا اس کی تنقید کرتے تھے، ان کی زندگی ہی میں ناقدین کے دو مختلف گروہ پیدا ہو گئے تھے، ایک گروہ ان کا زبردست حامی اور انکے فنی کارناموں کا حد درجہ مداح تھا، دوسرا گروہ ان کے ان مخالفین و ناقدین کا تھا جو ان کی شاعری میں کسی کمال کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، اس کا دعویٰ تھا کہ شوقیؔ کی شاعری میں نہ جذبات کی ترجمانی ہے اور نہ کسی طرح کی اپیل، وہ ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے فرض کی ادائیگی میں بالکل ناکام ہیں، اور بعد کے لوگوں کے .... سیلے کوئی اچھی مثال قائم نہ کر سکے، ایسی صورت میں شوقیؔ کی صحیح فنی حیثیت کو متعین کرنا اور جدید عربی ادب میں انکو ان کے اصلی مقام پر رکھنا مشکل ہے، تاہم آیندہ سطور میں شوقیؔ کی شاعری کا تعارف کراتے ہوئے ان کی فنی حیثیت اور موافق و مخالف آراء کے صحیح اجزا کو متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی، اس سے ہندوستان میں عربی ادب کے قدردانوں اور جدید عربی شاعری سے

دلچسپی رکھنے والوں کو اس باکمال شاعر کے بارے میں کچھ مفید معلومات حاصل ہوسکیں گی۔

قدیم وجدید رجحان | تقریباً ایک صدی پہلے سے عربی ادب میں دو مختلف رجحان نمایاں ہوئے ہیں

پہلا عربی ——— اور دوسرا مغربی۔

پہلے رجحان کی نمایندگی ازہر یونیورسٹی کرتی آئی ہے، جس نے ترکی دورِ حکومت میں عربی زبان کے تمام اسلامی سرمایہ کو پوری طرح محفوظ رکھا، اس دور میں دوسرے تمام مدارس تقریباً دم توڑ چکے تھے، عربی اور اسلامی تعلیم کی جو کچھ روشنی باقی تھی وہ فیض تھا جامعہ ازہر کا جس نے اس نازک دور میں بھی اپنی امتیازی حیثیت کو باقی رکھا۔

جامعہ ازہر نے اس دور میں دینی علوم کے ساتھ زبان ولغت اور طب وفلسفہ کے علوم پر بھی نگاہ رکھی، ان کی باقاعدہ تعلیم دیجاتی تھی، البتہ دینی علوم کے مقابلہ میں ان علوم کی اہمیت کم تھی، ویسے دینی علوم بھی ترکی حکومت کی بے اعتنائی کا شکار ہوچکے تھے۔[1]

اس دور میں علمی وادبی سرگرمیاں محدود ہوگئی تھیں، متقدمین کی علمی خدمات پر پردہ سا پڑ گیا تھا، فکری جمود کی یہ حالت تھی کہ ازہری علماء حواشی و شروح سے آگے کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکے، امام شافعی، فارابی اور ابن خلدون وغیرہ جلیل القدر علماء کی تصنیفات کے بارے میں جاننے والے بہت کم رہ گئے تھے۔

ازہری علماء کے اس جمود کی وجہ سے عربی علوم اپنی وسعت کے باوجود سمٹ گئے تھے اور ایک عام فکری جمود پیدا ہوچکا تھا، اس لیے اس تعطل اور فکری جمود کو توڑنے کی سخت ضرورت تھی۔

فکری زندگی کی جو جھلک ہم نے پیش کی یہی صورت ادبی زندگی کی بھی تھی، ترکی دور سے

---

[1] (ڈاکٹر شوقی ضیف: الادب العربی المعاصر فی مصر ص ۱۹)

پہلے ادبی میدان میں جو سرگرمی نظر آتی ہے وہ اس دور میں تقریباً ختم ہو چکی تھی، گذشتہ شعراء کی بھونڈی تقلید، صنائع و بدائع کا پُرتکلف استعمال اور بیجا تضمین وغیرہ اس دور کی شاعری کا امتیازی وصف ہیں۔

۱۷۹۸ء میں نپولین نے مصر پر چڑھائی کی، اس کے سہ سالہ قیام میں مصریوں کو یورپ کی ترقی و تمدن کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اس وقت ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ادبی و فکری میدان میں یورپ سے استفادہ کرنا ضروری ہے، دوسری طرف مصر کے بادشاہ محمد علی نے اپنی فوجی طاقت بہتر بنانے کے لیے مختلف مدارس قائم کیے، جن میں مغربی اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں[1]

اسی وقت سے مصر میں دو طرح کے فکری رجحانات پہلو بہ پہلو چلنے لگے، ایک تقلیدی و قدامت پرستی کا جس کا مرکز جامعہ ازہر تھا، اور دوسرا تجدد پسندی کا جس کا سرچشمہ مغربی تہذیب اور جدید علوم تھے، جن سے ابتک مصری ناآشنا تھے۔

مغربی دنیا کے ساتھ مصریوں کے اس ربط و اتصال سے علمی و فنی میدان میں نمایاں تبدیلی ہوئی، لیکن ادبی زندگی پر اس کا اثر انیسویں صدی عیسوی کے آخری پچاس سالوں میں شروع ہوا، کیونکہ جب تک دونوں قوموں کے مابین ادبی تعلقات استوار نہ ہوں اور ان کے ماحول و مزاج اور ذوق و فکر میں ہم آہنگی نہ پیدا ہو اس وقت تک ایک قوم دوسری قوم کے ادب کو نہ تو سمجھ سکتی ہے اور نہ اسے ہضم کر سکتی ہے۔

اس بنا پر مصری قوم اپنی علمی ترقی کے ابتدائی مرحلہ میں مغربی ادب سے زیادہ قریب نہ ہو سکی، اس کے لیے مزید کوشش اور وقت کی ضرورت تھی، اس کا راستہ مصری بادشاہ محمد علی کی کوشش سے ہموار ہوا۔

---

[1] عمر الدسوقی: فی الادب الحدیث ج ۱ ص ۱۶

محمد علی نے ۱۸۲۶ء میں یورپ وفود بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سے مصری نوجوانوں کو یورپ کی زندگی اور وہاں کے ادب سے قریب ہونے کا موقع ملا، اس طرح ادبی میدان میں تاثیر و تاثر کی ابتدا ہوئی۔[1]

ثقافتی وفود میں جو لوگ یورپ گئے اُن میں رفاعہ طھطاوی کا نام سب سے نمایاں ہے، انھوں نے وہاں سے واپسی کے بعد ترجمہ کی تحریک میں جان ڈالی اور مغربی علوم سے مصریوں کو روشناس کرانے میں بڑا کارنامہ انجام دیا۔

محمد علی اور اس کے بعد سعید کے زمانہ تک ان کوششوں اور ثقافتی سرگرمیوں کا کوئی خاص اثر ادبی زندگی پر نہیں پڑا، اسماعیل متوفی ۱۸۹۵ء کے دور سے ہر گوشہ میں تبدیلی پیدا ہونے لگی اور جدید تہذیب کا اثر سیاسی، تعلیمی اور ادبی تمام میدانوں میں ظاہر ہونے لگا اور تعلیمی امور کے ذمہ داروں نے یہ محسوس کیا کہ جامعہ ازہر عربی زبان کی تعلیم میں اب اپنی ذمہ داری پوری طرح انجام نہیں دے رہا ہے، اور اس کے فارغین میں موجودہ علمی تحریک کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں ہے، اس لیے علی مبارک پاشا متوفی ۱۸۹۳ء نے مدرسہ دار العلوم کی بنیاد ڈالی، اس نے ازہریوں کے جمود سے پیدا ہونے والے خلا کو پر کیا۔[2]

انیسویں صدی عیسوی کے آخری تیس سالوں میں لبنان اور شام کے ادباء کا ایک گروہ مصر آیا جس کے اکثر افراد یورپ و امریکہ کے عیسائی مدارس کے تعلیم یافتہ تھے، انھوں نے مصر کی ادبی ترقی میں اہم کردار ادا کیا، اور صحیح معنوں میں مصریوں کو مغربی ادب سے روشناس کرایا، نجیب حداد اور دوسرے ادیبوں نے کورنی اور شکسپیر کے اشعار اور ڈراموں کا ترجمہ کیا، سلیمان البستانی نے ہومر کی الیڈ کو عربی کا جامہ پہنایا، مغربی ناول اور ڈراموں

---

[1] عمر الدسوقی: فی الادب الحدیث ج ۱ ص ۲۳ [2] ایضاً ج ۲ ص ۳۹

کا ترجمہ ہوا جس سے عام لوگوں کے ذوق میں تبدیلی پیدا ہوئی۔

۱۹۰۸ء میں جب قاہرہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس میں مصری اساتذہ کے ساتھ مستشرقین بھی کام کرتے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں جب یونیورسٹی حکومت کی نگرانی میں آگئی تو اس میں ادب کے علاوہ طب، سائنس، قانون اور انجینیرنگ وغیرہ کے شعبے بھی قائم کیے گئے، ان کوششوں سے بہت جلد ایسے علما و ادبا کی ایک جماعت تیار ہوگئی، جسے مغرب کے قدیم وجدید جملہ علوم سے پوری واقفیت حاصل تھی، اس سے قدیم وجدید رجحانات کا تضاد اور عربی و مغربی کی کشمکش بڑی حد تک ختم ہوگئی، اور منفلوطی و رافعی جیسے محتاط اور متشدد بھی مغربی ادب سے مستفید ہوئے مغربی ادب کے ترجمہ کا سلسلہ صرف فرانسیسی اور انگریزی ادب تک محدود نہیں تھا بلکہ جرمن، اٹالین اور روسی زبان کی ادبیات کا بھی ترجمہ کیا گیا جس سے مصر میں ایک عالمی مصری ادب کی تخلیق ہوئی، جسے شوقی، شکری، عقاد، مازنی لطفی السید، طٰہٰ حسین ہیکل اور توفیق الحکیم وغیرہ مشہور ادیبوں نے پروان چڑھایا، یہ ادب صرف مصر اور مصریوں تک محدود نہیں تھا بلکہ اس میں وسعت و آفاقیت تھی، یہ ساری انسانی آبادی کے لیے خیر و صلاح کا ایک پیغام اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔[1]

شاعری اور اس کا ارتقاء

تقلیدی رنگ | انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی پچاس سالہ ترکی دورِ حکومت کی طرح شاعری کے لیے ناسازگار تھے، اس پچاس سالہ شاعری کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ شعراء اسلوب بیان اور مفہوم و مقاصد کے لحاظ سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے، محسنات کا پُرتکلف استعمال، تاریخی قطعے اور فرسودہ تخیل کی تکرار ان کی شاعری کا امتیازی وصف تھا، اس میں نہ تو زندگی تھی

---

[1] عمر الدسوقی: فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۲۹

اور نہ کوئی جذبہ، بلکہ شاعری کا پورا محل محاکات و تقلید پر قائم تھا،

محمد علی کے دور میں علمی و فنی ترقی ضرور ہوئی، لیکن شعر و شاعری پر اس کا کوئی خاص اثر ظاہر نہیں ہوا، کیونکہ ترقیاتی اسکیموں سے محمد علی کا مقصد صرف اپنے تخت و تاج اور شاہی فوج کو مضبوط بنانا تھا، مصری عوام اور ان کی تہذیب و ادب سے اسے کوئی ہمدردی نہیں تھی، چنانچہ محمد علی اور اسکے بعد عباس اول اور سعید کے دور کے شعراء میں اگر اسماعیل الخشاب، شیخ حسن العطار، شیخ محمد شہاب الدین اور سید درویش کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں وہی بے روح تقلید کی شاعری کے نمونے ملیں گے، جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہے، انھوں نے شاعری کو حساب و ریاضی کا گنجلک روپ دیدیا تھا، جسے حل کرنے کے لیے گھنٹوں دماغ سوزی کرنی پڑتی تھی، اس دور میں عوام کا ذوق بھی اسی سانچے میں ڈھل گیا تھا، اور وہ اسی طرح کے معمہ اور پہیلیوں کو شاعری کا کمال تصور کرتے تھے، انھیں ایسی شاعری سے دلچسپی نہیں تھی جو جذبات و شعور کو اپیل کرے، بلکہ وہ الفاظ کے پیچ اور بے روح تقلید ہی سے محظوظ ہوتے تھے،[1]

ترقی کا آغاز اس کے بعد انیسویں صدی کے آخری پچاس سالوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس مدت میں شاعری کے ڈھانچہ میں زبردست تبدیلی ہوئی، اور شعرائے قدیم تقلیدی رنگ سے نکل کر ایک نئی دنیا میں داخل ہوئے، یہیں سے شاعری کی ترقی کا آغاز ہوا،

موجودہ ادبی ترقی کا آغاز اس وقت سے ہوا جب مصریوں میں سیاسی و قومی شعور بیدار ہوا، اور انھوں نے اپنی تاریخی و تہذیبی حیثیت کو محسوس کیا، اور اسماعیل پاشا نے اس سیاسی بیداری کے بعد مجبوراً پارلیمانی نظام قائم کیا، اسی زمانہ میں قدیم شعراء کے متعدد دیوان طبع ہوئے، جن سے عربی شاعری کے ایسے نمونے ان کی نگاہ کے سامنے آئے جن سے وہ

---

[1] عمر الدسوقی: فی الادب الحدیث ج ۱ ص ۴۱

ابتک ناواقف تھے، یہ شاعری اپنے گرد و پیش کی ترجمان تھی، اس میں تقلید و تکلف کے بجائے جذبات و شعور کی گرمی تھی، جاہلی دور میں امرؤ القیس اور اسلامی دور میں جریر کو پڑھنے سے انھیں اندازہ ہوا کہ یہ شعرا اپنی قبائلی زندگی کے ترجمان اور قومی مفاخر و مناقب کے قصیدہ خواں تھے، انکے یہاں نہ تو صنائع و بدائع کی ریل پیل ہے اور نہ تقلید و تکلف کی بہتات۔

قدیم عربی شاعری کے نمونوں اور مغربی اقوام کے ادب کے مطالعہ سے مصریوں کے ادبی ذوق میں زبردست تبدیلی پیدا ہوئی اور وہ ایسی شاعری و ادب کے دلدادہ ہو گئے جس میں زندگی اور ماحول کی ترجمانی ہو، اور الفاظ کی بازیگری سے کام نہ لیا جائے۔

اس تبدیلی سے شعرا کی ایسی جماعت تیار ہو گئی جس کا مقصد عربی شاعری میں نئی روح پھونکنا اور ایسی زندگی کا آغاز کرنا تھا جس میں قومی و شخصی آزادی کا پورا شعور کارفرما ہو۔ اس رجحان کو پروان چڑھانے والوں میں سب سے پہلے محمود صفوت ساعاتی، علی ابو النصر، عبداللہ فکری علی لیثی، عبداللہ ندیم اور عائشہ تیمور یہ پر نگاہ پڑتی ہے، انھوں نے جدید رجحان کے معیار پر اپنی شاعری کو ڈھالنے کی ابتدا کی، لیکن پرانی کوتاہیوں سے یہ بھی پوری طرح آزاد نہ ہو سکے، ان کے بعد سامی بارودی نے اس سے گلوخلاصی حاصل کی اور ان کو جدید عربی شاعری کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس تبدیلی سے محدود قومی تصور رکھنے والے مصریوں میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ جدید یورپ کی طرح ہمیں بھی اپنے ادب کو علاقائی اور مصری بنانا چاہیے، اور جس طرح مغربی اقوام نے لاطینی زبان کو چھوڑ کر مقامی زبانوں میں شاعری و انشا پردازی کی ہے اور اس کے نتیجہ میں فرانسیسی، انگریزی اور اٹالین ادب نے جنم لیا، اسی طرح ہم کو بھی اپنی مقامی زبان کے ذریعہ ایک جدید مصری ادب کی تخلیق کرنی چاہیے،

انگریزوں نے عربی زبان کو کمزور کرنے کے لیے مصریوں میں یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی کہ

زندگی کے مختلف میدان میں ان کی پسماندگی کی اصل وجہ عربی زبان اور اس کا قدیم اسلوب ہے۔ سر ولیم ولکوکس نے ۱۸۹۳ء میں قاہرہ کے ازبکیہ کلب میں جو لکچر دیا اس کا عنوان تھا: "مصریوں میں ایجادات کی قوت کیوں نہیں پائی جاتی؟" اس لکچر میں اس نے اس کا سب سے اہم سبب یہ بتایا کہ مصری تقریر و تحریر میں چونکہ فصیح عربی زبان استعمال کرتے ہیں اس لیے وہ دوسری قوموں سے پیچھے ہیں۔

اس کی تائید میں مصریوں کی طرف سے سب سے پہلی آواز سلامہ موسیٰ کی بلند ہوئی۔ جس نے عامی زبان کو تحریر و تقریر کے لیے اختیار کرنے کا مطالبہ کیا۔[1]

اس سے متاثر ہو کر محمد عثمان جلال نے فصیح عربی زبان کے بجائے مصری عوامی زبان میں مولیر کے ناول اور لافونتین کی کہانیوں کا ترجمہ کیا۔ لیکن شعرا کے حلقہ میں اس تحریک کو مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، انھوں نے محسوس کیا کہ اس طرح ہم اپنے قدیم ادبی سرمایہ سے محروم ہو جائیں گے، اور قرآن کریم کی زبان سے ہمارا تعلق ختم ہو جائے گا، اور مصری قوم دوسری عرب اقوام سے کٹ جائے گی۔

عوامی زبان کو رواج دینے کی تحریک کی ناکامی کا ایک اہم سبب یہ بھی ہوا کہ بارودی اور اس کے متبعین نے اپنی ادبی کوششوں سے یہ ثابت کر دیا کہ موجودہ ادبی انحطاط کا سبب عربی زبان نہیں بلکہ خود ہماری کوتاہی ہے، اس زبان میں بے پایاں وسعت و گیرائی ہے لیکن اس کو برتنے کا سلیقہ ہم میں نہیں ہے جس سے یہ ادبی انحطاط پیدا ہوا ہے۔

اس دور میں شیخ حسین المرصفی نے اپنی کتاب "الوسیلۃ الادبیۃ" لکھی جس میں موجودہ دور کے مزاج کا لحاظ کرتے ہوئے نحو، بلاغت اور عروض کے قواعد پر روشنی ڈالی اور جاہلی، اسلامی

---

[1] فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۴۰

اور عباسی دور کی شاعری کے نمونے پیش کیے، اس کتاب سے بارودی کے اسلوب کو تقویت ملی اور دوسرے ادبا و شعرا بھی اس سے متاثر ہوئے، جن میں شوقی، حافظ اور خلیل مطران کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں،

ان تینوں شعرا نے بارودی کی تحریک کو پروان چڑھایا، اور بارودی کی شاعری کے ساتھ ساتھ عباسی دور کی شاعری کا بھی گہرا مطالعہ کیا اور ان کے قابل تقلید نمونوں کو سامنے رکھکر اپنے فن کو اس سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی، عباسی دور کی شاعری کے تتبع کی بناء پر انھیں "محافظین" (قدامت پرست) کا نام دیا گیا، لیکن ان کے یہاں قدامت پرستی کا مفہوم یہ نہیں تھا کہ شاعر اپنے متقدمین کے افکار و خیالات اور اسلوب و طرز ادا کا نرا مقلد بنجائے اور اپنی فکری صلاحیتوں سے مطلقاً کام نہ لے۔ بلکہ وہ انھیں قدیم بنیادوں پر نئی عمارت تعمیر کرنا چاہتے تھے، ان کا مقصد تھا کہ قدیم ادبی مواد ہی کو سامنے رکھکر سماجی رجحانات کی اس طرح ترجمانی کیجائے کہ اسلوب بیان کا جلال و جمال باقی رہے، اس لیے جدید عربی ادب کی تاریخ میں شعراء کے اس طبقہ کو قدیم و جدید کے امتزاج کا بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اس نے عربی اسلوب اور موجودہ زمانہ کی روح کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی،[1]

جدید عربی شاعری پر بحث کرنے والوں کو یہ اہم حقیقت سامنے رکھنی چاہئے کہ قدیم عربی شاعری کی اشاعت آج کی طرح نہیں تھی، شاعر جب کوئی قصیدہ کہتا تھا تو وہ بہت محدود لوگوں تک پہنچ پاتا تھا، کیونکہ آج کی طرح تعلیم کا عام رواج اور اخبار و رسائل کی فراوانی نہیں تھی، اور شاعر کے پیش نظر صرف خلیفہ یا امراء یا تعلیم یافتہ طبقہ میں مقبولیت تھی جو اس کے قصیدے کے اولین مخاطب تھے، اس لیے وہ ان کے ذوق کے لحاظ سے اپنی شاعری تیار

[1] عمر الدسوقی: فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۳۱۵

نازک خیالات کو عمدہ الفاظ اور خوبصورت پیرایۂ بیان میں ادا کرنا اور ان سے انعام و اکرام پانے کی خواہش شاعر کو ان کی مدح سرائی پر مجبور کرتی تھی، جس سے شاعری مدح و ستائش کے محور پر گھومتی نظر آتی ہے،

لیکن موجودہ دور میں جونکہ تعلیم کا رواج اور نشر و اشاعت کے وسائل عام ہیں، اسلیے شعراء اخبارات، رسائل اور مطبوعہ دواوین کے ذریعہ سے براہ راست عوام کو خطاب کرتے ہیں، اس لیے اب شاعری پہلے کی طرح صرف امراء اور اونچے طبقہ کی میراث نہیں رہی، بلکہ اسے "عوامی" و "جمہوری" حیثیت حاصل ہوگئی ہے، اور ہر طبقہ شاعر کا مخاطب بن گیا ہے، مخصوص مدحیہ قصائد میں بھی شاعر عوام کو فراموش نہیں کرتا اور انھیں محظوظ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس سے شاعری میں یہ انقلاب پیدا ہوا کہ شعرا نے اپنے اسلوب بیان کو عوام سے قریب کیا، اور ابوتمام، ابوالعلاء کی طرح ندرت و تعقید سے گریز کرنے لگے، اس سلسلہ میں حافظ کا نام سب سے نمایاں ہے، شوقی اور مطران کے مقابلہ میں وہ عوام سے بہت زیادہ قریب اور ان کے احساسات وخیالات کے بہترین ترجمان ہیں، اس دور میں شعرا اپنے سے زیادہ جمہور کے رجحان وخیالات کو اہمیت دینے لگے، اور ان کے اولین مخاطب وہی تھے، جس طرح جاہلی دور کا شاعر اپنی ذات کو فراموش کرکے قبیلہ کی مدح اور اس کے کارناموں پر فخر کے لیے اپنے اشعار کو وقف کر دیتا تھا،[1]

مصر میں جب جمال الدین افغانی کی آمد کے بعد دینی اصلاح ہوئی، سامراج کی مخالفت کا سلسلہ شروع ہوا، لوگوں نے عثمانی خلافت سے امیدیں وابستہ کیں، اس طرح ایک عام سیاسی و اجتماعی بیداری پیدا ہوئی، اس وقت ان رجحانات کو شعرا نے اشعار میں نظم کیا اور ہر مسئلہ کی بہترین تصویر پیش کی ہے[2]

---

[1] فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۲۹ [2] ایضاً ج ۱ ص ۲۵۹

حافظ کے دیوان میں ان اشعار کو دیکھا جاسکتا ہے، جن میں انھوں نے شیخ محمد عبدہ کی دینی اصلاحات، عثمانی خلیفہ کی جنگ و فتوحات اور حضرت عمرؓ کی سیاست و فتوحات کا تذکرہ کیا ہے، اسی طرح شوقی نے بھی عثمانی خلافت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں جو اشعار لکھے ہیں، انکا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ کس طرح اس دور میں شعراء عوام کے جذبات و رجحانات سے ہم آہنگ ہوگئے تھے،

یورپ سے جب مشرق کا ربط قائم ہوا اور وہاں کی تہذیب سے مشرق کا ایک طبقہ متاثر ہوا تو اس تمدنی انقلاب کو بھی حافظ و شوقی نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا، اور جدید علمی ترقی کی مدح کی، اور نوجوانوں کو اس سے بہرہ اندوز ہونے پر ابھارا، یورپ کی ایجادات و اختراعات کا تذکرہ کیا، ہوائی و بحری جہاز اور اسی طرح دوسری جنگی و تعمیری آلات پر طبع آزمائی کی۔

ان کوششوں سے ادب و شعر میں بڑی ترقی ہوئی، اور شاعری کا دامن پہلے سے بہت وسیع ہوگیا شعراء اپنی ذات میں گم ہونے کے بجائے عوام کے جذبات و رجحانات کی ترجمانی اور انکے مسائل کو اپنے مسائل پر ترجیح دینے لگے، یہ خصوصیت حافظ و شوقی تک محدود نہیں تھی، بلکہ اس دور کے دوسرے شعرا بھی عوامی رجحانات کے ترجمان تھے، چنانچہ اسماعیل صبری، مصطفی صادق رافعی اور احمد محرم وغیرہ بھی اس خصوصیت کے مالک تھے، صبری کی شاعری میں عام طور پر وجدانی پہلو غالب ہے، پھر بھی ان کے ایسے قصیدے موجود ہیں، جن میں قومی شعور اور سامراج کے خلاف جد و جہد کے جذبات نمایاں ہیں، رافعی نے اپنی علمی زندگی کے ابتدائی حصہ میں تین اجزاء پر مشتمل جو دیوان شائع کیا تھا، اس میں مصر پر انگریزوں کے غاصبانہ اقتدار کے خلاف آواز اٹھائی، ان کے مظالم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اپنے ہموطنوں کی اسلامی و عربی غیرت کو بیدار کیا اور ان سماجی مقاصد کی جانب توجہ دلائی جو قوم کی ترقی

میں رکاوٹ ثابت ہو رہے تھے، احمد محرم نے بھی اپنے دیوان میں آزادی کے نغموں کو دہرایا اور انگریزوں کے خلاف جد و جہد کے لیے اپنی قوم کو آمادہ کرنے کی کوشش کی۔[۱] ان کے علاوہ دوسرے شعراء نے بھی بارودی کے تتبع میں مذکورہ رجحان کو ترقی دی، اور اس نئے موڑ پر شاعری کو اپنی صلاحیتوں سے بہت کچھ دیا، اسی مدت میں ایسے سیاسی حالات پیدا ہوئے جن سے قومی شعور کو مزید ترقی ہوئی، اور شعراء نے فلسطین کے المیہ کے بعد اپنی شاعری کو بڑی حد تک قومی شاعری کا روپ دیدیا،

حافظ و شوقی اور اس طرز کا تتبع کرنے والے دوسرے شعراء نے عربی شاعری کو جو ترقی دی اسکی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ انھوں نے ایک طرف عباسی دور کی قدیم شاعری کو وزن اور ساخت کے لحاظ سے باقی رکھا، دوسری طرف عوام کے احساس و شعور کی ترجمانی کی۔

اس تحریک نے جدید عربی شاعری میں مصر کا درجہ بہت بلند کر دیا، قدیم زمانہ میں دوسرے عرب ممالک شاعری کے میدان میں مصر سے آگے تھے، اموی دور میں حجاز و عراق، عباسی دور میں عراق، سیف الدولہ کے عہد میں شام اور طوائف الملوکی کے دور میں اندلس کا درجہ مصر سے آگے تھا، مصر نے اس طویل مدت میں شاعری میں کوئی خاص کارنامہ انجام نہیں دیا،

لیکن جب شاعری کا جدید دور شروع ہوا اور مصر میں بارودی، شوقی اور حافظ وغیرہ شعراء پیدا ہوئے تو پھر مصر کا پلہ... دوسرے عرب ملکوں سے بھاری ہوگیا اور وہ مصری شعراء کی خوشہ چینی کرنے لگے۔[۲]

حالاتِ زندگی | جدید عربی ادب کی تاریخ میں شوقی سب سے زیادہ مشہور اور ممتاز شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں، ان کے ادبی کارنامے مختلف فنی پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں، قصائد اور نظموں کے علاوہ منظوم ڈراموں میں بھی انھیں بڑی کامیابی حاصل ہوئی جب کبھی وہ

---

[۱] عمر الدسوقی: فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۱۵۰ و مابعدہا [۲] ڈاکٹر شوقی ضیف: الادب العربی المعاصر

کوئی قصیدہ لکھتے تھے تو تمام اخبارات ورسائل اور ادبی مجلسوں میں اس کا تذکرہ ہوتا تھا،

ان کی اس اہمیت کے پیش نظر ان کے دور کے دوسرے ادبا، ونقاد ان کے کلام پر تبصرہ کرتے تھے کہ اس طرح وہ بھی شہرت ومقبولیت کا مقام حاصل کرسکیں، ان کی زندگی ہی میں انکی ناقدین دو۲ حصوں میں بٹ گئے تھے، ایک جماعت شوقی کی حمایت اور دوسری ان کی مخالفت میں سرگرم تھی، اور آج بھی یہ دونوں موجود ہیں، اور ان کا قلمی معرکہ جاری ہے،

شوقی ۱۸۶۹ء میں مصر کے ایک مالدار گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے والدین خالص عربی النسل نہیں تھے، تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ والد ترکی اور چرکسی نسل سے اور والدہ ترکی اور یونانی نسل سے تعلق رکھتی تھیں، ان مختلف عناصر کے امتزاج سے عربی زبان کا ایسا زبردست شاعر پیدا ہوا جو اپنے نغموں سے پوری عرب دنیا کو وجد میں لے آیا،

شوقی کے دادا احمد شوقی جن کے نام پر شوقی کا نام رکھا گیا، محمد علی کے زمانہ میں مصر آئے تھے، اور عربی وترکی میں مہارت کی وجہ سے محمد علی نے انھیں اپنے حاشیہ نشینوں میں شامل کرلیا تھا، سعید پاشا کے زمانہ میں انھیں مصری کسٹم کا انچارج بنا دیا گیا، انھوں نے وفات کے بعد بہت زیادہ دولت چھوڑی، جس سے شوقی کے والد علی اور خود شوقی بھی مستفید ہوئے،

شوقی کی تربیت ان کی نانی نے کی، جو نسلاً یونانی تھیں، قصر شاہی سے ان کا گہرا تعلق تھا، ایک مرتبہ یہ اپنے نواسہ کو لیکر اسماعیل پاشا کے پاس گئیں، اس وقت شوقی کی عمر تین سال کی تھی، اسماعیل نے دیکھا کہ معصوم بچہ نیچے دیکھنے کے بجائے برابر آسمان کی طرف تک رہا ہے، یہ دیکھکر اس نے سونے کی ایک تھیلی طلب کی اور اسے فرش پر بکھیر دیا، یہ دیکھکر شوقی گردے اترا شرفیوں سے کھیلنے لگے، اسماعیل نے شوقی کی نانی کو مخاطب کرکے کہا کہ تم بھی یہی ترکیب کرو تاکہ یہ بچہ زمین کی طرف دیکھنے کا عادی ہوجائے، نانی نے برجستہ جواب دیا کہ یہ علاج صرف آپ ہی کے یہاں مل سکتا ہے۔

اسماعیل نے کہا کہ تم جب چاہو اسے میرے پاس لے آؤ، میں اس کے قدموں پر سونا بکھیر دوں گا۔

تین سال کی عمر میں بادشاہ وقت کا شوقی کے قدموں پر اشرفیاں بکھیرنا فال نیک ثابت ہوا، اور شوقی زندگی بھر عیش و تنعم کی فضا میں سانس لیتے رہے، اور شعر و شاعری کے لیے انھیں ہر طرح کی فارغ البالی میسر رہی۔

چار سال کی عمر سے مکتب و مدرسہ کا سلسلہ شروع ہوا، پندرہ سال کی عمر میں مدرسہ تجہیزیہ سے ثانوی تعلیم پوری کی اور کامیابی کا انعام حاصل کیا، یہ تعلیم ازہر کی دینی تعلیم سے مختلف تھی، اس کا طریقہ وہی تھا جو یورپ میں رائج ہے اور جسے "دنیوی تعلیم" سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۱۸۸۵ء میں ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد شوقی کے والد نے انھیں قانون کی تعلیم کیلئے "مدرسۃ الحقوق" میں داخل کر دیا، ایک تذکرہ نویس لکھتے ہیں: شوقی مدرسہ میں اپنے ساتھیوں سے مختلف پرسکون مطالعہ کرتے رہتے، ہر چیز پر مستفسرانہ نگاہ ڈالتے تھے، معلوم ہوتا تھا جی ہی جی میں باتیں کر رہے ہیں، کھیل کود سے دلچسپی کے بجائے غور و فکر کی گہرائیوں میں کھوئے رہتے تھے۔[1]

اس مدرسہ میں عربی زبان کے استاد شیخ محمد بسیونی سے شوقی کا تعلق پیدا ہوا، استاد نے پہلی ہی نظر میں شاگرد کی فنی صلاحیتوں کو تاڑ لیا، شیخ محمد خدیوی توفیق کی مدح میں قصیدے لکھا کرتے تھے، جنھیں شائع کرنے سے پہلے شوقی کو ضرور دکھاتے تھے، اور شوقی اکثر ان میں اصلاح و ترمیم بھی کر دیتے تھے، استاد کی شاعری کا رنگ دیکھ کر شوقی نے بھی خدیوی توفیق کی مدح میں قصائد لکھنے شروع کر دیے۔

جب اس مدرسہ میں ترجمہ کا ایک شعبہ قائم ہوا تو شوقی نے اس کی بھی سند حاصل کی، یہ نصاب دو سال کا تھا، اس کو پورا کرنے کے بعد شوقی کو فرانسیسی زبان پر قدرت حاصل ہو گئی اور بعد

---

[1] احمد ذکی: ذکری الشاعرین: حافظ و شوقی ص ۳۲۷

میں اس سے ان کی شاعری کو جلا ملی۔

دوسری طرف گھر کے ماحول کی وجہ سے ترکی زبان پر بھی عبور حاصل تھا، اس طرح ابتدائے شباب ہی میں وہ تین زبانوں کے عالم ہوگئے، اس مدرسہ میں شیخ محمد بسیونی کے اثر سے شوقی میں ازہر کا دینیا رجحان بھی پیدا ہو چکا تھا،

۱۸۸۵ء میں جب شوقی ترجمہ کے شعبے سے فارغ ہوئے تو خدیوی توفیق نے انھیں دربار میں ملازم رکھ لیا، پھر قانون کی تعلیم مکمل کرنے کے لیے فرانس بھیج دیا، جہاں چار سال مسلسل قیام کرکے شوقی نے قانون کی تعلیم مکمل کی، فرانس کے دوران قیام میں انھیں انگلستان بھی جانے کا موقع ملا، فرانس میں مغربی تہذیب و تمدن، اور علمی و ادبی سرگرمیوں کا شوقی پر خاصا اثر پڑا، قانون کی کتابوں کے علاوہ شوقی نے مختلف شعراء اور ادبا کی کتابوں اور دواوین کو پڑھا اور شعر و شاعری کے نئے نمونوں سے آشنا ہوئے۔ فرانس میں قیام کے دوران بھی شوقی خدیوی توفیق کی شان میں مدحیہ قصائد لکھکر بھیجتے رہتے تھے، اور قصر شاہی سے اپنا ربط باقی رکھا تھا۔ (باقی)

(ہماری نئی کتاب)

اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں

مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم نے عربی میں الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند کے نام سے ہندستانی علما و مصنفین کی تصانیف کی ایک فہرست مرتب کی تھی، جو شام کے مشہور علمی ادارے المجمع العلمی العربی دمشق کی جانب سے شائع ہو چکی ہے، یہ اس کتاب کا ترجمہ ہے جس میں ہندستانی علما کی تصانیف کے ساتھ ضمناً ہندستانی مسلمانوں کی مکمل علمی، تعلیمی اور ذہنی و فکری تاریخ بھی آگئی ہے۔

از مولانا ابوالعرفان صاحب ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ قیمت: عہ

منیجر

صحابۂ کرامؓ کی عدالت

از جناب مولانا غلام محمد صاحب نورگت مدیر رسالہ تبلیغ سورت

دسمبر ۱۹۶۹ء کے رسالہ "معارف" میں کتاب فن اسماء الرجال مؤلفہ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری پر تعارف و تبصرہ نظر سے گذرا، قطع نظر اس غیر معتدل[1] انداز تبصرہ کے جو مولوی ضیاء الدین اصلاحی صاحب نے اختیار کیا ہے، اس میں بعض ایسی غلطیاں اور فروگذاشتیں کر ڈالی ہے[2] جو معارف جیسے بلند پایہ علمی و تحقیقی اور موقر رسالہ کی شایہ سے بعید ہے[3]۔

مثال کے طور پر اصلاحی صاحب لکھتے ہیں: ص ۹۱ پر محمد بن ظاہر[4] کا نام محمد طاہر لکھا گیا ہے جو غلط ہے"۔ درحقیقت ص ۹۱ پر مولف نے شیخ محمد[5] طاہر پٹنی کی کتاب "المغنی[6] فی اسماء رجال الحدیث" کا تعارف کرایا ہے، اس پر اصلاحی صاحب کی تنقید بالکل طفلانہ[7] ہے، اس لیے کہ شیخ محمد طاہر پٹنی کے اسم گرامی سے ہر حدیث کا مبتدی[8] طالب علم واقف ہے[9]۔ ان کے نام کو محمد بن ظاہر[10] قرار دینا غلط ہے، اگر اسکے لیے انھوں نے الثقافۃ الاسلامیۃ

---

[1] جن غیر معتدل باتوں سے قطع نظر کیا گیا ہے، وہ یہ ہیں کہ مصنف اور کتاب کی تعریف، اسکے مباحث کا اجمالی تعارف، حضرت عمرؓ کے زیر بحث قول میں مصنف کے نقل کی تین غلطیاں اور بعض حوالوں کے متعلق یہ صراحت کہ مصنف نے ان کو جن باتوں کے ثبوت میں پیش کیا ہے، وہ ان حوالوں سے ثابت نہیں ہوتیں، رہیں وہ غیر معتدل باتیں جنکا مضمون نگار نے آگے ذکر کیا ہے، ان کی حقیقت ان کے موقع و محل پر ظاہر کیجائیگی [2] اسکی حقیقت بھی آگے واضح ہو جائیگی [3] "کر ڈالی ہے" اور "شایہ سے بعید ہے" یہ شایہ کیا چیز ہے، دونوں جگہ ہے کے بجائے "ہیں" ہونا چاہیے [4] کتابت کی غلطی سے ظاہر (بالظاء) جو گیا، تبصرہ میں محمد بن طاہر (بالطاء) لکھا گیا تھا [5] محمد طاہر غلط، صحیح محمد بن طاہر ہے، [6] المغنی کو المغنی لکھا گیا ہے [7] تنقید طفلانہ نہیں درست تھی، البتہ محمد بن طاہر اور محمد طاہر میں فرق نہ کرنا ضرور طفلانہ بات ہے [8] "ہر حدیث کا مبتدی طالب" غلط ہے، صحیح حدیث کا ہر مبتدی طالب علم ہونا چاہیے۔ [9] مگر مضمون نگار تو صحیح نام سے واقف نہیں ہیں، [10] ظاہر (بالظاء) میں کتابت کی غلطی بالکل نہ ہے۔

فی الہند[1]، یا مقدمہ تحفۃ[2] الاحوذی یا کم ازکم مولانا احمد رضا بجنوری کی تذکرۃ المحدثین[3] ہی کا مطالعہ کیا ہوتا تو بھی صحیح نام معلوم[4] ہوسکتا تھا۔

اسی طرح وہ لکھتے ہیں کہ "اردو میں اس موضوع پر ضمناً بہت لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ہی اس سے بالکل متضاد اور خلاف واقعہ بات فرماتے ہیں کہ سیرۃ النبیؐ جلد اول اور خطبات مدراس میں اس پر تفصیلی[5] کلام کیا گیا ہے۔

ان فروگذاشتوں[6] کے علاوہ انھوں نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے بارے میں جو نامناسب کلمات تحریر کیے ہیں، اس[7] سے صحابہ کرامؓ کی عدالت مجروح[8] ہوتی ہے۔

---

[1] الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند میں چار جگہ صفحات ۱۳۰، ۱۵۷، ۱۵۸ اور ۱۶۰ پر محمد طاہر کے بجائے محمد بن طاہر درج ہے جس کو دیکھا جا سکتا ہے [2] صاحب مقدمہ مولانا عبدالرحمن مبارکپوری ص ۱۰۹ پر لکھتے ہیں "محمد طاہر ہذا ہو شیخ الاسلام، حجۃ الاسلام جمال الدین الشیخ محمد بن طاہر بن علی الصدیقی الفتنی" اس سے بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ صحیح کون ہے؟ محمد طاہر غلط العوام ہے۔ [3] یہ کتاب نظر سے نہیں گذری لیکن گجرات کی تاریخ کے نامور محقق مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم نے شیخ کے پوتے عبدالوہاب کے رسالہ "مناقب" کا جو شیخ کے حالات میں ہے، اردو ترجمہ کیا ہے، اسکے شروع میں خود مترجم کے قلم سے بھی شیخ کے مفصل حالات درج ہیں اور ص ۱۱ تا ۱۳ پر انکے نام کی تحقیق کرکے محمد بن طاہر کو صحیح اور محمد طاہر کو غلط قرار دیا گیا ہے، اور اس غلطی کے اسباب بھی لکھے گئے ہیں، یہ رسالہ ندوۃ المصنفین دہلی سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا، آپ اس کو ملاحظہ فرما لیتے تو پتہ چل جاتا کہ محمد بن طاہر اور محمد طاہر میں واقعی کون صحیح ہے [4] صحیح نام سے واقف ہونا اس شخص کے لیے ضروری ہے جو محمد بن طاہر کے بجائے محمد طاہر کو صحیح قرار دینے پر مصر ہو [5] دونوں باتوں کو متضاد اور خلاف واقعہ قرار دینا مضمون نگار کے قصور فہم کا نتیجہ ہے، انھوں نے ضمنی اور تفصیلی کے مفہوم ہی کو نہیں سمجھا، سیرۃ النبی کے مقدمہ میں روایت و درایت کے اصولوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و واقعات کے استقصاء میں مسلمانوں کی جامعیت و احتیاط، اس سلسلہ کے تحریری سرمایوں وغیرہ کا اور خطبات مدراس کے ایک خطبہ میں "سیرت نبوی کا تاریخی پہلو" کے زیر عنوان محدثین کے اس عظیم الشان کارنامہ کا جو انھوں نے احادیث کے ضبط و حفاظت نقل و روایت اور جمع و تدوین میں کی ہے اتنا مفصل ذکر ہے کہ اس پر مولف فن اسماء الرجال بھی کوئی خاص اضافہ نہیں کرسکے ہیں، لیکن ان دونوں کتابوں کا اصل موضوع سیرت نبوی ہے، یہ بحثیں ضمنی ہیں، اسلیے رجال کے متعلق انکی بحثوں کو مفصل ہونے کے باوجود ضمنی لکھا گیا تھا اور مولانا تقی الدین کی کتاب اسی موضوع پر ہے، اسلیے اسکو مستقل قرار دیا گیا تھا۔ [6] ناظرین خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ فروگذاشتیں کس نے کی ہیں؟ [7] "اس سے" کے بجائے "ان سے" ہونا چاہیے۔
[8] مضمون نگار نے "عدالت صحابہ" کی بحث یہ فرض کرکے کی ہے کہ نعوذ باللہ تبصرہ نگار نے ایک جلیل القدر صحابی اور مقدس
(باقی ص ۲۲۲ پر)

حالانکہ جمہور فقہاء و محدثین کا ان کے بارے میں فیصلہ ہے "الصحابۃ کلھم عدول" صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پوری جماعت روایت حدیث میں عادل ہے۔

لگایا تھا مالی نے ایک[1] باغ ایسا
نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا

مولف فن اسماء الرجال نے قرآن وحدیث کی روشنی میں ان حضرات صحابہ کرامؓ کے مقام و مرتبہ کو بتایا ہے، اور یہ لکھا ہے کہ ان میں بعض حضرات سے لغزشوں کا صدور بھی ہوا ہے، اور مراد معنی کی تعیین میں

(بقیہ ص ۲۲۲) صحابیہ کی عظمت و احترام کو ملحوظ رکھکر عدالت صحابہ کو مجروح کیا ہے، جو سراسر غلط فہمی ہے، میری تحریر کا تعلق نہ عدالت صحابہ سے ہے اور نہ میں نے کذب بمعنی اخطاء کے اجماع کا انکار کیا ہے بلکہ اس تحریر کا تعلق صرف مولانا تقی الدین کی اس دلیل سے ہے جو انھوں نے کذب بمعنی اخطاء کیلئے حضرت عمرؓ کے قول سے قائم کی تھی، میری ناچیز رائے میں حضرت عمرؓ کا قول جس سیاق وسباق میں نقل کیا گیا تھا، اس سے فاضل مصنف کا یہ مقصد کہ کذب بمعنی اخطاء پر اتفاق ہے، ثابت نہیں ہوتا، گو اصلاً صحیح ہے بلکہ اس سے اسکا نقض ثابت ہوتا تھا، معلوم نہیں فاضل تنقید نگار نے اس سے یہ نتیجہ کس طرح نکال لیا کہ میں نے کذب کے اخطاء کے معنی میں ہونے کا انکار کیا ہے، فرض کیجئے اگر قرآن مجید کی کسی آیت کا برمحل استعمال نہ کیا گیا ہو اور اسکے بارہ میں یہ کہا جائے کہ قائل کے مقصد کی اس سے تائید نہیں بلکہ تردید ہوتی ہے تو کیا اسکو آیت کا انکار کہا جائیگا، مضمون نگار کو صرف اس حیثیت سے بحث کرنے کی ضرورت تھی کہ حضرت عمرؓ کے قول سے مولانا تقی الدین کے اس مدعا کی کہ "کذب بمعنی اخطاء پر اتفاق ہے" کی تائید ہوتی ہے یا نہیں؟ میرے خیال میں نہیں ہوتی، کیونکہ انھوں نے حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں (لا ندری احفظت او نسیت) غور فرمایئے کہ جب اس میں "کذب" کا لفظ ہی موجود نہیں ہے، تو وہ اخطاء کے معنی میں کس طرح ہو جائیگا بلکہ اس سے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک "کذب" کا "اخطاء" کے معنی میں ہونا مسلم اور ثابت نہیں تھا، اسلیے انھوں نے اسکے بجائے نسیان کا لفظ فرمایا، لیکن ظاہر ہے کہ اس بحث کا تعلق صرف مصنف کی تحریر کے استشہاد سے تھا، اسکا ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ کذب کو اخطاء کے معنی میں لینا ہی غلط ہے، یا العیاذ باللہ حضرت عمرؓ نے حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کو جھوٹا قرار دیا تھا۔

رہی یہ بحث کہ واقعۃً حضرت عمرؓ کے الفاظ کیا تھے تو زیادہ صحیح و ثابت الفاظ حفظ و نسیان ہی معلوم ہوتے ہیں، جیسا کہ مولانا تقی الدین صاحب نے نقل کیا ہے اور صحاح اور سنن کے بعض مجموعوں میں بھی یہی پائے جاتے ہیں، لیکن صدق و کذب کے الفاظ کی روایت بھی کی گئی ہے، جیسا کہ مضمون نگار نے شرح معانی الآثار اور نصب الرایہ سے نقل کیا ہے، لیکن ہماری گفتگو حفظ و نسیان ہی کے الفاظ پر مبنی تھی، کیونکہ مولانا نے انہی کو نقل فرمایا تھا، اگر وہ صدق و کذب کے الفاظ نقل فرماتے تو بلا شبہہ انکا مقصد ثابت ہو جاتا، حقیقت یہ ہے کہ اگر حضرت عمرؓ کے الفاظ "حفظت" "ام نسیت" ہی کو مد نظر رکھا جائے تو حضرت فاطمہؓ کی بھول چوک بھی قطعی اور یقینی طور پر ثابت نہ ہوگی چہ جائیکہ جھوٹ اور غلط بیانی۔ اسکی مزید وضاحت آگے کیجائیگی۔

[1] اگر مولانا تقی الدین کی کتاب سامنے رکھکر مضمون نگار نے مولانا حالی مرحوم کا شعر نقل کیا ہوتا تو "اک" کی جگہ "ایک" کی غلطی نہ ہوتی۔

(حاشیہ:) یہ قول جامع ترمذی کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے لیکن ترمذی نے "او" کے بجائے "ام" کی روایت کی ہے۔

ان میں باہم اختلاف بھی رہا ہے، مگر کسی صحابی نے کسی دوسرے صحابی پر کذب علی النبی کا الزام نہیں لگایا، اور نہ کسی صحابی سے کذب علی النبی ثابت ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :-

واللہ ماکنا نکذب ولا کنا ندری ما الکذب (الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع ص۱۶)	واللہ نہ ہم جھوٹ بولتے تھے اور نہ ہی ہم جانتے تھے کہ کذب کسے کہتے ہیں۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :-

لیس کلنا کان یسمع حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانت لنا ضیعۃ واشغال ولکن الناس لم یکونوا یکذبون یومئذ فیحدث الشاهد الغائب (المحدث الفاضل ج ۳ ص ۲۳۲ و ۲۳۳)	ہم میں سے سبھی لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو نہیں سن سکتے تھے ، ہمارے پاس جائداد اور بہت سے مشاغل تھے، لیکن اس وقت لوگ (صحابہ کرام) جھوٹ نہیں بول سکتے تھے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو حاضر غائب سے بیان کرتا تھا)

صحابہ کرام جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث وسنت کے اولین رُواۃ اور واقعات کے چشم دید گواہ ہیں، ان کی عقل، رزانت ومتانت پر ان کے کارنامے شاہد عدل ہیں، مرادِ معنی کی تعیین میں ان کا باہم اختلاف ہوا ہے، اور خطأ اجتہادی بھی ان سے واقع ہوئی ہے، مگر اس کی ایک مثال بھی نہیں پیش کی جاسکتی کہ کسی صحابیؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی بات منسوب کرکے بیان کی ہو،[1] جب فاطمہ بنت قیسؓ کی طلاق والی حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کی گئی تو فاروق اعظمؓ نے اس کو قرآن وسنت نبوی کے خلاف سمجھتے ہوئے بھی بھول چوک اور نسیان سے آگے کوئی بات ان کی روایت کے متعلق نہیں فرمائی۔

مؤلف فنِ اسماء الرجال نے لکھا ہے، اسی لیے علماء امت کا اتفاق ہے کہ اگر ایک صحابی

---

[1] فاضل مصنف کے ان خیالات سے تبصرہ نگار نے کسی قسم کا اختلاف نہیں ظاہر کیا تھا،

دوسرے صحابیؓ کے لیے "کذب فلان" کہے تو اس سے جھوٹ کے معروف معنی مراد نہیں ہوتے، بلکہ اسکے معنی خطأ اجتہادی کے ہیں۔[۱]

اس کے بعد اب اصلاحی صاحب کا تبصرہ و تنقید پڑھیے، وہ لکھتے ہیں: ص ۷۱ "یہ کذب بمعنی خطأ کو علماے امت کا متفقہ قول قرار دیا گیا ہے، حالانکہ حضرت عمرؓ کا قول[۲] خود اس اجماع کے ناقض ہے الخ"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اصلاحی صاحب کے خیال میں حضرت فاطمہؓ سے خطأ اجتہادی یا بھول چوک نہیں ہوئی ہے، بلکہ حضرت عمرؓ نے ان کے[۳] روایت کی تردید اسلیے کہ وہ دانستہ کذب علی النبی کی مرتکب ہوئی تھیں،[۴] سب سے پہلے ہمیں حضرت عمرؓ کے الفاظ پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے کہ کس[۵] الفاظ سے انھوں نے تردید فرمائی ہے، تاکہ حضرت عمرؓ کے ارشاد کا مطلب بسہولت متعین ہو جائے، ان کے الفاظ روایت حدیث میں مختلف بیان کیے گئے ہیں، مثلاً لا ندع کتاب ربنا ولا سنة نبينا بقول امرأة لا ندري صدقت ام كذبت، حفظت ام نسيت (نصب الرایہ ج ۲ ص ۲۷۳)

صحیح مسلم میں لعلها حفظت او نسيت (ج ۲ ص ۴۸۵) کے الفاظ ملتے ہیں،

امام طحاوی نے "لعلها كذبت" کے الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، مگر اسی صفحہ پر دوسری سند سے لعلها اوهمت کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں (شرح معانی الآثار ج ۲ ص ۳۹)

---

۱ لیکن فاضل مصنف نے حضرت عمرؓ کے جو الفاظ نقل فرمائے ہیں ان میں کذب کا لفظ موجود نہیں ہے اس لیے اسکے خطأ اجتہادی کے معنی میں ہونے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا ۲ "تبصرہ میں" "کا" لکھا گیا تھا "کے" فاضل ناقد کی اصلاح ہے، اور ناقض قرار دینے کا منشا یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کا قول مولف کے مدعا کا ناقض ہے، اس سے بحث نہیں تھی فی الواقع مسئلہ کیا ہے؟ ۳ "کے" کی جگہ "کی" ہونا چاہیے ۴ لیکن حضرت عمرؓ کے جو الفاظ لائق مصنف نے نقل کیے ہیں یعنی "حفظت ام نسیت" ان سے تو کذب کا کوئی احتمال ہی نہیں ہوتا بلکہ بھول چوک کے ساتھ اس کا بھی خفیف احتمال ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے حدیث کو بالکل ٹھیک بیان کیا ہو کیونکہ لفظ "حفظت" کا یہی اقتضا ہے اور اسی بنا پر امام احمدؒ کا فتوی اس حدیث کے مطابق ہے، یا حدیث ٹھیک بیان کرنے کے باوجود ان کو یہ غلط فہمی ہوئی ہو کہ جو حکم ان کے مخصوص حالات کے پیش نظر ان ہی کے لیے خاص تھا، اس کو انھوں نے عام قرار دیدیا جب حضرت فاطمہؓ سے ہمارے حسن ظن کا یہ حال ہے تو ہم ان کو جھوٹا کس طرح قرار دے سکتے ہیں ۵ "کس" الفاظ کے بجائے "کن" الفاظ ہونا چاہیے۔

ان الفاظ[1] پر معمولی غور و فکر کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اس روایت میں کَذَبَتْ کو حضرت عمرؓ نے بھول چوک و خطأ اجتہادی[2] ہے کہ معنی میں استعمال فرمایا ہے، علامہ شیخ محمد طاہر پٹنی نے اپنی مشہور کتاب مجمع بحار الانوار (ج ۳ ص ۲۰۲) میں لکھا ہے کہ اسی طرح حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ حضرت سمرةؓ سے فرمایا کَذَبْتَ، شیخ فرماتے ہیں کہ یہاں حضرت عمرؓ نے "کَذَبْتَ" کو "اخطأت" کے معنی میں استعمال فرمایا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے، کلام عرب میں کذب کا استعمال خطا کی جگہ پر کیا گیا ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے ابن حبان کی کتاب الثقات کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے "اھل الحجاز یطلقون کَذَبَ فی موضع اخطأ" اہل حجاز اخطا کی جگہ پر کذب کا اطلاق کرتے ہیں، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ عبادہ بن صامتؓ سے جب یہ بتایا گیا کہ ابو محمدؓ وتر کو واجب کہتے ہیں تو انھوں نے فرمایا "کذب ابو محمد" عبادةؓ کے کہنے کا مطلب یہی تھا کہ ابو محمدؓ نے کسی روایت سے یہ نقل نہیں کیا ہے بلکہ اپنے اجتہاد سے کہا ہے، مجتہد کے لیے کذب نہیں کہا جائے گا[3] بلکہ اخطأ ہی کہا جائے گا، حافظ ابن عبد البر مالکی نے اس کی کئی مثالیں نقل کی ہیں۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۴۲۶)

حضرت فاطمہؓ بنت قیس بھی مجتہد تھیں، اس لیے ان کے لیے حضرت عمرؓ نے جب صدقت ام کذبت فرمایا تو یہاں حضرت عمرؓ کذب کے معروف معنی مراد نہیں لیے ہیں، بلکہ خطأ اجتہادی ہی مراد لیا ہے[4]،

حضرت فاطمہؓ بنت قیس کی روایت پر ایک دوسری حیثیت سے غور کرنے کی بھی ضرورت ہے، وہ یہ کہ جس مسئلہ میں حضرت عمرؓ نے ان کی تردید فرمائی ہے وہ مسئلہ یہ ہے مطلقہ ثلاثہ غیر حامل کے نفقہ و سکنی[5] شوہر کے ذمے واجب ہے یا نہیں؟ حضرت عمرؓ اور اکثر صحابۂ کرامؓ اور ائمہ میں امام ابو حنیفہؒ نے واجب بتایا ہے، ابن عباسؓ امام احمد کے نزدیک دونوں میں سے کوئی چیز بھی شوہر کے ذمہ واجب نہیں ہے، امام شافعی

---

[1] مؤلف نے کذبت نہیں لکھا تھا بلکہ نسیت لکھا تھا اور اسی کے پیش نظر تنقید کی گئی تھی [2] "ہے" کے بجائے "ہی" ہونا چاہیے [3] حضرت عبادہ بن صامتؓ کی حدیث مؤلف رسالہ نے نہیں نقل کی تھی [4] مولف نے تو "نسیت" لکھا تھا [5] "یہاں" کا "صحیح ہوگا۔

و امام مالکؒ کے نزدیک صرف سکنیٰ شوہر کے ذمہ واجب ہے، نفقہ واجب نہیں ہے (دیکھو کتاب مذکور ج ۱ ص ۳۴۸ و شرح نووی صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۸۳)
ائمہ میں امام احمد کا عمل حضرت فاطمہؓ کی حدیث پر ہے، اور جن حضرات ائمہ نے حضرت فاطمہؓ کی حدیث پر عمل نہیں کیا ہے، ان لوگوں نے حضرت فاطمہؓ کی حدیث کی جو توجیہات بیان کی ہیں ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہؓ کو غلط فہمی ہوگئی تھی، شیخ ابن ہمام شارح ہدایہ نے حضرت فاطمہؓ کی حدیث کو شاذ بتایا ہے، اسکی تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "ان الاشتغال بذلک حسن حملاً للروایۃ علی الصحۃ" اس حدیث کو صحت پر محمول کرکے اسکی توجیہ بیان کر دینا بہتر ہے، انکی توجیہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت فاطمہؓ چونکہ زبان کی تیز تھیں اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حضرت عبداللہؓ بن مکتوم کے مکان میں منتقل کر دیا تھا، تاکہ گھر والوں سے جھگڑا ختم ہو جائے، جیسا کہ سنن ابی داؤد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، اسی طرح مسلم کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے، ان کے شوہر تین طلاق دے کر یمن چلے گئے تھے، اور انکے مکان میں چند قفیز جَو کے سوا اور کچھ نہیں تھا، یہ زیادہ کا مطالبہ کر رہی تھیں، اس لیے گھر والوں نے کہا کہ آپ کا نفقہ ہمارے ذمہ نہیں ہے، جب حضورؐ تک معاملہ پہنچا تو آپؐ نے کہا کہ "لا نفقۃ لک"۔ اس لیے انھیں غلط فہمی ہوئی کہ مطلقہ ثلاثہ غیر حامل کے لیے سکنیٰ و نفقہ نہیں ہے۔ (فتح القدیر ج ۳ ص ۳۴۰ و بذل المجہود ج ۳ ص ۱۱۴)

بہرحال کسی امام نے بھی کَذَبَتْ سے کذب کے معروف معنی مراد نہیں لیے ہیں، اب یہ مسئلہ صاف واضح ہوکر سامنے آگیا کہ جب کوئی صحابیؓ دوسرے صحابی کے لیے "کذب فلان" فرمائیں تو اس سے کذب کے معروف معنی مراد نہیں لیے جاسکتے،[۱] مؤلف فن اسماء الرجال نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے کہ اس پر جمہور کا اتفاق ہے، حدیث نبوی میں کذب بیانی کو اکبر الکبائر میں شمار کیا گیا ہے، اس لیے کسی صحابی کے بارے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، مؤلف نے اپنی کتاب میں حافظ ابن کثیر کے حوالہ سے یہ بات بھی لکھی ہے: "وہ لوگ جن کے متعلق ثابت ہو جائے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی بات منسوب کرکے بیان کرتے ہیں، اس پر اجماع ہے کہ ایسے لوگوں کی روایت نہیں لیجائے گی۔"[۲]

---

[۱] مجھکو اس سے اختلاف نہیں ہے [۲] "وہ لوگ جن کے متعلق ...... نہیں لیجائے گی" جملہ صحیح نہیں ہے۔

اور یہ کذب علی النبیؐ اکبر الکبائر ہے، بلکہ علماء کی ایک جماعت نے ایسے شخص کی تکفیر کی ہو، اور ایک دوسری جماعت نے اس کو واجب القتل قرار دیا ہے۔ (اختصار علوم الحدیث ص ۱۰۱)

جب کذب علی النبیؐ اکبر الکبائر ہے اور ایسے لوگوں کی روایت کے مردود ہونے پر اجماع ہے، بلکہ ایسے شخص کی تکفیر کی گئی اور واجب القتل تک قرار دیا گیا تو پھر کیسے ممکن تھا کہ حضرت عمرؓ حضرت فاطمہؓ کو اس کا مرتکب قرار دیتے، جمہور محدثین و فقہاء نے تو صحابہ کرامؓ کے بارے میں "الصحابۃ کلھم عدول" کا فیصلہ کیا ہے[۱]، ان پر جرح و تنقید جائز قرار نہیں دی گئی۔

اصلاحی صاحب نے حضرت عمرؓ کے قول کا جو مطلب[۲] بیان کرنا چاہا ہے، وہ حضرت عمرؓ پر بھی افتراء ہے[۳]، اور صحابیہؓ کی شان میں بھی گستاخی[۴]، صحابہ کرامؓ کے بارے میں امام الحرمین فرماتے ہیں کہ "ان حضرات صحابہ کی عدالت میں غور و فکر نہ کرنے کا سبب یہی ہے کہ یہی حضرات درحقیقت شریعت کے حامل ہیں، پس اگر ان کی روایت میں بھی توقف کیا جائے تو شریعت آپؐ ہی کے عہد کے ساتھ منحصر ہو کر رہ جائے گی، اور آپؐ کے وصال کے بعد دین و شریعت کی بنیاد ہی باقی نہیں رہے گی۔" (تدریب الراوی طبع قدیم ص ۲۰۴)

اصلاحی صاحب کی غلط تنقید[۵] سے صحابہ کرامؓ کے متعلق جو غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی، امید ہے کہ میری ان مختصر معروضات سے ان کا ازالہ ہو جائے گا[۶]۔

اللھم وفقنا لما تحب وترضی واجعل آخرتنا فی الاولیٰ[۷]۔ فقط والسلام

---

[۱] میں عدالت صحابہ کا منکر نہیں ہوں [۲] اس مطلب کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے [۳] معاذ اللہ [۴] نعوذ باللہ [۵] اس وضاحت کے بعد غالباً وہ "غلط تنقید" نہیں سمجھی جائے گی [۶] مضمون نگار کی معروضات خود غلط فہمی پر مبنی تھیں، خدا کرے وہ دور ہو گئی ہو۔ [۷] آمین (ضیاء الدین اصلاحی)

وفیات

ڈاکٹر اسحٰق مرحوم

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو نام ونمود کے لیے سرگرداں رہتے ہیں، لیکن یہ اُن سے گریزاں رہتی ہے، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس کے خواہاں تو نہیں ہوتے لیکن یہ ان کے پیچھے لگی رہتی ہے، اور وہ نہ صرف اپنے معاصروں اور ہم چشموں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، بلکہ اپنی وفات کے بعد بھی محبت سے یاد کیے جاتے ہیں، ڈاکٹر محمد اسحٰق (جن کو مرحوم لکھتے وقت دلی رنج ہوتا ہے) ایسے ہی لوگوں میں تھے،

وہ ۱۲ر ستمبر ۱۹۶۹ء کو کلکتہ میں حرکت قلب کے بند ہو جانے سے اللہ کو پیارے ہوئے، ان کا کوئی سوانح نگار ان کے سوانح حیات لکھنے بیٹھے تو ان کی روداد زندگی کو طویل اور ضخیم تو نہیں بنا سکتا لیکن کے کارنامے کچھ ایسے ہیں جن کو قلمبند کرنے میں ان کی روداد حیات اگر طویل نہیں ہو سکتی ہے تو دلنشین ضرور ہو جائے گی،

وہ کلکتہ میں ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے، وہاں کے مدرسۂ عالیہ اور ہیر اسکول میں تعلیم پائی، پھر اسکاٹش چرچ کالج سے ۱۹۲۱ء میں بی، ایس، سی کیا، سائنس کی تعلیم پانے کے بعد ایم، اے میں عربی لے لی، ۱۹۲۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے اس مضمون میں فرسٹ کلاس پایا، ۱۹۲۴ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے لکچرار مقرر ہوئے، ۱۹۲۶ء میں کلکتہ اسلامیہ کالج میں عربی و فارسی دونوں مضامین کے لکچرار ہو کر اپنے وطن واپس آگئے، ۱۹۲۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے لکچرار ہو گئے، جہاں ۳۳ سال کی خدمت کے بعد اسی یونیورسٹی سے

عربی اور فارسی کے ریڈر اور صدر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ انکے علمی ذوق کے تنوع کا اندازہ اس سے ہوگا کہ سائنس کی تعلیم پانے کے باوجود عربی اور فارسی کا ذوق بہت اچھا رکھتے تھے، عربی میں ام اے کی ڈگری حاصل کی لیکن فارسی پڑھاتے رہے، اس زبان کی جو خدمت انجام دی ہے، وہ انکی زندگی کا نمایاں کارنامہ ہے۔

وہ اپنی ملازمت کے زمانہ میں ۱۹۳۰ء میں لندن گئے وہاں پروفیسر ولڈ امیر منورسکی کی نگرانی میں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں کام کرتے رہے، اور جدید فارسی شاعری پر ایک مقالہ لکھکر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری پائی، پھر سوئزرلینڈ، فرانس اور اٹلی کی بھی سیاحت کی، ہندوستان واپس آئے تو ایرانی زبان و ادب پر ان کی واقفیت کی شہرت بڑھتی گئی، مشہور مستشرقین رینالڈ نکلسن اور ال، لوک ہارٹ سے انکے تعلقات پیدا ہوئے، اسی شہرت کی بنا پر فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے جشن کے موقع پر ایران کی حکومت نے ان کو مدعو کیا، وہ طہران اور طوس گئے تو بغداد، بصرہ، کربلا اور نجف کی بھی سیاحت کی،

فارسی زبان و ادب سے ان کو فطری دلچسپی تھی، اس لیے ایران کے قیام کے زمانہ میں وہاں کے معاصر شعراسے متاثر ہوکر ایک کتاب **سخنوران ایران در عصر حاضر** دو جلدوں میں قلمبند کی، جو ۱۳۵۱ھ اور ۱۳۵۵ھ میں شائع ہوئیں، یہ علمی حلقہ میں بہت پسند کی گئیں، جو مقبول اور کئی لحاظ سے مفید بھی ثابت ہوئیں، ان دونوں جلدوں کو ایران کی جدید فارسی شاعری کا خزینۂ زریں سمجھنا چاہیے، ہندوستان کا ادبی حلقہ تو ایران کے قدیم شعراء سے اچھی طرح واقف تھا، لیکن وہاں کے جدید شعراء سے بیگانہ ہوگیا تھا، اس کتاب کے ذریعہ وہ ہندوستان میں روشناس ہوئے جس سے ہندوستان و ایران کے پرانے ثقافتی تعلقات کی تجدید بھی ہوئی، ہندستان کے مغل حکمرانوں کے زمانے میں تو ہندوستان و ایران فارسی زبان کے شعراء کے لیے ایک ہی مکان کے دو صحن تھے، لیکن برطانوی حکومت میں لندن تو ہندوستان سے قریب ہوگیا مگر ایران دور ہوگیا، ڈاکٹر اسحق کی اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہندوستان سے ایران کی دوری بہت حد تک کم ہوگئی اور ہندستان کے ادبی حلقہ میں ایران کے جدید شعراء سے دلچسپی پیدا ہونے لگی۔

ان دونوں جلدوں میں تقریباً ۳۰۰ شعرا کا تذکرہ ہے۔ شروع میں ان کے مختصر حالات ہیں، پھر انکے کلام پر تبصرہ اور ان کے نمونے ہیں۔ ڈاکٹر اسحٰق نے یہ دونوں جلدیں جدید فارسی میں لکھی ہیں۔ ایران کے دانشور سبک ہندی کو پسند نہیں کرتے، اسی لیے وہ ہندوستان کی فارسی نثر و شاعری کی تعریف کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں لیکن ڈاکٹر اسحٰق نے اپنی دلنشین تحریروں کے ذریعہ سے ان کو اپنی طرف مائل کیا، اور ان سے خراج تحسین بھی حاصل کیا۔ ایران کے آقای سید محمد علی جمال زادہ نے اس کتاب کی ابتدا میں تقریظ و تشکر کے عنوان سے ایک تحریر لکھی ہے۔ اس کے شروع میں وہ لکھتے ہیں :-

"جمع آورندہ کتاب مستطاب "سخنوران ایران در عصر حاضر" آقای محمد اسحٰق از فضلای ہندوستان و معلم در دارالعلوم کلکتہ بسابقۂ علاقمندی با ایران و ادبیات فارسی چندی قبل با ایران آمدہ و مدت مدیدی در اطراف و اکناف مملکت ما سیر و سیاحت نمودہ و در ضمن نیز ہر کجا اتفاق یاری کردہ با بزرگان نظم و نثر ایران آشنائی و نشست و برخاست نمودہ و بدین وسیلہ گلچین گلچیں ہما نطور کہ خود ایشان در مقدمۂ کتاب با عبارات شیرین و مضامین دلنشین اشارہ فرمودہ اند، از گلستان مرز و بوم فردوسی و سعدی و حافظ ہموطنان خویش و مشتاقان علم و ادب را دامنے پر از گل و ریحان و معنی و عرفان از ایران ارمغان آوردہ اند، بر ما ایرانیان فرض است کہ از علو ہمت ایشان و دلبستگی کہ با ادبیات ما دارند سپاسگذاری نمودہ و مسئلت نمائیم کہ توفیقات یزدانی شامل حال ایشان باشد"۔

اور پھر ڈاکٹر اسحٰق نے جس محنت اور سلیقہ سے اس کتاب کی ترتیب دی ہے، اس کی تعریف کرتے ہوئے سید محمد علی جمال زادہ رقمطراز ہیں :-

"بندہ نگارندہ اجازہ میخواہم از جانب کلیہ ہموطنان و ادبا و فضلای ایران و اشخاص بیگانہ کہ با ادبیات فارسی تعلق خاطر و دلبستگی دارند و رواج آنرا خواستار و مشوق می باشند

از مولف محترم صمیمانہ تشکر نمودہ و بر ہمت عالی ایشان آفریں می خوانم۔"

اس کتاب کی اشاعت پر آقای میرزا محمد علی خاں فروغی ذکاء الملک (رئیس الوزرای سابق ایران) نے ایک مکتوب میں ڈاکٹر اسحٰق کو یہ لکھ کر مبارک باد دی :-

"از دریافت کتاب "سخنوران ایران در عصر حاضر" بسیار خوشنود شدم و بر مراتب اخلاصم نسبت بآں دوست دانشمند بسی افزود۔"

خود حکومت ایران نے ڈاکٹر اسحٰق کی اس ادبی خدمت کو نشان علم کا تمغہ عطا کر کے سراہا، جو ایک ہندوستانی کے لیے بڑا امتیاز ہے۔

ڈاکٹر اسحٰق نے اپنے مقدمہ میں ایران کی جدید شاعری کا تجزیہ بھی کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ ایران کے جدید دور میں کچھ ایسے شعرا ضرور ہیں جو پرانے اساتذہ کی تقلید میں غزلیں، قصیدے اور مراثی لکھتے ہیں لیکن اس جدید دور میں ایسے شعرا بھی ہیں، جو روایتی شاعری سے بغاوت کر کے زیادہ تر ایسی نظمیں لکھتے ہیں جن میں وطن کی محبت کا تو اظہار ہوتا ہے لیکن پرانی چیزوں پر استہزا بھی ہوتا ہے، وہ مذہبی موضوعات پر نظمیں نہیں لکھتے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مذہب سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں، وہ زیادہ تر سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل کو اپنی شاعری کے موضوعات بناتے ہیں، گو اپنے انداز بیان کو سلیس اور عام فہم بھی بناتے ہیں لیکن اس ادبی انقلاب سے ڈاکٹر اسحاق خوش نہ تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں :-

"این انقلاب ادبی معایبی نیز در بر داشت کہ شاید اگر دقت سنجیدہ شود باید گفت ادبیات ایران دریں معاملہ چنداں سود نبردہ است۔"

ڈاکٹر اسحٰق کو اس بات سے بھی دکھ ہوا کہ اہل ایران اپنی شاعری اور روزمرہ کی گفتگو میں فرانسیسی اور دوسری یورپین زبانوں کے الفاظ بہت استعمال کرنے لگے ہیں، اس دکھ کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"نمی توانستم تصور کنم که ادبای ایران بدست خویش تیشه بر ریشه زبان خود می زنند و در فنا و اضمحلال این زبان شیرین ادبی می کوشند۔"

لیکن ان نکتہ چینیوں کے ساتھ انھوں نے جدید شعرا کے کمالات پر دل کھول کر داد بھی دی ہے۔ یہاں پر ان کی داد کے کچھ نمونے اس لیے بھی ہم پیش کرتے ہیں تاکہ فارسی میں انکے طرز تحریر کا بھی اندازہ ہو جائے۔

ادیب نیشاپوری (پیدائش ۱۲۸۱ھ) "در شاعری بدواً پیرو قاآنی بود، بعد شیوۂ ترکستانی را تعقیب نموده و در عین حال خود دارای سبک مخصوصی است و حقیقتاً در حقیقت در شاعری کمتر کسی بپایه او می رسد انتخاب الفاظ و انسجام ترکیبات و اظهار معانی دقیقه و عواطف درونی از مزایای اشعار اوست۔"

ایرج میرزا (المتوفی ۱۳۴۳ھ) "اشعار ایرج مرزا را تقریباً می توان بہترین نمونہ ادبیات جدید ایران شمرد زیرا علاوه بر اینکه روان و دلچسپ و شامل مضامین بدیع و شیوا است دارای استحکام و متانت کلام قدماست نه چون پیروان متقدمین نکته چین کلمات عرب است و نه چون متجددین دشمن علم و ادب است۔"

بدیع الزمان خراسانی (پیدائش ۱۳۱۸ھ) "در خطابه و نطق نیز مقام مهمی را حائز است اشعار او بسبک ترکستانی و دارای مضامین دل نشین می باشد۔"

پروین اعتصامی (پیدائش ۱۳۲۵ھ) "افکار این گوینده متجدد نصائح و اندرز است که بوسیله افسانه‌های دلکش و شیرین بیان شده، و بجنس راجع باجتماعیات و وطن قطعات بسیاری بطرز جدید و قدیم ساخته است، غزل کمتر از دیده شده۔"

محمود خان افشار (پیدائش ۱۳۱۳ھ) "اشعارش بسبک قدما با مضامین جدیده و صنعی بسیار مطبوع و شیرین می باشد۔"

روحانی۔ نکاهیات بسبکی خاص واسلوبی ساده که هم مطبوع طبع عامه است وهم در نزد ارباب ادب مطلوب و دل پسند۔"

میرزا حسین خاں عطا (پیدایش ۱۲۹۳ھ) عطا منشی زبردست شاعر و توانائی می باشد در شاعری بیشتر پیرو سبک شعرای عراق است۔ ودر شعر مضامین دقیق وکلمات رقیق بسیار دارد ودر دی هم رفته شاعر بسیار حساس ورقیق القلبی می باشد وطبع او بعرفان بیشتر مائل است۔"

ملک الشعراء بهار (پیدایش ۱۳۰۴ھ) بهار بدون اختلاف امروز از بزرگ ترین شعراو نویسندگان محسوب........ راه اعراق را نپیموده است، چه در فن نظم و نثر شیوا بغایت مهارت را دارد، و مبدع و مبتکر و پیشرو ادبیات جدید ایران است۔

ڈاکٹر اسحٰق ان ایرانی شعراء کی تعریف کرتے وقت سبک ہندی سے مجوب یا شرمندہ ہوتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ بلکہ انھوں نے اپنی کتاب کی ابتدا ادیب پیشاوری (پیدائش درمیان سال ۱۲۵۰ھ ۱۲۶۰ھ) کے تذکرہ سے کی ہے۔ اس ہندی الاصل شاعر نے ایران والوں سے اپنا لوہا منوالیا تھا، چنانچہ مرزا محمد قزوینی نے اپنی کتاب بست مقالہ میں ان کو بقیۃ الفضلا، خاتمۃ الادبا اور نابغہ عصر کہا ہے۔ ان کا ذکر ڈاکٹر اسحٰق نے بھی بہت فخر سے کیا ہے، پھر وہ حیدر علی کمالی اصفہانی (پیدائش ۱۲۸۸ھ) کے ذکر میں لکھتے ہیں :

"اشعار کمالی با اینکه دارای سبک اشعار شعرای فارس و عراق است معهذا از حیث لطافت ودقت فکر با بهترین اشعار سبک هندی برابری دارد۔"

اس کے یہ معنی ہیں کہ سبک ہندی میں جو لطافت اور دقت فکر ہوتی ہے، ڈاکٹر اسحٰق اسکے نہ صرف قائل تھے بلکہ سبک ایرانی اور سبک عراقی میں شاید نہ پاتے تھے لیکن سبک ہندی سے

تعلق خاطر رکھنے کے باوجود وہ سبک ایرانی کے بھی معترف رہے، ان کی اس رواداری کی وجہ سے ایران کے ممتاز شاعر اور ادیب مثلاً ملک الشعرا تقی بہار، پروفیسر پور داؤد، ڈاکٹر لطف علی صورت گر اور ڈاکٹر علی اصغر حکمت، سید محمد علی جمال زادہ اور میرزا محمد علی فروغی ان کے دوست اور قدردان رہے، موجودہ شہنشاہ ایران اعلیٰ حضرت محمد رضا پہلوی آریا مہر بھی ان کی عزت کرتے تھے، اسی لیے ایران میں دو مرتبہ ان کے حضور میں باریاب ہوئے،

فارسی شاعری سے ڈاکٹر اسحٰق کے شغف کا اظہار انگریزی میں ان کی کتاب "ایران کی چار مشہور خواتین شاعرے" سے بھی ہوتا ہے، اس میں انھوں نے قزدار کی رابعہ، گنجہ کی مہستی، قرۃ العین اور پروین اعتصامی کی شاعری پر فاضلانہ تبصرہ کیا ہے، مہستی کا وہی زمانہ تھا، جو رودکی (المتوفی ۳۲۹ھ) کا تھا، وہ ایک غلام سے عشق کرنے کے سلسلہ میں موت کے گھاٹ اتاری گئی، مگر اسکا ذکر تذکروں میں احترام سے کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ ملا جامی نے اسکا ذکر نفحات الانس میں کیا ہے (ص ۶۵-۵۶۴ لکھنؤ اڈیشن)۔ ڈاکٹر اسحٰق نے اسکی بہت سی رباعیاں اپنی کتاب میں جمع کر دی ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ اسکے عشقیہ اشعار واردات قلبی کی عکاسی کرتے ہیں، اور بعض رباعیوں میں قدرتی مناظر کی بڑی اچھی مرقع آرائی ہے، جن میں دل آویز انداز بیان کے ساتھ روانی بھی ہے، اور تشبیہات اور تلمیحات کی برجستگی بھی، مہستی کے زمانہ کا صحیح تعین ڈاکٹر اسحٰق نہیں کر سکے ہیں، انھوں نے دو مختلف روایتیں بیان کی ہیں، ایک سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان سنجر (۵۱۱-۵۵۲ھ / ۱۱۱۷-۱۱۵۷ء) کے دربار کی شاعرہ تھی، اور دوسری روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں تھی، ڈاکٹر اسحٰق نے اسکی بہت زیادہ رباعیاں جمع کر دی ہیں، اسکے عشقیہ اشعار کو وہ غیر سنجیدہ قرار دیتے ہیں، لیکن اسکے خمریات کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ وہ خیام کی یاد تازہ کرتے ہیں، ڈاکٹر اسحٰق یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ فی البدیہہ اشعار کہتی، اور حاضر جوابی میں بہت مہارت رکھتی تھی، ڈاکٹر صاحب نے بانی مذہب کی مشہور مبلغہ قرۃ العین (سید الشہدا ۱۲۳۰-۱۲۶۸ھ / ۱۸۱۴-۱۸۵۱ء) کے اشعار بھی جمع کیے ہیں، گو وہ خود ان کو اس کے اشعار سمجھنے میں متامل ہیں لیکن ان کو پیش کرتے وقت انھوں نے کچھ ایسا انداز بیان اختیار کیا ہے کہ ناظرین مشکوک تو ضرور ہو جاتے ہیں، مگر ان اشعار

کو ردکرنے میں ہچکچاہٹ بھی محسوس کرتے ہیں، ڈاکٹر اسحٰق نے پروین اعتصامی کے کلام پر تبصرہ نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ کیا ہے، اس لائق شاعرہ نے زندگی کم پائی ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئی اور ۱۹۴۱ء میں وفات پاگئی لیکن اس نے اپنی زندگی کی اس مختصر مدت میں پانچہزار اشعار کہے، ڈاکٹر اسحٰق نے اپنی پہلی کتاب "سخنوران ایران در عصر جدید" میں اس کا ذکر مختصر طریقہ پر کیا تھا لیکن اپنی انگریزی تصنیف میں اسکی وفات پر دلگیر ہوکر اسکی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ: تجدد پسند شاعرہ ضرور رہی لیکن اسکے کلام میں وہ عشقیہ اور رومانی جذبات نہیں جن سے فارسی شاعری پر ہے، عورت ہونے کے باوجود اس نے اپنے کلام میں طبقۂ نسواں کی فلاح وبہبود میں کچھ بھی نہیں کہا، اس نے زیادہ تر "مناظرہ" کے رنگ میں نظمیں کہی ہیں، جو بعض تو بہت اچھی ہیں لیکن زیادہ تر وہ طویل اور خشک ہیں، البتہ کہیں کہیں سوال وجواب دلچسپ اور دلآویز ہیں، اسکی اخلاقی نظمیں موثر ہیں، جن کو قصوں سے دلچسپ بھی بنادیا ہے، اس نے ان نظموں میں رحم دلی اور طبیعت کی صفائی اور پاکیزگی پر زیادہ زور دیا ہے، وہ مزدوروں کی بھی حامی رہی، ان کی حمایت میں رنجبر کے عنوان سے ایک پرزور نظم لکھی جس کا مطلع یہ ہے:

تابکے جان کندن اندر آفتاب اے رنجبر　　　ریختن از بہر نان از چہرہ آب اے رنجبر

ان چاروں خواتین پر ڈاکٹر اسحٰق کا قلم چلا تو ان کو فارسی کی اور دوسری خواتین شاعرہ بھی یاد آگئیں، انھوں نے اسی کتاب کے ایک ضمیمہ میں ایران اور ہندستان کی تقریباً سو شاعرہ کا ذکر کرکے ان کے کلام کے نمونے دیے ہیں، اسکا مطالعہ ایسے ناظرین کیلیے مفید ہوگا جو سرسری طور پر ایسی باکمال خواتین کے متعلق کچھ جاننا چاہتے ہیں، لیکن اس ضمیمہ کی روشنی میں ان خواتین پر پوری ایک کتاب تیار ہوسکتی ہے، اس لحاظ سے ڈاکٹر اسحٰق کی یہ محنت بڑی کارگر ثابت ہوگی۔

انھوں نے ۱۹۶۳ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے لیے امین احمد رازی کی ہفت اقلیم (ج ۳) کو ایڈٹ کیا جس میں ہندستان، ایران اور دوسرے ممالک کے ۲۹۰ فارسی شعراء کا ذکر ہے، ایشیاٹک سوسائٹی کیلیے روضۃ الجنات فی اوصاف مدینۃ الہرات کو بھی ایڈٹ کیا اور اسکے عربی مخطوطات کی فہرست بھی تیار کی، اپنی آخری زندگی میں علی قلی داغستانی کی ریاض الشعراء کو بھی ایڈٹ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، اور غزنوی عہد کے فارسی شعراء پر ایک کتاب بھی لکھ رہے تھے، لیکن زندگی نے وفا نہ کی، اسلیے یہ دونوں کام پورے نہ ہوسکے۔

ان علمی سرگرمیوں کے ساتھ انھوں نے ۱۹۳۲ء میں کلکتہ میں ایران سوسائٹی قائم کی، جو انکی زندگی کا اصلی راس المال ہے، اسکی جو تاریخ ہے وہ گویا انکی تاریخ زندگی ہے، اس کے ذریعہ سے گذشتہ پچیس سال کے اندر جو علمی و ادبی کام ہوا ہے وہ دراصل اُن ہی کے زریں کارنامے ہیں، یہ سوسائٹی ہندوستان کے علمی حلقہ کے لیے ایک ایسی مثال ہے کہ علم و فن کا ایک خدمتگذار اپنے اخلاص و محنت سے بے سروسامانی کی حالت میں بھی علمی سرگرمیوں اور تحقیقی کاوشوں کا ایک ایسا مرکز قائم کرسکتا ہے جو نہ صرف اس ملک بلکہ اس سے باہر کے ارباب علم کے لیے بھی توجہ کا مرکز بن سکتا ہے، ڈاکٹر اسحٰق نے جب اسکی بنا ڈالی تو ان کے پاس جذبۂ اخلاص کے سوا کوئی اور سرمایہ نہ تھا، لیکن اب اس کے پاس ایک ایسی عمارت ہے جو کئی لاکھ کی ہے، اسکا اپنا کتب خانہ بھی ہے، اس کی علمی سرگرمیوں سے ملک کے ثقافتی سرمایہ میں بڑا قیمتی اضافہ ہوتا جارہا ہے، گذشتہ پچیس برس میں اس کی طرف سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، اُن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں :-

(۱) البیرونی، یادگار جلد۔ یہ کتاب ۱۹۵۱ء میں البیرونی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر شائع ہوئی، اس میں امریکہ، یورپ، ایران اور ہندوستان کے اہل قلم کے گرانقدر مضامین ہیں، ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے (۲) ہندوستانی جغرافیہ سے متعلق البیرونی کی معلومات از ڈاکٹر بی. سی. لا (۳) البیرونی۔ سوانح حیات از ریورنڈ فادر وی. کورتے (۴) البیرونی اور پنڈت از ایضاً (۵) ایران کی چار مشہور خواتین شاعرہ از ڈاکٹر محمد اسحٰق (۶) فرد۔ بہار کا ایک گمنام فارسی شاعر از پروفیسر مسعود الحسن (۷) بوعلی سینا، یادگار جلد، ۱۹۵۲ء میں بوعلی سینا کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر شائع کی گئی، اس میں بھی مختلف ممالک کے اہل قلم کے مضامین ہیں، ۳۲۴ صفحے پر مشتمل ہے، (۸) کشمیر سلاطین کے عہد میں۔ از پروفیسر محب الحسن (۹) دیوان کاہی، از ڈاکٹر ہادی حسن (۱۰) فارسی ادب کی ایک ایک جھلک۔ از ڈاکٹر علی اصغر حکمت (۱۱) نقش پارسی بر احجار ہند، از ڈاکٹر علی اصغر حکمت (۱۲) الادویۃ القلبیہ مصنفہ بوعلی سینا مترجمہ حکیم عبداللطیف (۱۳) ہدیۃ السلطانیہ مصنفہ قاضی محمد یوسف بلگرامی، مرتبہ مولانا فضل الرحمٰن باقی۔ یہ ساری کتابیں ڈاکٹر اسحٰق مرحوم کی مساعی جمیلہ سے شائع ہوئیں، ایران سوسائٹی کی طرف سے ملا صدرا شیرازی کی چار سو سالہ برسی کا جشن منایا گیا، اور پروفیسر ایڈورڈ براؤن کی بھی صد سالہ سالگرہ منائی گئی، ان دونوں مشاہیر پر قابل قدر لٹریچر شائع کیا گیا۔

اس سوسائٹی کی طرف سے انگریزی میں ایک سہ ماہی رسالہ انڈو ایرانیکا بھی نکلا کرتا ہے جس کی ابتک ۲۰ جلدیں نکل چکی ہیں، ان جلدوں کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ انکے ذریعہ سے ہندستان اور ایران کے تعلقات کو کس قدر خوشگوار کرنے کی کوشش کی گئی ہے، پھر اس میں ہندستان کے فارسی لٹریچر پر اتنے مفید اور گراں قدر مضامین نکلے ہیں کہ ان سے نہ صرف علمی سرمایہ میں اضافہ ہوا ہے بلکہ سبک ہندی کی طرف اہل ایران کی بھی نظریں اٹھنے لگی ہیں، اگر اسمیں اسی طرح کے مضامین شائع ہوتے رہے تو سبک ہندی کے خلاف سبک ایرانی کے حامیوں کے تعصب میں بڑی کمی ہو جائیگی، اور خود ہندستان والے اس علمی و ادبی ورثہ پر فخر کرنے لگیں گے جس کے بعد ان کو ڈاکٹر اسحٰق مرحوم کے کارناموں کا تہِ دل سے شکر گذار ہونا پڑے گا، کیونکہ انڈو ایرانیکا ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر اسحٰق نے ایران سوسائٹی اور رسالہ انڈو ایرانیکا کو اپنا قلب و جگر بنا رکھا تھا، ان ہی کے لیے وہ زندہ رہے اور مرے، جب اس سوسائٹی کے پچیس سال ہوئے تو اسکی سلور جوبلی اعلیٰ پیمانہ پر منانے کی فکر میں تھے، اور انڈو ایرانیکا کا ایک سلور جوبلی نمبر ترتیب دے رہے تھے، مگر یکایک وہ جنت کو سدھار گئے، انکی یہ آرزوئیں انکی زندگی میں پوری نہ ہوئیں، وہ سوسائٹی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتے، اس جذبۂ اخلاص کو دیکھکر اہل ثروت انکی خاطر سوسائٹی کو بڑے سے بڑا سرمایہ دینے میں پس و پیش نہ کرتے، سوسائٹی کی موجودہ عمارت کو خریدنے کے لیے انکے پاس کچھ بھی سرمایہ نہ تھا، لیکن اسکے صدر جناب ام، اے، کاشانی نے انکو تین لاکھ روپے کا قرض کسی شرط کے بغیر دیدیا جس سے یہ عمارت خرید لی گئی، مولانا ابو الکلام آزاد اور پروفیسر ہمایوں کبیر نے اپنی وزارت کے زمانہ میں سوسائٹی کو حکومت ہند کی طرف سے سالانہ امداد دلاتے رہے، انکے بعد یہ امداد بند ہوگئی تو ڈاکٹر اسحٰق مرحوم کی جبیں پر شکن نہ آئی، مغربی بنگال کی حکومت کلکتہ کارپوریشن اور کبھی کبھی حکومت ایران سے جو تھوڑی بہت مالی مدد مل جاتی اسی سے سوسائٹی کا کام حسب دستور جاری رکھا، انکی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کام کرنا جانتے تھے، اسلیے کام لینا بھی جانتے تھے، انڈو ایرانیکا کے لیے اہل قلم سے مضامین ایسے شفقت آمیز خطوط لکھکر طلب کرتے کہ پھر مضمون لکھکر بھیجنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ ہوتا، ان ہی کی محبت بھرے خطوط کی وجہ سے میں نے بھی اس رسالہ میں مضامین لکھنے شروع کیے، اور برابر لکھتا رہا، وہ مجھکو بہت ہی اخلاص اور شفقت سے خطوط لکھتے، اگر میرے جواب جانے میں دیر ہوتی تو تردد اور پریشانی کا اظہار کرتے، جب وہ کلکتہ یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے تو مجھکو اپنی جگہ میں کلکتہ یونیورسٹی کے اسٹاف میں دیکھنا چاہتے تھے، تاکہ

میری قربت ان سے اور بھی زیادہ ہو جائے، اسکے لیے مجھکو ایک پرزور خط لکھا، مگر دارالمصنفین کے کاموں سے میری دلچسپی ایسی زیادہ ہوگئی ہے کہ میں نے ان کے خط کے جواب میں لکھ بھیجا

جسکا لگا ہے کام کا شغل ہے صبح و شام کا　　　اب میں تمھارے کام کا ہم نفسو نہیں رہا

یہ جواب پاکر آزردہ خاطر ہونے کے بجائے میرے لیے بہت دعائیں کیں، میں اکتوبر ۶۹ء میں ڈھاکا جانے والا تھا، ان کا اصرار تھا کہ جب میں کلکتہ آؤں تو انکے ساتھ قیام کروں، چنانچہ ستمبر کے شروع میں ان کو لکھا کہ ڈھاکہ جاتے وقت انکے ساتھ قیام کرنے کی سعادت حاصل کرنے کا ارادہ ہے، اس کے جواب میں انکی اہلیہ کی طرف سے ایک مکتوب ملا، تو دل پکڑ کر رہ گیا، ۱۲ ستمبر کو وہ وہاں پہنچ گئے جہاں آخر میں سب کو جانا ہے، انکی رحلت کی خبر پاکر ایسا معلوم ہوا کہ اپنے خاندان کا ایک شفیق بزرگ کھو بیٹھا ہوں۔ وہ یاد آئیں گے اور اکثر یاد آئیں گے، انھوں نے تو سب کو بھلا دیا، مگر ان کو دل سے بھلائیگا کون؟ انکی بے لوث علمی خدمت انکے نام کو زندہ رکھے گی، انکے کام کرنے کا طریقہ اور سلیقہ انکے معاصروں کے لیے چراغ راہ ہے، انکے رفقائے کار محض اس اخلاص و محبت کی خاطر جس کے وہ اعلیٰ نمونہ تھے، انکے چھوڑے ہوئے کاموں کو اور آگے بڑھائیں گے اور جب وہ ان کو یاد کریں گے تو زبان حال سے کہہ رہے ہونگے کہ آہ! تو اس دنیا میں نہیں رہا لیکن اخلاص سے بھری ہوئی تیری علمی سرگرمیوں، تیری نیکیوں اور تیری خوبیوں کی شمع تیرے جاننے والوں کے دلوں میں روشن رہیگی، تیری تربت پر اللہ تعالیٰ کی برکتوں اور رحمتوں کی بارش ہوتی رہے، اور تجھے کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا ہو، آمین ثم آمین۔

ان سطروں کے چھپنے کے وقت ڈاکٹر اسحٰق مرحوم کے بے لوث رفقائے کار جناب خواجہ محمد یوسف صاحب ایڈوکیٹ پریسیڈنٹ ایران سوسائٹی اور جناب ام، عبدالمجید صاحب ایکٹنگ جنرل سکریٹری کی کوششوں سے اس سوسائٹی کی سلور جوبلی دھوم دھام سے منائی جا رہی ہوگی، ڈاکٹر اسحٰق مرحوم کی روح خوش ہو رہی ہوگی کہ جو آرزو ان کی زندگی میں پوری ہونے سے رہ گئی تھی، وہ انکے بعد ان کے دست راست رفقائے کار کے ذریعہ سے پوری ہوگئی، اب ان دونوں علم دوست اور مخلص حضرات سے امید کامل ہے کہ مرحوم کے چھوڑے ہوئے کاموں کو اسی لگن اور دھن کے ساتھ انجام دیتے رہیں گے، جس طرح کہ خود مرحوم دیتے تھے۔

مطبوعات جدیدہ

شرکت و مضاربت کے شرعی اصول - مرتبہ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صاحب صدیقی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۶۰، قیمت عہ، پتہ: مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، دہلی ۶

لائق مصنف اسلامی اور جدید معاشیات دونوں کے ماہر اور مسلم یونیورسٹی میں اس کے استاذ بھی ہیں، انھوں نے غیر سودی نظام بنک کاری کی بنیادیں فراہم کرنے کے لیے اس کتاب میں شرکت و مضاربت کے ان شرعی اصول وضوابط اور فقہی قوانین واحکام کا ذکر کیا ہے جو جدید سودی بنک کاری نظام اور موجودہ تجارتی صنعتی اور زرعی شرکتوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق از سر نو تشکیل دینے میں مدد ومعاون ہو سکتے ہیں، مثلاً دونوں کی تعریف مشترکہ کاروبار میں نفع کی تقسیم، نقصان کی ذمہ داری، شرکا کے کاروباری تصرفات کے حدود، ان کی مالی ذمہ داریاں اور مدت کاروبار وغیرہ اور آخر میں مشترکہ تجارتی کاروبار کی طرح مشترکہ صنعتی کاروبار کے جواز پر مدلل گفتگو کی گئی ہے، مسائل کی تشریح میں اسلامی فقہ کے چاروں مشہور مذاہب کو پیش نظر رکھا گیا ہے، اور زیادہ تر ان کے متفقہ نقطۂ نظر کی وضاحت کی کوشش کی گئی ہے، لیکن بعض مواقع خصوصاً نئے پیش آمدہ مسائل میں اپنے ذوق و اجتہاد سے بھی کام لیا گیا ہے، مگر فاضل مصنف کی اس قسم کی رائیں بھی حقیقت پسندی اور مضبوط دلائل پر مبنی ہیں، یہ کتاب انھوں نے بڑی محنت ومطالعہ اور طویل غور وفکر کے بعد نہایت دلنشین اور سلجھے انداز میں لکھی ہے، جو اسلامی قانون ومعاشیات کے طلبہ کے لیے خصوصیت سے لائق مطالعہ ہے۔

عیارِ غالب ۔ مرتبہ جناب مالک رام صاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۲ مجلد قیمت سنہ، پتہ علمی مجلس دلی ۶

غالب صدی کی تقریب کے موقع پر علمی مجلس دلی نے اپنے سہ ماہی رسالہ تحریر کا پہلے غالب نمبر شائع کرنے کا ارادہ لیا تھا، پھر افادیت کے خیال سے اس کے بجائے اس کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے، یہ غالب کے متعلق بارہ مقالات اور ان کی مشہور فارسی مثنوی "چراغ دیر" کے منظوم اردو ترجمہ پر مشتمل ہے۔ دو مضامین خود فاضل مرتب کے قلم سے ہیں، ان میں "غالب شناسی جب اور اب" قابل ذکر ہے، جس میں اس عام خیال کی تردید کی گئی ہے کہ غالب کی انکے زمانہ میں قدر نہیں ہوئی، مولوی ضیاء احمد صاحب بدایونی نے غالب کے نعتیہ کلام پر روشنی ڈالتے ہوئے نعت گوئی کی اجمالی تاریخ بھی تحریر کی ہے، "غالب کا نفسیاتی مطالعہ" (ڈاکٹر نریندر ناتھ وگ)، "غالب کی بیماریاں" (ڈاکٹر عبد الجلیل) خصوصیت سے زیادہ دلچسپ اور انوکھے طرز کے مضامین ہیں، مشاہیر میں فراق گورکھپوری، سید مسعود حسن رضوی اور قاضی عبد الودود وغیرہ کے مضامین بھی درج ہیں، مجموعی حیثیت سے یہ کتاب غالبیات میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ " ض "

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	صدیق احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	" " "
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
اڈیٹر	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	" " "

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ دستخط

مصنفاتِ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

۱۔ اسوۂ صحابہ؛ (حصہ اول) قیمت: للعہ/

۲۔ اسوۂ صحابہ: (حصۂ دوم) " للعہ/

۳۔ اسوۂ صحابیات: " عا/

۴۔ تاریخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کے خصوصیات کی تفصیل: قیمت: علو/

۵۔ حکمائے اسلام: (حصۂ اول) دوسری صدی ہجری سے لیکر خاندانِ فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، قیمت: علو/

۶۔ حکمائے اسلام: (حصۂ دوم) متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، قیمت: للعہ/

۷۔ شعر الہند (حصۂ اول) " علو/

۸۔ شعر الہند (حصۂ دوم) " لعہ/

۹۔ انقلابِ الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان کی ایک کتاب کا انشاپردازانہ ترجمہ قیمت: للعہ/

۱۰۔ سیرۃ عمرؒ بن عبدالعزیز: (زیرِ طبع)

۱۱۔ امام رازی: امام فخرالدین رازی کے سوانح اور اُن کی تصنیفات: قیمت للعہ/

۱۲۔ ابنِ خلدون: ابنِ خلدون کے سوانح زندگی اور اُس کے فلسفہ کی تشریح (زیرِ طبع)

۱۳۔ اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانحِ حیات کے ساتھ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل، اُن کے فلسفۂ خودی کی تشریح، اور اُن کے فارسی و اردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت للعہ/

مقالاتِ عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی و فقہی تاریخی و تنقیدی وادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعراء کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر طویل تبصرے بھی کئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اُن کے مضامین کی ترتیب اشاعت بھی ناظرین کے پیش نظر ہے، یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زبان و ادب و شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، صفحات ۲۴۷ قیمت: عہ/ منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(اڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ اپنی مکی و مدنی زندگی میں ۲۳ برس تک مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت، بلا امتیاز نسل و رنگ و بلا لحاظ زاد و بوم سرتاپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب میں انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف ابواب کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ پورا دین اسلام ہی نہیں، بلکہ اس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے لئے آیۂ رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورتوں کا درجہ، اور ان کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخ اسلام میں ان کا مرتبہ، بلا تفریق مذہب و ملت پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق، جن میں اہل کتاب، اور مشرکین عرب وغیرہ سب شامل ہیں غیر مسلم رعایا کے حقوق، حیوانات کے حقوق، اور ان کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو بابوں میں دنیا پر دینِ اسلام کے علم بردار مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارناموں، اور مختلف علوم و فنون میں ان کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت:- ۲۳۰ صفحے، قیمت:- [illegible]

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)

اپریل سنہ ۱۹۷۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

[illegible]

مجلسِ ادارت

سلسلۂ تاریخ ہند

عہدِ مغلیہ

مسلمان ہند و مورخین کی نظر میں

(جلد اول)

ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں کے عہد کی فارسی، انگریزی اور اردو میں ہندو مسلمان مورخین نے قلم نے بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے ہیں، اس کتاب میں مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد اور دورِ جدید کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصل تحریروں کی روشنی میں پیش کئے گئے ہیں، قیمت: لعہ

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب (ایم اے)

کشمیر

سلاطین کے عہد میں

خطۂ جنت نظیر کشمیر کو علمی و تمدنی و سیاسی اعتبار سے ہمیشہ سے اہمیت حاصل رہی ہے، اور اس وقت تو ساری دنیا کی نگاہیں اس کی طرف ہیں، اس کتاب میں اس لالہ و گل کی سرزمین میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان حکمرانوں کی حکومت رہی ہے اس کی بہت ہی مستند اور مفصل، سیاسی اور تمدنی تاریخ قلم بند کی گئی ہے، قیمت: لعہ

مرتبہ جناب محب الحسن صاحب پروفیسر تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مترجمہ علی حماد عباسی صاحب ایم۔اے (اعظم گڑھ)

(منیجر دارالمصنفین اعظم گڑھ)

جلد ۱۰۵ ۔ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۰ء ۔ عدد ۴

مضامین

شذرات

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، وہ کسی نسل، قوم اور ملک و وطن میں محدود نہیں اسلیے اس نے مسلمانوں میں وحدت کی بنیاد قومیت اور وطنیت کے بجائے عقائد و افکار کے اتحاد اور اسلامی اخوت پر رکھی، کیونکہ مختلف نسلوں، قوموں اور ملکوں کے مسلمانوں کے درمیان جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل کی دوری پر رہتے ہیں، اور جن کی قومی خصوصیات اور ملکی مصالح جدا جدا ہیں، اسکے سوا اتحاد اور اشتراک کا اور کوئی رشتہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو ملیشیا اور انڈونیشیا کے مسلمانوں کو افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے، عربوں سے یہ تعلق اس بنا پر اور گہرا ہے کہ مسلمانوں کے مذہب کا سرچشمہ عرب ہے، اسلام کے اولین مبلغ عرب تھے، ان کا قبلہ عرب میں ہے اور انکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آرام گاہ عرب ہی ہے، اس لیے جو لوگ اسلامی اخوت اور اسلامی اتحاد کی مخالفت کرتے ہیں، وہ درحقیقت مسلمانوں کی وحدت کو ختم اور عربوں کو ان کی ہمدردی سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔

قومیت سے انکار نہیں اگر اس کو اسکی حد کے اندر رکھا جائے تو وہ بھی ایک حقیقت ہے، مگر قوم پرستی اور وطن پرستی مذہب کو بہالیجاتی ہے، جس کا تجربہ عرب ملکوں میں ہو رہا ہے، لیکن قومیت صرف ایک ملک اور ایک حکومت کے باشندوں میں جن کے مصالح یکساں ہوں، اتحاد پیدا کر سکتی ہے، مختلف حکومتوں کے باشندوں میں خواہ وہ نسلاً ایک ہوں مگر انکے مصالح جدا جدا ہوں، اتحاد نہیں پیدا کر سکتی، جس کا ثبوت عرب حکومتوں کا اختلاف ہے، اور قومیت کا نعرہ آجتک ان کو متحد نہیں کر سکا، ان کے اتحاد کا ذریعہ آج بھی مذہب ہی ہے

جس کا اب عربوں کو بھی احساس ہو چلا ہے، رباط اور اس کے بعد جدہ کانفرنس اسی کا نتیجہ ہے، صدیوں کے بعد یہ موقع آیا ہے کہ اسلامی ملک ایک مقصد کے لیے ایک جگہ جمع ہوئے اور اپنے اتحاد و تنظیم کے لیے ایک ادارہ کی بنیاد رکھی، یہ نہایت مبارک قدم اور مسلمانوں کے مستقبل کے لیے فال نیک ہے، جو عرب ابتک قومیت کے نشہ میں سرشار اور کمیونزم کے طلسم میں گرفتار ہیں وہ اسکو ناکام بنانے کی پوری کوشش کرینگے لیکن اگر یہ تنظیم مستحکم ہو گئی تو وہ بھی اس میں شرکت کیلئے مجبور ہونگے۔

درحقیقت اسلامی اتحاد و تنظیم نہ کوئی خطرہ کی چیز ہے اور نہ کسی کے خلاف جتھابندی ہے، بلکہ وہ اسلام کے ایک حکم کی جو مسلمانوں کی وحدت کا سنگ بنیاد اور خود اسلامی حکومتوں کے مصالح کے لیے ضروری ہے، تعمیل ہے، اتحاد اسلامی کا ہوّا تو مغربی قوموں نے کھڑا کیا ہے، انھوں نے مسلمانوں کے اتحاد اور عثمانی خلافت کی مرکزیت کو ختم کرنے کیلیے اسکے خلاف اتنا پروپیگنڈا کیا کہ عرب خاص طور سے اس کا شکار ہو گئے، جس کا نتیجہ ان کے حق میں مہلک نکلا اور وہ ایک متحدہ طاقت کے بجائے چھوٹی چھوٹی کمزور ریاستوں میں بٹ گئے، اگر انھوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت نہ کی ہوتی تو ان کی طاقت اس طرح پراگندہ نہ ہوتی، اس میں ترکوں کی بھی غلطی تھی، جس کا خمیازہ ان کو بھگتنا پڑا، اب اس تنظیم کی مخالفت بے نتیجہ ہے، حکومت ہند کو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے، متحدہ ہندستان میں یہاں کے مسلمانوں کا ہمیشہ اسلامی ملکوں میں ایک وزن رہا ہے، اب بھی ہندستان میں انکی تعداد چھ کرور ہے، انڈونیشیا اور پاکستان کو چھوڑ کر مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کسی اسلامی ملک میں بھی نہیں ہے، اس لیے کوئی اسلامی تنظیم ان کو نظر انداز نہیں کر سکتی اور ان کے ذریعہ حکومت ہند اس تنظیم سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

دارالمصنفین کے تعلقات عرب ملکوں کے بعض علمی اداروں سے ہیں اور وہ اپنی مطبوعات ہدیۃً بھیجے ہیں، لیکن ایران کے کسی علمی و تعلیمی ادارہ سے ابتک کوئی رابطہ نہیں تھا، اس لیے ان کی تصانیف اور مطبوعات کا بھی علم نہ ہوتا تھا، وہاں کے ایک فاضل ڈاکٹر شہریار نقوی استاد دانشکدۂ الہیات و معارف اسلامی تہران یونیورسٹی نے جو ہندوستان میں رہ چکے ہیں اور دارالمصنفین سے واقف اور اس کے قدر دانوں میں ہیں تہران یونیورسٹی کی پچاس مطبوعات دارالمصنفین کو ہدیۃً بھجوائی ہیں، یہ کتابیں مختلف فنون کی اور اعلیٰ کاغذ و طباعت سے آراستہ ہیں، آیندہ کسی پرچہ میں ان کا تفصیلی ذکر کیا جائے گا، جو کتابیں ہمارے پاس آئی ہیں ان کے سلسلۂ مطبوعات کا نمبر چودہ سو سے اوپر ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تہران یونیورسٹی تعلیم کے ساتھ کتنا مفید علمی کام انجام دے رہی ہے، دارالمصنفین اس قیمتی علمی تحفہ کے لیے تہران یونیورسٹی اور ڈاکٹر شہریار نقوی کا شکر گذار ہے، ڈاکٹر صاحب کو اردو میں پوری مہارت ہے، اور ایسی صاف سلیس   اردو لکھتے ہیں کہ کسی اہل زبان کی تحریر معلوم ہوتی ہے، ان کے تین خط اس نمبر میں شائع کیے جا رہے ہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بعض مفید انتظامی تبدیلیاں ہوئی ہیں، مولانا محب اللہ صاحب لاری ندوی مہتمم اور مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندوی نائب مہتمم مقرر ہوئے ہیں، یہ دونوں بڑی محنت اور توجہ سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، ان کے حسن انتظام سے عام طور سے اساتذہ اور طلبہ مطمئن ہیں، ابھی ڈائننگ ہال کی وسیع عمارت بنکر تیار ہوئی ہے، اس سے طلبہ اور منتظمین مطبخ دونوں کو بڑی سہولت ہو گئی ہے، یوں تو دارالعلوم میں متعدد عمارتوں کی ضرورت ہے، لیکن طلبہ کی کثرت کی وجہ سے مسجد کی عمارت بہت تنگ ہو گئی ہے، اسکی توسیع سب سے مقدم ہے، اور اصحاب خیر مسلمانوں کو خاص طور سے اسکی جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

مقالات

اردو زبان کا ترکی عنصر

از جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب سابق پروفیسر عربی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

کئی برس کی بات ہے، میں نے پنجاب یونیورسٹی کی عربک اینڈ پرشین سوسائٹی کے ایک جلسہ میں "اردو زبان کے ترکی عنصر" ایک لکچر دیا تھا، جس کے نفسِ مضمون کے متعلق ایک تحریری یادداشت میرے پاس مدت سے محفوظ پڑی تھی، اور جس کی اشاعت کی آج تک نوبت نہیں آئی تھی، اب "معارف" کے دسمبر ۱۹۶۹ء کے شمارہ میں فاضل معاصر ڈاکٹر اکمل صاحب ایوبی کا عالمانہ مضمون نظر سے گزرا، جو انھوں نے "اردو میں ترکی زبان کے الفاظ" کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے، اگرچہ اس میں دو چار باتیں محلِ نظر ہیں، جن کی طرف اس مضمون کے اخیر میں اشارہ کروں گا، تاہم ان کا مقالہ بحیثیت مجموعی بیحد دلچسپ ہے اور مفید معلومات پر مشتمل ہے، اس کو دیکھنے سے مجھے احساس ہوا کہ بعض علم دوست احباب کو اس موضوع سے خاص دلچسپی ہے، لہٰذا مذکورۂ بالا لیکچر کا خلاصہ موجودہ مضمون کی صورت میں ناظرین معارف کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کیا جاتا ہے؛

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اگرچہ اردو زبان اپنی صرف و نحو اور اپنے بنیادی ذخیرہ الفاظ کے اعتبار سے شمالی ہند کی اکثر بولیوں کی طرح ایک آریائی زبان ہے، لیکن اپنے مستعمل الفاظ کے لحاظ سے اس کا

دامن بہت وسیع ہے۔ علاوہ اُن الفاظ کے جن کا ماخذ سنسکرت یا اس کی پراکرت بولیاں ہیں، اس میں عربی، فارسی، ترکی اور متعدد مغربی زبانوں کے الفاظ بھی بکثرت اور بلا تکلف مستعمل ہیں، اردو زبان کے اس قدر وسیع المشرب ہونے کا راز اُن تاریخی واقعات میں مضمر ہے، جو ہندوستان کی سرزمین میں رونما ہوے، جو صاحب علم عربی، فارسی یا مغربی زبانوں سے واقف ہیں، وہ ان زبانوں کے الفاظ کو فوراً پہچان لیتے ہیں، جو اردو میں مروج ہیں، خواہ ان کی موجودہ صورت بعض اوقات اپنے اصل سے دور رہی کیوں نہ جا پڑی ہو، لیکن چونکہ اس ملک میں ترکی زبان کا علم بہت محدود ہے، بلکہ کالعدم ہے، اس لیے پڑھے لکھے لوگ بھی اس امر سے کماحقہٗ آگاہ نہیں کہ اردو زبان میں ترکی عنصر کس کثیر مقدار میں موجود ہے۔ لغت نگاروں نے بھی اس ترکی عنصر کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا، یعنی ترکی الفاظ کی کافی تحقیق و تدقیق نہیں کی، اور بہت سے ترکی الفاظ کو فارسی کتابوں میں دیکھ کر انھیں فارسی قرار دیدیا ہے، حتیٰ کہ مؤیدالفضلا کے فاضل مؤلف نے بھی متعدد ترکی الفاظ کو فارسی الفاظ کی فصلوں میں ڈالدیا ہے، یہی حال پلاٹس (Platts) کا ہے، جس نے اپنی اردو انگریزی ڈکشنری میں بہت سے ترکی کلمات کو فارسی یا ہندی لکھدیا ہے اور اوروں کو بھی گمراہ کیا ہے، اندریں حالات اس مضمون کی تحریر سے میرا مقصد یہ ہے کہ ناظرین کرام کی توجہ ان ترکی الفاظ کی طرف مبذول کرائی جائے، جو فی زمانا ہمارے ہاں تحریری اور تقریری طور پر بکثرت مستعمل ہیں، لیکن ان کے اصل ماخذ کے بارے میں ہم نے بہت کم دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔

جب ایک زبان کے الفاظ کسی دوسری زبان میں داخل ہوتے ہیں، تو الفاظ کا لین دین عام طور پر مختلف قوموں کے باہمی میل جول کا نتیجہ ہوتا ہے، لہٰذا موضوع سخن کی وضاحت کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ترک لوگ عالم اسلام میں بالعموم اور ہندوستان میں بالخصوص کب

اور کس طرح واردِ ہوئے،

ترکستان کی فتح | ترکوں کو اہلِ اسلام کے ساتھ پہلی صدی ہجری ہی میں سابقہ پڑ چکا تھا جب خلیفہ ولید اموی کے عہدِ حکومت (۸۶ھ تا ۹۶ھ) میں عربوں کا مشہور اور تجربہ کار سپہ سالار قتیبہ بن مسلم دریائے جیحون عبور کر کے ترکستان میں داخل ہوا، تو اس نے چند سالوں میں تمام ملک فتح کر لیا، اور اسے اپنے قبضہ میں رکھنے کے لیے مختلف مقامات میں متعدد چھاؤنیاں اور آبادیاں قائم کر دیں، جن کے بعض لسانی اور ثقافتی آثار کو حال ہی میں، روسی مستشرقین نے دریافت کیا ہے،

عباسی عہدِ خلافت | ترکستان کی اسلامی فتح کے تقریباً سوا سو سال بعد عباسی خلیفہ معتصم باللہ (۲۱۸ھ تا ۲۲۷ھ) کا زمانہ آیا، اس وقت اسلامی فوج میں عربوں اور خراسان کے ایرانیوں کا بہت زور تھا، اور خلیفہ اُن کی سرکشی سے بہت پریشان رہتا تھا، لہٰذا اس نے فوج میں توازن پیدا کرنے کے لیے ترکوں کو بھرتی کرنا شروع کیا، اس کے علاوہ معتصم کو خلافت کی شان و شوکت بڑھانے کا بڑا شوق تھا، چنانچہ اس نے ترکوں کی شجاعت اور وجاہت دیکھ کر سمرقند، فرغانہ اور ترکستان کے دوسرے حصوں سے ہزاروں ترک لشکری فراہم کیے اور ان کو اپنی فوج میں اس کثرت سے داخل کیا کہ ان کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی، اور ان میں سے جو ذاتی وجاہت اور قابلیت کے مالک تھے، خلیفہ کی خوشنودی حاصل کر کے سپہ سالاری کے منصب تک جا پہنچے، اگرچہ عربی زبان پیشتر ہی سے بعید وسیع تھی، اور علمی اور سیاسی ضروریات کے لیے کافی تھی، تاہم لشکریوں کی آمد سے بہت سے ترکی الفاظ عربوں اور ایرانیوں کی زبانوں پر جاری ہو گئے، مثلاً ایلچی، بیرق اور اس کا مرکب بیرقدار، چقمہ یا چخمہ (جسے عربوں نے جوخ بنا لیا) کلیق وغیرہ، اسی خلیفہ معتصم نے جب ۲۲۱ھ

میں ترک لشکریوں کے لیے بغداد کے شمال میں سامرا کے مقام پر ایک الگ چھاؤنی قائم کی اور اسے اپنا دارالحکومت قرار دیکر وہاں اپنا محل تعمیر کرایا، تو عرب مؤرخوں کے بیان کے مطابق لوگ اس قصرِ خلافت کو "الجوسق الخاقانی" کہتے تھے، اور یہ امر قابلِ غور ہے کہ یہ دونوں لفظ یعنی جوسق اور خاقان ترکی الفاظ کے معرّب ہیں،

سلاجقہ کی آمد دنیائے اسلام میں ایک مدت تک ترکوں کی حیثیت محض لشکریوں کی رہی، مگر پانچویں صدی ہجری کی ابتدا میں جب عباسی خلافت کا انحطاط حدسے گزر چکا تھا، ترک لوگ ایران میں فاتحین کی حیثیت سے داخل ہوئے، یہ سلجوقی قوم کے ترک تھے، جو چغری بیگ اور طغرل بیگ کی سرکردگی میں پہلے خیوا کے علاقہ پر قابض ہوئے اور پھر انھوں نے خراسان کا رخ کیا، اور سلطان محمود غزنوی کی اجازت سے وہاں آباد ہوگئے، لیکن سلطان ممدوح کی آنکھیں بند ہوتے ہی خود مختار بن بیٹھے، اور چند سالوں میں تمام ایران پر چھاگئے، یہاں تک کہ انھوں نے خلیفۂ بغداد کو بھی اپنی حمایت میں لے لیا، الپ ارسلان، ملک شاہ اور سنجر جیسے نامور اور اولوالعزم سلاطین اسی سلجوقی خاندان سے تھے، ظاہر ہے کہ سلاجقہ کی آمد سے بھی ترکی زبان کے اثر ونفوذ میں اضافہ ہوا ہوگا،

ہندوستان کے ترک حکمراں جس زمانہ میں سلاجقہ نے خوارزم میں ظہور کیا، اسی زمانہ کے قریب سلطان محمود ہندوستان میں اپنی فتوحات کا آغاز کرچکا تھا، جیسا کہ سب کو معلوم ہے سلطان مذکور نسلاً ترک تھا، اور اگرچہ اس کے عساکر میں ایرانی، افغان اور ہندو سبھی قوموں کے لوگ شامل تھے، لیکن اس کے اکثر معتمد علیہ افسر ترک ہی تھے،

جب شاہانِ غور نے غزنوی خاندان کو افغانستان سے بیدخل کردیا، تو غزنوی حکمرانوں نے پنجاب کو اپنا وطن بنایا اور اس کے صدر مقام لاہور نے بتدریج ایک اسلامی شہر کی

صورت اختیار کرلی۔

غزنویوں کے بعد ہندوستان میں جتنے مسلمان حکمراں ہوئے ہیں، اُن میں سے بیشتر ترکی نسل سے تھے۔ سلطان معزالدین محمد غوری جس نے دہلی اور اجمیر کے راجہ پرتھوی راج کو شکست دیکر شمالی ہند میں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی، اگرچہ افغان تھا، لیکن اس کا نائب قطب الدین ایبک جس نے سلطان محمد غوری کی وفات (۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء) کے بعد دہلی کو اپنا دارالحکومت بناکر ہندوستان میں ایک مستقل اسلامی سلطنت قائم کی نسل کے لحاظ سے ترک تھا۔ اور اس کے جانشینوں سلطان التمش اور سلطان بلبن کے علاوہ خلجی اور تغلق خاندانوں کے حکمراں بھی ترک تھے، صرف لودھی اور سُوری خاندانوں کے بادشاہ افغان تھے، لیکن ان کا عہد حکومت نسبتہً بہت مختصر ہے۔ اگرچہ ان تمام سلاطین کے عہد میں سرکاری اور علمی زبان فارسی تھی، تاہم ترکی زبان کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ ان سینکڑوں ترکی الفاظ سے ثابت ہے جو اُس عہد کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور جن میں سے بعض ابتک ہماری زبانوں پر جاری ہیں۔

تاتاری عُنصر | ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں (یعنی مغول) کے خروج کے بعد انھوں نے نہ صرف ہندوستان پر بار بار حملے کیے جن کا سلسلہ عہدِ غلامان سے شروع ہوتا ہے، بلکہ وہ ہندوستان کے بعض مقامات میں آباد ہوگئے تھے، چنانچہ ملک بھر میں کئی مقامات ایسے ہیں جو آجتک مغل پورہ یا مغل سرائے کے نام سے مشہور چلے آتے ہیں، اُن میں سے ایک مغل پورہ لاہور کے مضافات میں ہے۔ تاتاریوں کی آمد سے بھی ہندوستان کی زبانوں میں متعدد ایسے الفاظ براہ راست مروج ہوگئے۔ جو ان کی زبان کے ساتھ مخصوص تھے، مثلاً خان، آغا، بہادر، دگلا، باورچی، چاقو، قینچی، داروغہ، قدغن، نوکر وغیرہ۔

سلطنت مغلیہ | سولھویں صدی کے اوائل میں بابر اور اس کے ساتھیوں نے فرغانہ سے نکل کر

کابل میں اپنی مسند حکومت بچھائی اور چند سال کے بعد ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں اپنی قسمت آزمائی، بابر اور اس کے ہمراہی نسلاً ترک تھے، اور ترکی زبان بولتے تھے، چنانچہ بابر بادشاہ نے اپنی تزک ترکی ہی میں قلمبند کی تھی، بابر کی آمد سے ہندوستان میں ترکی زبان کے اثر و نفوذ کو از سر نو تقویت ملی مغل بادشاہوں نے اپنے محلات میں ترکی زبان کو بڑے اہتمام سے زندہ رکھا، چونکہ ترکی جاننے والے لوگ مثلاً تورانی امراء ہمیشہ ان کے گرد و پیش رہتے تھے، اس لیے شاہی خاندان کے افراد کو ترکی سیکھنے اور بولنے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی تھی، شاہی محلات کے زنان خانوں میں جو اُردا بیگنیاں اور قلماقنیاں پہرہ دینے اور دیگر انتظام کرنے پر مقرر تھیں وہ بھی وسطی ایشیا کے ترکی اور تاتاری قبیلوں سے فراہم کیجاتی تھیں، شاہی خاندان میں ترکی کے استعمال کی یہ روایات محمد شاہ کے عہد تک قائم رہیں، یہ رنگیلا بادشاہ غالباً ہندوستان کا پہلا مغل تاجدار تھا، جو ترکی سے بے بہرہ رہا، چنانچہ اسی لیے یہ مثل مشہور ہے کہ "بر محمد شاہ ترکی تمام شد"

نظام الملک آصف جاہ جو تورانی امراء کا سرخیل تھا، اور جس نے مغل بادشاہ کی نالائقی اور دربار دہلی کی مسلسل سازشوں سے تنگ آکر آخر کار ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) میں دکن میں ایک آزاد اور خود مختار ریاست کی بنیاد رکھی، یہ امیر کبیر بھی ترکی نسل سے تھا، اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جن دنوں نادر شاہ افشار مغلوں کی شامتِ اعمال بن کر دہلی میں مقیم تھا، نظام الملک اس سے بعض اوقات ترکی میں گفتگو کرتا تھا، اور محمد شاہ ان کا منہ تکتا رہ جاتا تھا، اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ نادر شاہ جس قبیلہ افشار سے تھا، وہ بھی ایک ترکی قبیلہ تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی امراء بھی شاہانِ وقت کی قومی زبان سے دلچسپی رکھتے تھے، کچھ مدت ہوئی، مجھے ایک ترکی گرامر کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، جو مغلیہ عہد میں ایک ہندو وزیر

نے ایک ہندو راجہ کی فرمائش پر فارسی میں لکھی تھی، ترکی زبان کا علم اب عملی طور پر ہندوستان اور پاکستان میں تقریباً کلیۃً مٹ چکا ہے، اور صد افسوس ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں ابھی تک اس اہم زبان کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکا۔

ترکی الفاظ کی فہرست | اب میں ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے چند ایک ایسے الفاظ صنف وار پیش کرتا ہوں جو تحقیقی طور پر ترکی ہیں، یہ فہرست کسی طرح سے بھی مکمل نہیں کہی جا سکتی، بلکہ اسے محض نمونۂ از خروارے تصور فرمایئے۔

اولاً خود اس زبان کا نام اردو ترکی لفظ ہے، جس کا معنی لشکر یا لشکر گاہ (کیمپ) ہے، اس لفظ کے مفہوم و معنی سے اس زبان کی ابتدا اور اس کے ترکیب پانے کے طریقہ اور محل و موقع پر بڑی قیمتی اور دلچسپ روشنی پڑتی ہے، اس لیے میں نے ذیل کے صفحات میں لفظ "اردو" پر ایک الگ نوٹ لکھ دیا ہے۔

(۲) مندرجہ ذیل الفاظ، جو مختلف رشتہ داروں کے لیے مستعمل ہیں، ترکی ہیں:۔

بابا بمعنی باپ۔ بادا بھی شاید اسی لفظ کی ہندی صورت ہے، جس میں باء واؤ سے بدل گئی ہے۔ (اطالوی زبان کا لفظ پاپا (Papa) بمعنی باپ، جس سے انگریزی کا لفظ پوپ ماخوذ ہے، لفظ بابا سے بہت مشابہت رکھتا ہے)

انّا بمعنی ماں۔ بعض لغت نگاروں نے انا کا معنی بے احتیاطی سے دایہ لکھ دیا ہے، یعنی وہ عورت جو دودھ پلائے، لیکن یہ اس لفظ کا اصلی لغوی معنی نہیں ہے، اس کا لغوی معنی فقط ماں ہے، اگر ایک دودھ پیتا بچہ اپنی دایہ کو انا یعنی ماں کہہ کر پکارتا ہے تو وہ معذور ہے، کیونکہ وہ اپنی حقیقی اور رضاعی والدہ میں تمیز نہیں کر سکتا، لیکن لغت نویس تو بچے نہیں، ان کو الفاظ کے اصلی اور ثانوی معنوں میں تمیز کرنی چاہیے۔

ترکی میں رضاعی ماں یعنی دایہ کو "سود انا" یا "سوت اناسی" کہتے ہیں، سود یا سوت کا معنی دودھ ہے،

باجی ۔ بمعنی بڑی بہن، ہندوستان اور پاکستان کے تعلیم یافتہ شریف گھرانوں میں اس لفظ کا استعمال بہت عام ہے،

کوکلتاش ۔ رضاعی بھائی ۔

خَصْم ۔ شوہر، خاوند، ترکی میں اس کا تلفظ خِصْم ہے، اور اس کا معنی محض رشتہ دار ہے،

(۳) مندرجۂ ذیل ترکی القاب بھی ملاحظہ فرمایئے :۔

خان ۔ ایک قدیم اور کثیر الاستعمال لقب ہے، جس کا مؤنث خانم ہے،

خاقان ۔ یعنی خان اعظم ۔ ترکی لقب قاغان کا معرّب ہے ،

بیگ ۔ کسی قوم یا قبیلہ کا سردار، امیر کبیر ۔ اس کا مؤنث بیگم ہے ۔

آغا یا آقا ۔ بمعنی مالک یا مرد بزرگ و محترم ۔ لغوی معنی "برادر بزرگ"۔

خاتون ۔ زن معزز و محترم، لیڈی، اردو میں اس کی جمع خواتین مروج ہے ۔ مگر جمع کا یہ صیغہ عربی طریقہ پر بنایا گیا ہے ۔

پاشا ۔ جو غالباً فارسی لفظ بادشاہ کا مخفف ہے ۔

آفندی ۔ تعلیم یافتہ اور معزز لوگوں کے لیے ازراہ احترام موسیو یا اسکوائر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔ دراصل یہ یونانی کلمہ (Authentes) کی بگڑی ہوئی صورت ہے ۔

(۴) ہمارے ہاں کھانے پینے کی اشیاء کے لیے جو کلمات مروج ہیں، ان میں سے ذیل کے الفاظ ترکی ہیں :۔

پلاؤ۔ وہ چاول جس کو گوشت یا گوشت کی یخنی ڈال کر پکایا جائے۔ پلاؤ ترکوں کا ایک مخصوص اور مرغوب کھانا ہے جس کو وہ طرح طرح سے تیار کرتے ہیں، اس لیے ان کے ہاں پلاؤ کی کئی قسمیں پیدا ہو گئی ہیں، مثلاً عجم پلاوی، قیمہ لو پلاؤ اور مولوی پلاؤ وغیرہ۔

یخنی۔ گوشت کو پانی میں ابالنے کے بعد جو مشروب یا سُوپ حاصل ہوتا ہے وہ یخنی ہے۔

قیمہ۔ وہ گوشت ہے جس کو پکانے سے پہلے ریزہ ریزہ کر لیا جائے، یہ لفظ ترکی مصدر قیمق سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے کسی چیز کو ریزہ ریزہ کرنا۔

قورمہ۔ جس کی اصلی صورت قاوُرمہ ہے، وہ تلا ہوا یا بھنا ہوا مسالہ دار گوشت ہے، جو سبزی یا ترکاری کے بغیر تیار کیا جائے۔

جُغرات، دہی، اس لفظ کی اصلی صورت یُوغورت ہے، لیکن بعض علاقوں میں جغرات بھی کہتے ہیں اور فارسی کتابوں میں بیشتر یہی صورت مستعمل ہے،

شلغُم، ایک معروف ترکاری ہے، جسے انگریزی میں ٹرنپ (Turnip) کہتے ہیں،

(۵) کھانے پینے کے لیے جو ظروف استعمال ہوتے ہیں اُن میں ذیل کے الفاظ ترکی ہیں:

آیاغ ۔ پینے کا پیالہ یا جام۔

ساغَر۔ پینے کا پیالہ۔

چمچہ۔ ترکی میں لکڑی کی ڈوئی کو چمچاق کہتے ہیں، چمچہ اسی طرح مرخّم صورت ہے، چمچ اور چمچی ترکی زبان میں معروف نہیں، یہ اہل ہند کی اختراع ہیں، لیکن ان کا ماخذ وہی ترکی لفظ چمچاق ہے۔

آجکل ترکی اور ایران میں چمچی کے لیے قاشق کا لفظ مستعمل ہے۔ قاشق بھی ترکی ہے۔

قاب۔ وہ بڑی رکابی یا پلیٹ جس میں کھانا کھاتے ہیں۔

بُشقاب۔ ترکی میں بش کا معنیٰ پانچ ہے، لہٰذا بشقاب وہ خوانچہ ہے جس میں مختلف کھانوں کی پانچ رکابیاں رکھی جائیں۔

کشکول۔ کاسۂ گدائی، یعنی وہ کشتی نما برتن جس میں درویش یا گداگر رنگارنگ کے مختلف کھانے جمع کر لیتے ہیں، یہ ترکی لفظ کچکول کا معرب ہے۔

(۶) مندرجۂ ذیل الفاظ جن کا تعلق لباس یا پوشش سے ہے، ترکی ہیں:۔

چُوغہ۔ اونی کپڑے کا لبادہ، فرغل یا جبّہ۔

دَگلہ یا دگلا (تاتاری) چھوٹی آستینوں والا کوٹ۔

قَلپاق۔ وہ کلاہ یا ٹوپی جس کے اندر سمور یا بھیڑ کی کھال لگائی جائے۔

تُکمہ۔ گھنڈی یا بٹن۔ اس کی اصل ترکی صورت دوگمہ ہے۔

توشک۔ چادرِ خواب یا بستر، توشک خانہ یا توشہ خانہ وہ جگہ ہے، جہاں پوشاک اور دیگر متعلقہ سامان رکھا جائے۔

چادر۔ وہ لمبا چوڑا اَن سلا پارچہ ہے جو دیہاتی عورتیں ستر کے لیے بدن پر دوسرے کپڑوں کے اوپر لپیٹ لیتی ہیں، ہندوستان اور پاکستان میں بھی یہ لفظ بعینہٖ اسی مفہوم میں مستعمل ہے۔

چادر کا دوسرا معنیٰ خیمہ ہے، اس لیے ایران میں ان خانہ بدوش قبائل کو جو کھلے میدانوں میں خیموں میں رہتے ہیں، چادر نشین کہتے ہیں۔

(۷) ترک ہمیشہ سے اپنی شجاعت اور بسالت کے لیے مشہور رہے ہیں، اور انھوں نے اپنے قومی جوہر بیشتر حرب و ضرب کے میدان میں دکھائے ہیں، اس لیے اُن کے اثر سے ہندوستان کی زبانوں میں جو ترکی الفاظ آئے ہیں، اُن میں سے بہت سے الفاظ معرکہ آرائی اور عسکری

زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً :-

یلغار - جس کی اصل صحیح صورت ایلغار ہے کسی سوار فوج کا کمال سرعت سے کوچ کرکے دشمن پر حملہ یا چڑھائی کرنا۔

یُورش۔ دشمن پر دوڑکر حملہ کرنا یا چڑھائی کرنا، دھاوا بولنا۔

چپقلش - تلوار کی لڑائی یا جھڑپ۔

کوچ ۔ فوج کا ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرنا، مارچ کرنا۔

ہراوُل ۔مقدمتہ الجیش یا وہ نقیب جو کسی سواری کے آگے پیادہ چلے۔

قراوُل۔ سنتری یا سرحدی محافظ۔

قراوُلی۔ وہ لڑائی جو سرحدی فوجی چوکیوں کے درمیان ہو۔

کُمک یا کُومک۔ امداد، خصوصاً امدادی فوج کا دستہ۔

چاوُش ۔ نقیب یا سارجنٹ (عربوں نے اس لفظ کو لیکر شاویش بنا لیا ہے)

بَیرق۔ علم، جھنڈا۔ بیرقدار (یعنی علمبردار) اسی بیرق سے ماخوذ ہے۔

سنجق۔ علم، جھنڈا۔

پُرچم ۔ پھندنا جو نیزے کے سرے پر باندھتے ہیں۔

یَراق۔ سازو سامان، اسلحہ

قمچی - چمڑے کا کوڑا یا چابک (عربوں نے اس لفظ کو لیکر قمشہ بنا لیا ہے)

چاقو۔

(۸) مسلمان اقوام میں ترکوں نے سب سے پہلے آتشیں اسلحہ اور توپخانہ کی اہمیت اور افادیت کو سمجھا، اور ان کے استعمال سے فائدہ اٹھایا۔ تاریخِ اسلام میں اس کا سب سے

پہلا مظاہرہ مرج دابق (شام) کی جنگ میں ہوا (۲۴ اگست ۱۵۱۶ء) جس میں سلطان سلیم عثمانی کی فوج نے توپ و تفنگ کے استعمال سے مصر کے مملوکوں پر فتح پائی؛ حالانکہ مملوک ذاتی بہادری اور شجاعت میں کسی سے کم نہ تھے۔ اس کے دس سال بعد یعنی ۱۵۲۶ء میں توپخانہ نے اسی قسم کا کرشمہ پانی پت کے میدان میں دکھلایا، جہاں بابر بادشاہ کے ساتھ صرف بارہ ہزار فوج خاصہ تھی، لیکن ابراہیم لودھی کی ایک لاکھ سپاہ اس ترک کے توپخانہ کی بے پناہ گولہ باری کے آگے نہ ٹھہر سکی، اس لیے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ اردو زبان میں توپخانہ اور آتشیں اسلحہ کے متعلق اکثر الفاظ ترکی ہیں، مثلاً

توپ۔ جسے عثمانی ترک طوپ لکھتے ہیں یا لکھتے تھے، توپ کا اصلی معنی گولہ ہے۔

توپچی۔ توپ چلانے والا۔

توپخانہ۔ دراصل وہ کارخانہ ہے جہاں توپ تیار ہوتی ہے۔

تفنگ۔ وہ آتشیں ہتھیار ہے جسے کندھے پر رکھ کر چلایا جائے۔

تفنگچی۔ فوجی جو تفنگ چلائے، اس کا فارسی ترجمہ تفنگ انداز ہے۔

(۹) ترکی اور تاتاری حکمرانوں اور امیروں کے جو نام تاریخی اور ادبی کتابوں میں پائے جاتے ہیں، وہ مہمل نہیں بلکہ بامعنی ہیں، مثلاً

آرسلان۔ بمعنی شیر (Lion)

قزل ارسلان۔ شیر سرخ

الپ تگین۔ بہادر سورما

اُلغ بیگ۔ بیگ بزرگ، امیر کبیر۔

اوجائتو، خوش نصیب، فیروز بخت۔

اللہ ویردی خاں ۔ اللہ ویردی کا معنی ہے خدا پرست ۔

بابر ۔ بمعنی شیر (Tiger)

بغرا خاں ۔ بغرا کا معنی نر اونٹ ہے ۔

باتو خاں ۔ باتو کا معنی طاقتور ہے ۔

بغا یا بوغا ۔ بمعنی بیل ، طاقتور جانوروں کے نام سطوت وصولت کے اظہار کیلئے اختیار کیے جاتے تھے ۔ ملاحظہ ہو انگریزوں کا قومی لقب John Bull

بیرم خاں = عید ے خاں ۔ بیرم کا معنی عید ہے ۔

تیمور ۔ تمر یا تیمور کا معنی لوہا ہے (ملاحظہ ہو روسی نام Stalin جس کا لفظی معنی ہے سٹیل یعنی فولاد کا بنا ہوا مرد آہنین)

تغری بردی = تنگری بردہ = خدا بندہ = عبداللہ

تولوی ۔ بمعنی آئینہ

چقاق ۔ ایک مشہور پتھر ہے جو اپنی سختی اور مضبوطی کے لیے مشہور ہے ۔ عرب مورخین اس نام کو جمق لکھتے ہیں ۔

سُنقر یا سُنغر ۔ باز

آق سُنقر ۔ باز سپید ۔

طُغرل بیگ ۔ طغرل کا معنی شاہباز ہے ۔

علی قلی = غلام علی

قرا خاں = کالے خاں ، قرہ یا قرا کا معنی سیاہ ہے ۔

قلیچ خاں ، قلیچ کا معنی تلوار ہے ۔

منگو خان، منگو کا معنی جاوید ہے۔

یلدرم، برق، بجلی کی کڑاک، رعد، سلطان بایزید کا لقب تھا۔

(۱۰) مندرجۂ بالا کلمات کے علاوہ ذیل کے الفاظ بھی ترکی ہیں:-

ایلچی، اتالیق، استرا، الم غلم، بی بی، بقچہ یا بغچہ (گٹھری یا بنڈل)، باورچی، تمغا، تومان (= دس ہزار۔ تمندار اسی سے ماخوذ ہے)، توزک، جرگہ، جوق جوق، چھمک (پھول) خربوزہ، خواجہ، داروغہ، سراغ، سوغات، شلغم، قاز، قالین، قابو، قدغن، قینچی، قزاق، قلتبان (بھڑوا)، کاکل، کوچک، کلابتون، کوسہ، کوشک، گولہ (غلام) مچلکا، نوکر، یغما (لوٹ)، یرغمال۔

بعض ترکی کلمات کی تشریح | مندرجۂ بالا کلمات میں سے بعض الفاظ تشریح طلب ہیں، چونکہ اس تشریح کی سیاق کلام میں گنجایش نہ تھی، اس لیے ان الفاظ پر ذیل کے صفحات میں الگ نوٹ لکھے جاتے ہیں، جو امید ہے ناظرین کی دلچسپی کا موجب ہوں گے۔

اردو، اردو ہندوستان اور پاکستان کی وہ لنگوا فرینکا (Lingua Franca) یعنی عام فہم اور کثیر الاشاعت زبان ہے جو دونوں ملکوں میں پشاور سے لیکر چاٹگام تک اور سری نگر سے مدراس اور میسور تک اگر ہر جگہ بولی نہیں جاتی تو کم از کم سمجھی ضرور جاتی ہے، اردو ترکی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی لشکر یا لشکرگاہ (کیمپ) ہے، اس نام سے اسکی ابتدا کی پوری وضاحت ہوتی ہے یعنی اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ اس زبان کی ابتدا کہاں اور کن حالات میں ہوئی اور کن لوگوں نے اس کی تشکیل و ترقی میں حصہ لیا، خود زبان کے علاوہ تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ زبان نووارد مسلمانوں اور مقامی ہندو باشندوں کے باہمی میل ملاپ کا نتیجہ ہے، اور اس لحاظ سے انڈو مسلم کلچر کی ایک پائدار لسانی اور ثقافتی یادگار ہے، بقول

ادیب لبیب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی مرگباشی " اردو کیا ہے؟ وہ مختلف معاشروں، وہ مختلف مذہبوں، وہ مختلف کلچروں کے شیر و شکر ہونے اور ارتباط کی یادگار۔ وہ سے عرب کے مذہب اور ایران کی کلچر کا دنیا کی سب سے قدیم کلچر یعنی آرین تہذیب سے تصادم نہیں، بلکہ اختلاط، یہ سب کچھ اپنے آپ ہوا، بالطبع ہوا"؎

مختلف قوموں کا باہمی اختلاط سب سے پہلے مسلمان حکمرانوں کے "اردو" یعنی کیمپ میں ہوا، لہٰذا ان کے میل جول سے جو نئی زبان پیدا ہوئی، وہ "زبانِ اہلِ اردو" یا "زبانِ اردو" کہلائی اور پھر محض "اردو" کے نام سے موسوم و مشہور ہوئی۔

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کے اسلامی کیمپ کو جہاں اس زبان کی بنیاد پڑی، "اردو" کیوں کہتے تھے یا بالفاظ دیگر اس کے لیے ایک ترکی لفظ کیوں استعمال کرتے تھے، اس کی توجیہ یہ ہے کہ نو وارد مسلمان حکمرانوں اور ان کے ہمراہیوں میں اکثر لوگ ترک تھے، جو وسطی ایشیا کے ترکی علاقوں سے آئے تھے اور جن کی مادری زبان ترکی تھی ہندوستان میں سطوتِ اسلام جن حکمراں خاندانوں کے قوتِ بازو سے قائم ہوئی، اُن میں سے اکثر ترکی نسل سے تھے، سلطان محمود غزنوی جس نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے، اور بالآخر پنجاب کو مستقل طور پر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، ترک تھا، اس کے بعد محمد غوری جس نے دہلی کے راجہ کو شکست دے کر شمالی ہند میں اسلامی سلطنت کے قیام کے لیے راستہ کھول دیا، اگرچہ غور کا افغان تھا، لیکن اس کا سپہ سالار اور نائب قطب الدین ایبک جس نے اس کی وفات کے بعد ہندوستان میں ایک مستقل سلطنت کی بنیاد ڈالی، ترک تھا، اور سادات، لودھی اور سوری خاندان کے علاوہ باقی تمام خاندان جو دہلی کے تخت پر بیٹھے، ترک تھے، ان حالات میں اگر ہندوستان

؎ منقول از "حمسۂ کیفی" ص ۱۰۱، مطبوعہ دہلی ۱۹۴۲ء

کا اسلامی لشکر گاہ "اردو" کہلایا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں بلکہ ایک طبعی امر ہے،

لفظ اردو کی بحث کے سلسلہ میں یہ دلچسپ بات قابل ذکر ہے کہ یہ لفظ یورپ کی متعدد زبانوں مثلاً انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور پولش میں بھی *Horde* کی صورت میں دخیل ہو چکا ہے، اور لشکر یا فوج کے معنی میں بکثرت مستعمل ہے، یہ لفظ مغربی ملکوں اور مغربی زبانوں میں کیسے پہنچا؟ اس کی تشریح یہ ہے کہ تاتاریوں نے تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں صرف چین اور اسلامی ملکوں ہی کو تاخت و تاراج نہیں کیا تھا، بلکہ ان کی ایک شاخ نے چنگیز خاں کے پوتے باتو خاں کی سرکردگی میں ۱۲۳۶ء میں یورپ پر چڑھائی کی تھی، اور مغرب کی طرف بڑھتے بڑھتے پولینڈ اور مشرقی جرمنی کی سرحدوں تک جا پہنچے تھے، انھوں نے بلاد روس میں دریائے والگا کے علاقہ میں، جسے اسلامی مورخوں نے "دشت قبچاق" کہا ہے، جو مملکت قائم کی، وہ اڑھائی سو سال تک قائم رہی، ان وجوہ سے یورپ کے لوگ لفظ "اردو" سے آشنا ہوئے، جو تاتاری لشکر کے لیے استعمال ہوتا تھا جس میں بہت سے ترک قبیلے بھی شامل تھے، اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری (کلاں) کے مؤلف لکھتے ہیں کہ *Horde* کی ابتدا میں جو H پایا جاتا ہے اسے پولینڈ والوں نے بڑھایا تھا[1]،

---

[1] تاتاریوں کی جس شاخ نے روس کے ملک میں اپنی حکومت قائم کی تھی، وہ تاریخ میں "آلتون اردو" کے نام سے مشہور ہے، روسی اسے *Zololaya Orda* اور انگریز *Golden harde* کہتے ہیں، اسکے متعلق یہ بات قابل ذکر ہے کہ تمام تاتاریوں میں سب سے پہلے یہی لوگ تھے جنھوں نے اپنے حکمران برکہ خاں (۱۲۵۵ء تا ۱۲۶۶ء) کی سرکردگی میں قبول اسلام میں سبقت کی تھی، باتو خاں کا خاندان کچھ مدت کے بعد زوال پذیر ہو گیا لیکن دشت قبچاق میں مسلمان تاتاریوں کی آبادی بدستور باقی رہی، اسے عہد حاضر میں روسی حکمرانوں نے تاتار سوویٹ ریپبلک (*Tatar Soviet Republic*) کے نام سے ایک الگ ریاست کی صورت دیدی ہے جس کا صدر مقام قازان کا مشہور تاریخی شہر ہے۔

آقا (آغا)۔ آغا تاتاری (منغولی) زبان کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنے بڑے بھائی کے ہیں، ترکی زبان میں بھی اس کے یہی معنے ہیں۔

چھوٹے بھائی کو منغولی میں اینی کہتے ہیں، منغول کی تواریخ میں "آقا و اینی" کے الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں، چنانچہ تاریخ وصاف میں جس کا سنہ تصنیف ۷۰۰ھ - ۱۳۰۱ء ہے، کیخاتو خاں کی ہلاکت کے ذکر میں اس طرح آیا ہے

"چون کیخاتو از ترتیب ملک داری اعراض نمود و یاسا چنگیز خانی دگر کرد،
باتفاق آقا و اینی و خواتین و امرا، او را بر داشتیم"

جامع التواریخ کے مؤلف رشید الدین فضل اللہ نے بھی آقا و اینی کی ایسی تعبیر کی ہے جس سے ان الفاظ کا اطلاق تمام بھائیوں اور ان کی اولاد پر ہوتا ہے۔

ایلخانی اور تیموری دور کی تاریخی کتابوں میں "آغایان و خواتین" اور "آغایان و شاہزادگان" کے الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔

آغا کا لفظ از راہ احترام تیموری اور صفوی دور میں شاہی خاندان کی خواتین اور شاہزادیوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، مثلاً گوہر شاد آغا، شاد ملک آغا وغیرہ۔

تاتاریوں کے دستور کے مطابق بڑا بھائی دوسرے تمام بھائیوں اور ان کی اولاد پر برتری رکھتا تھا، اور ان کو اپنے ضبط میں رکھنے کا مجاز تھا، اس لیے آغا کے معنے رفتہ رفتہ خاندان کے بزرگ اور رئیس اعلیٰ اور پھر مطلق بزرگ و برتر اور مالک کے ہو گئے، چنانچہ ایک مدت سے ایران اور ہندوستان میں آغا کا لفظ کلمۂ تعظیمی کے طور پر مستعمل ہے۔

ایران میں آغا کو بالعموم آقا لکھتے ہیں اور اس کی جمع آقایان بناتے ہیں، لیکن جمع کا یہ صیغہ فارسی قواعد کے مطابق بنایا گیا ہے۔

عثمانی ترکوں کے ہاں بھی آغا کا لفظ تعظیم و تکریم کے لیے آتا ہے اور کئی عہدہ داروں کے القاب میں استعمال ہوتا ہے۔

فارسی زبان کے اکثر لغت نگاروں نے آغا کے مذکورۂ بالا دونوں معنی یعنی (۱) برادر بزرگ اور (۲) مالک اور بزرگ مطلق درج کئے ہیں، لیکن اس کے ثانوی معنے کو غالباً شہرت عام کی بنا پر بالعموم مقدم رکھا ہے۔ مگر اس ترتیب سے لفظ کے معنی اور اس کے مفہوم کے ارتقاء کی حقیقت واضح نہیں ہوتی۔

آغا خاں۔ آج کل اسمٰعیلی شیعوں کی نزاری شاخ کے اماموں کا امتیازی لقب ہے۔ یہ لقب قاچاریوں کے عہد میں دربار ایران کی طرف سے حسن علی شاہ کو دیا گیا تھا، جو موجودہ آغا خاں کے مورث اعلیٰ تھے۔ اب یہ لقب ان کے خاندان میں موروثی بن گیا ہے (اس سلسلہ میں یہ امر ذہن نشین رہے کہ زند اور افشار کی طرح قاچار خاندان کے حکمران بھی نسلاً ترک تھے)۔

آغا اور خان دونوں ترکی بلکہ تاتاری زبان کے لفظ ہیں، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے عالم اسلام میں یہ الفاظ تاتاریوں کی آمد سے پہلے استعمال میں نہیں آئے۔ میرے لیے اور غالباً ناظرین کرام کے لیے بھی یہ امر بیحد تعجب انگیز اور قابل غور ہے کہ فی زمانا ایک اسلامی فرقہ کے مذہبی پیشوا کے لیے اس قوم کی زبان کے الفاظ بطور لقب کے احتراماً استعمال ہوں جس نے کسی زمانہ میں اسلامی دنیا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی، اور خلافت بغداد کا چراغ گل کر دیا تھا لیکن اس عجوبہ کی تشریح ہمیں ان تاریخی واقعات اور انقلابات میں ملے گی جن کی طرف میں نے صفحات بالا میں اشارہ کیا ہے۔ تاتاریوں کو ایک زمانہ میں قضا و قدر کی طرف سے جو عزت و حکومت ارزانی ہوئی تھی، اس کی بدولت ان کی زبان کے الفاظ و القاب کو وہ وسعت اور وجاہت اور رفعت نصیب ہوئی کہ مہذب اور متمدن قوموں کے لوگ آج بھی ان کے استعمال کو اپنے لیے مایۂ افتخار و اعتبار

سمجھے ہیں، تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ

ناظرین کو یاد ہو گا کہ انگریزی عہد میں حکمرانوں کی طرف سے بعض ہندوستانیوں کو ان کی خدمات کے صلہ میں "خان بہادر" کا خطاب ملا کرتا تھا، اس ضمن میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ بہادر کا لفظ بھی خالص تاتاری ہے۔

آق۔ آق ایک ترکی لفظ ہے جس کا معنی سفید ہے اور جو ذیل کے مرکب کلمات کا جزء ہے،

آق صو، لفظی معنی: آبِ سفید۔ ترکستان کے متعدد دریاؤں کا نام ہے۔

آق سرائے، ترکی کا ایک شہر ہے۔

آق سُنقُر، زنگی خاندان کا بانی۔ لفظی معنی: باز سفید۔

آق قویونلی، سفید بھیڑ والے۔ ترکمانوں کا ایک اہم تاریخی قبیلہ تھا، جن کے علم پر سفید بھیڑ کی تصویر بطور علامت ہوا کرتی تھی۔

اَتا۔ ترکی ہے، بمعنی باپ

پلاٹس نے اپنی اردو انگریزی ڈکشنری میں اسے فارسی لکھا ہے، جو غلط ہے۔[1]

اتا کا لفظ کئی مرکب کلمات میں احتراماً استعمال ہوا ہے، مثلاً:۔

اتابیگ، سلجوقی سلاطین کے ہاں دستور تھا کہ وہ ہر شہزادہ کی تعلیم و تربیت کے لیے کسی ذی رتبہ امیر کبیر کو مقرر کر دیتے تھے، شہزادے اسے ازراہ تعظیم اتابیگ کہتے تھے، بیگ کا لفظ بھی ترکی ہے جس کا معنی امیر کبیر ہے، یہی اتابیگ جو ابتدا میں شہزادوں کے اتالیق اور سربراہ تھے، رفتہ رفتہ سلاجقہ کی سلطنت پر متسلط ہو گئے، عرب مصنفوں نے اتابیگ کو اتابک لکھا ہے اور اس کی جمع اتابکہ بنائی ہے۔

---

[1] *Urdu Classical Hindi and English Dictionary by J.T. Platts. Oxford, 1930*

اتاترک ۔ یہ وہ لقب ہے جو ترکوں نے مصطفیٰ کمال پاشا (متوفی ۱۹۳۸ء) کو اس کے شاندار فوجی کارناموں اور اعلیٰ قومی خدمات کے اعتراف میں دیا تھا ۔

اتالیق ۔ کسی خرد سال لڑکے کا معلم و مؤدب اور نگران کار ۔

الپ ۔ الگ ایک ترکی لفظ ہے جس کا معنی بہادر اور دلاور ہے اور جو ترکی ناموں میں اکثر ملتا ہے ، مثلاً

الپتگین ۔ وہ ترک سردار جس نے سامانیوں سے برگشتہ ہو کر غزنی میں اپنی الگ بساط حکومت بچھائی اور بعد ازاں سبکتگین اور اس کا بیٹا سلطان محمود اس کے جانشین ہوئے ۔

الپ ارسلان ، سلجوقی خاندان کا نامور سلطان جس نے ملازگرد کی جنگ میں قیصر روم (دیوجانس) پر فتح عظیم پائی تھی ۔

الپ خاں ، جسے بعض کم سواد لوگ غلطی سے الف خاں لکھتے اور پڑھتے ہیں ۔

ایل ، ایک ترکی کلمہ ہے ، جس کا معنی قوم یا قبیلہ ہے ۔ یہ لفظ ذیل کے مرکبات میں پایا جاتا ہے ۔

ایل بیگی ، اپنے قبیلہ کا بیگ یعنی امیر یا سردار

ایلچی ، سفیر جو اپنے قبیلہ یا ملک کی نمائندگی کرتا ہے ۔

ایلخان ، اپنے قبیلہ کا خان یا حاکم

تاتاریوں کے خاقان یعنی خان اعظم کے مقابلہ میں ہلاگو خاں کو مغولی سلطنت کے صرف ایک حصے یا صوبے کا حاکم تھا ، اس لیے اس کا لقب ایلخاں ٹھہرا ، اور اس کا خاندان ایلخانی کہلایا جو اس کے بعد ایران پر حکمراں رہا ۔

جدید فارسی میں " ایلخانی " کا لفظ سرداری کے معنی میں مستعمل ہے ۔

ایران میں ایل کی جمع ایلات بنالی گئی ہے ، اور ایلات (یا ایلیات) سے مراد ترکی نسل کے

وہ قبائل ہیں جو آجکل ایران کے میدانوں اور صحراؤں میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اقصرائی۔ اقصرائی علم طب کی ایک کتاب ہے، جو عربی مدارس میں داخلِ نصاب رہ چکی ہے، اقصرائی دراصل اس کتاب کے مصنف کا نام ہے۔

علامہ قرشی نے شیخ الرئیس کے قانون کی تلخیص "موجز القانون" کے عنوان سے کی تھی، اس پر جمال الدین محمد الاقصرائی نے ایک شرح لکھی، جو اقصرائی کے نام سے مشہور ہوئی۔

لفظ اقصرائی کی ہیئت کو دیکھکر ناظرین اسے غالباً عربی تصور کریں گے لیکن اسکی تہ میں ایک ترکی لفظ آق (بمعنی سفید) پوشیدہ ہے۔

اقصرائی دراصل آقسرائی تھا، اقصرائی اسی کا معرب ہے،

آقسرائی منسوب ہے آق سرائے کی طرف جو ترکی کا ایک شہر ہے۔

آق سرائے میں آق ایک ترکی کلمہ ہے، جس کا معنی سفید ہے۔ لہذا آق سرائے کا لفظی معنی ہوا "شہر سپید" یا "دار البیضاء"۔

آلم غلم۔ بے معنی اور مہمل باتیں جو سمجھ میں نہ آئیں، جن کا کوئی سر پیر نہ ہو۔ "کسی چیز کو آلم غلم کرنا" یعنی فریب دہی یا حیلہ بہانہ سے کسی چیز کو اڑا لینا، ہیر پھیر کرنا۔ یہ کلمہ دراصل ترکی ہے جس کو ترک آلم قلم لکھتے ہیں، اور اسی معنی میں استعمال کرتے ہیں، جس مفہوم میں یہ محاورہ اردو میں مستعمل ہے، (دیکھو ریڈ ہاؤس کی ترکی انگریزی لغات مطبوعہ قسطنطنیہ ۱۸۹۰ء ص ۱۸۸)

امیر احمد مینائی لکھنوی اس محاورہ کے اصل کے بارے میں خاموش ہیں، اور عدم واقفیت کی صورت میں ان کی خاموشی، ان کی احتیاط پسندی اور دانشمندی کی دلیل ہے، لیکن پلاٹس نے اور ان کے تتبع میں جامع اللغات کے مؤلف خواجہ عبد المجید لاہوری نے بھی جو

لغت نویسی کے میدان کے ماطب اللیل ہیں)، اس محاورہ کو فارسی اور ہندی بتایا ہے جس سے ان کی مراد غالباً یہ ہے کہ یہ کلمہ دراصل فارسی ہے اور پھر ہندی میں مستعمل ہے، اور یہ دونوں باتیں محل نظر ہیں، کیونکہ اس کے فارسی الاصل ہونے کی کوئی سند نہیں، دوسرے اس کا رواج بیشتر اردو داں طبقہ میں ہے لیکن پلاٹس صاحب کی زبان سے اردو کا نام بہت کم سننے میں آتا ہے۔

(باقی)

گجرات کی تمدنی تاریخ

(مسلمان حکمرانوں کے عہد میں)

گجرات کا اسلامی دور بہت شاندار رہا ہے، اس دور میں گجرات نے علمی، تمدنی، صنعتی، تجارتی، تعمیری ہر حیثیت سے بڑی ترقی کی، اور وہ شاہان گجرات کے ذوق تعمیر و نفاست پسندی سے رشک ارم بن گیا، جس کے آثار آج بھی وہاں پائے جاتے ہیں۔ اس پر اردو میں کوئی کتاب موجود نہیں تھی مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی مرحوم نے یہ کتاب لکھ کر اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے، جس میں نہایت کاوش اور تلاش و جستجو سے قدیم فارسی ماخذ، اور دوسری کتابوں سے گجرات کی تمدنی تاریخ اور شاہان گجرات کے آثار و مشاہد سے متعلق ہر قسم کے معلومات فراہم کیے گئے ہیں۔

ضخامت ۳۳۶ صفحے۔ قیمت ۷ے

مولانا سید ابوظفر صاحب مرحوم کی دوسری اہم کتاب **تاریخ سندھ** کا دوسرا اڈیشن بھی تیار ہو گیا ہے۔ ضخامت ۴۱۶ صفحے۔ قیمت ۸ے

مینجر

شوقی اور اُن کی شاعری

(۱۸۶۹ء — ۱۹۳۲ء)

از جناب مولوی مقتدیٰ حسن صاحب اعظمی فاضل الازہر یونیورسٹی قاہرہ

(۲)

دربار شاہی میں شوقی ۱۸۹۲ء میں جب مصر واپس آئے تو خدیوی توفیق کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کی جگہ عباس دوم تخت نشین ہوئے تھے، عباس نے شوقی کو دربار میں ترجمہ کا شعبہ سونپ دیا، دربار میں شوقی کو بہت زیادہ مقبولیت اور عروج حاصل ہوا، اور ۱۸۹۲ء سے ۱۹۱۴ء تک کی طویل مدت میں شوقی کی شاعری کا محور عباس اور اس کے کارنامے تھے محل شاہی میں باہر کی دنیا سے شوقی یکسر بے تعلق تھے.

اس عہدہ پر شوقی نے بیس سال گذارے جو ان کی زندگی کا بہترین دور شمار کیا جاتا ہے، اسی مدت میں انھوں نے ایک مالدار عورت سے شادی کی جو بہترین رفیقۂ حیات ثابت ہوئی، اس کے بطن سے دو لڑکے علی اور حسین اور ایک لڑکی امینہ پیدا ہوئی،

دربار شاہی سے شوقی کا جب تک تعلق رہا وہ فکری اعتبار سے مقید اور شاہی پالیسی سے ہم آہنگ تھے، بڑے سے بڑے واقعات میں بھی وہ حکومت مصر کے خلاف عوام کے جذبات کی ترجمانی نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ جب دنشوای کا واقعہ پیش آیا تو شوقی ایک سال تک بالکل خاموش رہے، اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ مصر کے ایک ضلع "شبین الکوم" کے "دنشوای" نامی

گاؤں میں انگریز فوجیوں کی ایک جماعت ۱۳ر جون سنہ ۱۹۰۶ء کو فاختہ کا شکار کرنے کی غرض سے گئی، شکار میں ان کی گولی سے ایک مصری عورت زخمی ہوگئی اور کسانوں کے کھلیان میں آگ لگ گئی۔ اس واقعہ سے گاؤں کے کسان غصہ میں بھر گئے اور گھروں سے نکل پڑے۔ انگریز فوجیوں نے ان پر بڑی زیادتی شروع کی اور ایک بڈھے آدمی کو جان سے مار ڈالا۔ گاؤں والوں نے ان پر پتھر برسانا شروع کردیے، جس سے ایک فوجی افسر کے سر میں چوٹ آئی اور سب بھاگ کھڑے ہوئے، زخمی فوجی تقریباً آٹھ میل تک بھاگنے کے بعد تیز دھوپ کی تاب نہ لاکر گر پڑا اور وہیں مرگیا۔ اس واقعہ سے انگریزوں میں آگ لگ گئی اور انھوں نے مخصوص فوجی عدالت میں گاؤں والوں پر مقدمہ چلاکر اکیس آدمیوں کو ملزم قرار دیا جن میں سے چار کو سولی دی گئی اور باقی لوگوں کو مارنے پیٹنے کے بعد قید کردیا گیا۔[۱]

اس واقعہ پر شوقی نے فوراً کچھ نہیں کہا، عوام کو امید تھی کہ یہ نامور شاعر اس المناک حادثہ کے بارے میں ان کے جذبات کی ضرور ترجمانی کرے گا۔ لیکن قصر کی پالیسی انگریزوں کے حق میں تھی۔ اور خدیوی عباس انگریزوں کے قبضہ سے خوش اور مطمئن تھا۔ اسلیے انگریزوں کے خوف اور عباس کی رضاجوئی میں شوقی بھی خاموش رہے۔ ایک سال کے بعد جب مقررہ انگریز حاکم مصر سے چلا گیا تو شوقی نے "ذکری دنشوای" کے عنوان سے چودہ اشعار کا ایک قصیدہ لکھا،[۲] اس کے چند اشعار یہ ہیں:-

یا دِنشوای علی رباكِ سلامُ ذهبت بأنس ربوعكِ الأيامُ
عشرون بيتاً أقفرت وانتابها بعد البشاشة وحشةٌ وظلامُ
ياليت شعري في البروج حمائمٌ أم في البروج منيةٌ وحمامُ

---

[۱] عبدالرحمن الرافعی: مصطفیٰ کامل ص ۱۹۰، [۲] عمر الدسوقی: فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۳۹

نیرونُ لو ادرکتَ عہدَ کرومرٍ لعرفتَ کیفَ تنفذُ الاحکامُ

وطنشوا ای! تیری سرزمین سلامت رہے، تیرا سکون زمانہ کے ہاتھوں غارت ہو گیا۔ ہیں گھر سنسان ہو گئے، اور خوشی کے بعد ان میں وحشت و تاریکی چھا گئی۔

معلوم نہیں برج میں کبوتر رہتے ہیں یا وہاں پر موت کا بسیرا ہے؟۔

نیرون! اگر تم کرومر کے عہد میں ہوتے تو سمجھ میں آتا کہ احکام کا نفاذ کیسے کیا جاتا ہے۔

فرانسیسی شعراء کے کلام کے مطالعہ سے اُن میں ایک نیا رجحان پیدا ہو چکا تھا، اسکے زیر اثر انھوں نے "کبار الحوادث فی وادی النیل" کے عنوان سے ایک طویل قصیدہ لکھا جس میں فراعنہ کے دور سے لیکر محمد علی کے دور تک کی مصری تاریخ کو خوبصورتی کے ساتھ سمویا گیا ہے، اس قصیدہ کو شوقی نے ۱۸۹۴ء میں مستشرقین کی کانفرنس میں سنایا، اس کے بعد فراعنہ اور قدیم مصری آثار کے بارے میں انھوں نے متعدد قصیدے لکھے۔

جلاوطنی | شوقی اور ان کی شاعری ابتک قصر شاہی میں محصور تھی، لیکن پھر ایسے واقعات پیش آئے کہ شوقی کو جلاوطنی کی زندگی بسر کرنی پڑی، اور اب شوقی شاہی محل سے باہر کی دنیا میں آ گئے، اور ان کی شاعری ایک نئے مرحلہ میں داخل ہوئی۔

۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم کا اعلان ہوا تو مصری بادشاہ عباس ترکی میں تھا، انگریزوں نے اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر مصر پر اپنے قبضہ اور تسلط کا اعلان کر دیا اور عباس کی جگہ حسین کامل کو بادشاہ مقرر کیا، عباس کے حاشیہ نشینوں اور درباریوں کا تعلق بھی قصر شاہی سے ختم کر دیا گیا، شوقی، عباس کے قریب ترین لوگوں میں تھے، اس لیے ان کی سخت نگرانی ہونے لگی، ان واقعات سے شوقی بہت متاثر ہوئے، عباس کے مقابلہ میں وہ نئے بادشاہ حسین سے مطمئن نہیں تھے، لیکن بدلتے ہوئے حالات کو روکنا بھی مشکل تھا، اس موقع

شوقی نے ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع تھا :

أأخون اسماعيل فی ابنائه ولقد ولدتُ بباب اسماعيلا

(میں اسمٰعیل کے ساتھ انکی اولاد کے سلسلہ میں خیانت نہیں کرسکتا جبکہ میں انہی کے آستانہ پر پیدا ہوا ہوں)

اس قصیدہ میں شوقی نے اپنی بےچینی کا اظہار کیا ہے، ایک مصرع میں لکھتے ہیں: ان الرواية لم تتم فصولا (ڈرامہ کے تمام سین ابھی پورے نہیں ہوئے ہیں) یعنی انگریز علوی خاندان کو زک دینے کے لیے حالات کے منتظر ہیں، شوقی کی شعلہ بیانی سے انگریزوں کو اندیشہ لاحق ہوا کہ اگر انھیں مصر میں چھوڑ دیا گیا تو یہ اپنے کلام سے ہیجان پیدا کر دیں گے اور پھر عوام کی بغاوت کا روکنا بہت مشکل ہو جائے گا، چنانچہ شوقی جلاوطن کر دیا گیا، اور انھوں نے برشلونہ کے ایک گاؤں میں سکونت اختیار کی، یہ مقام سمندر کی سطح سے بلند ہونے کی وجہ سے پُربہار تھا، شوقی اس منظر سے لطف اندوز ہوتے تھے، اور بندرگاہ پر آنے جانے والے جہازوں کا نظارہ انکے جذبۂ شاعری کو تیز کرتا تھا، شوقی یہاں آکر آزادی کی ایسی دنیا میں پہنچ گئے تھے جس میں قصر شاہی کی قیود اور فکری پابندیوں کا نام ونشان بھی نہیں تھا،

شوقی کی زندگی کا یہ دوران کے رنج ومحن کا سبب بنا، ان کی خوشگوار زندگی میں بڑی تلخیاں پیدا ہوگئیں، مالی مشکلات، وطن سے دوری اور بادشاہ کی معزولی ان کے لیے تلخ گھونٹ کی حیثیت رکھتے تھے، ان کی شاعری کو اس تلخی کی ضرورت تھی، تاکہ شوقی زندگی کے دونوں رخوں سے واقف ہوں جس طرح قصر میں ناز ونعمت کا ماحول دیکھا، اسی طرح جلاوطنی میں حرماں نصیبی اور آلام روزگار سے آشنا ہوں اور انھیں عوام کے درد اور ان کے مصائب کا اندازہ ہوسکے۔

۱۹۱۸ء میں جب صلح کا اعلان ہوا تو شوقی کو اسپین کے شہروں میں جانے کی اجازت ملی اور انھوں نے قرطبہ، اشبیلہ اور غرناطہ دیکھے، ان میں عربوں کے آثار آج بھی زبان حال سے

ان کی عظمت کی داستان سنا رہے تھے، شوقی ان آثار سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور اپنا مشہور سینیہ قصیدہ لکھا جس میں وطن کے اشتیاق، مصر کے مشہور مقامات و آثار اور ان کے دامن میں سمٹی ہوئی تاریخ کے ذکر کے بعد اندلس اور وہاں کی حکومتوں کا ذکر کیا ہے، اور اپنے اشعار میں قصر حمرا کی ایسی حسین عکاسی کی ہے کہ اس کا سراپا آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، عربوں کے اندلس میں داخلہ اور یہاں سے ان کے زوال کے بارے میں کہتے ہیں کہ: آئے ہوئے جو جہاز تخت شاہی کا منظر پیش کرتے تھے، ان ہی جہازوں پر زوال کے بعد مقبروں کا گمان ہوتا ہے

رکبوا بالبحار نعشا وکانت تحت آبائهم هي العرش امس

اس قصیدہ میں قرطبہ میں عربوں کی تہذیب و ترقی کے متعلق اچھے تاثرات کو شعر کے قالب میں ڈھالا اور ان سے دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش کی ہے،

اندلسی شعراء میں شوقی کو ابن زیدون سب سے زیادہ پسند ہے، اندلس آنے سے پہلے شوقی کو وجدانی شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا، ان کو متنبی کی طرح قصیدہ گوئی سے زیادہ مناسبت تھی لیکن اندلس آنے کے بعد انھوں نے ابن زیدون کا مطالعہ اور اپنے نونیہ قصیدہ میں ان کا تتبع کیا، اس قصیدہ میں بھی شوقی نے وطن کا اشتیاق ظاہر کیا ہے، اس قصیدہ میں جو درد و حسرت ہے، اس سے شوقی کی سابقہ شاعری خالی ہے،

جنگ عظیم کے خاتمہ پر شوقی کو فوراً مصر واپس آنے کی اجازت نہیں ملی تھی لیکن اندلس سے باہر جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی، اس لیے انھوں نے اسپین اور پھر جنیوا کا سفر کیا اور وہاں سے بحری جہاز سے مصر آئے، ان کی آمد پر پورا شہر ان کے استقبال کے لیے ٹوٹ پڑا، جس سے شوقی غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔

آزاد فضا میں شوقی جب وطن واپس ہوئے تو یہاں قومی تحریک پورے شباب پر تھی،

اور یہاں کی ہر چیز انہیں بدلی ہوئی نظر آئی، اور یہیں سے ان کی عوامی زندگی کا آغاز ہوا۔

شوقی اب بڑی حد تک "جمہوری" بن چکے تھے، اور پوری عرب قوم کے احساس و شعور کا ساتھ دینا چاہتے تھے۔ ان کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی اور ہر جگہ ان کا شاندار استقبال کیا جاتا تھا، جیزہ اور اسکندریہ میں ان کا گھر ادبا و شعرا کا مرکز بن چکا تھا، دوسرے ملکوں کے لوگ بھی شوقی سے ملاقات کے لیے ان کے گھر آتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں ہندوستان کے نامور شاعر ٹیگور بھی شوقی سے ملے تھے۔

۱۹۲۷ء میں جب شوقی نے اپنا دیوان "الشوقیات" دوبارہ شائع کیا تو ان کے اعزاز میں متعدد مجلسیں منعقد ہوئیں جن میں عرب ممالک کے مندوبین نے شرکت کی۔ اور شوقی کے فن پر عقیدت و قدر دانی کے پھول نچھاور کیے۔

ان تقریبات میں جن ممتاز شخصیتوں نے حصہ لیا اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔ دمشق کے عربک اکاڈمی سے محمد کرد علی، لبنان سے شبلی ملاط، فلسطین سے امین الحسینی، شکیب ارسلان بلجیم سے فنڈ نبرگ۔ اسی موقع پر شوقی کو عربی شاعری کے "امیر" کا لقب دیا گیا، اور حافظ نے تمام عرب شعراء کی طرف سے شوقی کی بیعت کا اعلان کیا:

امیر القوافی قد اتیت مبایعا   وھذی وفود الشرق قد بایعت معی

اے تاجدارِ سخن! میں آیا ہوں اور میرے ساتھ مشرق کے وفود بھی بیعت کے لیے حاضر ہیں۔

شوقی اب عوام سے قریب ضرور آچکے تھے، لیکن یہ قربت افکار و خیالات تک محدود تھی، ان کی زندگی اب بھی شاہانہ تھی، ان کے منشی احمد عبد الوہاب کا بیان ہے کہ "وہ پھولوں پر چلتے اور معطر فضا میں سانس لیتے تھے، زندگی میں ہر طرح کی آسودگی و خوشحالی میسر تھی۔"[۲]

---

[۱] عمر الدسوقی، فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۱۰۹ [۲] اثنی عشر عاما فی صحبۃ امیر الشعراء ص ۸۹

شوقی کا شمار ان شعراء میں نہیں ہے جن کی زندگی کی عکاسی ان کے اشعار سے ہوتی ہو بلکہ وہ ایسے شعراء میں ہیں، جن کا فن غیروں کے لیے وقف رہتا ہے اور اپنے لیے وہ کچھ نہیں سوچتے۔ خدیوی عباس کے بعد شوقی کے سامنے کوئی ایسی شخصیت نہیں تھی جسے وہ اپنی شاعری کا محور بنا سکیں۔ اسپین کے پانچ سالہ قیام کے دوران میں وہ اس کی تلاش میں رہے، اسی وجہ سے اس عرصہ میں انکی شاعری بہت مختصر اور محدود ہوگئی تھی، پھر جب وہاں سے مصر واپس ہوئے اور عوام میں تبدیلی و بیداری نظر آئی تو انھوں نے عوام ہی کو اپنی شاعری کا مرکز بنانے کا فیصلہ اور ان کے ساتھ ملنے جلنے کا سلسلہ شروع کیا اور ان کی زندگی اور شعور کی ترجمانی کی کوشش کی۔

مگر اس تبدیلی کے باوجود عمومی لحاظ سے ان کی شاعری میں "ذاتیت" کے بجائے "غیریت" ہی رہی، پہلے وہ عباس کے شاعر تھے اور اب مصری عوام کے شاعر بن گئے، بلکہ عرب دنیا کی ترجمانی کو اپنا موضوع بنایا، مگر ذاتی رنگ اب بھی پیدا نہ ہوسکا اور ان کا فن شاعری دوسروں ہی کا تابع رہا، عباس کے بعد مصری عوام کے روپ میں انھیں دوسرا عباس مل گیا، یہاں شوقی کو اشرفیوں کے بجائے محبت و عقیدت کے جذبات کا صلہ ملتا تھا، جن کی معنوی قیمت سونے چاندی کے سکوں سے زیادہ تھی، اس لیے یہیں سے شوقی کی شاعری میں جذبات کی جھلک نمایاں ہوئی اور وہ عوام کے شعور کی سچی ترجمانی میں کامیاب ہوئے۔

شوقی زندگی کے آخری دو سالوں میں مختلف امراض کا شکار رہے، اس زمانہ میں وہ قرآن کریم احادیث نبوی، غزالی اور الجبرتی کی کتابوں کا بکثرت مطالعہ کرتے تھے، مگر طبیعت کی شگفتگی اور ظرافت اس دور میں بھی باقی تھی۔

۱۴ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کی رات میں دو بجے اس عظیم فنکار نے دنیا کو خیرباد کہا اور اس کی سحر آفریں آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی، موت کی خبر سے پوری عرب قوم میں صف ماتم

بہت سے شعراء نے پرسوز مرثیے اور انشا پردازوں نے مضامین لکھے، جگہ جگہ مجالس تعزیت منعقد ہوئیں اور اخبارات نے رنج وغم کا اظہار کیا، مراثی میں بشارہ خوری کا مرثیہ بہت موثر ہے، جس کا مطلع یہ ہے۔

قف فی ربی الخلد واهتف باسم شاعره   فسدرة المنتهى ادنى منابره

(مقام خلد میں ٹھہر کر اس کے شاعر کا نام لو، سدرۃ المنتہیٰ اس کا ادنیٰ منبر ہے)

شوقی کے دوست خلیل مطران نے اپنے مرثیہ میں شوقی کے فنی کمال اور ان کی موت پر عرب دنیا کے حزن والم کی بہترین تصویر پیش کی ہے، اس کا ایک شعر ہے۔

یجلو بنوغك كل يوم آية   عذراء من آياته الغراء

(تمھاری مہارت اور کمال کے انوکھے نشانات روزانہ ظاہر ہوتے ہیں۔[1])

فن شاعری: شوقی نے شاعری کی دنیا میں اس وقت قدم رکھا جب مصر میں عربی شاعری محمود سامی البارودی کے ہاتھوں جمود سے نکل کر آزاد فضا میں آرہی تھی اور اس کا "شجرۂ طیبہ" برگ و بار پیدا کر رہا تھا، قدرت نے گویا بارودی کو شوقی کا رہنما بنا کر بھیجا تھا، اس کی شاعری شوقی کے لیے نشان راہ ثابت ہوئی،

بارودی نے شعرائے متقدمین کی بیجا قیود اور پر تکلف اسلوب سے شاعری کو آزاد کر کے اس میں ایسی وسعت پیدا کی کہ موجودہ دور کی صحیح ترجمانی کر سکے۔

شوقی نے بارودی کے تتبع میں شاعری کے اسلوب، جمال اور مفہوم میں گہرائی پیدا کی، ان کی شاعری کی تاثیر اور سحر آفریں موسیقی پر آج بھی عرب دنیا سر دھنتی ہے، شوقی کے اس فنی کمال نے ان شاعری کو دائمی مقبولیت عطا کی اور ان کے اشعار کا حسن و جمال کبھی ختم نہیں ہوگا۔

[1] شوقی شاعر العصر الحدیث ص ۳۰ و ۳۱ عمر الدسوقی: فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۳۱۵

موسیقی کے بعد شوقی کی شاعری کا دوسرا اہم عنصران کا وسیع تخیل اور کامیاب مصوری ہے، یہ صحیح ہے کہ انھوں نے اکثر اپنا مفہوم قدیم عرب شعراء سے لیا ہے، لیکن اس میں رنگ بھر کر ایک نیا حسن پیدا کر دیا ہے۔

شوقی کی منظر نگاری کا یہ کمال ہے کہ وہ ایک چیز کی تمام جزئیات کو اس خوبی سے پیش کرتے ہیں جس طرح مصور اپنی تصویر کے تمام خط و خال کو واضح کر دیتا ہے، اور وہ زبان حال سے بولنے لگتی ہے[1]۔ مصر میں فراعنہ کی جو یادگاریں ہیں ان میں "قصرانس الوجود" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شوقی نے اپنے قصیدہ میں اس قصر کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے قصیدہ پڑھنے والے کے سامنے کھڑا ہے، لکھتے ہیں:

ایها المنتحی باسوان دارًا   کالثریا ترید ان تنقضّا

اخلع النعل واخفض الطرف واخشع   لا تحاول من آية الدهر غضّا

قف بتلك القصور في اليم غرقى   ممسكًا بعضها من الذعر بعضا

كعذارى اخفين في الماء بضًّا   سابحاتٍ به وأبدين بضّا

شاب من حولها الزمان وشابت   وشباب الفنون مازال غضّا

ربّ نقشٍ كانما نفض الصنّا   ع منه اليدين بالأمس نفضا

ومحاريب كالبروج بنتها   عزماتٌ من عزمة الجن امضى

صنعة تدهش العقول وفنٌّ   كان اتقانه على القوم فرضا

اسوان کے قصر میں جانے والے جو ثریا کی طرح بلند اور مائل بسقوط ہے،
جوتے نکال دو، نظر پست اور خود کو متواضع رکھو، زمانہ کے معجزہ سے چشم پوشی کی کوشش نہ کرو،

---

[1] عمر الدسوقی: فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۱۶۴

صدیاں بیت جانے کے بعد جب ان محلات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈر سے بعض بعض کو پکڑے ہوئے ہے،
حسین دوشیزاؤں کے مانند جو تیرتے ہوئے جسم کا کچھ حصہ چھپائے اور کچھ ظاہر کیے ہوئے ہیں۔
زمانے اور خود یہ محلات بوڑھے ہو چکے ہیں لیکن ان کا فن اپنے شباب پر باقی ہے۔
بہت سے نقوش اتنے شفاف و تازہ ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں فنکار نے کل ہی بنایا ہے۔
برج نما محراب کو جنوں سے قوی تر عزم رکھنے والوں نے تعمیر کیا ہے۔
اس فن اور صنعت کاری پر عقل حیران ہے، لوگوں نے پورے خلوص سے اسے استحکام عطا کیا ہے۔)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح شاعر نے اپنے فنی کمال سے قصر کی زندہ تصویر پیش کی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قصر آنکھوں کے سامنے موجود ہے اور معماروں کی فنکاری ان کی عظمت کی داستان سنا رہی ہے۔ یہ شوقی کے تخیل کا کمال ہے کہ قصر کے تمام پہلوؤں کو اس خوبصورتی سے واضح کیا اور کلام میں اتنی زبردست تاثیر پیدا کی۔[1]

شوقی کی شاعری کا تیسرا عنصر جذبہ ہے، چونکہ شوقی 'ذاتی' شاعر نہیں ہیں، اس لیے ان کے کلام میں ان کے ذاتی جذبات کی وہ ترجمانی نہیں ملتی جو دوسرے شعراء کے یہاں ملتی ہے، پھر بھی اس سے انکی شاعری خالی نہیں ہے، لیکن عباس العقاد کی رائے ہے کہ شوقی کی شاعری میں ایسا کوئی عنصر موجود نہیں جس کے ذریعہ ہم ان کی شخصیت کو دوسروں سے ممتاز کر سکیں، ان کی شاعری نہ زندگی کا کوئی پیغام ہے اور نہ فطرت کی ترجمانی، بلکہ اس پر صرف تصنع کا رنگ غالب ہے۔[2]

یہاں تک تو صحیح ہے کہ شوقی کی شخصیت ان کے اشعار میں واضح نہیں ہوتی لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ ان کی شاعری میں نہ کوئی پیغام حیات ہے اور نہ فطرت کی ترجمانی، یہ صحیح ہے کہ شوقی کے کلام میں ذاتیت کے بجائے 'غیریت' کا پہلو نمایاں ہے، لیکن یہ ان کا مذہب شاعری

---

[1] عمر الدسوقی: فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۸۴　[2] شعرائے مصر و بیئاتہم فی الجیل الماضی ص ۱۰۵

اور فنی رجحان ہیں، شوقی نے اپنے رجحانات وجذبات کی ترجمانی کا دعویٰ کہیں نہیں کیا، بلکہ صرف اپنے گردوپیش کی دنیا کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، اس لیے ان کو کسی ایسے پیمانہ سے ناپنا ظلم ہوگا جسے وہ پسند نہیں کرتے تھے۔

شوقی کی شاعری میں جذبات واحساسات کی جھلک موجود ہے، لیکن یہ جذبات عمومی وعوامی ہیں، ذاتی اور مخصوص نہیں، جن اشعار میں شوقی نے اپنی اولاد اور خاندان کا تذکرہ کیا ہے ان میں البتہ یہ جذبات پوری طرح واضح ہیں، اپنی ایک سالہ لڑکی امینہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

امینتی فی عامہا الاول مثل الملک
کم خفق القلب لہا عند البکا والضحک
وکم رعتہا العین فی السکون والتحرک
فان مشت فخاطری یسبقہا کالممسک
الحظہا کانہا من بصری فی شرک

(ایک سالہ امینہ فرشتہ کے مانند ہے، یہ روتی یا ہنستی ہے تو دل دھڑکتا ہے، چلتے پھرتے نگاہ اس کی نگرانی کرتی ہے، چلتی ہے تو دل اس کو پکڑنے کے لیے آگے جاتا ہے۔ میں اسے دیکھتا رہتا ہوں، گویا وہ میری نگاہ کے جال میں ہے)

شوقی کے مرثیوں میں ان کا شعور بہت نمایاں ہے اور وہ سوز و درد اور رنج وغم کی اچھی تصویر ہیں، ۱۹۰۶ء میں اپنے والد کی وفات پر جو مرثیہ لکھا، اس کے چند شعر یہ ہیں:-

ما ابی الا اخ فارقتہ ودّہ الصدق وودّ الناس مین
طالما قمنا الی مائدۃ کانت الکسرۃ فیہا کسرتین
وشربنا من اناء واحد وغسلنا بعدذا فیہ الیدین

وتمشینا یدی فی یدہ من سرٍّ أنا قال عنا اخوین

(باپ کی جدائی بھائی کی جدائی کے مانند ہے، اس کی محبت سچی تھی اور دوسروں کی محبت جھوٹی ہے ہم ایک ہی دسترخوان پر جاتے اور ایک ٹکڑے کو دو حصوں میں کرکے کھاتے تھے ایک ہی برتن سے پانی پیتے اور پھر اس میں ہاتھ دھوتے تھے ،

"غیریت" کو "ذاتیت" پر ترجیح دینے کی بنا پر یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ شوقی کی شاعری میں احساس اور ذاتی شعور کا فقدان ہے ۔ البتہ ان کے مدحیہ قصائد اور مرثیوں میں یہ چیز کچھ دھندلی ضرور ہے ۔ لیکن ان کی تاریخی نظمیں اور قصیدے ان کے زندہ شعور اور حساس طبیعت کی زندہ مثال ہیں ، یہ موضوع ان کے "غیریت" کے رجحان سے مناسبت رکھتا ہے، اسلئے اس میں ان کی طبیعت کی جولانی شباب پر ہوتی ہے اور وہ تاریخی واقعات کو زندہ جاوید بنا دیتے ہیں ،

شوقی سے پہلے بھی شعرائے تاریخی واقعات پر قصائد لکھے ہیں ، ابن المعتز نے عباسی خلیفہ المعتضد باللہ کے دور کے واقعات کو ، نشوان بن سعید الحمیری نے شاہان یمن کو ، ابوطالب اندلسی نے انبیاء اور اسلامی حکومتوں کو ، اور ابن الخطیب نے اسلامی ممالک کی تاریخ کو اپنے اپنے قصائد کا موضوع بنایا ، اور اس کا بہت اچھا نمونہ پیش کیا ہے لیکن ان شعراء کے قصیدوں میں وہ روح اور تاریخی واقعات کو صحیح طور پر سمجھنے کا وہ جذبہ موجود نہیں ہے جو شوقی کے قصیدوں میں ملتا ہے ۔ شوقی نے "کبار الحوادث فی وادی النیل" (وادی نیل کے اہم واقعات) کے عنوان سے جو قصیدہ لکھا ہے وہ ان کے فن کا عمدہ نمونہ ہے ، اس قصیدہ میں انھوں نے بانیان اہرام اور ان کے بعد کے بادشاہوں کے دور کی نہایت عمدہ تصویر پیش کی ہے ، اور ایک مورخ کی طرح ان واقعات سے متعلق اپنا تاثر اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے ، ایک جگہ کہتے ہیں :-

وبنینا فلم نخل لبانٍ وعلونا فلم یجزنا علاء

وملکنا فالمالکون عبید والبرایا بأسرھم اسراء

(ہم نے اپنی تعمیر سے تمام معماروں کو بیکار بنا دیا اور اس قدر بلند ہوئے کہ اس کے آگے بلندی کا تصور نہیں کیا جا سکتا، ہماری بادشاہت کے سامنے دوسرے بادشاہ غلام ہیں اور پوری مخلوق ہماری قیدی)

شوقی کا یہ قصیدہ ان کے دیوان کا سب سے اہم قصیدہ مانا جاتا ہے، اس قصیدہ نے جدید مصر کے آسمان پر اُن کے نام کو ہمیشہ کے لیے روشن کر دیا، اسی طرح کا ان کا دوسرا قصیدہ "النیل" کے عنوان سے ہے، جس میں انھوں نے فراعنۂ مصر کی تاریخ، ان کے آثار، مصریوں کے دینی رسوم، تابوت حضرت موسیٰؑ، یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کا قصہ، مریم و عیسیٰ علیہما السلام کے واقعہ اور پھر وادی میں اسلام کے داخلہ کی طرف نہایت لطیف پیرایہ میں اشارہ کیا ہے، اور ان تمام واقعات کو اس خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے کہ ان کی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے، اس قصیدہ کے بارے میں ڈاکٹر شوقی ضیف لکھتے ہیں کہ اس عظیم شاعر کی یاد تازہ رکھنے اور اس کے فن کی قدر کرنے کے لیے ہر مصری کا فرض ہے کہ اس قصیدہ کو اپنے ملاقات کے کمرۂ خاص میں آویزاں رکھے[1]۔

شوقی نے قصر میں اور قصر سے باہر ہر جگہ اپنے فن میں اپنی شخصیت کے بجائے دوسروں کو زیادہ اہمیت دی، قصر شاہی سے علٰحدگی کے بعد بھی انھوں نے اپنی ذات کی ترجمانی کے بجائے اپنے معاشرہ اور عوام کی ترجمانی کی، اور چونکہ شوقی نے اپنے فن کے لیے اسی طرز کو اختیار کیا تھا، اس لیے اس باب میں ہم ان پر کسی طرح کا حرف نہیں رکھ سکتے، انھوں نے اپنے احساس و جذبات سے مصری عوام اور عرب دنیا کا ساتھ دیا، اور ان کی صحیح ترجمانی کی، اگر وہ اپنی انفرادیت و ذاتیت سے آزاد نہ رہتے تو قومی و تاریخی موضوعات میں اس بلند مقام پر ان کا پہنچنا مشکل تھا۔

---

[1] شوقی ضیف: شوقی شاعر العصر الحدیث ص ۵۷

بدیہہ گوئی | شوقی کی بدیہہ گوئی اور برجستگی پر تمام ناقدین کا اتفاق ہے، قصیدہ لکھتے پر جب وہ آتے تو معانی کا ایک سیلاب ان کے ذہن میں امنڈ آتا تھا۔ شعر کی تخلیق کے لیے ان کا ذہن و دماغ ہمیشہ آمادہ رہتا تھا۔ ان کے یہاں آمد تھی آورد نہیں، شوقی کے دور میں روزنامہ الاہرام کے ایڈیٹر داؤد برکات لکھتے ہیں: "اگر صبح کو کوئی اہم واقعہ رونما ہوتا تو شام تک اس کے بارے میں شوقی کا کوئی قصیدہ اس واقعہ سے متعلق عوام میں آجاتا تھا، کیونکہ اس طرح کے واقعات ان کے دل و دماغ کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتے تھے۔ اور ان کی طبیعت و خیالات میں زبردست ہیجان پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ اکثر جلتے یا دوستوں میں بیٹھے ہوئے شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ مجلس میں ان کا جسم دوستوں کے ساتھ رہتا اور ذہن و دماغ افکار و تخیلات کی دنیا میں کھوئے رہتے، شعر کہنے کے لیے کمرہ میں بیٹھکر سوچنے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ اگر بیٹھتے تو صرف ذہن میں جمع شدہ اشعار کو لکھنے کے لیے بیٹھتے تھے۔[1]

اس بیان سے شوقی کی بدیہہ گوئی اور موزوں طبیعت کا پتہ چلتا ہے، کسی موقع پر شعر کہنے کے لیے انھیں کد و کاوش نہیں کرنی پڑتی تھی، بلکہ ذہن میں معانی کا ایک تسلسل قائم ہو جاتا تھا جنھیں وہ الفاظ کے ذریعہ شعر کے قالب میں ڈھالتے جاتے تھے۔ شوقی کے دوست خلیل مطران لکھتے ہیں: "شوقی اور دوستوں کی مجلس میں شعر کہتے رہتے تھے، کشتی میں، ریل میں اور سرکاری تقریبات میں بیٹھے بیٹھے وہ گنگنانے لگتے، آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی، پیشانی سہلاتے اور سوچتے رہتے، اسی حالت میں کوئی کچھ پوچھ لیتا تو فوراً مناسب جواب بھی دیتے، پھر اسی وقت یا کئی دنوں کے بعد اس قصیدہ کو مکمل کرنے بیٹھتے تو پہلی مجلس کے تمام اشعار ان کے ذہن میں آجاتے اور اس طرح مہینوں پہلے کہے ہوئے اشعار اور نئے اشعار کو ایک ہی نشست میں قلمبند کر کے قصیدہ مکمل کر لیتے۔"[2]

---

[1] ذکری الشاعرین ص ۱۰۰، [2] مختارات المنفلوطی ص ۷۸

شوقی کی بدیہہ گوئی اور برجستگی کے بارے میں محمد کرد علی کا بیان ہے کہ: "دمشق کی علمی عربی اکیڈمی کی طرف سے شوقی کے اعزاز میں جو اجلاس منعقد ہوا اس میں پڑھنے کے لیے شوقی نے جو قصیدہ لکھا تھا وہ خود ان کو کچھ زیادہ پسند نہیں آیا، اس لیے وہیں برجستہ ایک دوسرا قصیدہ لکھ دیا، اور اتنا عمدہ لکھا کہ ان کے کمال کی داد دینی پڑتی ہے، اس قصیدہ کا ایک شعر ہے:

قم ناج جلق وانشد رسم من بانوا   مشت على الرسم احداث وازمان

شوقی کی اس بدیہہ گوئی کی وجہ سے ان کے شعر کہنے کے لیے کوئی مخصوص وقت نہیں تھا، ان کا ملکۂ شعر اس کے لیے ہر وقت آمادہ رہتا تھا، ان کے کاتب کا بیان ہے کہ دس سال پہلے ۱۹۲۲ء میں ایک دن ساڑھے گیارہ بجے شوقی گھر واپس ہوئے اور کمرہ میں آکر اٹھائیس[28] شعر لکھوائے، پھر مجھ سے کہا کہ یہیں ٹھہرو، تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفہ سے پانچ پانچ، چھ چھ شعر لکھواتے جاتے تھے، ایک بجے تک چوراسی شعروں کا ایک قصیدہ تیار ہوگیا۔ اس قصیدہ کا مطلع تھا:

قفي يا اخت يوشع خبرينا

ان بیانات سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ شوقی کے یہاں آمد ہی آمد تھی طبیعت کی موزونیت کی وجہ سے شعرگوئی ان کے لیے بالکل آسان تھی اور وہ لمبے لمبے قصیدے چند گھنٹوں میں مکمل کر لیتے تھے۔

اشعار پر نظر ثانی کی ضرورت بھی بہت کم ہوتی تھی، شعر اپنی مکمل و مہذب شکل میں ان کی زبان پر آتا تھا، اس میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت نہیں رہتی تھی، شوقی کے لکھے ہوئے جو مسودے موجود ہیں ان میں لمبے لمبے قصیدوں میں صرف دو تین شعر اصلاح شدہ ملتے ہیں، بقیہ اشعار بغیر کسی ترمیم و اصلاح کے ہیں، پھر جن اشعار میں ترمیم ہے ان سے بھی شوقی کے اعلیٰ ذوق اور بلند معیار کا پتہ چلتا ہے۔

قدیم رنگ شوقی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ان کے پیشرو شاعر البارودی اور دوسرے عرب شعراء سے بڑا لگاؤ ہے، شوقی نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں متعدد قدیم شعراء کا والہانہ تذکرہ کیا ہے، مثلاً ابو فراس، ابو العلاء، ابو العتاہیۃ، العباس بن الاحنف، البہاء زہیر، متنبی کے سامنے تو وہ دست بستہ کھڑے نظر آتے ہیں، اس فہرست میں ابو نواس، ابو تمام، البحتری اور ابن الرومی کا نام نہیں ہے، لیکن شوقی ان سب سے واضح طور پر متاثر ہیں، بحتری اور ابو تمام کے تتبع میں تو ان کے بعض قصائد بہت مشہور ہیں، بحتری نے ایوانِ کسریٰ کی تعریف میں جو مشہور سینیہ قصیدہ لکھا ہے، شوقی نے اس کے تتبع میں اپنا طویل قصیدہ لکھا جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، یہ قصیدہ شوقی کے فن شاعری، منظر نگاری، دقتِ تعبیر، قدرت کلام اور عبقریت کا نمونہ ہے، اس کی فنی خوبیوں کو واضح کرنے کے لیے ایک مستقل مقالہ درکار ہے۔

انھوں نے قدیم شعراء کے تتبع میں جو اشعار کہے ہیں ان میں بھی کسی قسم کا جھول یا تکلف نہیں، ان کے قصیدوں میں عربی شاعری کی روح اور موسیقیت پوری طرح نمایاں ہے، شوقی نے جن خیالات میں دوسرے شعراء کا تتبع کیا ہے اُن میں وہ ان شعراء سے سبقت لے گئے ہیں، مصطفی الرافعی لکھتے ہیں: شوقی کا مشہور شعر ہے:

لک نصحی وما علیک جدالی   آفۃ النصح ان یکون جدالا

(میرا مقصد تمھیں نصیحت کرنا ہے جدل و جدال نہیں، کیونکہ جدال نصیحت کے لیے ہلاک ہے)

دوسرے قصیدہ میں اسی مفہوم کو یوں ادا کیا ہے:

آفۃ النصح ان یکون جدالا   واذی النصح ان یکون جھارا

جھگڑا نصیحت کا ضیاع ہے، اور علانیہ نصیحت باعث تکلیف ہوتی ہے

یہ دونوں شعر شوقی کے ابتدائی زمانہ کے ہیں، اور ابن الرومی کے اس شعر سے ماخوذ ہیں:

وفی النصح خیر من نصیح موادع ولا خیر فیه من نصیح مواثب

(نرم رو ناصح کی نصیحت بہتر ہے، اور سخت گیر کی نصیحت میں کوئی خیر نہیں)

شوقی نے ابن الرومی کے شعر کے مفہوم تصحیح کرتے ہوئے "مواثبۃ" کی جگہ "جدال" کا لفظ استعمال کیا جو ابن الرومی سے نہ ہو سکا۔ شوقی کی تقلید بھی جامد نہیں ہے، بلکہ انھوں نے قدیم خیال کو نکھارا ہے، اس طرح شعر کا مفہوم خود ان کا اپنا نتیجۂ فکر معلوم ہوتا ہے۔

عربی شاعری کا روایتی ڈھانچہ اس کی موسیقیت کے ساتھ دوسرے شعراء کے مقابلہ میں بحتری کے یہاں زیادہ نمایاں ہے، شوقی نے ایک طرف اس روایتی حیثیت کو برقرار رکھا، دوسری طرف جدید خیالات کو اپنی شاعری میں جگہ دی، اس لیے ان کو جدید عربی شاعری کا "بحتری" کہا جا سکتا ہے، بحتری کے علاوہ شوقی نے متنبی کے ساتھ اپنے گہرے تعلق کا تذکرہ "شوقیات" کے مقدمہ میں بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے، یہی تعلق ان کو ابوالعلاء سے بھی ہے، لیکن ان کے دیوان میں ابو العلا سے تاثر اتنا نمایاں نہیں جتنا متنبی سے ہے، اس کی وجہ دونوں شاعروں کا نفسیاتی اختلاف ہے، ابوالعلاء کے مزاج میں یاس و قنوطیت اور تشاؤم تھا، اور شوقی کو حرماں نصیبی اور مایوسی کا سامنا بہت تھوڑے دنوں تک کرنا پڑا تھا، ابوالعلاء کو زندگی، سیاست، حکام اور علماء سے نفرت اور بیزاری تھی، اور شوقی کو ان چیزوں سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور ان کی زندگی اس طرح کی بیزاری اور فلسفیانہ الجھنوں سے پاک تھی، اس بنا پر شوقی کے کلام میں ابوالعلاء کا کوئی واضح اثر نہیں ملتا، اس کے مقابلہ میں متنبی کے ساتھ ان کا تعلق انتہائی گہرا اور مضبوط ہے، شوقی پر تمام لکھنے والوں اور ان کے اور متقدمین شعراء کے درمیان موازنہ کرنے والوں کا اس پر اتفاق ہے، جس طرح متنبی نے اپنے اشعار میں حِکَم کو نمایاں جگہ دی ہے، اسی طرح شوقی نے بھی، لکھتے ہیں:۔

والشعر مالم یکن ذکری وعاطفۃ او حکمۃ فہو تقطیع واوزان

یعنی اگر شعر میں جذبات، نصیحت اور حکمت کی بات نہ ہو تو وہ نرا وزن ہی وزن رہ جاتا ہے

شکیب ارسلان لکھتے ہیں کہ: متنبی کی تقلید اور تتبع میں شوقی کے کلام میں پیچیدگی اور تعقید بھی ملتی ہے، ترکیب کی ناہمواری اور ضمیروں کے اضطراب سے بعض جگہ شوقی کے کلام میں ابہام پیدا ہوگیا ہے۔ استعارہ و کنایہ کا خفا اور زیادہ مفہوم کو محدود و مختصر الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش بھی کہیں کہیں تعقید کا سبب بن گئی ہے[1]

ڈاکٹر شوقی ضیف لکھتے ہیں:

شوقی نے متنبی کو فن شاعری میں اپنا امام و پیشوا تسلیم کیا ہے، جس طرح متنبی سیف الدولہ کی مدح میں قصیدے لکھتا تھا، اسی طرح شوقی بھی بادشاہ کے دربار سے وابستہ ہوگئے اور اپنے فن کو اس کے لیے وقف کر دیا۔ متنبی کے قصیدوں میں حکمت و موعظت، اور معاشرہ پر تنقید وغیرہ کے نمونے بکثرت موجود تھے، شوقی نے ان تمام اصناف میں اس کا تتبع کیا، چنانچہ ان کے قصیدوں کا عام ڈھانچہ، ساخت و ترکیب اور حکم و امثال سب متنبی سے ملتا جلتا ہے، دونوں شاعروں کا یہ گہرا فنی ارتباط ان کے نفسیاتی ربط کا پتہ دیتا ہے۔

جس طرح شوقی دوسروں کی ترجمانی کرتے تھے، اور اس سے ان کا اتفاق ضروری نہیں تھا، اسی طرح متنبی بھی کافور وغیرہ کی مدح میں جو کچھ کہتا تھا، اس سے وہ نہ تو خود پوری طرح مطمئن ہوتا تھا، اور نہ اس کو اپنی زندگی میں برتنے کی ضرورت سمجھتا تھا[2]

عربی قصیدوں کی مخصوص ساخت میں جو موسیقیت اور نغمہ پایا جاتا ہے، وہ شوقی کے کلام میں بھی موجود ہے، اور عرب دنیا میں ان کی مقبولیت میں اسکو بڑا دخل ہے، شوقی نے اسی پرانے ساز پر نغمہ سرائی کرکے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا جو ان کی فنی صلاحیتوں کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

(باقی)

---

[1] شکیب ارسلان: شوقی ص ۹۰ [2] ڈاکٹر شوقی ضیف: شوقی شاعر العصر الحدیث ص ۲۰۸

پاکستان میں دو مہینے

از سید صباح الدین عبد الرحمن،

۱۹۶۵ء میں ہندوستان و پاکستان کی لڑائی کے بعد سے دونوں ملکوں میں تجارتی اور مالی لین دین بند ہوگیا تو دار المصنفین کی بہت سی مطبوعات پاکستان کے بعض ناشروں نے اجازت کے بغیر چھاپ لیں جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:-

(۱-۲) شعر الہند حصہ اول و دوم، از مولانا عبد السلام ندوی۔ ناشر عشرت پبلشنگ ہاؤس، ہسپتال روڈ لاہور

(۳) گل رعنا، از مولانا عبد الحیٔ ""

(۴-۵) مقالاتِ شبلی، حصہ دوم و چہارم ""

(۶-۷) شعر العجم حصہ اول و دوم از مولانا شبلی۔ " اسٹار بک ڈپو، اردو بازار لاہور

(۸) " " حصہ سوم " ملک نذیر احمد تاج بک ڈپو " "

(۹) " حصہ چہارم " حاجی فرمان علی اینڈ سنز " "

(۱۰) " پنجم

تاریخ اسلام مرتبہ مولانا شاہ معین الدین کے متعلق بھی خبر ملی تھی کہ اسکی چاروں جلدیں کوئی تاجر شائع کر رہا ہے، اسکی بھی اطلاع ملی کہ بعض ناشر سیرۃ النبی کی چھ جلدوں کا بلاک چھاپ رہے ہیں تاکہ ناواقف انکو دار المصنفین کی مطبوعہ سمجھیں۔

دار المصنفین کی آمدنی کا دار و مدار اس کی مطبوعات کی فروخت پر ہے، ۱۹۴۷ء کے سیاسی انقلاب کے

بعد ہندوستان میں اردو کتابوں کی بکری بہت کم ہوگئی ہے، ۱۹۶۵ء تک پاکستان دارالمصنفین کی کتابوں کی برآمد بکثرت ہوتی رہی، خیال ہوا کہ آگے چل کر کبھی کبھی دونوں ملکوں کے تعلقات اچھے ہوں گے اور تجارتی اور مالی لین دین ضرور ہوگا، پھر اس وقت جب کہ دارالمصنفین کی بہت کتابیں پاکستان کے بعض ناشر چھاپ چکے ہوں گے، اس کے لیے وہاں کا مارکیٹ ختم ہو چکا ہوگا، پہلے تو اس کے لیے احتجاج ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر سے کیا گیا، وہاں سے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا، کیونکہ ان کو خود شکایت تھی کہ پاکستان کی کتابیں ہندوستان میں بھی چھپتی رہتی ہیں، کراچی میں جناب سید حسام الدین راشدی صاحب دارالمصنفین کے بڑے قدر دان ہیں، وہ اعلیٰ پایہ کے اہل علم ہیں، اسلیے پاکستان کے علمی حلقے میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، راقم نے ان کی توجہ بھی پاکستان کے بعض ناشروں کے دستبرد کی طرف دلائی، ان کو دارالمصنفین کے ساتھ اس بدسلوکی سے بڑا دکھ پہنچا، اور پاکستان کے اہم اخبارات مثلاً حریت، جنگ، مشرق، امروز، نوائے وقت وغیرہ میں اپنا ایک بیان شائع کر کے دارالمصنفین کو تباہی سے بچانے کی اپیل کی، اور اس کے لیے وہاں کے تمام ممتاز اہل علم کی امداد کے خواستگار ہوئے، ان کی اپیل سے دارالمصنفین کی حمایت میں وہاں اچھی فضا پیدا ہوئی، اخبارات نے اداریے لکھ کر ان کی ہمنوائی کی۔

جناب افضل اقبال صاحب آج کل پاکستان کی طرف سے سوئٹزرلینڈ میں سفیر ہیں، وہ پہلے ہندوستان میں پاکستان کی طرف سے ڈپٹی ہائی کمشنر تھے، پھر اسی عہدہ پر لندن بھیج دیے گئے، جہاں سے ترقی کر کے سوئٹزرلینڈ گئے، وہ دارالمصنفین کے علمی کاموں کے قدر دان ہیں، اس کی طلائی جوبلی میں بھی ۱۹۶۵ء میں شریک ہوئے تھے، دارالمصنفین کو جو نقصان پاکستان کے بعض ناشر پہنچا رہے ہیں، ان کی بھی توجہ ایک خط کے ذریعہ سے اس کی طرف دلائی گئی، انھوں نے بھی دارالمصنفین کے ساتھ اس بدسلوکی سے بیزاری ظاہر کی۔ جس کے بعد پاکستان کی حکومت کی طرف سے ایک آرڈیننس جاری ہوا کہ پاکستان کا

کوئی ناشر بیرونی مصنفوں کی کتابیں حکومت کی اجازت کے بغیر چھاپ کر فروخت نہیں کر سکتا،

ان ہمدردانہ کارروائیوں سے دارالمصنفین کی مطبوعات پاکستان کے بعض ناشروں کے دستبرد سے بظاہر تو محفوظ ہو گئیں، پھر بھی وہاں کے مخلص علمی دوستوں کا اصرار تھا کہ میں وہاں آؤں اور دارالمصنفین کی کتابوں کو جلد حقوق محفوظ کرانے کی خاطر اور بھی مؤثر کارروائیاں کروں، دارالمصنفین کے قدردانوں اور مخلصوں میں مولانا عبدالوہاب جمال الدین صاحب ہیں، جو اپنے زمانہ کے مشہور رہنما اور مذہبی پیشوا مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے صاحبزادے ہیں، انھوں نے اب مستقل سکونت ڈھاکہ میں اختیار کر لی ہے، ان کا اصرار ہوا کہ میں پہلے ڈھاکہ آؤں اور ان سے مل کر کراچی اور لاہور جاؤں، اس اثنا میں ڈھاکہ سے میرے بہت ہی شفیق اور محبوب چچا جناب سید قطب الدین صاحب کی تشویشناک علالت کا تار ملا، انھوں نے مجھکو جلد از جلد طلب کیا، اس لیے سفر میں عجلت کی کہ ایک ہفتہ دو کا ج ہو جائے گا۔

پٹنہ سے میرے ایک عزیز افضال کریم سلمہٗ ساتھ ہو گئے، تاکہ وہ مجھکو اس طویل سفر میں مدد پہنچائیں، ۱۲ر اکتوبر کو ہم دونوں کلکتہ پہنچے، پہلے تو ہمارے میزبان جناب اسحٰق صاحب عرف مولانا ہوئے، جو خاص کلکتہ کے رہنے والے ہیں، بہت ہی خلیق اور متواضع ہیں، علمی ذوق بھی رکھتے ہیں، انھوں نے ہمارے قیام کا انتظام بہو بازار بنگال میں انجمن مفیدالاسلام کی ایک عمارت میں کیا، یہ انجمن ۱۹۰۹ء سے کلکتہ میں قائم ہے، پہلے تو اس کا کام لاوارث مسلمان مردوں کی تجہیز و تدفین کرنے تک محدود تھا، لیکن اب اسکی نگرانی میں ایک یتیم خانہ، مسلمان لڑکیوں کا ایک پرائمری اسکول اور دو ہائی اسکول بھی ہیں، ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۷ء تک میرے چھوٹے چچا جناب سید صلاح الدین صاحب بی اے اس کے روح رواں رہے، اب وہ ڈھاکہ چلے گئے ہیں جہاں اسی قسم کی ایک انجمن قائم کی ہے، بہو بازار بنگال، ہاتھی بگان، تانتی بگان اور انٹالی کے مسلمان اب تک ان کے بہت مداح ہیں، ان کو بہت محبت اور عزت سے یاد کر کے انکی کمی کو محسوس کرتے ہیں، آج کل انجمن مفیدالاسلام کے نگران الحاج غلام رسول ہیں، جو چمڑے کی تجارت کرتے ہیں، بہار کے رہنے والے ہیں، مسلمانوں کے مذہبی کاموں میں آگے آگے رہتے ہیں، معلوم ہوا کہ زنانہ ان کے یہاں

حاجتمندوں کی ایک بھیڑ لگی رہتی ہے، اور وہ سب کی ضرورتیں کسی نہ کسی طرح پوری کرتے رہتے ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ انجمن کے گرلز اسکول میں نو برس کی بچیوں کو بھی برقعہ پہننا لازمی ہے، اس کے نصاب میں زیادہ تر اسلامی کتابیں رکھی گئی ہیں، اس لیے حکومت اور کارپوریشن سے امداد نہیں ملتی ہے، ایک اسکول کا خرچ سات ہزار ماہانہ ہے، جو مسلمانوں کے عام چندوں سے پورا ہوتا رہتا ہے۔

انجمن مفید الاسلام میں کلکتہ کے مشہور امینیہ ہوٹل کے مالک حاجی عبد القیوم صاحب سے ملاقات ہوئی، وہ دریاباد ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے ہیں، دارالمصنفین کے قدردان ہیں، اس لیے وہ اصرار کرکے مجھکو میرے عزیز کے ساتھ اپنے ہوٹل میں لے آئے جو نیو مارکٹ میں واقع ہے، انھوں نے خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اپنے کاروبار میں مشغول رہنے کے باوجود دل میں مسلمانوں کا درد رکھتے ہیں، اس لیے حاجی غلام رسول کے ساتھ عام مسلمانوں کے رفاہی کاموں میں برابر شریک رہتے ہیں۔

کلکتہ میں پاکستان کے لیے ویزا حاصل کرنا بہت صبر آزما کام ہے، میرے پاس کچھ سفارشی خطوط تھے خیال تھا کہ ان کی مدد سے ویزا ملنے میں زیادہ وقت نہ ہوگی، پھر بھی اس کے لیے کلکتہ میں پانچ روز قیام کرنا پڑا، حاجی عبد القیوم صاحب اور اسحٰق صاحب عرف مولانا کی خاطر مدارات سے یہ زندگی گراں نہیں گزرا، ورنہ پانچ روز کا وقت کاٹنا بہت تکلیف دہ ہوجاتا، اس اثنا میں کلکتہ کے بعض خاص خاص اہل علم سے ملتا رہا، کلکتہ کی ایران سوسائٹی کے بانی اور روح رواں ڈاکٹر محمد اسحٰق (جن کو مرحوم لکھتے ہوئے بہت دکھ ہوتا ہے) مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے، ان ہی کے اصرار پر میں ان کے انگریزی رسالہ انڈو ایرانیکا میں برابر مضامین لکھتا رہا، انھوں نے کئی بار لکھا تھا کہ جب میں کلکتہ آؤں تو ان ہی کے ساتھ قیام کروں، ستمبر کے شروع میں ان کو ایک خط لکھا کہ میں پاکستان جاتے ہوئے کلکتہ میں ان کے ساتھ قیام کرونگا، لیکن اس کے جواب میں ان کی اہلیہ نے یہ المناک خبر دی کہ وہ ۱۲ ستمبر کو حرکت قلب بند ہوجانے سے اللہ کو پیارے ہوئے، یہ معلوم کرکے مغموم اور افسردہ ہوا کہ کلکتہ میں ان کی تعزیت کرنی ضروری تھی مگر

ان کے کوئی اولاد نہیں ہے، وہ پہلے انڈو ایرانیکا کے منیجنگ ایڈیٹر اور ایران سوسائٹی کے وائس پریسیڈنٹ خواجہ محمد یوسف صاحب کی دعوت پر ان کے گھر گیا، وہ ۴ ۔ سی نارتھ میننج میں رہتے ہیں جو مسلمانوں کا محلہ ہے، کلکتہ یونیورسٹی سے اسلامک کلچر میں ایم ۔ اے کر کے وکالت کی ڈگری حاصل کی، اب وہاں ہائی کورٹ کے کامیاب ایڈوکیٹ ہیں، عمر ابھی زیادہ نہیں ہے، پچاس کے اندر ہی ہیں، ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کے دست راست تھے، اپنے پیشے کی مشغولیت کے باوجود ایران سوسائٹی کے کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں، ان کے یہاں پہنچا تو دیر تک ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کی گوناگوں خوبیوں کا ذکر رہا، وہ ایران سوسائٹی تھے اور ایران سوسائٹی ڈاکٹر اسحٰق تھی، ان کا واحد مشغلہ اس کے لیے دن رات کام کرنا تھا، وہ کوئی معاوضہ بھی نہیں لیتے تھے، بلکہ اس میں اپنا ہی سرمایہ لگاتے رہے۔ ان پر میرا ایک مضمون مارچ سنہ ۱۹۶۰ء کے معارف میں شائع ہو چکا ہے، خواجہ محمد یوسف صاحب کے یہاں کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر ڈاکٹر عطا کریم برق سے بھی ملاقات رہی، وہ ایران میں کئی سال تک رہ چکے ہیں، فارسی زبان کے سبک ہندی پر گفتگو آئی تو وہ کہنے لگے کہ اب ایران کا ادبی طبقہ اس کی طرف رفتہ رفتہ مائل ہوتا جا رہا ہے، وہاں کے مشہور شاعر بہآر اور دوسرے ارباب نظر مثلاً کوہی فیروزی وغیرہ کو اس سے دلچسپی ہو رہی ہے، خواجہ محمد یوسف صاحب کے ساتھ ایران سوسائٹی بھی گیا، جو ۱۲ ۔ کڈ اسٹریٹ میں واقع ہے، یہ اب سے پچیس سال پہلے سنہ ۱۹۴۴ء میں قائم ہوئی، اس کی عمارت اچھی خاصی بڑی ہے، سامنے ایک چھوٹا سا میدان بھی ہے، اوپر کئی منزلیں ہیں، ۱۴ کٹھے میں ہے، کسی مسلمان کی ملکیت تھی، اس کو ایران سوسائٹی نے سنہ ۱۹۶۲ء میں تین لاکھ میں خرید لیا ہے، اس وقت اس کی قیمت اس سے چار گنی زیادہ ہو گئی ہو گی، اوپر کرایہ دار ہیں، نیچے رسالہ انڈو ایرانیکا اور ایران سوسائٹی کا دفتر ہے، اس میں فارسی کا کلاس بھی ہوتا ہے، اس کے مدرس ایک ایرانی محمد مہدی شیخانی ہیں جو حکومت ایران کی طرف سے یہاں بھیجے گئے ہیں، اس کا کتب خانہ ابھی زیادہ بڑا نہیں ہے،

اس مفید ادارہ کو کہیں سے بڑی سالانہ امداد اس وقت نہیں ملتی ہے، پہلے انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز نئی دہلی کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد اور پروفیسر ہمایوں کبیر کی وزارت کے زمانے میں بارہ ہزار سالانہ کی امداد ملتی تھی، لیکن اب وہ بند ہوگئی ہے، حکومت ایران، حکومت مغربی بنگال اور کلکتہ کارپوریشن کی طرف سے کچھ امداد مل جاتی ہے لیکن وہ بہت ہی ناکافی ہے۔ مثلاً ۱۹۶۸ء میں نئی دہلی کے ایرانی سفارت خانہ کے کلچرل کانسلر کی طرف سے دو ہزار، مغربی بنگال کی وزارت تعلیم کی طرف سے پانچ سو اور کلکتہ کارپوریشن کی طرف سے تین سو ترانوے روپئے کی امداد ملی، اس سوسائٹی کے صدر ام۔اے، کاشانی صاحب ہیں جو کلکتہ میں حکومت ترکی کی طرف سے آنریری کونسل جنرل بھی ہیں، وہ اسکو ضرورت کے وقت قرض بھی دیا کرتے ہیں، بنگالی ہندوؤں کو بھی اس سے دلچسپی ہے، اس وقت اسکے نائب صدر مسٹر اس۔ان۔ مدوک آئی۔سی۔ایس (ریٹائرڈ) ہیں، اس کے کانسل کے ممبروں میں جے۔ان۔ تعلقدار (آئی۔سی۔ایس ریٹائرڈ) اور ڈاکٹر جین ائی دت بھی ہیں، مشہور بنگالی اسکالر اور انڈولوجی کے بہت بڑے ماہر پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی بھی اس کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں، اس کی علمی سرگرمیوں کی شہرت ہندوستان سے باہر کے ممالک میں بھی پھیل رہی ہے، خواجہ محمد یوسف صاحب نے اس کی تمام چیزیں بڑی محبت سے دکھائیں، وہ چار گھنٹے ساتھ رہے، ان سے پہلی ملاقات تھی لیکن وہ بہت جلد اس طرح گھل مل گئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان سے دیرینہ عزیزانہ تعلقات ہیں، اس کے موجودہ عارضی جنرل سکریٹری ام۔اے مجید صاحب ہیں، جو سرکاری ملازم ہونے کے باوجود سوسائٹی کے کاموں سے پوری دلچسپی لیتے ہیں، خواجہ محمد یوسف صاحب ان کی خوبیوں کے بھی معترف تھے، ان سے بھی مل کر خوشی ہوئی، ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کے بعد اس سوسائٹی کو کامیابی سے لے چلنے کا بار ان ہی دونوں صاحبوں پر ہے۔

ایک روز شام کو ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کے یہاں گیا، انھوں نے ۱۹۳۰ء میں مجھکو ہندوستان کے صوفیائے کرام اور ان کی تصانیف پر پی۔ایچ۔ڈی کا ایک مقالہ لکھنے پر آمادہ کیا تھا، اس وقت

کلکتہ یونیورسٹی میں آسوتوش گورنمنٹ پروفیسر آف اسلامک اسٹڈیز تھے، ان ہی کی ترغیب میں کلکتہ یونیورسٹی میں پی، ایچ، ڈی کا طالب علم بھی ہو گیا تھا، اور یہ مقالہ بڑی حد تک مکمل بھی ہو گیا تھا، لیکن یکایک خیال آیا کہ ان بزرگانِ دین کو دنیاوی فوائد کے لیے استعمال کرنا مناسب نہیں، اس لیے اس کے ذریعہ پی، ایچ، ڈی حاصل کرنے کا خیال ترک کر دیا، اور یہی کتاب بزمِ صوفیہ کے نام سے دار المصنفین سے شائع ہوئی، ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب نے ۶- سہروردی ایونیو میں بہت بڑا مکان بنا لیا ہے، عرصہ ہوا کہ ریٹائر ہو کر اسی میں رہتے ہیں، ابھی تک علمی کام کرتے رہتے ہیں، اس لیے علمی حلقہ میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، گفتگو بھی دلچسپ کرتے ہیں۔ انھوں نے فضل اقبال صاحب (سابق ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان نئی دہلی) کی ایک کتاب کلچر آف اسلام دکھلائی، میں نے یہ نہیں دیکھی تھی، ان کے پاس یہ کتاب لاہور سے ریویو کے لیے آئی ہوئی تھی، انھوں نے اس کا پورا مطالعہ کر ڈالا تھا، جہاں جہاں ان کو اختلاف تھا وہاں نشانات لگا رکھے تھے۔

ایک شام کو پروفیسر مسعود حسن صدر شعبۂ عربی، کلکتہ کالج کے یہاں بھی نشست رہی، جس میں خواجہ محمد یوسف، ڈاکٹر عطا کریم برق، سید محمد علی صاحب کیور میرز دلوجکل سروے اور محمد اسحق صاحب عرف مولانا بھی شریک تھے، مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، لیکن بار بار یہ سوال آیا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو کس طرح سنبھالیں، اسی نشست میں یہ معلوم ہوا کہ کلکتہ یونیورسٹی میں اسلامک کلچر اور ہسٹری کے شعبہ میں زیادہ تر ہندو اساتذہ ہیں، صرف ایک مسلمان لکچرار ہے، طلبہ اور طالبات میں بھی ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے۔

۳۰ اکتوبر کو کلکتہ سے ڈھاکہ کو روانگی ہوئی، وہاں جانا اب آسان کام نہیں، پہلے یہاں تک کی ریلگاڑی سیالدہ اسٹیشن سے چھوٹتی تھی جس سے سفر کرنے میں زیادہ وقت نہیں ہوتی تھی لیکن

۱۹۶۵ء کے بعد سے اس ریل گاڑی کا آنا جانا بند ہو گیا ہے، پہلے کلکتہ سے ڈھاکہ ہوائی جہاز بھی گیا آیا کرتا تھا جس سے ایک گھنٹہ کے اندر یہ سفر تمام ہو جاتا تھا، یہ سروس بھی اب بند ہو گئی ہے، سیالدہ سے ہم لوگ ۹ بجے دن کو ایک لوکل ٹرین میں بن گاؤں روانہ ہوئے، جو چوبیس پرگنہ میں ہے، یہاں ساڑھے گیارہ بجے دن کو پہنچ گئے، وہاں سے رکشے پر ۵ میل کی مسافت طے کر کے ہندوستان و پاکستان کے چک پوسٹ پر تقریباً دو بجے دن کو پہنچے، جہاں سے جیسور پچیس میل ہے، وہاں جا کر ہوائی جہاز میں ڈھاکہ تک سفر کرنا تھا، ایک ٹیکسی پر جیسور پانچ بجے تک پہنچ گئے، بن گاؤں سے جیسور تک سڑک بہت اچھی ہے، اس کے دونوں طرف مسلسل گھنے دار درخت لگے ہوئے ہیں، اس پر چلنے میں ٹھنڈی سڑک کا لطف ملتا ہے، یہ وہی مشہور شاہراہ ہے جس کو شیر شاہ نے پشاور سے سنار گاؤں تک بنوائی تھی۔

ہم دو آدمی تھے، اس لیے دونوں حکومتوں کے قاعدے کے مطابق ہمارے پاس بیس بیس روپئے تھے، اتنی چھوٹی رقم کے ساتھ یہ مشکل اور دور و دراز سفر طے کرنا آسان نہیں، معلوم نہیں کس مصلحت سے اتنی قلیل رقم کی تعیین کی گئی ہے، ہوائی جہاز کے ٹکٹ کا انتظام ڈھاکہ سے کرنا پڑا تھا، جیسور سے ڈھاکہ ۲۰ منٹ میں پہنچ گئے، ریل سے سفر ۸ گھنٹے میں طے ہوتا ہے، اس طرح ہوائی جہاز کا سفر مختصر اور خوشگوار رہا، ڈھاکہ اپنی قیام گاہ پر آٹھ بجے رات تک پہنچ گئے، یہاں اپنے اعزہ سے مل کر بیحد خوشی ہوئی، وہ اپنے ہی گوشت پوست ہیں لیکن قانون کی نظر میں اب ہم اور وہ غیر ملکی ہیں، تکان کے باوجود بچھڑوں کی باتیں ایک بجے رات تک ہوتی رہیں، عم محترم اپنی تشویشناک علالت کے بعد روبصحت ہو رہے تھے، جس سے اطمینان ہوا۔

دوسرے دن صبح کو مولانا جمال میاں فرنگی محلی کے یہاں ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ رابطۂ اسلامیہ کی دعوت پر مکہ معظمہ تشریف لے گئے ہیں، لیکن جلد ہی واپس ہوں گے، ان کا انتظار کرنا ضروری تھا، اسی روز پاکستان کے چار اخبارات پڑھنے کا موقع ملا، دو انگریزی، دو اردو، انگریزی میں

پاکستان ٹائمز، ڈان اور مارننگ نیوز، دونوں بار، ملنے کے تھے، پاکستان ٹائمز کے اڈیٹر فیض احمد فیض تھے، ڈان کے اڈیٹر الطاف حسین صاحب تھے، مارننگ نیوز کے اڈیٹر سید محسن علی صاحب ہیں، پاکستان آبزرور بنگالی مسلمانوں میں مقبول ہے، مارننگ نیوز مہاجروں کے حلقے میں زیادہ پڑھا جاتا ہے، دونوں ڈھاکہ سے نکلتے ہیں، اردو کا اخبار پاکستانی آواز بالکل نیا ہے، اردو بولنے والے مہاجروں کا آرگن ہے، اس کا معیار ابھی اونچا نہیں ہے، ڈھاکہ ہی سے نکلتا ہے، دوسرا اخبار جنگ کراچی سے آتا ہے، اس کے اڈیٹر خلیل الرحمٰن اور منیجنگ اڈیٹر یوسف صدیقی صاحب ہیں، جاوید پریس میکلوڈ روڈ کراچی سے شائع ہوتا ہے، ہندوستان کے مشین سائز کی طرح ٹائپ کا چھپا ہوا ہے لیکن بجائے نستعلیق حروف میں لکھا ہوتا ہے، چھپتا تو بہت عمدہ ہے لیکن حروف بہت باریک ہوتے ہیں، اس میں رنگین تصویریں بھی شائع ہوتی ہیں، پاکستان کا بہت ہی کثیر الاشاعت اخبار ہے، ایک صاحب نے بتایا کہ ڈیڑھ لاکھ چھپتا ہے، اس کے اڈیٹوریل کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے، اڈیٹوریل کے بغل میں ایک مستقل کالم دغیرہ دغیرہ کا ہوتا ہے، اس میں مستقل طور پر ابراہیم جلیس صاحب مزاحیہ رنگ کی تحریریں لکھا کرتے ہیں تلخ و شیریں کے عنوان سے انعام درانی گلفشانی کرتے رہتے ہیں، رئیس امروہوی صاحب کی ایک رباعی روزانہ شائع ہوا کرتی ہے، جس میں سیاسی رنگ غالب ہوتا ہے، ایک روز اس میں یہ رباعی پڑھی،

سچ پوچھ کے جو لوگ ہیں مسلماں وہ لوگ تو چند رہ گئے ہیں
باقی تو فقط بہ حسب اطلاق اسلام پسند رہ گئے ہیں

میں پہلی بار ڈھاکہ ۱۹۵۱ء میں آیا تھا، اس وقت یہ شہر بہت زیادہ ترقی یافتہ تھا کلکتہ کے مقابلہ میں محض ایک قصبہ معلوم ہوتا تھا، دوسری بار ۱۹۶۲ء میں آیا تو اس کی شکل بہت بدل گئی تھی، اب ۱۹۶۸ء میں آیا تو اس کی بہت سی سڑکوں پر کلکتہ ہی جیسی رونق اور چہل پہل پائی، موتی جھیل، جناح ایونیو، رشید پیلس، ہندو سوسائٹی، گلشن اور نیو مارکٹ ان میں تو بہت سی

خوبصورت عمارتیں بن گئی ہیں، ایک دن اپنے چھوٹے چچا جناب سید صلاح الدین صاحب کے ساتھ ہائی کورٹ چلا گیا، اس کی نئی عمارت بہت شاندار ہے لیکن بلندی کی کمی محسوس ہوئی، عمارت کا پورا فرش موزیک کا ہے، یہاں کی نئی عمارتوں میں موزیک کی بڑی فراوانی دیکھی، چیف جسٹس کے کورٹ کے اندر گیا، بڑا وسیع ہال تھا، جو ہر طرح آراستہ تھا، وکلا اور ججوں کا لباس وہی تھا جو ہندوستان کے ہائی کورٹ میں ہے، عمارت کے بیچ میں وسیع لان تھا، اس کی گھاس چھلی ہوئی تھی، موتھے کثرت سے تھے لیکن مالیوں نے ان کو کاٹ کر برابر کر رکھا تھا جس سے دیکھنے میں پورا لان بھلا معلوم ہوتا تھا، دوسرے دن ڈھاکہ ہائی کورٹ کے جسٹس محمود حسین صاحب کے یہاں جانے کا اتفاق ہوا، وہ اپنی سفید لمبی داڑھی میں بہت متشرع معلوم ہوئے، سلہٹ کے رہنے والے ہیں، اردو صاف اور اچھی بولتے ہیں، باتیں شروع ہوئیں تو میں نے کہا کہ آپ کے ہاں ہائی کورٹ کی عمارت خوبصورت اور شاندار ہے، کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ جیسا اس کا ظاہر ہے ویسا اس کا باطن بھی ہو جائے، گفتگو چل نکلی تو بولے کہ مسلمانوں کا بھی عجیب حال ہے، حافظ شیرازی کی موت ہوئی تو کچھ لوگوں نے کہا کہ وہ کافر مرا، اور ان کے جنازہ کی نماز پڑھنے سے انکار کیا، لیکن ان کے دیوان سے فال نکالی گئی تو یہ شعر نکلا:

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ — کہ اگرچہ غرق گناہ است می رود بہشت

پھر کہنے لگے کچھ مسلمان مولانا روم کو بھی مسلمان نہیں سمجھتے ہیں، خدا ایسے مسلمانوں پر اپنا فضل رکھے،

جمعہ کے روز ڈھاکہ کی مشہور مسجد بیت المکرم میں نماز پڑھنے گیا، جو یہاں کی جامع مسجد ہے، بالکل ہی نئے طرز کی سہ منزلہ عمارت ہے، ہر منزل پر جا صف بچھی ہوئی ہے، اس میں دہلی کی جامع مسجد کی طرح لمبا صحن نہیں ہے، اور نہ گنبد ہے، دھوپ سے بچنے کے لیے اس میں شامیانہ ڈالنے کا موقع

نہیں ہوتی جبکہ یہاں ایک بڑا ہال ہے، وہیں امام صاحب کی امامت کی جگہ بنی ہوئی ہے، اس کے اوپر اور نیچے کے حصوں میں دکانیں ہیں، جن سے کافی آمدنی ہوتی ہوگی، اس کا ایک کتب خانہ بھی ہے، انتظام ذرا ٹھیک کا ہے، امام صاحب کے لیے ایک علیحدہ کمرہ بھی ہے، جہاں ان سے لوگ فیوض و برکات حاصل کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں، موجودہ امام صاحب کا اسم گرامی مولانا عمیم الاحسان ہے، پہلے ان کا وطن بہار شریف ضلع پٹنہ تھا، میں ۱۹۴۶ء میں پٹنہ میں ایک بڑا آپریشن کرا رہا تھا، تو میرے ایک محترم عزیز جناب سید محمد امین صاحب نے ان سے میرے لیے دعائیں کرائی تھیں، اسلیے میں ان سے جذبۂ ممنونیت کے ساتھ ملا، وہ دارالمصنفین سے اچھی طرح واقف تھے، اسلیے بڑی خندہ پیشانی سے ملے، دیر تک گفتگو ہوتی رہی، انھوں نے بتایا کہ اردو اور بنگلہ میں ان کی تقریباً اسی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جمعہ کی نماز کا وقت آیا تو وہ اپنے حجرہ سے باہر نکلے، ایک عصا بردار مرصع عصا لیے ان کے آگے آگے چلا، وہ سب سے مصافحہ کرتے ہوئے منبر تک پہنچے، خطبہ کچھ تحت اللفظ اور کچھ قرأت کے ساتھ پڑھا، ان کے پڑھنے کا انداز اچھا اور موثر تھا، مگر لاؤڈ اسپیکر اچھا نہ تھا، اس لیے آواز کبھی کبھی نا صاف ہو جاتی تھی، معتقدین دس ہزار سے کم نہ رہے ہوں گے۔

اسی روز شام کو خبر ملی کہ بنگالیوں اور اردو بولنے والے مہاجروں میں تناؤ پیدا ہو گیا ہے دونوں کے تعلقات خراب ہو رہے ہیں، اردو بولنے والے مہاجروں کا مطالبہ ہے کہ آئندہ انتخاب کے لیے ووٹر بنانے کیلئے جو فارم اردو میں بھی مہیا کیے جائیں، چیف الیکشن کمشنر کی طرف سے اعلان ہوا کہ مشرقی پاکستان میں بنگالی کے علاوہ اردو میں فارم دینے سے انتظامیہ کی مشکلات بڑھ جائیں گی۔ اردو بولنے والے مہاجروں نے حکومت کے خلاف احتجاج کرنے کی خاطر ڈھاکہ میں محمد پور اور میر پور کے علاقوں میں دکانیں بند کیں اور کرائیں، یہ جھگڑا دراصل مہاجروں اور حکومت کے درمیان تھا، لیکن بنگالیوں اور اردو بولنے والے مہاجروں کے جھگڑے کی شکل میں تبدیل ہو گیا، گھر سے باہر نکلنا

شکل ہو گئی، ۲ نومبر سے کئی روز تک خاص خاص اوقات میں کرفیو لگا رہا۔ ۲ نومبر کی صبح کو اخبار تھا تو اس میں یہ خبر تھی کہ چھ آدمی ہلاک ہوئے۔ یہ خبر پڑھ کر یاد آیا کہ جب پاکستان میں مسلمان مسلمان سے لڑ کر ہلاک ہوتے ہیں تو پھر ہندوستان کے ہندو مسلمان لڑتے ہیں تو وہاں کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ بنگالیوں اور غیر بنگالیوں دونوں کی زبان پر تھا کہ ان کے آدمی زیادہ مارے گئے۔ مجھ کو کرفیو سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا، ہیبت ناک عالم چھایا ہوا تھا۔ فوجی ٹرک گذرتا تو اس کی صرف آواز کانوں میں پڑتی۔ ۲ نومبر سے ۲ نومبر تک فضا بڑی مکدر رہی۔ اخباروں میں مارننگ نیوز اور پاکستان آبزرور دونوں کا لب و لہجہ صلح کل تھا، لیڈروں کے بیانات میں بھی امن و آشتی کا پیام ہوتا۔ بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے ملے جلے جلوس بھی نکلے۔ اور مسلمان بھائی بھائی کے نعرے لگائے گئے۔ پاکستان آبزرور کے اڈیٹر عبد السلام صاحب کا ایک اچھا مضمون بھی شائع ہوا جس میں انھوں نے اس جھگڑے کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا۔ بنگالیوں اور غیر بنگالیوں دونوں پر الزامات عائد کیے، اردو بولنے والے مہاجروں کو مخاطب کر کے لکھا کہ وہ وہ اپنے کلچر کے احساس برتری میں مبتلا ہیں، اور بنگالیوں کی طرف روئے سخن کر کے لکھا کہ ان میں تنگ نظری آگئی ہے، اردو بولنے والے مہاجروں سے اپیل کی کہ وہ احساس برتری کو چھوڑ کر بنگلہ زبان ضرور سیکھیں، بنگالیوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اردو زبان ضرور سیکھیں، کیونکہ اردو زبان بھی ان کے کلچر کا ایک ضروری حصہ ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کے لوگ اردو سیکھے بغیر مشرقی پاکستان کو عظیم تر نہیں بنا سکتے۔ پاکستان آبزرور میں وہاں کے مشہور رہنما حمید الحق چودھری صاحب کا بھی ایک مضمون شائع ہوا جس میں انھوں نے مشرقی پاکستان کے تمام لوگوں کو مخاطب کر کے لکھا کہ یہ تصادم محض اس لیے ہوا کہ ان میں رواداری، وطنیت اور عزت نفس وغیرہ کا فقدان ہو گیا ہے۔ لیکن ایک بنگالی اخبار پیپلز ویو کا لب و لہجہ جارحانہ تھا، اس کے ایک مضمون کا اردو ترجمہ

مہاجروں کے اخبار "جاودانی آواز" میں چھپا۔ اس میں یہ لکھا گیا تھا کہ مہاجروں کو مشرقی پاکستان میں جگہ دے کر ان پر بڑا احسان کیا گیا ہے، اس لیے ان کو بنگالیوں کے سامنے جھکا رہنا چاہیے، اور وہ اپنے لائے ہوئے کلچر کو خیرباد کہہ کر بنگالیوں میں ضم ہو جائیں۔ پاکستان آبزرور کے ایک اڈیٹوریل سے بھی معلوم ہوا کہ کچھ اشتہارات ایسے بھی بنگالی زبان میں چھپے جن میں بنگالیوں کو یہ تلقین کی گئی تھی کہ وہ اردو بولنے والوں کو بالکل ختم کر دیں، پھر ایسے اشتہارات بھی تقسیم کیے گئے جن میں بنگالی جاگو اور بہاری بھاگو کا بھی نعرہ بلند کیا گیا، وہاں کے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار "دی پیوپل" کے ایک مضمون کو بھی پڑھنے کا اتفاق ہوا، جس میں فساد کی ساری ذمہ داری مہاجروں پر ڈال دی گئی تھی، اسکے مضمون نگار کو شکایت تھی کہ ان کو حکومت نے محمد پور اور میرپور میں اجتماعی طور پر بسا کر سخت غلطی کی۔ ان کو منتشر رکھنا چاہیے تھا تاکہ وہ بنگالیوں میں رفتہ رفتہ ضم ہو جاتے، مضمون نگار نے یہ بھی لکھا کہ مہاجروں کو بسا کر بنگالیوں پر بڑا اقتصادی بار پڑ رہا ہے، اور ان کو کروڑوں روپئے مہاجروں کی خاطر ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے، یہ مضمون مہاجروں کے لیے بڑا تلخ تھا، بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کی اس اعصابی جنگ میں کچھ مہاجروں کے حوصلے پست ہو گئے ہیں، اور وہ سمجھنے لگے ہیں کہ ان کا مستقبل مشرقی بنگال میں تاریک ہے"

لیکن کچھ مہاجر ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان چھوڑ کر تو یہاں آئے، اب یہاں سے کہاں جائیں، ان کے جذبات کی ترجمانی کرنے کے لیے ان کی ایک تنظیم بھی قائم ہے، اس کا ایک کنونشن ۱۶ اکتوبر کو رنگ پور میں ہوا تھا جس میں یہ مطالبے کیے گئے تھے۔ (۱) مشرقی پاکستان کے اردو بولنے والے طلبہ کے لیے ذریعۂ تعلیم اردو ہو، ڈھاکہ یونیورسٹی کی طرح چاٹگام اور راج شاہی یونیورسٹیوں میں بھی اردو کے شعبے قائم کیے جائیں (۲) پالی ٹکنک، میڈیکل اور انجینیرنگ کالجوں میں مہاجروں کے بچوں کے لیے نشستیں مخصوص کر دی جائیں (۳) یہ مقامات جہاں مہاجروں کی کثیر آبادی ہے مثلاً میرپور، محمد پور، [illegible] خالص پور، بونرپاڑہ [illegible]

تعلیم اردو میں ہو، سید پور کے ٹیکنیکل ہائی اسکول میں اردو کو بھی مساوی حیثیت دی جائے (۴) ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں بنگلہ کے ساتھ اردو کو مساوی حیثیت دی جائے (۵) فوج، پولیس، جدید انتظامیہ اور دوسری ملازمتوں میں مہاجر امیدواروں کے لئے کوٹہ مخصوص کیا جائے، وغیرہ وغیرہ۔

اخبار میں ان تجویزوں کو پڑھ کر مجھ کو ایسا محسوس ہوا کہ میں پاکستان کا کوئی اخبار نہیں پڑھ رہا ہوں بلکہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے ہندوستان کے کسی مسلم اخبار کا مطالعہ کر رہا ہوں، ایک روز مہاجروں کے ارگن ہماری آواز کے نامہ نگار حفیظ الحق سے ملاقات ہوئی، وہ بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے جھگڑوں پر دیر تک تبصرہ کرتے رہے، ان کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستان کی صورت حال اس لیے بگڑتی چلی جا رہی ہے کہ قائد اعظم نے پاکستان کے بنیادی تصورات کے ساتھ جو مذہبی، اخلاقی، قومی اور وطنی فضا تیار کی تھی، وہ ان کے بعد قائم نہ رہ سکی، اسی روز ایک بہت ہی سلجھے اور دور اندیش بنگالی مسلمان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا، تو وہ بھی کہنے لگے، ہمارے سامنے قومی سیرت و ذہن کا جو اعلیٰ تصور ہونا چاہیے، وہ ابھی تک نہیں پیدا کیا جا سکا ہے، یہ اعلیٰ تصور کسی مثالی نمونہ کے کردار رکھنے والے رہنما ہی کے ذریعہ ساری قوم کے سامنے آسکتا ہے، لیکن اس وقت ہماری ذہنی نشو و نما اخباروں کی لمبی لمبی سرخیوں اور جلسے جلوس کے نعروں سے ہو رہی ہے، وہ یہ بھی کہنے لگے کہ اس وقت ہم صرف دنیاوی منفعت اور مادی فوائد کے حصول میں لگے ہوئے ہیں، فیکٹریوں، کارخانوں، محکموں اور عمارتوں کی توسیع کا مطالبہ تو جاری ہے، مگر کسی کو ذاتی اخلاق و سیرت کو سنوارنے کے لیے کچھ کہئے تو وہ سننے کے لیے تیار نہیں، یہ مادی فوائد کی ہوس معلوم نہیں ہم کو کہاں لے جائے گی،

بہت سے تعلیم یافتہ بنگالیوں سے ملنے کا موقع ملا جن میں ایک ریٹائرڈ ایس پی تھے، کچھ سکریٹریٹ کے ملازمین اور کچھ ہائی کورٹ کے وکلاء تھے، ان کی گفتگو کا رنگ کچھ اور تھا، ان سب کو شکایت تھی کہ مغربی پاکستان والوں نے ان کے ساتھ بڑی بے انصافی کی ہے بلکہ ظلم کیا ہے، ان کا خون چوس چوس کر اپنے یہاں [illegible]

نیز بلند بانگ دعوے کیے جاتے ہیں کہ ساری آمدنی کا نوے فی صد حصہ مغربی پاکستان میں خرچ ہوتا رہتا ہے، کراچی اور اسلام آباد کی ترقی انہی کے روپے سے ہوئی ہے، ملازمتوں میں ان کی آبادی کے تناسب کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے، فوج میں ان کو جگہ نہیں دی جاتی، انگریزوں کے زمانے کی طرح وہ مغربی پاکستان کے محض محکوم ہیں، یہ کیسی بے انصافی ہے کہ ان کی آبادی تو اکثریت میں ہے لیکن اکثریت اقلیت کے ماتحت ہو گئی ہے، انصاف کا تقاضا ہے کہ اکثریت کی حکومت ہونی چاہیے، اس لیے سارے مرکزی دفاتر حتی کہ دارالسلطنت کو بھی مشرقی پاکستان ہی میں ہونا چاہیے، ان کی شکایتوں میں بڑی تلخی ہوتی تھی، اتفاق سے انہی دنوں لاہور کے ایک ہفتہ وار رسالہ "زندگی" کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، اس کے سرورق پر یہ لکھا ہوا تھا کہ اس کی اشاعت ۲۶ ہزار ہے، اس کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی، مدیر مسئول الطاف حسین قریشی اور مدیر مجیب الرحمن شامی ہیں، اس میں ایک ایسا مضمون نظر سے گزرا جس میں مشرقی پاکستان کی بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اس کی تردید کی گئی تھی کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کے مقابلہ میں سال زرمبادلہ زیادہ حاصل کرتا ہے، مثلاً اس میں ۱۹۶۳-۶۴ء تک کے برآمد کے اعداد و شمار دیے گئے تھے، اس کے بیان کے مطابق ۱۹۶۳-۶۴ء میں مشرقی پاکستان سے ایک ارب ۲۲ کروڑ اور مغربی پاکستان سے ایک ارب ۸ کروڑ کی برآمد ہوئی، لیکن مغربی پاکستان کی برآمد کی کمی کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ یہ اپنا مال باہر بھیجنے کے بجائے مشرقی پاکستان کو بھی سپلائی کرتا ہے، مثلاً ۱۹۶۳-۶۴ء میں مشرقی پاکستان نے مغربی پاکستان کو ۴۰ کروڑ ۷۰ لاکھ کا مال بھیجا تو مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کو ۸۰ کروڑ ۱۵ لاکھ کا مال بھیجا، درآمد میں بھی مغربی پاکستان مشرقی پاکستان سے بڑھا ہوا ہے، مثلاً ۱۹۶۳-۶۴ء میں مشرقی پاکستان نے ایک ارب ۵۴ کروڑ کا مال درآمد کیا تو مغربی پاکستان نے ۲ ارب ۹۰ کروڑ کا مال منگایا، پھر اس مضمون میں

یہ بھی تھا کہ مرکزی حکومت زرمبادلہ مشرقی پاکستان میں زیادہ خرچ کر رہی ہے، مثلاً ۱۹۶۳ء میں
یہ زرمبادلہ مشرقی پاکستان میں ۱۹ کروڑ ۳۰ لاکھ خرچ ہوئے، اس کے مقابلہ میں مغربی پاکستان میں
صرف ۱۰ کروڑ ۱۹ لاکھ خرچ کیے گئے۔ میں نے ڈھاکہ میں ایک سنجیدہ بنگالی مسلمان سے ان مضمون کے اعداد و شمار
کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ قابل اعتماد نہیں، یہ محض اخباری پروپیگنڈا ہے، پھر یہ بھی کہا کہ ہمارا بیرونی زرمبادلہ
اب تو ہر سال کم ہوتا جائے گا، اس لیے کہ مغربی پاکستان تیزی سے ہر شعبہ میں ترقی کر رہا ہے، اور ہم بہت
پچھڑتے جا رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ مہاجروں کا بھی خیال تھا کہ ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان میں پہلے سے مزید
زیادہ ترقی ہوئی ہے، پھر بھی مرکزی حکومت نے بہت سی باتوں میں اس علاقہ کو کافی نظر انداز کیا ہے،
جس سے مشرقی پاکستان والوں کا اشتعال بڑی حد تک درست ہے۔ مگر مرکزی حکومت کے ایک
بہت بڑے افسر سے بات ہوئی تو وہ یہ کہتے تھے کہ مشرقی پاکستان میں ترقیاتی پروگرام کے لیے جو روپے
مرکز سے آتے ہیں وہ اس عجلت اور مستعدی سے خرچ نہیں کیے جاتے جس طرح پاکستان کے مغربی حصہ میں
ہوتے ہیں۔

ان گفتگوؤں کو سن کر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر غلط فہمیاں دور ہوتی رہیں تو پھر بہت سی شکایتیں
خود بخود رفع ہو جائیں، پاکستان مسلمانوں کی بڑی قربانیوں کے بعد بنا ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد ان کو پھر سے
ایک مملکت ملی ہے جس پر ان کو حکومت کرنے کا موقع ملا ہے، ان کی سلطنت ایک زمانہ میں کشمیر سے
اراکان تک پھیل گئی تھی لیکن وہ کھو بیٹھے، آخر ان کے زوال کے کیا اسباب ہوئے، حال اور مستقبل کو
سنوارنے کے لیے ماضی سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسلمان ۱۲۰۶ء سے ۱۸۵۷ء تک ہندوستان
کے اندر قطب مینار، تخت طاؤس اور تاج محل تو ضرور بناتے رہے لیکن انھوں نے کوئی ایسا مضبوط
صالح، توانا اور صحت مند معاشرہ نہیں بنایا جو ان کو ہر حال میں سنوارے اور سنبھالے رکھتا، اسی لیے
وہ منتشر اور پراگندہ ہو کر سب کچھ کھو بیٹھے، ماضی کے اس دردناک پہلو سے بہت کچھ سبق حاصل کیا جا سکتا

تاریخ کہتی ہے کہ معاشرہ اچھا ہوتا ہے تو سیاست بھی اچھی رہتی ہے، معاشرہ بگڑا ہوا ہو تو سیاست بھی بگڑتی رہتی ہے، ارباب فکر کی تعلیم ہے کہ اچھے معاشرہ کے لیے پاک ضمیر، بلند خیال اور لطیف ذوق کا ہونا ضروری ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب قوم کی اصلی روح میں پاکیزگی بھی ہو، اقبال نے بھی کہا ہے ؎

ضمیر پاک وخیال بلند وذوق لطیف
نہ ہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید

اس مرتبہ ڈھاکہ یونیورسٹی نہ جا سکا، کیونکہ یہ بند تھی، لیکن ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی صدر شعبۂ اردو، اور ڈاکٹر ظفر الہدیٰ ریڈر شعبۂ فارسی سے جا کر ملا، ان سے معلوم ہوا کہ یونیورسٹی میں فارسی میں طلبہ کی تعداد برائے نام رہ گئی ہے، اردو میں بھی ان کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے، عربی میں بھی تعداد کچھ اچھی نہیں ہے، اور دوسری جگہوں کی طرح یہاں کے بھی طلبہ سیاسی پارٹیوں کے ساتھ ہو جاتے ہیں، اخباروں سے معلوم ہوا کہ یہاں کے طلبہ دو گروہوں میں تقسیم ہیں، سیکولرسٹ اور اسلام پسند، ان دونوں گروہوں میں ایک سال پہلے سخت تصادم ہو گیا تھا جس میں ایک طالب علم عبدالمالک شہید ہو گیا، وہ اسلام پسند طلبہ کا رہنما تھا، میرے قیام کے زمانہ میں اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ ۵؍ اکتوبر کی رات کو اس جگہ جہاں عبدالمالک کی موت ہوئی ہزاروں طالب علم، جوان، بوڑھے اور عام شہری کلمۂ توحید اور کلمۂ شہادت کا ورد اور حفاظ کلام پاک کی تلاوت کر رہے تھے، عبدالمالک کی یاد میں ریس کورس میں ایک مسجد تعمیر کرنے کی بھی تجویز منظور ہوئی، اسلام پسند طلبہ کے ان جذبات کے باوجود یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کے اثرات سیکولرسٹ طلبہ کا جوش وخروش مدھم پڑ جائے گا، ان کی سیکولرزم پر بنگالی نیشنلزم زیادہ غالب ہے، جو پاکستانی نیشنلزم سے زیادہ ہم آہنگ نہیں،

ایک روز پاکستان ایشیاٹک سوسائٹی میں بھی گیا، اس کے لائبریرین جناب ضیاء الدین صاحب نے

اس کی ہر چیز بہت شوق سے دکھائی، یہ ۱۹۴۹ء میں قائم ہوئی، مگر ابتک کرایہ کی عمارت میں ہے، اس کا کتب خانہ بھی بہت بڑا نہیں ہے، لیکن اس انیس (۱۹) برس کے اندر اس کی طرف سے بہت سی مفید کتابیں شائع ہوئی ہیں، جو زیادہ تر انگریزی میں ہیں، یہ ایک شیلف میں رکھی ہوئی تھیں، ان میں ڈاکٹر اے، ایچ۔ دانی کی دو کتابیں "بنگال میں مسلمانوں کے عہد کی تاریخی عمارتیں" اور "بنگال میں مسلم کتبات کی کتابیات" تھیں، وہ اس وقت پشاور یونیورسٹی میں ارکیالوجی کے شعبہ کے صدر ہیں، اور پاکستان کی قدیم تاریخ اور انڈولوجی کے بہت بڑے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں۔

مطبوعات کے اس سلسلہ میں ڈاکٹر ابو امام کی کتاب "سر الکزنڈر کننگھم اور ہندستان کے آثار قدیمہ" بھی تھی، میجر جنرل الکزنڈر کننگھم (۱۸۱۴ء۔ ۱۸۹۳ء) ہندوستان و پاکستان میں ایک بڑے محسن کی حیثیت سے یاد کیے جائیں گے، انھوں نے ہندوستان کے ارکیالوجکل سروے کے ڈائرکٹر جنرل کی حیثیت سے اپنی رپورٹ کی تقریباً ۲۳ جلدیں مرتب کی تھیں جن میں ہندوستان کے شمالی اور وسطی حصوں کے آثار قدیمہ سے متعلق بڑے قیمتی تاریخی اور اثری معلومات ہیں، ابو امام صاحب نے انکے کارناموں کو اپنی کتاب میں پیش کرکے اس محسن کا جو حق تھا وہ پورا کر دیا ہے، اس سلسلہ کی اہم مطبوعات میں تاریخ خان جہانی و مخزن افغانی کی دو جلدیں بھی ہیں، جن کو ڈاکٹر ایس، ایم امام الدین ریڈر اسلامک ہسٹری اینڈ کلچر ڈھاکہ یونیورسٹی نے بڑی محنت سے ایڈٹ کیا ہے، اور اپنے فاضلانہ مقدمہ میں اس غلط فہمی کو دور کیا ہے کہ تاریخ خان جہانی اور مخزن افغانی دونوں ایک ہی کتاب ہیں، مخزن افغانی تاریخ خان جہانی کا خلاصہ ہے، موخرالذکر تاریخ کا مصنف نعمت اللہ ہے، اس نے یہ تاریخ ۱۰ ذی الحجہ ۱۰۲۱ھ مطابق ۲۲ جنوری ۱۶۱۳ء میں ختم کی اور اپنے مربی خان جہاں کے نام پر اس کا نام رکھا، اس میں ہندوستان کے افغان حکمرانوں کی تاریخ لودی سلاطین سے سوری خاندان کے خاتمہ تک کی ہے، یہ جہانگیر کے عہد میں لکھی گئی، اس لیے اس کے ابتدائی دور کی بھی

کچھ تاریخ ضمناً آگئی ہے۔

سوسائٹی کی مطبوعات کی اشاعت سے پاکستان کے نئے اور ہونہار اہل قلم کی تحقیقی صلاحیتیں بھی بروئے کار آرہی ہیں، ان ہی میں ڈاکٹر عبدالکریم ہیں، جن کی حسب ذیل چار کتابیں اس سلسلہ میں دیکھیں، "بنگال میں مسلمانوں کی معاشرتی تاریخ" "بنگال کے مسلمان حکمرانوں کے سکے" "مرشد علی خاں اور اس کا عہد" "مغلوں کے عہد میں ڈھاکہ" ان سے مشرقی پاکستان کے تاریخی لٹریچر میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے، امید ہے کہ ڈاکٹر عبدالکریم کی یہ علمی سرگرمیاں آئندہ بھی جاری رہیں گی، تاکہ وہ آگے چل کر پاکستان کے ایک مایۂ ناز مورخ کی حیثیت سے یاد کیے جائیں۔ بنگال پر جو اور دوسری تاریخی کتابیں یہاں سے شائع ہوئی ہیں، ان کے نام یہ ہیں: "وہابی تحریک کے خلاف مقدمات کے سلسلہ میں حکومت بنگال کے دستاویزات کے انتخابات" از ڈاکٹر معین الدین احمد خاں، کراچی یونیورسٹی "حسین شاہی بنگال" از ڈاکٹر ممتاز الرحمٰن طرفدار ڈھاکہ یونیورسٹی "ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں بنگال کی تجارتی اور بری پالیسی" از ڈاکٹر مظہر الحق۔ "برٹش پالیسی اور بنگال کے مسلمان" از ڈاکٹر اے، آر ملک اس آخری کتاب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انگریزوں نے اٹھارہویں صدی کے آخر سے مسلمانوں کے خلاف جو سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی پالیسی اختیار کی، اسی کے نتیجہ میں برصغیر ہند کی تقسیم ہوئی،

سوسائٹی کی طرف سے عمرانیات پر بھی تین کتابیں شائع ہوئی ہیں، پائرے بے سنگنٹ، یونسکو کی طرف سے ڈھاکہ میں عمرانیات کے پروفیسر تھے، انھوں نے یہاں رہ کر چاٹگام کے پہاڑی قبیلوں کا مطالعہ کیا، اور ایک کتاب "چاٹ گام کے پہاڑی علاقے کے قبیلے" کے نام سے لکھی، انھوں نے ایک دوسری کتاب "مشرقی پاکستان میں سوشل ریسرچ" کے نام سے مرتب کی ہے جس میں مشرقی پاکستان کے عمرانی مسائل پر بہت سے ممتاز اہل قلم کے مضامین ہیں، ان کے علاوہ ڈاکٹر ج۔ ای آووِن نے بھی "مشرقی پاکستان میں عمرانیات" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔

سوسائٹی کی اور دوسری مطبوعات یہ ہیں "بنو امیہ کے عہد میں اسپین کی اقتصادی تاریخ" از ڈاکٹر ایس، ایم امام الدین۔ "بنگالی زبان کے مخطوطات کی فہرست" مرتبہ منشی عبدالکریم و احمد شریف۔ "ڈھاکہ کی مچھلیاں" از عبداللطیف۔ "پاکستان میں انتخابی مسائل" از ڈاکٹر محفوظ الحق۔ "ہندوستان اور پاکستان میں جدید اسلامی تحریکات کی کتابیات" از ڈاکٹر محی الدین احمد خاں۔ ڈاکٹر محمد شہید اللہ کی یادگار جلد مرتبہ ڈاکٹر انعام الحق۔

انیس برس کی مدت میں مذکورۂ بالا معیاری کتابوں کی اشاعت ضرور قابل قدر ہے، دار المصنفین کیلئے یہ کتابیں ہدیے کے طور پر مجھکو دی جا رہی تھیں لیکن ان کا لانا آسان کام نہ تھا، سوسائٹی کی طرف سے ایک رسالہ بھی ہر چار مہینے کے بعد جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان کے نام سے شائع ہوتا ہے، کلکتہ کی بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے علمی کارنامے تو بہت شاندار رہے، ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں جو اہم فارسی تاریخیں لکھی گئی تھیں، ان میں بہت سی کتابیں اس کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، اور یہ ایسا احسان ہے جو مسلمانوں کے عہد سے دلچسپی رکھنے والے مورخین فراموش نہیں کرسکتے۔ پاکستان کی ایشیاٹک سوسائٹی کو بھی اُن فارسی تاریخوں کی اشاعت کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے، جو اب تک شائع نہیں ہوسکی ہیں، تاکہ اس کا کارنامہ اس لحاظ سے بھی قابل قدر سمجھا جائے۔

اسی اثنا میں مولانا جمال میاں مکہ معظمہ سے ڈھاکہ واپس آگئے، ان کی کوٹھی پر حاضر ہوا تو بڑی محبت سے پیش آئے، ۱۹۶۵ء میں ان سے فرنگی محل میں ملا تھا، تو اس وقت وہ مجھکو بہت شکیل و جمیل نظر آئے تھے، وہ باتیں کرتے تو ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے، ہر بات پر ایک موزوں شعر پڑھ دیتے لیکن اس عرصہ میں ان کی صحت اچھی نہیں رہی، اس لیے ان کے چہرہ پر پہلی سی شگفتگی اور شادابی نہیں تھی، گو انھوں نے انگلستان جاکر اپنا علاج بھی کرایا ہے، ڈھاکہ میں رہ کر ملنے ملانے، مہمانداری اور وضعداری میں فرنگی محل لکھنو اور اپنے والد بزرگوار جناب مولانا عبد الباری صاحبؒ کی شاندار روایت کو برقرار رکھا ہے، کئی ملاقاتوں میں دار المصنفین کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، دار المصنفین کی مطبوعات پر تبصرہ کو

ہو گئے کے لیے، انھوں نے مختلف قسم کے مشورے دیے، ان مشوروں کو عملی شکل دینے میں ان کو بھی یہ خیال رہا کہ جب تک دونوں ملکوں کے تعلقات خراب ہیں، دارالمصنفین کے لیے پاکستان میں کوئی ایسا کام نہیں ہونا چاہیے جس سے یہ علمی ادارہ ہندوستان کی حکومت اور وہاں کے لوگوں کی نظر میں مجروح اور مشکوک ہو جائے، کیونکہ ان کو یہ اچھی طرح علم تھا کہ دارالمصنفین اگر پاکستان کے علمی اور سنجیدہ حلقہ میں اچھی نظر سے دیکھا جاتا ہے تو ہندوستان میں بھی سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں پسند کیا جاتا ہے، اس ادارہ کی اس خصوصیت کو ہر حال میں برقرار رکھنا ہے، لیکن ہم دونوں اس سے متفق تھے کہ کوئی ایسی موثر صورت اختیار کی جانی چاہیے جس سے دارالمصنفین کی مطبوعات پاکستان کے ناشر اجازت کے بغیر چھاپنے نہ پائیں، انھوں نے کراچی کے کچھ لوگوں کے نام بتائے جو اس سلسلہ میں زیادہ عملی مشورے دے سکتے تھے۔

ڈھاکہ میں فساد کی وجہ سے ڈھاکہ اور کراچی کے ہوائی جہاز کے مسافروں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی، اس لیے کراچی کے لیے ٹکٹ حاصل کرنا آسان کام نہ تھا، ۱۴ نومبر کو مجھکو کراچی کے لیے ٹکٹ ملا، میرے ہم سفر میرے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر سید محمد شمیم بھی ہوئے، جو ڈھاکہ کے بہت کامیاب اور ہر دلعزیز ڈاکٹر ہیں، ان کی وجہ سے ہوائی جہاز کا سفر بہت خوشگوار رہا، ڈھاکہ سے ہم لوگ سات بجے شام کو چلے تھے اور سوا تین گھنٹے میں کراچی پہنچ گئے، ہم دونوں کا قیام اپنے ایک سعادتمند عزیز خالد شرف الدین سلمہٗ کے یہاں ہوا، جو پاکستان کے اسٹیٹ بینک میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں، ان کا کوارٹر اسٹیٹ بینک افیسر کالونی میں واقع ہے، جو بڑا آرام دہ تھا، پھر انھوں نے اپنی سعادتمندی سے ہر طرح کی راحت پہنچائی، اس سے پہلے میں کراچی ۱۹۵۵ء میں آیا تھا، اس پندرہ برس میں کراچی میں ہر طرف بڑی توسیع ہو گئی ہے، ہر ایک کالونی ایک شہر ہے، مثلاً پاکستان ایمپلائز ہاؤسنگ سوسائٹی گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی آبادی سوا لاکھ ہے،

کراچی آکر سب سے پہلے استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندویؒ کے مزار پر حاضری دی، پہلے یہ مزار ایک کھلے ہوئے میدان میں تھا، اسکے تھوڑے فاصلہ پر مولانا شبیر احمد عثمانی کا مرقد تھا، اب اس میدان میں اسلامیہ کالج کی عمارت بن گئی ہے، حضرت سید صاحبؒ کے داماد سید محی الدین مرحوم نے اس کو علحدہ کرا کے گھیر دیا ہے، پورا مزار اب سنگ مرمر کا ہے، فاتحہ پڑھتے وقت آنکھوں سے آنسو جاری تھا کہ اسکے نیچے کون ہے؟ شمع رسالت کا پروانہ، جوئے شیر اسلامیہ کا فرہاد، علم و فن کا مجسمہ، اخلاق، اخلاص، محبت، شفقت، لینت، نرمی کا پیکر، تحمل، بردباری، توکل اور قناعت کا ستون۔ آنکھیں بند تھیں اور دیکھ رہا تھا کہ وہ دارالمصنفین کے کتب خانہ میں اپنی میز پر بیٹھے لکھ رہے ہیں، وہ اس کے احاطہ میں چل رہے ہیں، پھر رہے ہیں، آرہے ہیں، جارہے ہیں، مسکرا رہے ہیں، اپنے شاگردوں کو علمی نکتے بتا رہے ہیں تحقیق و تلاش کے راز آشکارا کر رہے ہیں، اپنی ایک بات سے علم و ادب کی تمام گتھیاں سلجھا رہے ہیں، میرا جی چاہا کہ قبر سے لپٹ جاؤں، ان کے سارے احسانات آنکھوں کے سامنے آگئے، خیال آیا کہ انکی آخری آرامگاہ دارالمصنفین ہی میں ہونا چاہیے تھا جس کو انھوں نے اپنے خون اور پسینہ سے سینچا، وہی ان کا تخت طاؤس رہا، وہی انکا تاج محل بھی ہونا چاہیے تھا، مگر آہ! مصلحت خداوندی اور مشیت ایزدی کچھ اور تھی، دارالمصنفین میں وہ ابدی نیند سوتے ہوتے تو ہر لمحہ ان کے شاگرد اپنی عقیدت کے نذرانے انکے مرقد مبارک پر چڑھاتے اور اسکی خاک کو طوطیائے چشم بناتے رہتے، اور وہ اسکے اندر سے ژرف نگاہی، نکتہ پروری اور فکری گہرائی کی کرنیں پھوٹتے ہوئے دیکھتے، آہ: وہ کراچی میں اس وقت اجنبی بنے ہوئے ہیں لیکن دارالمصنفین کے احاطہ میں اپنی وفات کے بعد بھی وہ اپنے شاگردوں کے جھرمٹ میں پاتے، میں زبان حال سے کہہ رہا تھا، استاد محترم! آپ اب بھی ہم لوگوں کے ذہن و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں، آپ کا قلم تو ہم لوگ نہ پاسکے لیکن آپکے قلم کے مصری کی صدائیں کانوں میں گونج رہی ہیں اور اسی کی رجز خوانی اور حدی خوانی کے سہارے ہمارا قافلہ چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ سلام، ہزاروں سلام، لاکھوں سلام۔

پھر بیگم صاحبہ (یعنی اہلیہ استاذی المحترم) کی خدمت میں حاضر ہوا، جو اس طرح ملیں جس طرح کہ [illegible]

حیاتی گیلانی، حیاتی کاشی اور تغلق نامہ امیر خسرو

از جناب ڈاکٹر امیر حسن صاحب عابدی صدر شعبۂ عربی و فارسی دہلی یونیورسٹی

مولانا حیاتی گیلانی گیلان کے شہر رست میں پیدا ہوئے اور سن رشد کو پہنچکر بحیثیت تاجر کاشان اور گیلان کے درمیان آتے جاتے رہے، عراق اور خراسان کی بھی سیر کی، شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں وہ ہندوستان آئے اور حکیم ابوالفتح گیلانی کے توسط سے اکبر کے ملازم اور صاحب ثروت و منصب ہوئے، اکبر کے بعد جہانگیر کے مداحوں میں ہو گئے، اور ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے، آخر میں حیاتی عبدالرحیم خانخانان سے بھی متوسل ہوئے، انکے سال وفات میں اختلاف ہے، مگر سعید گیلانی کے ایک قطعہ سے جو ان کے سونے چاندی میں تولنے پر کہا تھا ۱۰۱۹ھ نکلتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس وقت تک زندہ تھے،

حیاتی کاشی شروع میں سقائی کا کام کرتے تھے، کہا جاتا ہے کہ نقطوی خیالات کی وجہ سے بادشاہ وقت نے ان کو قید میں ڈال دیا تھا، دو سال کے بعد جب قید سے چھوٹے تو شیراز چلے گئے، اور وہاں سے کاشان پہنچے، اس کے بعد قزوین پہنچے اور وہاں سے ہندوستان آئے، اور احمد نگر میں رہنے لگے، اور سنہ ۱۰۱۱ھ میں انتقال کیا،

حضرت امیر خسرو کی آخری تصنیف تغلق نامہ ہے، جسے انھوں نے تغلق حکومت کے بانی سلطان غیاث الدین تغلق کی فرمایش پر لکھا تھا، جہانگیر کے زمانہ میں اس مثنوی کا صرف ایک نسخہ موجود تھا جس کے دونوں طرف ناقص تھے، اس لیے بادشاہ نے اپنے

درباریوں کو حکم دیا کہ اس کو مکمل کر دیں، حیاتی کا تکمیل کردہ تغلق نامہ بادشاہ کو اس قدر پسند آیا کہ اس کو سونے چاندی میں تلوایا۔

مجلس مخطوطات فارسی حیدرآباد دکن نے ۱۳۵۲ھ میں حیاتی کے الحاقی تغلق نامہ کو شائع کیا، ابھی حال میں مجھے دیوان حیاتی کا ایک قلمی نسخہ ملا ہے جو الہ آباد میوزیم (۲۸۹۶۸) میں ہے، اس میں تغلق نامہ بھی ہے، اور یہ تغلق نامہ مطبوعہ تغلق نامہ سے بہت کچھ مختلف ہے، خاص کر مثنوی کا آخری حصہ، مطبوعہ تغلق نامہ کے اڈیٹر ہاشمی فرید آبادی صاحب نے الحاقی تغلق نامہ کو حیاتی کاشی کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن میری رائے میں یہ حیاتی گیلانی کا ہے، یہ دونوں شاعر بالکل معاصر تو نہ تھے، لیکن ان کا زمانہ ایک دوسرے سے بالکل قریب تھا۔

یہ بحث کہ مثنوی حیاتی گیلانی کی ہے، یا حیاتی کاشی کی، اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنا یہ امر کہ اصل مطلب دونوں مثنویوں میں مختلف ہے، جس سے اس زمانہ کی تاریخ کے مطالعہ کرنے والوں کے نظریات میں فرق ہو سکتا ہے۔

مکتوباتِ ایران

کتاب خانہ پہلوی - خیابان شاہ رضا

تہران - ۱۳ رمضان المبارک

جناب مدیر محترم دار المصنفین صاحب سلام علیکم و رحمۃ اللہ

میں تہران یونیورسٹی میں "معارف اسلامی در ہند و پاکستان" کی کلاسیں لیتا ہوں، اسکے علاوہ وزارتِ دربار شاہنشاہی ایران سے متعلق ایک ادارے ایران شناسان کے جہانی مرکز میں ہند و پاک کے شعبہ کا متصدی ہوں، اپنی تدریسی اور اداری ضروریات کے پیش نظر ہندوستان کے ان تمام موسسات کے بارے میں اطلاعات جمع کر رہا ہوں جنھوں نے مسلمانان ہندوستان اور فارسی کے سلسلے میں اہم خدمات علمی انجام دی ہیں، ادارہ دار المصنفین کی اہمیت اور عظمت اظہر من الشمس ہے، چنانچہ آپ سے التجا ہے بڑا مہربانی اس ادارہ سے متعلق اطلاعات عنایت فرما کر شکر گذاری کا موقع دیجئے۔

اس ادارے کی تشکیل اور علمی و ادبی خدمات کا تعارف درکار ہے، جسے یہاں کے اہم علمی رسالوں اور اپنی کتاب کے لیے حاصل کرنا چاہتا ہوں، امید ہے آپ جلد ہی میری استدعا کو قبول فرماتے ہوئے دار المصنفین سے مجھے کما حقہ روشناس کرائیں گے۔

میرے پاس بزم تیموریہ اور بزم صوفیہ موجود ہیں۔ کیا خلجیوں، تغلقوں اور لودیوں کے زمانے سے متعلق بھی بزم خلجیہ و بزم تغلقیہ و بزم لودیہ کتابیں چھپ چکی ہیں؟ دار المصنفین

کی مطبوعات منگانے کے سلسلے میں کس طرح اقدام کیا جا سکتا ہے؟ واقعاً آپ کا ادارہ بڑی سنجیدہ اور ٹھوس قسم کی علمی خدمات انجام دے رہا ہے، بزم صوفیہ اور بزم تیموریہ بڑی قابل قدر مطبوعات ہیں، سبحان اللہ بہت ہی اچھا کام کیا گیا ہے۔

عید الفطر کی مبارک باد قبول فرمایئے۔ آپ کے جملہ ہمکاروں اور مددگاروں کو مخلصانہ

والسلام
ارادت مند، دکتر شہریار نقوی

(۲)

کتاب خانہ پھلواری

سرور گرامی دانشمند عالی مقام فاضل ارجمند و ذی اکرام

سلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ کا نوازش نامہ مورخہ ۱۰ر دسمبر موصول اور منکشف حالات ہوا، ذرہ نوازی کا بے انتہا شکریہ، آپ کے حسب ارشاد میں نے تہران یونیورسٹی سے چاہا کہ آپ کو پچاس کتابیں فوراً بھیج دیں چنانچہ انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ کتابیں بھیجی جا رہی ہیں، کتابوں کی روانگی کی اطلاع والی چٹھی ۱۸ر جنوری ۱۹۸۰ء کو لکھی گئی ہے، ارسال شدہ کتابوں کی فہرست کی ایک نقل ملفوف کی جا رہی ہے کتابوں کے پہنچ جانے پر ضرور مطلع فرمائیں۔

میں ایران اور تہران یونیورسٹی میں برصغیر کے مسلمانوں سے متعلق تمام امور کا جاننے والا سمجھا جاتا ہوں، میری کلاسیں بھی "معارف اسلامی در ہند و پاکستان" کے عنوان سے قائم ہیں یہاں کے رسالوں، اخباروں اور ریڈیو میں بھی میرے مقالات اور لیکچر ان ہی عناوین کے تحت چھپتے اور براڈکاسٹ ہوتے رہتے ہیں، اسی لیے اشد ضرورت مجھے اس کی ہے کہ میرے گھر میں ا

کی مکمل لائبریری ہو، اور مجھے ہندوستان و پاکستان والے رسالوں اور اپنی مطبوعات کے ذریعہ وہاں کے جملہ امور ثقافتی، ادبی اور تاریخی سے مطلع رکھیں، میں ایرانی ہوں لیکن یوپی کی فضاؤں کا پروردہ، مجھے اعظم گڈھ، بلگرام، علی گڑھ اور یوپی کے تمام علمی مراکز سے بے انتہا محبت ہے، بھوپال، حیدرآباد دکن، لکھنؤ، جونپور، بے پور، کلکتہ، بمبئی، دہلی اور ہندوستان کے متعدد علمی اور اسلامی مراکز میں رہا ہوں، اسی لیے وہاں کے زعمائے قوم اور علمی اور ادبی رہنماؤں سے بخوبی آشنا ہوں، میری تمنا ہے کہ یہاں بیٹھ کر وہاں کی علمی و ادبی شخصیتوں اور ثقافتی اور علمی اداروں کو فارسی دانوں سے روشناس کراؤں اور برصغیر کے مشاہیر علم و ادب کے کارناموں کو ایران میں متعارف کرا سکوں۔

آپ نے دارالمصنفین کے تعارف کے لیے انگریزی اور اردو میں دو کتابچے اور دارالمصنفین کی مطبوعات کی فہرست روانہ فرمانے کی اطلاع دی لیکن بدقسمتی سے باوجود شدید انتظار کے مجھے کوئی چیز بھی ہنوز موصول نہ ہو سکی، میں آج بھی بدستور آپ کی فرستادہ اطلاعات کا منتظر ہوں، امید ہے مجھے یہ کتابچے اور فہرست مطبوعات مل سکیں گی۔

کیا یہ ممکن ہے دارالمصنفین کا مشہور رسالہ المعارف مجھے میسر آسکے، میں اس کے قدیمی (قابل حصول) پرچے بھی حاصل کرنے کا آرزومند ہوں۔ اس کا دائمی خریدار بننا چاہتا ہوں، جو صورت بھی ارسال زر کی آپ ارشاد فرمائیں تعمیل کروں گا، آپ کی ارسال شدہ فہرست کتب اور کتابچوں کے انتظار کے باعث جواب میں تاخیر ہوئی۔

خدا کرے آپ بہ متعلقین بخیر و عافیت ہوں، اور جلد ہی جواب سے شادکام فرمائیں۔

والسلام

آپ کا مخلص ارادتمند: ڈاکٹر شہریار نقوی

(۴)

کتابخانہ پہلوی، خیابان شاہ رضا

تہران - ۷/ مارچ ۱۹۷۸ء

مکرمی محترمی جناب معین الدین صاحب سلام علیکم ورحمۃ اللہ

نوازش نامہ صادر ہوا، چند کتابچے بھی رجسٹرڈ ڈاک سے موصول ہوئے، ان سے کافی معلومات حاصل ہوسکیں، جیسا کہ قبلاً عرض کرچکا ہوں، دل میں یہ تمنا لیے ہوئے ہوں کہ ہندوستان کے مشاہیر اسلامی خاص طور پر ۱۹۴۷ء کے بعد کے علما، فضلا اور ادبا کو یہاں پہنچاؤں اور ان کے کارہائے نمایاں سے ایرانیوں کو مطلع کروں، ساتھ ہی اسلامی علوم کے اداروں کو بھی بیان کردوں، ایسے اداروں میں دارالمصنفین کا خاص مقام ہے، اچھا ہوا اور بہت اچھا ہوا اس کی شناسائی میں آپ نے مدد فرمائی، آپ سے التجا ہے کہ ہندوستان کے دیگر علمی اور ثقافتی اداروں کے نام اور پتے بھی بتلادیجیے تاکہ ان سے بھی مراسلت کرسکوں، فارسی زبان میں ان اداروں اور مشاہیر کا تعارف میرے خیال سے ایک علمی خدمت ہوگی، ندوۃ العلماء کے بارے میں تو آپ بھی کافی اطلاعات فراہم فرماسکتے ہیں، جامعہ ملیہ کو لکھوں گا، اس قسم کے اور کون کون سے ادارے ایسے ہیں جن کی طرف توجہ کی جائے، ازراہ کرم اس کا جواب ضرور عنایت فرمائیں۔

آپ کی شرح حال کی بھی ضرورت ہے، اسی طرح دارالمصنفین سے منسلک جملہ دیگر اشخاص اور افراد کی شرح احوال درکار ہے، آپ کے ادارے کی مطبوعات کس طرح منگائی جاسکتی ہیں، "خیام" تالیف سید سلیمان ندوی کی بڑی ضرورت اس لیے ہے کہ اس کو فارسی میں ترجمہ کرنے کی نیت رکھتا ہوں، بزم تیموریہ کا فارسی ترجمہ ایک ہاشمی نام طالب علم نے جو دو سال ہوئے یہاں آگئے تھے، کیا ہے، وہ دہلی چلے گئے، دہلی یونیورسٹی کے فارسی شعبہ سے ان کا اتا پتا چلایا جاسکتا ہے، شعرالعجم

اور شبلی کی بعض دیگر تالیفات کے بارے میں آپ کو بخوبی علم ہے کہ فخر داعی گیلانی مرحوم نے ان کا فارسی ترجمہ کیا جو یہاں شائع ہو چکا ہے۔ مجھے علاوہ خیام کے جن کتابوں کی فوری ضرورت ہے وہ یہ ہیں: (۱) بزم صوفیہ (۲) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے اور تمدنی کارنامے (۳) عربوں کی جہاز رانی (۴) ارمغان سلیمان (۵) اسلامی درسگاہیں (۶) معارف سلیمان نمبر۔ آپ جس طرح قبول فرمائیں ان کی قیمت ادا کی جائے گی۔ انکے برابر قیمت کی آپ کی پسندیدہ فارسی کتب بھی بھیجی جا سکتی ہیں۔

اسلامی درسگاہیں اور خیام یہ کتابیں بیحد ہی ضروری اور انکی احتیاج فوری ہے۔

امید ہے ہندوستان کے مسلم علما اور ثقافتی اور علمی اداروں کا تعارف یہاں کرا سکوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ، آپ ایسے ذی علم اور بے لوث مددگار مل جائیں تو اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانا دشوار نہیں۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔ والسلام

مخلص نیازمند

ڈاکٹر شہریار نقوی

مکاتیب شبلی حصہ اول و دوم

مولانا مرحوم کے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ جس میں مولانا کے قومی خیالات اور علمی، تعلیمی اور ادبی نکات ہیں، یہ درحقیقت مسلمانوں کی تیس برس کی تاریخ ہے۔

اول صفحات ۱۵۴ قیمت للعہ

حصہ دوم زیر طبع ہے۔

منیجر

ادبیات

غزل

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

وحشتِ خاک آج جو شکلِ بشر میں ہے
کل دیکھئے تو کارگہِ کوزہ گر میں ہے

گرمی کے ساتھ ساتھ چمک بھی شرر میں ہے
کتنا لطیف ربط یہاں خیر و شر میں ہے

سودائے عاشقی نہ فقط میرے سر میں ہے
عشق و جنون فطرتِ نوعِ بشر میں ہے

رعنائیِ تصورِ جاناں نہ پوچھئے
ہر لحظہ ایک عالمِ دیگر نظر میں ہے

حل کر سکے گا کیا وہ معمہ حیات کا
الجھا ہوا جو گردشِ شام و سحر میں ہے

ناآشنا ہے اس سے ابھی سینۂ ملک
وہ آگ جو چھپی ہوئی قلبِ بشر میں ہے

پاکیزگیِ اشکِ ندامت نہ پوچھیے
موتی میں کب وہ آب ہے جو اس گہر میں ہے

دستِ طلب اٹھائے ہوئے ہیں خودی کی لاش
غیرت کا خون کاسۂ دریوزہ گر میں ہے

اے خضر اک عذابِ مسلسل ہے طولِ عمر
لطفِ حیات زندگیِ مختصر میں ہے

شاعر بھی محرمِ غمِ ہستی ہے اے حکیم
وہ درد میرے دل میں ہے جو تیرے سر میں ہے

پیتے ہیں اب بھی خونِ جگر صاحبانِ فن
اب بھی متاعِ عیش کفِ اہلِ زر میں ہے

اے بے خبر اسی کا تو ہے نام زندگی
پرواز کی خلش جو ترے بال و پر میں ہے

اے چشم ہوشیار، نہ افشا ہو رازِ دل
اے دل ذرا قرار، ابھی بات گھر میں ہے

ہنسنے کو چاہتا تو ہے میرا بھی دل وؔلی
لیکن مآلِ خندۂ گل بھی نظر میں ہے

غزل

از جناب تسکین قریشی

تو ہی نہ ذوقِ تشنہ لبی چاہتا نہیں
یہ بھی نہیں کہ پینے کو جی چاہتا نہیں

غم سے ہوں بے نیاز خوشی چاہتا نہیں
اتنا جیا کہ جینے کو جی چاہتا نہیں

ساقی، شراب دے کہ نہ دے سب مجھے قبول
بس ایک تیری کم نگہی چاہتا نہیں

دل سے عزیز تر ہے مجھے دل کی عافیت
دل جس کو چاہتا ہو وہی چاہتا نہیں

ایسے بھی دوست ہم کو ملے ہیں کہ جن سے ہم
ملتے ہیں اور ملنے کو جی چاہتا نہیں

میرا مقامِ رندی و مستی کچھ اور ہے
میں سب کے ساتھ بادہ کشی چاہتا نہیں

ننگ طلب ہے منزلِ گم گشتہ کی طلب
میں زندگی بھی گزری ہوئی چاہتا نہیں

واعظ یہ ایک بات نئی میکدے میں ہے
جب بیٹھیے تو اُٹھنے کو جی چاہتا نہیں

ہر تیر و نیشتر کی جگہ میرے دل میں ہے
احباب کی میں دل شکنی چاہتا نہیں

یہ دور ہے ستم کے لیے کتنا سازگار
مظلوم آج دادرسی چاہتا نہیں

ہر جدتِ کلام ہے تسکیںؔ مجھے پسند
لیکن ادب کی بے ادبی چاہتا نہیں

مطبوعاتِ جدیدہ

مسلمانوں کے عقائد و افکار حصہ اوّل	مترجمہ مولانا محمد حنیف صاحب ندوی متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۷۲، مجلّد مع گرد

پوش، قیمت: لعہ، پتہ: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، پاکستان۔

امام اہلسنت والجماعت علامہ ابوالحسن اشعری تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے نامور علمائے متکلمین میں ہیں، ان کی تصنیفات کی تعداد ایک سو سے متجاوز ہے، اُن میں "مقالات الاسلامیین" زیادہ مشہور اور علم کلام کی امہاتِ کتب میں شمار کی جاتی ہے، امام صاحب نے اس میں اپنے زمانہ تک کے اہم مسلمان فرقوں شیعہ، خوارج، مرجیہ، معتزلہ جہمیہ، ضراریہ، بکریہ اور اصحاب حدیث یعنی اہل سُنّت والجماعت کے عقائد و آراء سے بحث کی ہے، اور ان فرقوں کے ذیلی فرقوں کا مفصل تذکرہ بھی کیا ہے، اس اعتبار سے فرق اسلامیہ کے موضوع پر یہ پہلی جامع اور مستند کتاب ہے، جس میں ہر فرقہ کے اصول اور بنیادی عقائد کا غیر جانبداری سے ذکر کیا گیا ہے جو اپنی اہمیت کی بنا پر اس موضوع پر بعد میں لکھی جانے والی تمام کتابوں کا ماخذ رہی ہے، اس کے دو ایڈیشن استنبول اور مصر سے دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں، اب ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے فاضل رکن مولانا محمد حنیف ندوی نے ان دونوں کو سامنے رکھکر جلد اول کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے، اس میں مصری اڈیشن کے اکثر حواشی کے ساتھ فاضل مترجم کے بعض نئے مفید حواشی بھی شامل ہیں،

شروع میں فاضل مترجم کے قلم سے ۱۲ بیس صفحہ کا ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں امام اشعری کے حالات ومناقب اور تصنیفات کا مفصل ذکر اور ان کے اعتزال سے الگ ہونے کے اسباب اور رجعت پسندی کے الزام کا خصوصیت سے جائزہ لیا گیا ہے، ترجمہ سلیس ہے، مگر انشاپردازی کے زور کی بنا پر کہیں کہیں ناہمواری آگئی ہے، مقدمہ کے ص ۳۲ پر مسئلۂ صفات کے متعلق امام اشعری کے موقف میں التباس دکھانے کے بعد اپنا جو موقف تحریر کیا گیا ہے، وہ بھی واضح نہیں ہے، حواشی کے ص ۲۵۲ میں حماسہ کے اس شعر

اقول لها وقد طارت شعاعًا　　　من الابطال ويحك لن تراعي

کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے "جب اس کا دل خوف سے پراگندہ ہوگیا، تو میں نے کہا پگلی! جنگ جو بہادروں کے معاملہ میں ڈر اور وہم کو دل سے نکال دے" اس میں کئی غلطیاں ہیں "اس کا دل" اور "میں نے کہا پگلی" سے ظاہر ہوتا ہے کہ مترجم نے شاعر کا مخاطب کسی عورت کو سمجھا ہے، حالانکہ مخاطب خود اس کا نفس ہے، "من الابطال" کو معلوم نہیں کس کے متعلق قرار دیا گیا ہے، حالانکہ وہ "قد طارت شعاعًا" کے متعلق ہے، ویحک کا ترجمہ ہی نہیں کیا گیا ہے، اور "لن تراعی" کا ترجمہ وہم کے بجائے خوف کو دل سے نکال دے ہونا چاہئے، ان فروگذاشتوں سے قطع نظر اس ترجمہ کی اشاعت سے ایک مفید علمی وکلامی کتاب کا اردو میں اضافہ ہوا ہے،

مسلم پرسنل اور اسلام کا عائلی نظام - مرتبہ مولوی شمس تبریز خاں صاحب متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۲۶۳ مجلد مع گرد پوش، قیمت صرف ؎ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

مسلم پرسنل لا پر بہت لکھا جا چکا ہے، اسی نئی کتاب میں مذہبی، فقہی، عقلی اور تاریخی مختلف حیثیتوں سے بحث کرکے اس کو مسلمانوں کے قومی تشخص اور ملی زندگی کے لیے ناگزیر اور اس میں تبدیلی

کہ نہ صرف مسلمانوں، ملک ملک اور حکومت کے نقطۂ نظر سے بھی مضر ثابت کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں شرعی نصوص پر مشتمل احکام اور مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے جواز کے دلائل کی پوری تردید کی گئی ہے، غیر مسلم ممالک کے ردعمل کا جائزہ اور اسلامی عہد میں غیر مسلموں کے پرسنل لا کے تحفظ کا ذکر اور نکاح، طلاق، خلع، مہر، وراثت اور اوقاف کے فقہی احکام بیان کیے گئے ہیں، آخر میں اسلام میں عورت کا درجہ و مرتبہ اور اس کا دوسرے مذہبوں سے مقابلہ اور مسلم خواتین کی سیاسی، سماجی اور علمی خدمات کا اجمالی تذکرہ ہے، کتاب محنت سے لکھی گئی ہے اور موضوع پر بہت جامع ہے، لیکن بعض غیر متعلق بحثیں اور کہیں کہیں انداز تحریر جذباتی ہو گیا ہے، عورتوں کے حقوق کے ضمن میں ایک جگہ انکی نبوت کا بھی ذکر ہے، لیکن یہ قول جمہور امت کے خلاف ہے، اور جن کتابوں سے اس کی سند پیش کی گئی ہے ان سے بھی اس کا ضعیف ہونا ہی ثابت ہوتا ہے، صفحہ ۲۴۸ پر زیب النساء کی جن تین تصنیفات کا ذکر ہے ان میں ایک بھی اس کی تصنیف نہیں ہے، مونس الارواح جہاں آرا کی تصنیف ہے، اور زیب التفاسیر دراصل تفسیر کبیر کا فارسی ترجمہ ہے جو اس نے ملا صفی الدین اردبیلی سے کرایا تھا، اسی طرح دیوان اور مخفی تخلص کی نسبت بھی اس کی جانب مستند نہیں ہے، الحسبۃ فی الاسلام ابن قیمؒ کے بجائے ابن تیمیہؒ کا رسالہ ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں "حضرت عائشہؓ کے بارہ میں مولوی سعید انصاری نے سیر الصحابیات میں لکھا ہے کہ وہ لکھنا نہیں جانتی تھیں، لیکن یہ خلاف واقعہ ہے"، حالانکہ یہ بلاذری کے حوالہ سے لکھا گیا ہے جس کا مصنف نے کوئی ذکر نہیں کیا ہے، گو حضرت عائشہؓ کے متعلق اسکے خلاف روایت بھی ملتی ہے، تاہم علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا سعید انصاریؒ کی تحقیق میں ان کے لکھنا نہ جاننے ہی کی روایت صحیح ہے، جو قرین قیاس بھی ہے، ص ۷۵ تا ۷۱ پر جو آیتیں نقل کی گئی ہیں ان سے مصنف کا مدعا صراحۃً ثابت نہیں ہوتا، آیتوں کے آزاد ترجمہ کی وجہ سے بعض فقروں کا ترجمہ رہ گیا ہے، اور بعض میں غلطیاں ہو گئی ہیں، جیسے لفظ "زنا" کا "اشاعت" اھ

"ابیطا" کا رخصت ہو جانا کیا گیا ہے، کلام مجید کی بعض آیتیں غلط نقل کی گئی ہیں، لیکن ان معمولی فروگذاشتوں سے کتاب کی خوبی میں فرق نہیں آتا، شروع میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کا ایک جامع اور پرمغز مقدمہ ہے، جو زیر بحث موضوع پر بڑا مدلل اور بجائے خود نہایت کافی و وافی ہے۔

حیات ذاکر حسین مرتبہ جناب خورشید مصطفےٰ صاحب رضوی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۴۰۰ مجلد مع گردپوش، قیمت مجلد للعہ پتہ: مکتبہ برہان اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۲۶

یہ کتاب ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی ہی میں لکھی گئی تھی، اس میں ان کے خاندانی حالات اور ابتدائی دور سے صدر جمہوریہ ہونے تک کے جملہ واقعات وحالات کو قلمبند کیا گیا ہے، اور انکی جامعہ ملیہ کی صبر آزما زندگی، جامعہ اور علی گڑھ میں ان کے مشاغل وخدمات اور گورنر، نائب صدر اور صدر کی حیثیت سے ان کے کاموں کی مفصل روداد بیان کی گئی ہے، جو دلچسپ اور بعض حیثیتوں سے سبق آموز بھی ہے، ہندوستان کے گذشتہ نصف صدی کے واقعات سے عموماً اور علی گڑھ اور جامعہ ملیہ کی علمی وتعلیمی تحریکوں سے خصوصاً ذاکر صاحب کا بڑا تعلق رہا ہے، انکی سیرت وشخصیت کے آئینہ میں یہ تصویر نمایاں نظر آتی ہے، مرتب نے انکی زندگی کا دوسرا رخ بھی ایک حد تک پیش کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً علی گڑھ کی وائس چانسلری اور ملک کی صدارت کے زمانہ کے بعض واقعات کی بنا پر ان پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں، ان کا بھی اس میں ذکر آگیا ہے، غالباً اردو میں ذاکر صاحب پر یہ پہلی مستقل کتاب ہے اور اس سے انکی زندگی اور دلآویز شخصیت کے جلوے پوری طرح سامنے آجاتے ہیں، شروع میں رشید احمد صدیقی صاحب کا پیش لفظ اور آخر میں ذاکر صاحب کی اردو، انگریزی مضامین اور کتابوں کی فہرست بھی دیدی گئی ہے۔

صبوحی - مرتبہ جناب مہر چند کوثر، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۲۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت تین روپے ۵۰ پیسے، پتہ: پنجاب اردو اکاڈمی، 3349-D ۲۱-D چنڈی گڑھ۔ (۲) نوبہار صابر۔ مٹریا آشرم۔ راگھو مزرعہ پٹیالہ۔

جناب مہر چند کوثر پنجاب کے خوشگو شاعر ہیں، گو انکی شاعری کی عمر طویل نہیں ہے، لیکن انکے کلام میں پختگی اور شستگی پائی جاتی ہے۔ شاعر کو اصل مناسبت غزل سے ہے، چنانچہ اس مجموعہ کا بیشتر حصہ غزلیات ہی پر مشتمل ہے انکے تغزل میں رنگینی و لطافت معنی آفرینی اور طرز ادا کی دلکشی نمایاں ہے، ان کے درد مند دل نے حسن و عشق کے معاملات میں زندگی کے مسائل و حقائق کی جھلک اور غم عشق میں آلام روزگار کی تلخیاں بھی شامل کردی ہیں، اس طرح ان کی آپ بیتی میں جگ بیتی کی شان پیدا ہوگئی ہے، آخر میں بعض قومی و ہنگامی مسائل پر چند نظمیں ہیں، ان سے بھی مصنف کی قادر الکلامی اور ملک و وطن دوستی کا پتہ چلتا ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ اہل ذوق میں مقبول ہوگا۔

سوئٹ سفارتخانے میں - مترجمہ جناب محمود سعیدی، پریم گوپال متل صاحبان، وسعید انجم صاحبہ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۱۴، قیمت ۶ روپے ناشر نیشنل اکاڈمی ۹- انصاری مارکیٹ، دریا گنج - دہلی ۶

نیشنل اکاڈمی دہلی نے کمیونزم کے اصلی خد و خال کو دکھانے کیلیے متعدد مفید کتابیں شائع کی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک دلچسپ کڑی ہے، جو برما میں متعین ایک روسی ڈپلومیٹ اور سوئٹ نمایندے الیکزنڈر کزنا چیف کے ان تجربات پر مشتمل ہے جو ان کو وہاں کے روسی سفارت خانے کے اندر اور باہر پیش آئے، مصنف نے دکھایا ہے کہ ایک طرف تو سوئٹ محکمہ سفارت برمی حکومت سے دوستانہ معاہدے اور خوشگوار معاملات طے کرتا ہے، دوسری طرف اسکا خفیہ جاسوسی ادارہ کمیونسٹوں کو منظم کرنے، ملک میں بغاوت اور انارکی پھیلانے اور حکومت کو ختم کرنے کی پراسرار سازشیں کرتا رہتا ہے اور ان تخریبی کارروائیوں کا ذمہ دار وہاں کی کمیونسٹ پارٹی کو قرار دیا جاتا ہے، ممکن ہے مصنف کے بعض بیانات میں مبالغہ ہو لیکن مجموعی حیثیت سے حقیقت پر مبنی معلوم ہوتے ہیں، اور ان سے سوئٹ یونین کی کمیونزم کو پھیلانے کی خفیہ تنظیم جد و جہد کا حال بھی معلوم ہوتا ہے اور برما کے بعض معاشرتی حالات اور مشہور تاریخی یادگاروں کے متعلق معلومات بھی فراہم ہوتے ہیں۔

مصنفات مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

...صحابہ: (حصہ اول) قیمت: ...	۹- انقلاب الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان
...صحابہ: (حصہ دوم) " ...	کی ایک کتاب کا انشاپردازانہ ترجمہ قیمت: ...
...ۂ صحابیات: " عا	۱۰- سیرۃ عمرؓ بن عبدالعزیز: (زیر طبع)
...یخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کے خصوصیات	۱۱- امام رازی: امام فخرالدین رازی کے سوانح
کی تفصیل: قیمت: ...	اور ان کی تصنیفات: قیمت ...
...ئے اسلام: (حصہ اول) دوسری صدی ہجری	۱۲- ابن خلدون: ابن خلدون کے سوانح زندگی اور
سے لیکر خاندان فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان	اس کے فلسفہ کی تشریح (زیر طبع)
فلاسفہ کے حالات، قیمت: ...	۱۳- اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل
...ئے اسلام: (حصہ دوم) متاخرین حکمائے	سوانح حیات کے ساتھ ان کے فلسفیانہ
اسلام کے حالات، قیمت: ...	اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل کی گئی
...الشعر (حصہ اول) " ...	فلسفہ خودی کی تشریح، اور ان کے فارسی
...الشعر (حصہ دوم) " ...	و اردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت ...

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی و فنی
تنقیدی، ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعر کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر ریویو
...لکھے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح ان کے مضامین کی ترتیب و اشاعت بھی ضروری
...ہے، یہ مرحوم کے اہم ادبی و تحقیقی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے جو اردو زبان و ادب و شاعری
...کے مختلف پہلوؤں پر ہے، صفحات ۴۴۶ قیمت: ... منیجر دارالمصنفین اعظم گڑھ

(اڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دین رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ اپنی مکی و مدنی زندگی میں ۲۳ برس تک مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت، بلا امتیاز نسل و رنگ و بلا لحاظ زمان و مکان سراپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب میں انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف ابواب کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ پورا دین اسلام ہی نہیں، بلکہ اس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے لئے رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورتوں کا درجہ، اور ان کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخ اسلام میں ان کا مرتبہ، بلا تفریق مذہب و ملت پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہل کتاب و مشرکین عرب وغیرہ سب شامل ہیں، غیر مسلم رعایا کے حقوق، حیوانات کے حقوق، اور ان کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو بابوں میں دنیا پر دین اسلام کے علمبردار مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارناموں، اور مختلف علوم و فنون کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت :- ۲۲۰ صفحے، قیمت :- [illegible]

منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر ال

مئی سنہ ۱۹۷۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مجلسِ ادارت

سلسلۂ تاریخ ہند

عہدِ مغلیہ
مسلمان ہندو مؤرخین کی نظر میں

(جلد اول)

ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں کے عہد کا فارسی وانگریزی اور اردو میں ہندو مسلمان مورخین و اہل قلم نے بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے ہیں، اس کتاب میں مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے مغلیہ عہد اور دور جدید کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصلی تحریروں کی روشنی میں جمع کر دیئے گئے ہیں قیمت لعہ

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب (ایم۔ اے)

کشمیر
سلاطین کے عہد میں

خطۂ جنت نظیر کشمیر کو علمی و تمدنی و سیاسی اعتبار سے ہمیشہ سے اہمیت حاصل رہی ہے، اور اس وقت تو ساری دنیا کی نگاہیں اس کی طرف ہیں، اس کتاب میں اس لالہ وگل کی سرزمین میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان حکمرانوں کی حکومت رہی ہے اس کی بہت ہی مستند اور مفصل، سیاسی اور تمدنی تاریخ قلمبند کی گئی ہے، قیمت: لعہ

(مرتبہ جناب محب الحسن صاحب پروفیسر تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

مترجمہ محمد عماد عباسی صاحب ایم۔ اے۔ (اعظم گڈھ)

(مینیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ)

نمبر ۱۰۵ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۰ء عدد ۵

مضامین

شذرات

ہندوؤں کا مقدس شہر بنارس مسلمانوں کے لیے بھی بعض حیثیتوں سے پرکشش رہا ہے، شیخ علی حزیں اس کے اس قدر شیفتہ تھے کہ یہاں سے نکلنا پسند نہ کرتے تھے، اور اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

از بنارس نہ روم معبدِ عام است اینجا ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است اینجا

اور آج بھی ان کی لوحِ مزار کے یہ اشعار بنارس سے ان کی وابستگی کی یاد دلاتے ہیں:

زبان دانِ محبت بودہ ام دیگر نمیدانم ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید اینجا

حزیں از پائے رہ پیمابسے سرگشتگی دیدم سرِ شوریدہ بر بالینِ آسایش رسید اینجا

بنارس میں اسلامی عہد کے بہت سے تاریخی آثار ہیں، اس کی خاک سے بڑے بڑے علما پیدا ہوئے، حافظ امان اللہ بنارسی المتوفی ۱۱۳۲ھ اپنے دور کے نامور عالم تھے، اور ان کی ذات طالبانِ علم کا مرجع تھی، ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ جیسے علما ان کے شاگرد تھے، بنارس کی یہ خصوصیت اب بھی قائم ہے، اور وہ اس زمانہ میں بھی دینی تعلیم کا ایک بڑا مرکز ہے، یہاں عربی کے متعدد بڑے مدرسے ہیں، ان میں سے دو کو گذشتہ مہینہ دیکھنے کا موقع ملا، مظہر العلوم اور اہلحدیث کا مرکزی دار العلوم، یہ دونوں احناف اور اہل حدیث کے مرکزی مدرسے ہیں، مظہر العلوم کے ناظم بنارس کے ایک مخلص، دیندار اور مخیر تاجر حاجی عبد العزیز صاحب ہیں، ان میں دینی کاموں کی

بڑی لگن ہے، وہ اس میں وہ اپنی دولت کا معتد بہ حصہ صرف کرتے ہیں، مظہر العلوم کے علاوہ ایک ہائر سکنڈری اسکول، ایک مدرسۂ نسواں، ایک یتیم خانہ انکی نگرانی میں چل رہا ہے، اسپتال کی عمارت ابھی بنکر تیار ہوئی ہے، اس کا افتتاح باقی ہے، ان سب کی عمارتیں نہایت وسیع اور شاندار ہیں، ان کاموں میں مولانا محمد اسحٰق صاحب ندوی حاجی صاحب کے دست راست ہیں،

اہلحدیث کا مرکزی دار العلوم حال میں قائم ہوا ہے، گذشتہ اکتوبر میں بڑے اعلیٰ پیمانہ پر اسکی رسم افتتاح ادا ہوئی تھی، دمشق، حجاز اور کویت تک کے علما اس میں شرکت کیلئے آئے تھے، ابھی اسکے سامنے کے رخ کی دو منزلہ عمارت بنی ہے، دار الحدیث زیر تعمیر ہے، ان سے اس دار العلوم کی عظمت و شان کا اندازہ ہوتا ہے، اسکے ناظم مولانا عبد الوحید صاحب کو اللہ تعالیٰ نے علم اور دولت دنیا دونوں سے نوازا ہے، ابھی نوجوان ہیں اور دار العلوم کا کام بڑی دلسوزی سے انجام دیتے ہیں، یہ جمعہ کا دن تھا، مدرسوں میں تعطیل تھی، وقت بھی کم تھا، اسلیے صرف ان کی عمارتیں دیکھ سکا، اور بعض اساتذہ اور منتظمین سے سرسری ملاقات ہو سکی تفصیل سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، ان مدارس کا لاکھوں روپئے سالانہ کا خرچ ہے، جس کو بنارس کے مخیر تاجر فراہم کرتے ہیں، باہر سے امداد کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس زمانہ میں جبکہ مسلمانوں کے مذہب، کلچر اور زبان کے تحفظ کا بڑا شور ہے، انکی حفاظت کا کام یہی مدارس انجام دے رہے ہیں، اور انہی کے بدولت ان کا نام باقی ہے۔

بنارس کی انجمن ترقی اردو کو بھی دیکھنے اور اسکے کارکنوں سے ملاقات کا موقع ملا، انکے کاموں سے اخبارات کے ذریعہ کچھ واقفیت تھی، اسکی تفصیل سنکر بڑی حیرت ہوئی، اردو والوں کی اشک شوئی کے لیے اور دوسری زبانوں کے طفیل میں، اردو کو جو سہولتیں ملی ہیں ان میں ماتحت عدالتی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے کہ ان سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا ہے، اس انجمن کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے ان سہولتوں کے متعلق سرکاری احکام کو جنھیں عملے دبائے

وابستہ بیٹھے تھے، حاصل کرکے اس کا نفاذ کرایا، اور جہاں اس میں دشواری پیش آئی وہاں مقدمات دائر کرکے عدالتوں کے ذریعہ اردو کے حقوق حاصل کیے، چنانچہ اس وقت بنارس کے بہت سے اسکولوں میں اردو کی تعلیم ہوتی ہے اور عدالتوں اور رجسٹری آفس وغیرہ میں بھی اردو میں درخواستیں دینے کی اجازت ہے، جس سے خود اردو والے بہت کم فائدہ اٹھاتے ہیں، انجمن کا ایک کتبخانہ بھی ہے جس میں اردو اور ہندی کی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے، انجمن کے روح رواں دائم رسول صاحب اور بابو شیو نرائن ہیں جن کی اردو دوستی سے اردو کے اصحاب واقف ہیں، میں نے بابو صاحب سے کہا کہ اردو کے معاملہ میں "پاسباں مل گیا کعبہ کو صنم خانے سے"۔ مسلمانوں کے دینی و ملی کاموں میں مولوی احمد مکرم صاحب دلیہ پوری بھی پیش پیش رہتے ہیں۔

اردو کے بارہ میں حکومت کی پالیسی کھلی ہوئی ہے، اس سے توقع رکھنا عبث ہے، افسوسناک بات یہ ہے کہ خود اردو کے بہت سے ہمدرد و ہوا خواہ اسکی بقا و تحفظ کے لیے جو کچھ کرسکتے ہیں وہ بھی نہیں کرتے، اس میں سب سے زیادہ شکایت پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے مسلمان ممبروں سے ہے، وہ نجی صحبتوں میں تو اردو کشی کا رونا روتے ہیں لیکن انکو پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں لب کشائی کی جرأت نہیں ہوتی، ہندو ممبر تو کبھی کبھی اردو کی حمایت میں آواز بھی بلند کردیتے ہیں، مسلمان ممبروں سے اتنا بھی نہیں ہوتا، اگر وہ متحدہ آواز بلند کریں تو اردو کے بہت سے حقوق مل جائیں، بیشتر مسلمان والدین مستقبل کی موہوم امیدوں اور خیالی خطرات کی بنا پر اپنے لڑکوں کو اردو کی تعلیم نہیں دلاتے، دوسرے شعبوں میں بھی اردو سے بے اعتنائی کا یہی حال ہے، ایسی حالت میں محض حکومت کی شکایت بے نتیجہ ہے، یہ کام بھی ایک دینی جماعت، دینی تعلیمی کونسل انجام دے رہی ہے، کم سے کم مسلمانوں کو اس میں تو اس کا ہاتھ بٹانا چاہیے، اردو زبان اور مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا مسئلہ مسلمانوں کی ملی موت و حیات کا مسئلہ ہے، اگر اس سے انھوں نے غفلت برتی تو انکی آئندہ نسلیں صرف نام کی مسلمان رہ جائیں گی۔

مقالات

اُردو زبان کا ترکی عنصر

از جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب سابق پروفیسر عربی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

(۲)

باوُرچی - باورچی تاتاری زبان کا لفظ ہے، جو طبّاخ یعنی خانساماں کے معنی میں اردو میں بکثرت مستعمل ہے، اردو میں یہ لفظ غالباً براہ راست آیا ہے،

ترکی میں باورچی کو آشجی کہتے ہیں، آش بمعنی خوراک یا کھانا اور چی نسبتی ہے۔ فارسی میں آسے آشپز کہتے ہیں،

اکثر لغت نگاروں نے باورچی کے اصل ماخذ اور اشتقاق کے بارے میں کوئی کارآمد بات نہیں کہی اور جو کچھ لکھا ہے غلط سلط لکھا ہے۔ مثلاً مؤید الفضلاء کے مصنف نے اسے غلطی سے فارسی الفاظ کی فصل میں مندرج کیا ہے، جامع اللغاتِ اردو کے مؤلف نے اسے ہندی بتایا ہے جو قطعاً غلط ہے، پلاٹس کے نزدیک باورچی فارسی بھی ہے اور ترکی بھی، کیونکہ اس لفظ کے ساتھ انھوں نے فارسی اور ترکی دونوں زبانوں کی علامتیں ڈال دی ہیں یعنی وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ یہ لفظ فارسی ہے یا ترکی، لیکن اس شک کے باوجود انھوں نے اسے 'باور' سے مشتق بتایا ہے، اور اس اندراج سے اوروں کو بھی گمراہ کیا ہے، ہشٹنگس صاحب نے اپنی عافیت اسی میں دیکھی کہ اس کے اشتقاق اور ماخذ کے

اسے میں خاموشی اختیار کریں ۔

تاتاری امرا، کے اِن باورچی معمولی حیثیت کا ملازم نہیں ہوتا تھا، بلکہ خاصی اہمیت کا مالک ہوا کرتا تھا، اور باورچی کے عہدہ پر بالعموم اعلیٰ طبقہ کے قابلِ اعتماد لوگ مقرر کیے جاتے تھے، باورچی نہ صرف امیر کے کھانے کی تیاری کا انتظام کرتا تھا بلکہ تیاری کے بعد اس کا جائزہ بھی لیتا تھا، اور کھانے کے وقت دسترخوان پر بذات خود موجود رہتا تھا، اور اپنے آقا کی جملہ ضروریات پر نگاہ رکھتا تھا، ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں ترکی اور تاتاری امرا کے دسترخوان کی جو کیفیت لکھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک امیر کا ایک الگ باورچی ہوتا تھا، جو صاف ستھرے ریشمی کپڑے پہنے اور ہاتھ میں تولیے دسترخوان پر اپنے آقا کے سامنے موجود رہتا تھا، اور بوقت ضرورت چھری سے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر ہڈیوں سے جدا کرکے امیر کے سامنے پیش کرتا تھا، اور اس کام میں بڑی مہارت اور چابکدستی کا ثبوت دیتا تھا، (دیکھو رحلۃ ابن بطوطہ مطبوعہ پیرس جلد دوم صفحہ ۴۰۷)

بیگ ۔ بیگ ترکی لفظ ہے جس کے معنی کسی قوم یا قبیلہ کے سردار کے ہیں، اس لیے عربی میں بیگ کا ترجمہ امیر کرتے ہیں، بیگ کا مرتبہ خان اور خاقان کے مقابلہ میں کمتر ہے،

ترکی قواعد زبان کی رو سے بیگ کا مؤنث بیگم اور جمع بیگلر ہے، بیگلر بیگی سے مراد امیرالامرا ہے، آجکل عثمانی ترک بیگ کو بک لکھتے ہیں اور اس کا تلفظ بے کرتے ہیں، مثلاً انور بک (Enver Bey)

ہندوستان کے اسلامی دور میں بیگم کا لقب شاہی خاندان کی خواتین کے لیے استعمال ہوتا تھا، اور اس کی جمع بیگمات کرتے تھے، جیسے بیگماتِ اودھ ۔ آجکل ہندوستان اور پاکستان کے تعلیم یافتہ شرفا، میں بیگم انگریزی لفظ مسز (Mrs) کی جگہ استعمال ہوتا ہے ۔

بہادر ۔ بہادر تاتاری اور ترکی زبانوں کا ایک مشترک اور کثیرالاستعمال لفظ ہے ۔

جس کا معنی شجاع اور دلاور ہے، تاتاریوں کے ہاں یہ لفظ باتور اور بگاتور کی صورت میں بھی پایا جاتا ہے، اور آس پاس کی بہت سی زبانوں میں دخیل ہو چکا ہے۔

بہادر کا لفظ فارسی اور اردو میں داخل ہو کر ان زبانوں کا جزو لاینفک بن چکا ہے اور اسم علم، اسم صفت اور لقب ہر طرح سے بکثرت مستعمل ہے، مثلاً بہادر خاں، بہادر شاہ اور خان بہادر وغیرہ۔

تمُر یا تیمُور۔ تمُر یا تیمور ترکی لفظ ہے جس کا لغوی معنی لوہا ہے، تیمور اسم علم کے طور پر بھی مستعمل ہے، جیسے امیر تیمور گورگان۔

جیسا کہ ترکی الفاظ کے بارے میں دستور ہے، اگر تمُر کی حرکات کو بذریعہ حروف ظاہر کیا جائے تو اسے تیمور کی صورت میں لکھتے ہیں، مصری لوگ اس کا تلفظ تَیمور (بالفتحہ) کرتے ہیں، جو درست نہیں، کیونکہ اس کا ابتدائی حرف مکسور ہے۔

جرگہ۔ تاتاری زبان کا لفظ ہے جس کا بنیادی لغوی معنی حلقہ ہے۔

جرگہ قبیلہ کے افراد کا وہ حلقہ یا مجمع ہے، جو مشاورت کے لیے یا کسی اہم بات پر غور کرنے کے لیے جمع ہو۔

پھر جرگہ سے مراد وہ حلقہ بھی لیتے ہیں جو فوجی یا لشکری دشمن کو محصور کرنے یا شکاری جانور کو گھیرنے کے لیے بناتے ہیں۔

جرگہ کا لفظ فارسی پشتو اور اردو زبانوں میں بھی مروج ہو چکا ہے، اور کم و بیش ان ہی معنوں میں مستعمل ہے۔

پلاؤ۔ ترک اس کا تلفظ ابتدائی کسرہ کے ساتھ پِلاؤ کرتے ہیں، لیکن اردو داں طبقہ میں اس کا عام مروجہ تلفظ (ضمہ کے ساتھ) پُلاؤ ہے۔

پلاؤ وہ طعام یا کھانا ہے، جو چاولوں کو گوشت کی یخنی میں پکا کر تیار کیا جاتا ہے، اور ترکوں اور دوسری مسلمان قوموں کا مخصوص اور مرغوب کھانا ہے۔ ترکوں کے ہاں پلاؤ کی کئی قسمیں ہیں، مثلاً باش پلاؤ وہ پلاؤ ہے جو بکرے کی سری ڈال کر تیار کرتے ہیں، بالق پلاؤ وہ پلاؤ ہے جس میں گوشت کے بجائے مچھلی ڈالی جائے۔ طاوق پلانی جو مرغ کے چوزے کے گوشت کے ساتھ تیار کیا جائے، عجم پلاوی یا قیمہ لو پلاوی وہ پلاؤ ہے جو قیمہ کے ساتھ کھایا جائے، اور مولوی پلاوی وہ پلاؤ ہے جو صرف گھی اور پیاز ڈال کر پکایا جائے۔

ہندوستان میں بھی پلاؤ کی چند قسمیں مروج ہیں، مثلاً "مرغ پلاؤ" یا "مٹر پلاؤ"۔ مٹر پلاؤ وہ چاول ہیں جو گوشت کے بجائے سبز مٹر ڈال کر پکائے جائیں۔ لیکن اس پلاؤ کا مصنوعی ہونا ظاہر ہے، کیونکہ حقیقی پلاؤ وہ ہے جو گوشت کی یخنی میں تیار کیا جائے۔ پلاؤ کا لفظ اردو کے بعض محاورات میں بھی استعمال ہوتا ہے، مثلاً "خیالی پلاؤ پکانا" یعنی ہوائی قلعے بنانا، خیالی تجویزوں یا منصوبوں سے دل بہلانا۔

چونکہ پلاؤ مشرقی ملکوں کا ایک مشہور اور مقبول کھانا ہے جس کا مشرقی زندگی کے سلسلہ میں مغربی کتابوں میں بھی اکثر ذکر آیا ہے، اس لیے پلاؤ کا لفظ انگریزی زبان کی اکثر لغات میں Pilau یا Pilaw یا Pilaff کی صورت میں پایا جاتا ہے، اور اوکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے مؤلفین نے سراغ لگایا ہے کہ انگریزی مطبوعہ لٹریچر میں اس کا استعمال سب سے پہلے ۱۶۱۲ء میں ہوا تھا۔ لیکن ان لغات میں اس کے ماخذ کو فارسی بتایا گیا ہے، جو صریحاً غلط ہے۔ دوسری اسلامی قوموں کی طرح اگرچہ ایرانی بھی پلاؤ کے بہت شائق ہیں، لیکن یہ لفظ بذات خود ترکی ہے، ایک ایرانی شاعر نے پلاؤ کی تعریف میں کہا ہے:

ہیچ نعمت نمی رسد بہ پلاؤ   ہیچ شربت نمی رسد بہ شکر

پلاؤ کی تمدنی اور لسانی اہمیت اور دلچسپی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ انسائیکلوپیڈیا

برٹینیکا کے گیارہویں اڈیشن (مطبوعہ کیمبرج) میں اس کے متعلق مختصر سا آرٹیکل ذیل Rilau موجود ہے۔

جامع اللغات (اردو، مطبوعہ لاہور) کے مولف خواجہ عبدالمجید صاحب نے پلاؤ کو اصلاً ہندی بتایا ہے، اور اس بارے میں غالباً پلاٹس کو اپنا پیرومرشد بنایا ہے، لیکن جہاں تک علم اشتقاق (Etymology) کا تعلق ہے، خواجہ صاحب موصوف لغت نویسی کے میدان کے حاطب اللیل ہیں، میں انکی ہفوات کا کہاں تک ذکر کروں، ہندی اللسان لوگوں کا من بھاتا کھاجا تو "دال بھات" ہے، ان کی زبان کو، جو بالعموم قومی تمدن اور ملکی معاشرت کی عکاسی کرتی ہے، پلاؤ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے، جو گوشت سے تیار ہوتا ہے۔

جوق۔ اردو میں جوق کا لفظ کثرت اور بہتات کے معنے میں آتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ لوگ میلے یا جلسہ میں جوق جوق آئے یعنی کثرت سے آئے، ٹھٹھ کے ٹھٹھ آئے۔

جوق در اصل ترکی لفظ چوق ہے، جو کثرت اور بہتات کے مفہوم کو ادا کرتا ہے، گویا اردو لفظ "بہت" کا مترادف اور ہم معنی ہے۔ مثلاً ترکی میں کہتے ہیں چوق گوزل یعنی "بہت خوب، بہت خوبرو"۔ "چوق یاشا" مدت تک زندہ رہے یعنی زندہ باد۔ اسی طرح "چوق چوق" کا doublet بھی مستعمل ہے جس کا معنی ہے 'بہت کثرت سے'، بہتات کے ساتھ، اور یہی وہ کلمہ ہے جو اردو میں "جوق جوق" کی صورت میں مستعمل ہے۔ اس سے ہمارے اکثر لغت نویسوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جوق کا معنی گروہ ہے لیکن چوق در اصل ترکی میں اسم نہیں بلکہ ایک قسم کا حرف ظرف (adverb) ہے، جیسا کہ مذکورۂ بالا مثالوں سے ظاہر ہے۔

چوق کا لفظ عربی زبان میں بھی جوق کی صورت میں دخیل ہو چکا ہے، اور اس سے بالعموم گروہ یا جماعت یا جھنڈ مراد لیتے ہیں، اور میرا خیال ہے کہ ہمارے اردو لغت نگاروں کے

اندراجات بھی عربوں کے اس استعمال سے متاثر ہوئے ہیں، عربوں نے چوق کو ایک سہ حرفی مادہ قرار دے کر اس سے بعض افعال بھی مشتق کر لیے ہیں، یہ لفظ عربی لغت کی قدیم کتابوں میں نہیں ملتا، بلکہ عہد حاضر کے لغت نویسوں مثلاً دزتیات اور سپیر دبک نے اپنی لغات میں اس کا اندراج کیا ہے۔

چُغلی۔ غمازی کرنا، کسی کی غیر حاضری میں اس کی برائی یا شکایت کرنا۔ چغلی ترکی لفظ چوغولی ہے، جو چوغول سے ماخوذ ہے، چوغول وہ مخبر ہے جو پولیس یا دیگر حکام کو کسی کے متعلق خبر رسانی کرتا ہے، لہذا چوغولی یا چغلی در اصل وہ خبر یا اطلاع ہے جو کوئی مخبر حکام بالا کو پہنچائے۔

چی۔ چی ترکی زبان کا ایک نہایت مفید اور کثیر الوقوع لاحقہ (suffix) ہے جو کسی چیز کے ساتھ نسبت ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے، اس حرف کے اضافہ سے جو الفاظ وضع ہوئے ہیں، اُن میں پیشہ وروں کے نام بھی شامل ہیں، مثلاً طوپچی (توپچی)، قپوچی (دربان) باورچی، کبابچی، تیمورچی (لوہار)، سودچی (شیر فروش)، چیچکچی (گلفروش)

چی کا صرف بعض ایسے الفاظ کے ساتھ بھی استعمال ہوا ہے جو ترکی نہیں بلکہ عربی یا فارسی ہیں، مثلاً خزانچی، مشعلچی، بستانچی (باغبان) حلواچی (حلوائی)، میوہ چی (میوہ فروش) اجزاخانچی (عطار، دوا فروش)، قانونچی (سلطان سلیمان اعظم کا لقب)

اجزاخانچی کا لفظ اس لحاظ سے نہایت دلچسپ اور معنی خیز ہے کہ وہ تین مختلف اسلامی زبانوں کے الفاظ سے مل کر بنا ہے، اس کے تین اجزائے ترکیبی میں سے پہلا جزء یعنی اجزاء (بمعنی ادویہ) عربی ہے، دوسرا جزء خانہ فارسی ہے، اور تیسرا جزء چی ترکی ہے اگویا یہ لفظ تین مختلف اسلامی قوموں کے باہمی تمدنی اور ثقافتی اختلاط و ارتباط کا آئینہ دار ہے اور اس اسلامی تہذیب و تمدن کی عکاسی کرتا ہے جس کے فروغ اور ارتقاء میں عربوں،

ایرانیوں اور ترکوں تینوں قوموں نے مل کر اپنی اپنی بساط اور صلاحیتوں کے مطابق حصہ لیا ہے
بچی کا لاحقہ بعض اردو اور ہندی الفاظ کے ساتھ بھی آیا ہے، مثلاً دفاچی، ڈھنڈورچی وغیرہ

خان۔ خان ترکی اور تاتاری قوموں کا ایک قدیم لفظ ہے اور ان کے ہاں ایک اعلیٰ اور ارفع لقب ہے جو کسی زمانہ میں صرف حکمرانوں، سلطانوں اور عالی مرتبہ امیروں کے لیے استعمال ہوتا تھا، مثلاً چنگیز خان، ہلاکو خان، عثمان خان، اُور خان وغیرہ۔

بعض علماء کی رائے ہے کہ خان کا لفظ قاقان یا تاآن کی مخفف صورت ہے، جو تاریوں کے حاکم اعلیٰ کا لقب تھا۔

ترکی قواعد زبان کی رو سے خان کا مؤنث خانم اور جمع خانلر ہے، ہمارے ہاں خان کی جمع خوانین رائج ہے، مگر یہ عربی قواعد کے مطابق بنائی گئی ہے۔

انگریزوں نے خان سے ایک لفظ *Khanate* بنا لیا ہے جس سے وہ ریاست یا مملکت مراد لیتے ہیں، جو کسی خان کے زیر حکومت ہو، مثلاً *The Khanate*

The Khanate of Crimea and of Khiva.

پلاٹس نے لفظ خان کو غلط طور پر فارسی بتایا ہے اور اس کے ڈانڈے پہلوی، ژند اور سنسکرت کے بعض ایسے الفاظ سے ملانے کی عبث کوشش کی ہے، جن کا خان کے ساتھ لسانی، ادبی، تاریخی یا ثقافتی لحاظ سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، صاحب ممدوح نے اس بارے میں جو زحمت اٹھائی ہے وہ نہ صرف عبث اور بیکار ہے، بلکہ علمی اعتبار سے بھی ناقابل قبول اور بعید تعجب انگیز ہے۔

دیگر القاب اور تعظیمی کلمات کی طرح خان کا لفظ بھی بیحد مبتذل ہو چکا ہے، چنانچہ افغانستان، پاکستان اور ہندوستان وغیرہ ملکوں میں لاکھوں آدمی ایسے ہیں جو خان کا لفظ بطور لقب کے یا نام کے جزو کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، حالانکہ ان کا ترکوں یا تاتاریوں کے ساتھ جن کی زبان کا یہ لفظ ہے

نسلی یا لسانی یا ثقافتی اعتبار سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا۔

خاقان تاتاریوں کے خانِ اعظم یعنی حاکمِ اعلیٰ کا لقب ہے، جو عربی مصنفین کے ہاں مروج ہے۔ خاقان قاغان کی بگڑی ہوئی صورت ہے، مگر عربی اور فارسی تواریخ میں اس لقب کی یہی صورت مستعمل ہے۔

قاغان کی ایک اور مخفف شکل قاآن بھی ہے، چنانچہ ایلخانیوں کے وزیر رشید الدین فضل اللہ نے اپنی جامع التواریخ میں تاتاریوں کے خانِ اعظم کے لیے قاآن ہی کا لقب استعمال کیا ہے۔

داروغہ۔ داروغہ تاتاری زبان کا لفظ ہے، بمعنی گورنر یا حاکمِ شہر۔

داروغہ تاتاریوں کے ہاں ایک اعلیٰ منصب ہوا کرتا تھا جس کا ذکر سب سے پہلے ایلخانی عہد میں ملتا ہے۔ بعد ازاں تیموری دور میں داروغہ نے شحنہ یعنی کوتوالِ شہر کی جگہ لے لی جس کے فرائض ایک اعلیٰ پولیس افسر کی مانند ہوتے تھے، مثلاً وہ دنگہ فساد، شراب خوری اور بدمستی اور قماربازی وغیرہ جرائم کی روک تھام کرتا تھا، اور مجرموں کو سزا دیتا تھا۔

ابوالفضل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے عہد میں داروغہ شاہی اصطبل کا انتظام کرتا تھا۔

دیگر مشرقی القاب و مناصب کی طرح لفظ داروغہ بھی اب تبذل ہو چکا ہے، چنانچہ پنجاب کے بعض شہروں میں داروغہ سینٹری انسپکٹر کو کہتے ہیں، جو خاکروبوں کے کام کی نگرانی کرتا ہے۔ فاعتبروا یا اُولِی الابصار۔

قرا یا قرہ ترکی ہے بمعنی سیاہ۔

آق (سفید) کی طرح قرا کا لفظ بھی کئی مرکبات میں آیا ہے، مثلاً

قراخاں یعنی کالے خاں۔

قرہ طاغ یا قرہ داغ یعنی جبل اسود، مونٹی نیگرو (Montenegro)۔

قرہ دوکز یعنی بھیڑیا اسود۔

قرہ قلپاق۔ ایک قبیلہ ہے

قَرہ قُویُونلی ۔ ترکی قبائل جن کا نشان سیاہ بھیڑ تھا۔

قراقُل ، ایک قسم کی بھیڑ جس کی کھال سے ٹوپی یا کلاہ بناتے ہیں جو قراقُلی کہلاتی ہے۔

قِزِلباش ۔ ایران کے صفوی خاندان کے ایک مورث اور شاہ اسمٰعیل کے والد شیخ حیدر متوفی ۸۹۳ھ کے ترکمانی مریدوں کا لقب ہے۔

قِزِلباش ایک ترکی کلمہ ہے، جو دو لفظوں سے مل کر بنا ہے، قِزِل بمعنی سرخ اور باش بمعنی سر، اسی لیے فارسی میں ان کو "سرخ سر" یعنی سرخپوش کہتے ہیں۔

قِزِلباش کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ شیخ حیدر مذکور نے اپنے مریدوں کو حکم دیا تھا کہ وہ طاقیہ ترکمانی کو چھوڑ کر اپنی علامتِ خاص کے طور پر سرخ رنگ کی کلاہ اختیار کریں، ان ترکمانی مریدوں کی زبان ترکی تھی، اس لیے وہ قزلباش (یعنی سرخ سر) کے نام سے مشہور ہوئے اور یہ نام اُن کا امتیازی لقب بن گیا۔

ہندستان اور پاکستان میں بعض لوگ اب تک قزلباش کہلاتے ہیں اور شیعی مذہب رکھتے ہیں،

قلماقنی۔ قلموق قوم یا قبیلہ کی عورت۔

قلماقنی قلموق کا اسم مؤنث ہے، جو ہندی قواعد زبان کے مطابق بنایا گیا ہے،

قَلمُوق تاتاری نسل کے لوگ ہیں، جو پہلے کوہستانِ التائی کے قرب وجوار میں رہتے تھے، اور اب بھی منولستان (منگولیا) کے علاوہ دریائے والگا کے علاقہ میں پائے جاتے ہیں، اس قوم کی عورتیں شاہانِ مغلیہ کے محلات میں پہرہ داروں کی حیثیت سے حفاظت وحراست پا مور ہوا کرتی تھیں،

کشکول ـ کشکول ترکی کلمہ کچکول کا معرب ہے، اور کچکول وہ کشتی نما کاسہ ہے جس میں درویش یا گداگر یا گڈا ہیے رنگارنگ کے متفرق کھانے جمع کر لیتے ہیں، اسی مناسبت سے عربی میں کشکول کا لفظ ایسے متعدد مجموعوں کے لیے استعمال ہوا ہے، جس میں ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے انواع واقسام کے مضامین جمع کر دیے گئے ہیں، مثلاً محمد بن حسین بہاء الدین عاملی (متوفی ۱۰۳۱ھ) کا "الکشکول" جو مصر میں کئی مرتبہ طبع ہو چکا ہے، اسی سلسلہ میں کشکول انجشتی، کشکول جمال اور "الکشکول فی التصوف" بھی قابلِ ذکر ہیں۔

قزاق ـ قزاق بمعنی ڈاکو، راہزن، لٹیرا۔
اور قزاقی بمعنی لوٹ مار، غارتگری۔

اردو زبان میں قزاق کا لفظ مذکورۂ بالا جس مفہوم ومعنی میں مستعمل ہے، وہ محض استعارہ ہے اور یہ وہ مفہوم ہے جو اس لفظ کو سب سے پہلے ترکی قبیلوں اور قوموں نے دیا تھا، اور پھر انکے اثر سے وہی مفہوم نہ صرف اردو بلکہ متعدد مغربی زبانوں میں بھی رائج ہو گیا ہے، یہ مفہوم کیسے پیدا ہوا، اس کی مختصر تشریح ذیل کی سطور میں ملاحظہ فرمائیے۔

قزاق ایک معروف تاتاری قبیلہ ہے، جو بلادِ روس میں کئی صدیوں سے آباد چلا آرہا ہے، اس قبیلہ کے لوگ اپنی جوانمردی اور عسکری صفات کے لیے مشہور تھے، چنانچہ زارِ روس نے ان کو فوجی خدمت کے معاوضہ میں وسیع اراضی بطور جاگیر عطا کی تھیں، اور دوسری مراعات بھی دی تھیں، اور ان کے قبیلوں اور فوجی دستوں کو اپنی سلطنت کی سرحدوں پر متعین کیا تھا، قزاق اپنے ہمسایہ ترکی قبیلوں کے ساتھ اکثر برسرپیکار رہتے تھے، اور اس سے پیشتر بھی اپنے قرب وجوار کی اقوام پر غارتگری کرنے کے عادی تھے، اس لیے ترکی قبیلوں کے لوگ ان کو لٹیرے اور ڈاکو سمجھتے تھے، یہاں تک کہ قزاق کا لفظ ان کے ہاں غارتگر اور راہزن کا مترادف

بن گیا اور یہی وہ مفہوم و معنی ہے، جو ترکوں کے اثر سے ہندوستان میں بھی عام ہو گیا ہے، ترک لوگ اس کا تلفظ تشدید کے ساتھ قزّاق کہتے ہیں، اور یہی تلفظ ہندوستان میں رائج ہے۔ لیکن یہ لفظ در اصل مشدد نہیں ہے۔

روسی زبان میں قزاق کو Kazak یا Kozak لکھتے ہیں اور انگریزی میں Cossack

قزاق از روئے مذہب مسلمان ہیں، اور بیسویں صدی کے اوائل میں ان کی تعداد تقریباً چالیس لاکھ تھی، جب زار روس کی حکومت کے بعد بالشویک برسر اقتدار آئے تو قزاق کئی سال تک ان کے ساتھ برسرپیکار رہے، آج سے تقریباً پچیس سال پہلے کی بات ہے، انگریزی عہد میں قزاق قوم کے چند سو خاندان سیاسی اختلاف کی بنا پر بلاد روس سے ہجرت کر کے ہندوستان میں چلے آئے تھے، ان کے چند خاندان کچھ عرصہ تک لاہور میں بھی مقیم رہے، اور مجھے ان کے ساتھ ملنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ شکل و صورت میں یارقندیوں کے ساتھ بہت مشابہت رکھتے تھے، اور غریب الدیار ہونے کے باوجود ان کی رفتار و گفتار میں قابل تعریف وقار پایا جاتا تھا، جب برطانوی حکام کو ان کو ہندوستان میں آباد کرنے کی کوئی تسلی بخش صورت نظر نہ آئی تو انھوں نے ترکی حکومت کی رضامندی سے ان کو ترکی میں منتقل کر دیا۔

قزاق قوم کے یہ مہاجر خاندان جب تک لاہور میں مقیم رہے، اہل شہر کو ان سے کسی قسم کی شکایت کا موقع پیدا نہیں ہوا، اور ان کی خودداری اور خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا اور کسی سے کسی طرح کی امداد طلب نہیں کی، بلکہ یہ لوگ اون اور کھال کی ٹوپیاں بنا کر بازار میں فروخت کرتے تھے، اور اپنی دستکاری اور ذاتی محنت مزدوری سے گذر اوقات کرتے تھے، میں نے یہ بھی دیکھا کہ چند قزاق نوجوانوں نے عربی مدارس میں داخلہ لے رکھا تھا، تلک امۃ قد خلت لہا ما کسبت ولکم ما کسبتم۔

یکی چری۔ یکی چری جس کا تلفظ ینی چری ہے، ترکی زبان کا ایک مرکب کلمہ ہے۔ یہ کلمہ جس کا معنیٰ "جدید فوج" ہے، دو لفظوں سے مل کر بنا ہے، یکی اور چری۔ یکی کی قدیم صورت یَنگی تھی، لیکن عثمانی ترک اسے یکی لکھتے ہیں اور اس کا تلفظ ینی کرتے ہیں اور اس کا معنی جدید ہے، اور چری کا معنی فوج ہے، لہذا "یکی چری" کا معنی ہوا "جدید فوج"۔

عثمانی خاندان کے دوسرے حکمران سلطان اورخان (۱۳۲۶ء تا ۱۳۵۹ء) نے ایک نئی فوج مرتب کی تھی، اور اسے یکی چری کا نام دیا تھا۔ یہ فوج مدت دراز تک فتح وظفر کے پرچم اڑاتی رہی لیکن رفتہ رفتہ اس میں بدنظمی اور خودسری پیدا ہو گئی، اور وہ دولت عثمانیہ کے لیے ایک مصیبت بن گئی، آخرکار سلطان محمود خاں ثانی نے ۱۸۲۶ء میں اس کا خاتمہ کر دیا۔

یکی چری کو فرانسیسی مصنفین نے Janissaire اور انگریزی مؤلفین نے Janissary لکھا ہے، اور انگریزی کتابوں کے اردو مترجموں نے جو غالباً اس لفظ کی اصل حقیقت سے واقف نہ تھے، Janissary کا ترجمہ "جاں نثار" یا "جاں نثاری" فوج کیا ہے، Janissary سے جاں نثاری کی طرف جس طرح ان کا ذہن رسا منتقل ہوا ہے اس کی بہرحال داد دینی چاہیے۔

عربی مصنفین نے یکی چری کو کبھی انکشاری کبھی ینکشری اور کبھی ینکشریہ لکھا ہے۔

استدراک

بر مقالہ ڈاکٹر اکمل ایوبی صاحب

اب میں ڈاکٹر اکمل صاحب ایوبی کے دلچسپ اور قابل قدر مضمون کی طرف توجہ کرتا ہوں، اس میں چند باتیں محل نظر ہیں، اور چونکہ ان کا تعلق چند اصولی امور سے ہے، اس لیے ان کا بیان ناگزیر

ضروری سمجھا گیا ہے ورنہ ان کے عالمانہ مقالہ کی تنقید یا ان کے ساتھ مباحثہ کرنا مقصود نہیں کیونکہ جہاں تک اردو میں ترکی زبان کے الفاظ اور اس کے اثرات کی اہمیت کا تعلق ہے، مجھے ان کے ساتھ بہت حد تک اتفاق ہے۔

بعض الفاظ کو ڈاکٹر صاحب نے ترکی بتایا ہے، لیکن میری ناقص رائے میں وہ ترکی نہیں ہیں، مثلاً

سپاہی کا لفظ ترکی نہیں بلکہ قطعاً فارسی ہے۔ اس کی قدیم اصلی صورت اسپاہی تھی جو مشتق ہے اسپ (گھوڑا) سے۔ لہذا سپاہی در اصل وہ فوجی یا لشکری ہے جو اسپ سوار یعنی گھوڑ سوار ہو۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، اسپ ایک خالص فارسی لفظ ہے جس کا سنسکرت میں مترادف اشو ہے۔

اس ضمن میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا شاید خارج از بحث نہ ہوگا کہ ایران کے شاہان قدیم نے اپنی مملکت کے مرکز میں ایک بڑی بھاری چھاؤنی قائم کی تھی، جو اسپاہان یا سپاہان کے نام سے مشہور ہوئی، اسی اسپاہان کو بعد ازاں اسلامی دور میں عربوں نے اصفہان بنا لیا۔

اسی طرح شلوار کا لفظ بھی ترکی نہیں، بلکہ فارسی ہے۔ اور بعض علماء کا قول ہے کہ عربی کا لفظ سربال (جس کی جمع "سرابیل" پارچہ جات یعنی لباس کے معنی میں قرآن مجید سورۃ النحل میں استعمال ہوئی ہے) اسی شلوار سے مشتق ہے۔

سربال کی ایک دوسری صورت سروال ہے، جو آجکل نجد میں مروج ہے۔ مزید بحث کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر فرینکل کی کتاب جس کا نام حاشیہ میں مندرج ہے۔[1]

ڈاکٹر صاحب نے پانچہ کو بھی ترکی الفاظ کی فہرست میں شامل کر دیا ہے، حالانکہ لفظ

---

[1] Die Aramaischen Fremdworter im Arabischen

[illegible] Leiden

فارسی ہے، اور پائے (پاؤں) اور چہ کے لاحقہ سے مل کر بنا ہے۔ پائے قطعاً فارسی ہے، اور اردو کا لفظ پاؤں اسی کی صورت ہے، یہی لفظ دیگر آریائی زبانوں میں بھی تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ مختلف صورتوں میں موجود ہے، مثلاً سنسکرت میں پاد یا پات ہے، یونانی میں پوس، لاطینی میں پیڈ (ped) جس سے pedal کا لفظ ماخوذ ہے) اور پنجابی میں پیر کی صورت میں پایا جاتا ہے، باقی رہا چہ، سو یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ چہ فارسی میں الفاظ کو مصغر بنانے کے لیے آتا ہے۔ اس لاحقہ تصغیر کی مثالیں دیگر آریائی زبانوں میں بھی موجود ہیں، اس موقع پر میں صرف جرمن زبان کی نظیروں پر اکتفا کرتا ہوں جس میں اسم مصغر بنانے کے لیے چہ کی بجائے Chen کا حرف استعمال ہوتا ہے، مثلاً لفظ Madchen میں Chen تصغیر کی علامت ہے، اسی طرح آپ Greta سے Gretchen اور Dora سے Dorchen بنا سکتے ہیں۔ اس تفصیل سے مقصد یہ ہے کہ پاچہ کا لفظ جن اجزاء سے مرکب ہے، وہ دونوں خالصتہً فارسی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے نقارہ کو بھی ترکی بتایا ہے، حالانکہ نقارہ ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہے کہ میرا مولد میرا منشا، عرب کا خشک خطہ ہے۔ نقارہ عربی مادہ نقر سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے کسی چیز پر ضرب یا چوٹ لگانا یا کسی پرندے کا چونچ سے ٹھونگیں مارنا، اسی لیے ہُدہُد یعنی کھٹ بڑھئی کو نقار الخشب کہتے ہیں، اور پرندے کی چونچ کو منقار۔ اسی مادہ سے عربی کے چند اور الفاظ بھی بنے ہیں جو نقارہ کے ہم جنس ہیں، مثلاً ناقور یعنی بگل بجانے والا، نقارہ اپنے وزن فعّالہ کے لحاظ سے بھی ایک ٹھیٹھ عربی لفظ ہے۔

تندور کو ڈاکٹر صاحب نے ترکی بتایا ہے، اس میں کچھ شک نہیں کہ ترکستان میں یہ لفظ اسی صورت میں مروج ہے لیکن میرے خیال میں یہ عربی اور آرامی لفظ تنور کی بگڑی ہوئی صورت ہے

تنور کا لفظ قرآن مجید میں طوفانِ نوح کے ضمن میں دو مرتبہ ذکر ہوا ہے۔ پنجاب میں اور غالباً اور مقامات میں بھی عوام تندور ہی بولتے ہیں، اور یہ لفظ غالباً ترکی اثر کا نتیجہ ہے،

ڈاکٹر صاحب نے کمرہ کو بھی ترکی الفاظ کی فہرست میں داخل کر دیا ہے، حالانکہ یہ لفظ جہاں تک مجھے معلوم ہے، پرتگالی ہے، پرتگالی زبان میں اسے Camara لکھتے ہیں جو لاطینی کلمہ Camera ہی کی ایک صورت ہے، ترکی زبان میں کمرہ کے لیے اوطہ یا اودہ کا لفظ ہے جس کو شام کے عربوں نے اوضہ بنا لیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ترکی الفاظ کے سلسلہ میں کلابتو کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن اس لفظ کی مکمل شکل کلابتون ہے، جو آلتون (سونا) سے مل کر بنا ہے، اس کے نون کو حذف کرنے کی مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی،

اس موقع پر اگر لفظ کلابتون کی مختصر لغوی تشریح کر دی جائے، تو شاید بے محل نہ ہوگی، یہ دو لفظوں سے مرکب ہے، کلابہ یا کلادہ بمعنی سوت کا لچھا یا محض لچھا اور آلتون بمعنی سونا، لہذا کلابتون کے لفظی معنے ہوئے "سنہرا لچھا"۔

ڈاکٹر صاحب لفظ باورچی کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ "باورچی باور اور چی سے مرکب ہے باور کے معنے یقین کرنا، اعتبار کرنا ہیں اور چی کلمۂ نسبت ہے۔" ڈاکٹر صاحب کو یہ بات تسلیم ہے کہ باورچی ترکی لفظ ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اس کی تشریح ایک فارسی لفظ باور کے ذریعے سے کرتے ہیں، جو غیر منطقی اور نا قابل قبول بات ہے، لیکن در اصل یہ ڈاکٹر صاحب کا قصور نہیں، ان کا قصور یہ ہے کہ انھوں نے اس معاملہ میں بغیر پوری تحقیق کے پلاٹس پر اعتماد کیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ الفاظ کے اشتقاق و ماخذ کی تحقیق میں پلاٹس صاحب ہرگز ایسے قابل اعتماد سند نہیں ہیں کہ ان کے ہر قول کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا جائے، میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ انھوں نے

بہت سے کلمات کی لغوی تشریح میں سخت ٹھوکریں کھائی ہیں، جن کی نشاندہی میں اپنی بعض تحریروں میں کر چکا ہوں اور جس کے تکرار کا یہ موقع نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ "اردو زبان میں بغیر علامت اضافت دو اسموں کو ملا کر مرکب لفظ بنانے کی متعدد مثالیں موجود ہیں، جیسے بوٹ پالش، جیب گھڑی، سبزی منڈی، ڈاک خانہ، گھنٹہ گھر وغیرہ چونکہ یہ قاعدہ فارسی اور عربی کے بجائے ترکی زبان میں موجود ہے، اس لیے میرے خیال سے یہ ترکی زبان کا اثر ہے، جو اردو نے قبول کیا ہے"۔ ڈاکٹر صاحب نے جس خیال کا اظہار فرمایا ہے، وہ بوجوہ ذیل صحیح نہیں ہے۔

مرکب الفاظ بنانے کے جس دستور کا ذکر ڈاکٹر صاحب نے مندرجۂ بالا جملہ میں کیا ہے، اس کے متعلق علمائے لغت مختلف زبانوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مرکب الفاظ بنانے کے بارے میں سامی اور آریائی زبانوں کا طریق کار الگ الگ ہے، سامی زبانوں میں جنھیں عربی بھی شامل ہے، مرکب اضافی اور توصیفی کو چھوڑ کر دو لفظوں کو ملا کر نئے مرکب الفاظ بنانے کا دستور نہیں ہے، اگر زمانہ کے نئے تقاضوں سے نئے الفاظ وضع کرنے کی ضرورت پیش آئے تو یہ ضرورت اشتقاق کے عمل سے پوری کی جاتی ہے یعنی کسی مادہ یا اصل (Root) سے اشتقاق کے ذریعہ سے نئے الفاظ وضع کر لیے جاتے ہیں، مثلاً جب "اوری انٹلسٹ (Orientalist) کے لیے ایک مناسب عربی لفظ کی تلاش ہوئی تو مادہ "شرق" سے "مستشرق" کا نیا لفظ بنا لیا گیا ہے، جو عربی میں پہلے موجود نہ تھا، اور یہ نیا لفظ اشتقاق کے ذریعہ سے حاصل ہوا۔

لیکن سامی زبانوں کے برعکس آریائی یعنی انڈو یورپی زبانوں میں، جن میں فارسی، اردو، ہندی، فرانسیسی، جرمن اور یونانی وغیرہ زبانیں شامل ہیں، اشتقاق سے کام نہیں چلتا، کیونکہ اس کا دائرہ عمل ان زبانوں میں بہت محدود ہے، لہٰذا ان زبانوں میں دو لفظوں کو باہم ترکیب دیکر نئے مرکبات وضع کرنے کا دستور

عام ہے، مثلاً فارسی والوں کو جب اوری انشلٹ کے لیے موزوں لفظ کی جستجو ہوئی، تو انھوں نے دو لفظ "فاور" اور "شناس" کیکرانی حسبِ خواہ ایک نیا لفظ "فاور شناس" بنا لیا، اس لفظ کے علاوہ فارسی میں آتشکدہ، بتکدہ، میخانہ، لالہ رخسار، لالہ زار، گلبدن، پری پیکر، اور (شیخ سعدیؒ کی) آخر اور پریرو اور (خواجہ حافظؒ کا ساقی) سیم ساق وغیرہ مرکب الفاظ بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔

فارسی کے علاوہ دیگر آریائی زبانوں کے مرکب الفاظ کی مندرجۂ ذیل مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

اردو میں میوہ منڈی، عجائب گھر، چڑیا گھر، چڑیمار، چھاپہ خانہ، اٹھائی گیرا، گرہ کٹ، جیب کترا، کفن چور وغیرہ۔

ہندی میں اُڑن کھٹولا، پن گھٹ، بن باس، بن مانس، سُرگباسی، سوچ مکھی، دھرم سالہ، دھرم پتنی، گاؤ رکشا، مورتی پوجا وغیرہ۔

انگریزی میں Headache، afternoon، Sunflower، Timepiece، merry-making اور Weathercock وغیرہ

فرانسیسی میں (ہزار پا)، Lance-pierre (منجنیق) mille-pieds، Tête-à-Tête (سرگوشی) Papier-monnaie -

جرمن زبان میں Kindergarten، Tiergarten (چڑیا گھر)، Baumwolle (کپاس)، Blitzkrieg وغیرہ۔

یونانی میں Philosophia (فلسفہ)، Philologia (علم اللغہ) melaghkholia (مالیخولیا) اور Hydropholia وغیرہ۔

اوری انشلٹ کی مذکورہ بالا مثال سے آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جب عربوں کو اس لفظ کے ترجمہ کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے صرف ایک مفرد لفظ سے اپنی ضرورت کو پورا کر لیا۔ اسکے برخلاف فارسی والوں کو "فاور شناس" وضع کرنے میں دو لفظوں سے کام لینا پڑا۔ عربی زبان اور اسکے اسلوب بیان کے

ایجاز و اختصار کا راز اسی نکتے میں مضمر ہے۔ خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا، میں درحقیقت یہ واضح کرنا چاہتا ہوں اور ناظرین کرام کو اس نکتہ پر لانا چاہتا ہوں کہ اگر اردو میں مرکب الفاظ بنانے کا دستور موجود ہے تو یہ آریائی زبانوں کا ایک مسلمہ قاعدہ اور خاصہ ہے، اس میں کسی ترکی اثر کو کوئی دخل نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے غوری خاندان کو بھی ترکی حکومتوں میں شامل کر لیا ہے، مگر یہ بات درست نہیں، غوری ترک نہ تھے، افغان تھے، اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ترک اور افغان ایک ملک (افغانستان) میں جمع نہیں ہو سکتے، اسی بنا پر غزنوی اور غوری خاندانوں میں باہم تصادم ہوا اور اس تصادم نے ایسی ہولناک صورت اختیار کی کہ علاء الدین غوری کو جب غلبہ حاصل ہوا تو اس نے جوش انتقام میں غزنہ کے شہر کو (جسے غزنوی حکمرانوں کی علم دوستی اور انکے جاہ و جلال نے اپنے زمانہ کا عروس البلاد بنا دیا تھا) جلا کر خاک سیاہ کر دیا اور تاریخ میں 'جہاں سوز' کا لقب پایا،

ڈاکٹر ایوبی صاحب لکھتے ہیں کہ "ترکی اور اردو زبانوں کے جملوں میں لفظوں کی ترتیب عموماً ایک جیسی ہوتی ہے اور ایک زبان کا ترجمہ اگر دوسری زبان میں لفظ بلفظ کر دیا جائے تو وہ خود بخود بامحاورہ ترجمہ ہو جاتا ہے"۔ لیکن یہ بات تو فارسی جملے پر بھی صادق آتی ہے، مثلاً ہم فارسی میں کہتے ہیں کہ "حسن نان خورد"۔ اس جملہ میں پہلے فاعل آیا ہے، پھر مفعول اور سب سے آخر میں فعل ہے۔ اجزاء جملہ کی یہی ترتیب اس جملہ کے اردو ترجمہ میں بھی پائی جاتی ہے: "حسن نے روٹی کھائی"، اس صورت میں ترکی اثرات کو ترجیح دینے کی مجھے کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

مجھے اس نظریہ سے بھی علی وجہ البصیرت شدید اختلاف ہے کہ اردو پر (جسمیں زبان اور ادب دونوں کو شامل کرنا چاہیے) عربی اور فارسی کے مقابلہ میں ترکی اثرات زیادہ ہیں، چونکہ ڈاکٹر صاحب نے اسکی تائید میں کوئی برہان قاطع اور دلیل ساطع پیش نہیں فرمائی، اسلیے میں بھی فی الحال اس بحث کو اس موقع پر چھیڑنا نہیں چاہتا، کیونکہ یہ بحث ایک الگ مستقل مقالہ کا مقتضی ہے اور یہ استدراکی نوٹ پہلے ہی سے میری منشا کے برخلاف خاصا طویل ہو گیا ہے،

بہرحال ہم سب لوگوں کو ڈاکٹر صاحب ممدوح کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے ایک اہم اور دلچسپ لسانی اور علمی موضوع کی طرف توجہ دلائی ہے اور میں ذاتی طور پر بھی انکا تہ دل سے رہین منت ہوں کہ ان کا مضمون دیکھ کر مجھے اپنے ایک فراموش شدہ لکچر کو اشاعت کے لیے قلمبند کرنے کی تحریک ہوئی، جزاہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔

پاکستان میں دو مہینے

از سید صباح الدین عبد الرحمن

(۲)

کراچی کے قیام میں صرف دار المصنفین کے خیر خواہوں، علمی حلقے کے لوگوں، اعظم گڈھ والوں اور اپنے عزیزوں سے ملتا رہا، جناب ظہور الحسن صاحب سے ملنے میں عجلت کی، وہ دار المصنفین کی مجلسِ انتظامیہ کے رکن رہ چکے ہیں، ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس ہیں، لکھنؤ میں یو۔ پی حکومت کے محکمۂ مالیات کے سکریٹری تھے، پنشن پانے کے بعد اپنے صاحبزادے ابن الحسن صاحب کے پاس چلے گئے ہیں، جو اس وقت کراچی میں نیشنل بنک میں چیف پبلک ریلیشنز آفیسر ہیں، ان سے مفید مشورے کی امید تھی، اس لیے ان کے گھر پر ملا، جو پاکستان امپلائیز کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی میں ہے، وہ اسی اخلاق سے ملے جس کی ان سے توقع تھی، لکھنؤ میں اپنے مذہبی شغف کے لیے مشہور رہے، کراچی میں بھی سارا وقت عبادت و ریاضت میں گذارتے ہیں، ان کے صاحبزادے پر بھی مذہبی اثرات ہیں، ان کو بھی صوم و صلوٰۃ کا پابند اور تلاوت کلام پاک کرتے دیکھا، دونوں سے دار المصنفین کے مسائل پر گفتگو ہوئی اور یہ رائے قرار پائی کہ یہاں دار المصنفین کے جو خیر خواہ ہیں، ان کو یکجا کر کے مفید باتیں کیجائیں۔

جناب سید حسام الدین راشدی صاحب سے ملنے کے لیے مشتاق تھا کیونکہ انھوں نے پہلے ہی سے دار المصنفین کے لیے خوشگوار فضا پیدا کر رکھی تھی، ان سے وقت طے ہوا تو ۹ بجے رات کو ان سے جمشید روڈ پر ان کے دولت کدہ بیت الضیاء میں ملا، وہ اپنے کتب خانہ میں بیٹھے تھے، جہاں بیٹھکر محسوس ہوا کہ وہ مرف

کتابوں کی فضا چاہتے ہیں، کتب خانہ ان کے لیے ہے اور وہ کتب خانہ کے لیے ہیں، انگریزی لباس میں رہتے مگر ملنے ملانے، اٹھنے بیٹھنے، ساتھ چلتے وقت آگے پیچھے رہنے اور باتیں کرنے میں دہلی اور لکھنؤ کی پرانی تہذیب کی یاد تازہ کرتے ہیں، سندھ کے غالباً بڑے رئیسوں میں شمار کیے جاتے ہیں، لیکن اپنی ملاقاتوں اور خصوصاً علمی لوگوں سے ملنے ملانے میں بڑی خاکساری اور وضعداری کو راہ دیتے ہیں، ان سے ۱۹۵۹ء میں کراچی ہی میں ملا تھا تقریباً پندرہ برس کے بعد پھر ملاقات ہوئی، تو ہم دونوں دیر تک گلے سے لگے رہے، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کس طرح میری خاطر کریں، مسلسل سفر کی وجہ سے مجھ کو نزلہ اور زکام ہو گیا تھا، کھانسی برابر آ رہی تھی، گھر سے دوا منگوائی اور استعمال کرنے کو کہا، باتیں شروع ہوئیں تو سلسلہ ختم کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا، رات کے دس بج گئے پھر بھی جی چاہا کہ بیٹھا باتیں کرتا رہوں،

میں ان کے علمی کارناموں کا بڑا قدردان ہوں، وہ جب کوئی علمی کام کرتے ہیں تو محنت و کاوش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے، ۱۹۵۷ء میں ان کا ایڈٹ کیا ہوا تذکرہ مقالات الشعراء مؤلفہ میر علی شیر قانع تتوی (المتوفی ۱۲۰۳ھ) نظر سے گذرا تھا، اس میں ۷۱۹ فارسی شعراء کا ذکر ہے، اس کے مؤلف کو تاریخ سندھ پر ایک بہت ہی کارآمد کتاب تحفۃ الکرام کے مصنف کی حیثیت سے تو جانتا تھا، لیکن جناب راشدی صاحب نے مقالات الشعراء کے شروع میں اس کے جو حالات لکھے ہیں، ان کو پڑھ کر حیرت ہوئی کہ وہ نہ صرف ایک پُرگو شاعر تھا بلکہ اس نے ۴۳ کتابیں لکھیں، راشدی صاحب نے ان تمام کتابوں کے نام بڑی محنت سے ڈھونڈ نکالے ہیں، ان ہی کی وجہ سے اس قابل قدر مصنف کی علمی اور ادبی سرگرمیاں منظر عام پر آئیں، ورنہ بالکل بھلا دی گئی ہوتیں، راشدی صاحب نے اس کتاب کا مقدمہ سلیس اور رواں فارسی ہی میں لکھا ہے، جو اس زبان پر ان کی قدرت کی دلیل ہے، ان کے جس علمی و ادبی شاہکار سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں وہ ان کی ایڈٹ کی ہوئی شعرائے کشمیر ہے جو چار جلدوں میں ہے، ان کو پہلے اصلح تخلص یہ میرزا ابو الحاجی محمد اسلم خاں سالم کشمیری کا ایک تذکرہ ملا جس میں ۵۰۳ فارسی شعراء کا ذکر ہے، اور ان کے اشعار کے نمونے ہیں، یہ تذکرہ نگار محمد شاہ کے عہد کا ہے، اس میں اس نے زیادہ تر عالمگیری عہد سے لے کر محمد شاہی دور تک کے شعراء کا ذکر کیا ہے جن کی اکثر و بیشتر تعداد کو کشمیر سے کسی نہ کسی حیثیت سے تعلق رہی تھی، خود مصنف نے اس

تذکرہ کا کوئی نام نہیں رکھا تھا لیکن راشدی صاحب نے ایڈٹ کرتے وقت اس کا نام تذکرۂ شعرائے کشمیر رکھا، جس کے بعد انھوں نے یہ ذمہ داری محسوس کی کہ کشمیر میں فارسی کے جتنے شعراء گذرے ہیں اُن کے حالات اور آثار بھی جمع کیے جائیں، اس سلسلہ میں انھوں نے اپنی غیر معمولی محنت اور کاوش سے اتنا مواد جمع کر لیا کہ ان کو مزید تین ضخیم جلدوں میں شائع کیا ہے۔ ان میں جن جن شعراء کا ذکر آیا ہے، اُن سے متعلق جتنے تذکرے ان کو جو کچھ ملا، ان کے تمام اقتباسات جمع کر دیے ہیں جس کے بعد قارئین یا محققین کو ان شاعروں سے متعلق کوئی اور کتاب دیکھنے کی زحمت نہ اٹھانی ہوگی، ان شعراء نے اپنی نظموں میں جن باغات، تاریخی مقامات اور واقعات کے حوالے دیے ہیں، ان پر بھی حواشی اور ضروری معلومات فراہم کیے ہیں، اتنی جانکاہ کاوش اور صبر آزما محنت سے کم کسی کتاب کی ترتیب اور تدوین ہوئی ہوگی، یہ چاروں جلدیں ان مصنفوں اور مولفوں کے لیے سبق آموز ہیں جو عجلت میں اپنی کتابیں شائع کر کے سستی شہرت حاصل کرتے ہیں، حضرت راشدی صاحب بلکہ اس برصغیر کا علمی حلقہ اس کارنامہ پر جتنا فخر کرے کم ہے۔

راشدی صاحب کی مزید علمی سرگرمیوں کی تفصیل ان سے مختلف ملاقاتوں میں ہوئی، وہ اب تک فارسی کی حسب ذیل کتابوں کو ایڈٹ کر کے شائع کر چکے ہیں: (۱) مثنوی چانیسر نامہ از ادراکی بیگلار (۱۹۵۶ء) (۲) مقالات الشعراء از قانع ٹھٹھوی (۱۹۵۷ء) (۳) مثنوی مظہر الآثار (۱۹۵۷ء) (۴) تکملۂ مقالات الشعراء از خلیل ٹھٹھوی (۱۹۵۸ء) (۵) قصائد و مثنویات از قانع ٹھٹھوی (۱۹۶۱ء) (۶) مثنویات ہشت بہشت از عطا ٹھٹھوی (۱۹۶۳ء) (۷) تاریخ مظہر شاہجہانی از یوسف میرک (۱۹۶۲ء) (۸) منشور الوصیت از میاں نور محمد (۱۹۶۳ء) (۹) تاریخ ترخان نامہ از میر محمد ٹھٹھوی (۱۹۶۵ء) (۱۰) تذکرہ حدیقۃ الاولیاء از عبد القادر ٹھٹھوی (۱۹۶۷ء) (۱۱) تذکرہ شعرائے کشمیر از میرزا محمد اصلح (۱۹۶۷ء) (۱۲) تذکرہ شعرائے کشمیر بخش اول (۱۹۶۷ء) (۱۳) تذکرہ شعرائے کشمیر بخش دوم (۱۹۶۸ء) (۱۴) تذکرہ شعرائے کشمیر بخش سوم (۱۹۶۹ء) (۱۵) تذکرہ روضۃ السلاطین از فخری ہروی (۱۹۶۸ء) (۱۶) تذکرہ جواہر العجائب از فخری ہروی (۱۹۶۸ء)

(۱۷) دیوان فخری ہروی ۱۹۶۱ء، تذکرہ شعرائے کشمیر جلد چہارم ۱۹۶۸ء

مذکورۂ بالا کتابوں کو ایڈٹ کرنے میں راشدی صاحب نے جو مشقت کی ہے وہ علمی و ادبی تاریخ میں ایک بہت بڑی خدمت شمار کیے جانے کے لائق ہے، وہ اپنی غیر معمولی محنت و ریاضت سے ایڈٹ کی ہوئی کتاب میں بڑا وزن پیدا کر دیتے ہیں، مثلاً اوپر کی فہرست میں فخری ہروی کے دو تذکرے روضۃ السلاطین اور جواہر العجائب بہت مختصر ہیں، پہلا ۱۰۸ صفحے اور دوسرا کل ۳۸ صفحے پر مشتمل ہے، پہلے میں ان بادشاہوں، شہزادوں اور امیروں کا ذکر ہے جنھوں نے فارسی یا ترکی زبان میں اشعار کہے، دوسرے میں کچھ شاعرہ خواتین کا ذکر ہے، راشدی صاحب نے ان دونوں تذکروں پر ۱۰۰ صفحے کا مقدمہ اور ۱۲۰ صفحے کے تعلیقات لکھ کر ان کو علمی دنیا میں ایک اہم جگہ دیدی ہے جس تحقیق و کاوش سے فخری کے حالات اور اس کی تصانیف کے نام جمع کیے گئے ہیں، ان سے فخری کے بجائے خود راشدی صاحب قارئین کے دل و دماغ پر چھائے نظر آتے ہیں، روضۃ السلاطین ۹۵۳ھ کے بعد لکھی گئی اور جواہر العجائب ۹۶۳ھ میں قلمبند ہوئی، یہ دونوں تذکرے سندھ کے قدیم دار السلطنت ٹھٹھہ میں تصنیف ہوئے، راشدی صاحب نے اپنے مقدمہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ فارسی زبان میں سب سے پہلا تذکرہ تذکرۂ شعراء ہے جو ملتان میں ۶۱۸ھ سے پہلے لکھا گیا تھا، اس کے بعد عوفی کی لباب الالباب ہے جو سندھ ہی میں ۶۲۵ھ میں مرتب ہوئی، اس لحاظ سے راشدی صاحب کو بجا طور پر فخر ہے کہ فارسی زبان میں تذکرہ نویسی کی بنیاد سندھ میں پڑی، پھر شیر علی نوائی کی مجالس النفائس (۸۹۲ھ)، فخری ہروی کی روضۃ السلاطین اور جواہر العجائب سندھ ہی میں لکھی گئیں جس سے ظاہر ہے کہ فارسی زبان و ادب کی تاریخ میں سندھ کی یہ خدمت کوئی معمولی خدمت نہیں، اس خدمت کے ذکر کرنے میں راشدی صاحب کا قلم بڑا شادماں اور فرحاں ہو گیا ہے، انھوں نے روضۃ السلاطین اور جواہر العجائب کا مقدمہ تو اردو میں لکھا ہے لیکن تعلیقات فارسی میں قلمبند کیے ہیں جن کو پڑھنے سے دونوں زبانوں پر انکی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کی مادری زبان سندھی ہے اس لیے سندھی زبان کے علوم کی خدمت میں بھی لگے ہوئے ہیں، اس زبان میں ان کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں: (۱) مولانا عبد علی سندھی ۱۹۴۲ء (۲) سندھی ادب (۱۹۵۸ء) (۳) مہران جون ماڑ جون (۱۹۵۹ء) (۴) تذکرہ امیر خانی (۱۹۶۱ء) (۵) لکی بیتا والی ۱۹۶۶ء (۶) لکی نامہ ثانی ۱۹۶۷ء۔ موخر الذکر کتاب آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے، اردو میں ان کی دو کتابیں ہفت مقالہ اور دود چراغ محفل شائع ہوئی ہیں۔ اور پھر یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ ان کے پاس فارسی، سندھی، اردو کتابوں کے ۲۹ مسودے تیار ہیں جو جلد شائع ہونے والی ہیں، ان میں تاریخ رشیدی از میرزا حیدر دوغلت، تاریخ فرامین سلاطین تیموریان اور سلسلۂ نور جہاں بیگم زن جہانگیر بادشاہ، سندھ میں اردو، تذکرہ میر معصوم بھکری، غازی ترخان اور اس کی بزم ادب بھی شامل ہیں، فارسی ادب کی خدمت کے صلہ میں ان کو حکومت ایران کی طرف سے ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۶ء میں دو مرتبہ نشان سپاس کے تمغے مل چکے ہیں، پاکستان کی حکومت نے ان کی علمی خدمات کو ستارۂ امتیاز دے کر سراہا ہے، اور پھر معلوم نہیں کتنے رسائل و جرائد کے اڈیٹر بھی رہ چکے ہیں، ۱۹۳۰ء میں سکھر سے المنار ایک ماہانہ رسالہ نکلا تو اس کے اڈیٹر ہوئے، پھر ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک سندھ زمیندار کے اڈیٹر رہے، ستارۂ سندھ (۳۶-۱۹۳۴ء) الوحید (کراچی ۴۲-۱۹۴۰ء) قربانی (۴۶-۱۹۴۵ء) ان ہی کی ادارت میں شائع ہوئے، سہ ماہی رسالوں میں مہران کراچی، اردو کراچی، پارس کراچی کے بھی اڈیٹر رہے، طہران سے ایک رسالہ ۱۹۶۶ء سے ایران شناسی نکلا کرتا ہے، اس کے بھی اڈیٹر ہیں، مغربی پاکستان کی شاید ہی کوئی علمی یا ادبی مجلس ہو جس کے وہ اہم رکن نہیں، اور پھر وہاں کی یونیورسٹیوں کی کسی نہ کسی کمیٹی کے ممبر ضرور منتخب کیے جاتے ہیں، ایشیا اور یورپ کے ممالک کی بھی سیاحت کرتے رہتے ہیں، ۱۹۶۳ء میں پاکستان کی طرف سے بغداد کی ہزار سالہ سالگرہ کے موقع پر عراق بھیجے گئے، ۱۹۶۴ء میں یورپ اور ایشیا کے زبان دانوں کی کانفرنس ماسکو میں ہوئی، تو ان کو بھی

اس میں پاکستان کے وفد کی قیادت کی، ۱۹۶۵ء میں طہران میں ایرانیات کے ماہرین کی بین الاقوامی کانگریس میں شرکت کی، ۱۹۶۶ء میں چین گئے، جہاں مصنفوں کی ایک کانفرنس ہوئی تھی،

انھوں نے کسی یونیورسٹی میں باضابطہ تعلیم نہیں پائی لیکن سندھی، اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی اور عربی میں ان کی غیر معمولی قابلیت خدا داد ہے، جس میں وہ اپنی محنت اور ریاضت سے جلا دیتے رہتے ہیں، ان کا اصلی وطن بھن ضلع لاڑکانہ سندھ میں ہے، ۱۹۱۱ء میں یہیں پیدا ہوئے، کراچی میں مستقل طور پر رہتے ہیں، اور شب و روز علوم و فنون کی خدمت کے لیے فکرمند اور سرگرداں دکھائی دیتے ہیں، وہ باتیں کرتے ہیں تو ان کی بے تکلفی میں متانت، اور ان کی متانت میں بے تکلفی ہوتی ہے، دار المصنفین کے علمی کارناموں کے بہت مداح ہیں، کہنے لگے کہ خدا کی قسم میں نے جو کچھ سیکھا ہے دار المصنفین کی کتابوں ہی سے سیکھا ہے، انکی اس قسم کی باتوں سے بے حد متاثر ہوا، اور مجھکو بھی اپنے ادارہ پر فخر محسوس ہوا، اس کے مسائل اور مشکلات پر گفتگو آئی تو کہا اپنے یہاں کسی روز رات کے کھانے پر کراچی کے تمام اہل علم کو جمع کرکے ان کے سامنے اس کی مشکلات کو پیش کروں گا۔

ان کے دولت کدہ پر ۲۰ نومبر کو یہ اجتماع ہوا، جس میں کراچی کے حسب ذیل ممتاز اہل علم سے ایک جگہ ملنے کا اتفاق ہوا،

(۱) ممتاز حسن صاحب۔ وہ یہاں کی علمی مجلسوں کے روح رواں ہیں، انگریزی، فارسی، عربی اور اردو کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں، اقبال اور غالب کے پرستاروں میں ہیں، حکومت پاکستان کے محکمۂ خزانہ کے سکریٹری تھے، اس عہدہ سے ریٹائر ہونے کے بعد نیشنل بینک کے ڈائرکٹر ہوئے، آجکل نیشنل بک ٹرسٹ کے ڈائرکٹر ہیں، ان کی علمی گفتگوؤں میں وزن کے ساتھ بڑی شگفتگی ہوتی ہے، ان سے چند برس پہلے کراچی میں ملا تھا جب کہ انھوں نے پاکستان میں دار المصنفین کی کتابوں کی قدر کے

سنڈیکیٹ نے منظور کیا تھا، اور اس کے لیے پچاس ہزار کا لائسنس بھی منظور کر دیا تھا، اسی جذبۂ ممنونیت کے ساتھ ان سے ملنے میں خوشی ہوئی، کراچی کے تمام لوگ ان کی شرافت، اخلاق، جذبۂ اخلاص اور پاکیزہ ذوقِ علم و ادب کے معترف ہیں، ان کو علمی اداروں کا سرپرست یا کسی کانفرنس کا صدر بنانے میں مسرت اور عزت محسوس کرتے ہیں، وہ علی گڈھ کے اولڈ بوائے بھی ہیں، ان کا ذکر خیر آگے بھی آئے گا۔

(۲) ڈاکٹر معین الحق۔ پہلے وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تاریخ کے استاد تھے، اب پاکستان کی ہسٹاریکل سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ہیں، اور اس کو بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں، بہت سی کتابیں ایڈٹ کی یا لکھی ہیں، ان کی ایڈٹ کی ہوئی کتابیں یہ ہیں، (۱) تذکرۃ الخواتین جلد اول (فارسی) (۲) ایم، ڈی سیلین نے انگریزی میں ابن خلکان کی وفیات الاعیان کا ترجمہ چھ جلدوں میں کیا تھا، ان کو بھی ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے (۳) آثار الصنادید از سرسید احمد، اس کتاب کو مفید حواشی کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے، سرسید کی زندگی میں اس کا جو اڈیشن شائع ہوا تھا، اس کے بعد اس کا حاصل کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا، ڈاکٹر صاحب کی محنت سے اب یہ آسانی سے دستیاب ہونے لگی ہے (۴) سرکشی ضلع بجنور از سرسید احمد خاں، اس میں سرسید کے حالات ۱۲۰ صفحے میں لکھے گئے ہیں، جو خود ایک مستقل کتاب بن گئی ہے۔ (۵) اخبار رنگیں، اس سے شاہ عالم اور اکبر شاہ ثانی دہلی کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے لکھنے میں بڑی قدرت حاصل ہے، پاکستان میں انگریزی میں ہسٹری آف فریڈم موومنٹ کے نام سے اب تک کئی جلدیں لکھی جا چکی ہیں، وہ اس کی ادارتی مجلس کے بھی سکریٹری ہیں، ان کی انگریزی تصانیف کے نام یہ ہیں: (۱) برنی کی تاریخ تغلق (۲) اورنگ زیب کا مطالعہ ایک شہزادہ کی حیثیت سے (۳) ۱۸۵۷ء کا انقلاب عظیم ۔۔۔۔ اردو میں انھوں نے حسب ذیل کتابیں لکھی ہیں:

(۱) اسلامی ہند و پاکستان کی معاشرتی و علمی تاریخ (۲) اسلامی عہد میں فن تعمیر (۳) تاریخ ہند و پاکستان

(۲) ہمایوں کے حالات اس کے آفتابچی جوہر نے تذکرۃ الواقعات کے نام سے مرتب کیے تھے، ڈاکٹر صاحب نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہے، وہ جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی (انگریزی) اور البصائر (اردو) کے اڈیٹر بھی ہیں، جرنل کے بلند پایہ مضامین سے مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق بہت ہی مفید لٹریچر کا اضافہ ہو رہا ہے، وہ اس وقت پاکستان کے بڑے مایۂ ناز مورخ سمجھے جاتے ہیں، اس اجتماع میں ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، میرا موضوع بھی ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی تاریخ ہے، اس اشتراک ذوق کی بنا پر ہم دونوں کی ملاقات میں بڑی گرمجوشی تھی، ان کے چہرہ پر شگفتگی کے ساتھ علم و تحقیق کی خدمت کے آثار بھی نظر آئے

(۳) جمیل الدین عالی صاحب۔ نیشنل بینک میں انکم ٹیکس کے ایڈوائزر ہیں لیکن کراچی کے تمام علمی کاموں کو فروغ دینے میں سرگرم رہتے ہیں، انجمن ترقی اردو پاکستان کے معتمد ہیں، اور اس کو اپنی پرانی شاندار روایات کے ساتھ آگے بڑھانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، رائٹرز گلڈ پاکستان کی بڑی اہم علمی و ادبی تنظیم ہے، اس کے بھی وہ سکریٹری ہیں، خاندان لوہارو سے تعلق رکھتے ہیں، شاعر بھی ہیں، غزلوں کے علاوہ دوہے اور گیت بھی لکھتے ہیں، اور معلوم ہوا کہ خوب جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں، گو مجھکو سننے کا اتفاق نہیں ہوا، انکی ایک تصنیف "نئی کرن" بہت مقبول ہوئی تھی میں نے اس کو نہیں پڑھا، غیر ممالک کی سیاحت بھی کی ہے، اور روزنامہ جنگ میں "دنیا مرے آگے" کے عنوان سے اپنا سفرنامہ بھی لکھتے رہے ہیں، ان کے چہرہ پر شادابی، زندہ دلی، اور غیر معمولی ذہانت پائی۔

(۴) سید الطاف علی بریلوی صاحب۔ پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے بانی اور روح رواں ہیں، وہ ہندوستان میں ۱۹۳۲ء ہی سے اپنی مشہور تصنیف حیات حافظ رحمت خاں کی وجہ سے مشہور ہو چکے تھے، تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے، جہاں انھوں نے علی گڑھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرح پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی، علی گڑھ کی کانفرنس تو اب بوڑھی ہو چکی ہے لیکن پاکستان

کی ایجوکیشنل کانفرنس ان کی بدولت جوان ہے، یہ اپنی تعلیمی دلچسپیوں کے ساتھ مفید کتابوں کی اشاعت میں بھی سرگرم ہے، اور اس کی طرف سے پانچ درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اس کی کچھ ادبی اور علمی مطبوعات کے نام یہ ہیں: گلشن بے خار مصنفہ مصطفےٰ خان شیفتہ، ترجمہ سید احسان الحق فاروقی، مشرقی و مغربی تہذیب از ڈاکٹر احسان محمد خان، شیخ عبد القدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات از مولانا اعجاز الحق قدوسی، سرسید کا علمی کارنامہ از قاضی احمد میاں جونا گڑھی، اردو غزلیات اور اسالیب از محمود رضوی، اکبر آبادی وغیرہ، اس کا قابل قدر کارنامہ فن تعلیمات پر اس کی مطبوعات ہیں، امریکہ اور انگلستان کے ماہرین تعلیم مثلاً جان ڈیوی، ڈاکٹر زورتھ، اسپنسر ارنٹ، سر پرسی نن، اے این وائٹ ہیڈ، میتھو آرنلڈ، ایس سارجنٹ اور میکس ایلیٹ ہین کی مشہور تصانیف کے جو اردو ترجمے اس کی طرف سے شائع ہوئے ہیں، ان سے اردو زبان میں بڑا اچھا اضافہ ہو گیا، اور یہ جناب سید الطاف علی بریلوی ہی کی مساعی جمیلہ کے نتیجے ہیں، وہ کانفرنس کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ العلم بھی نکالتے ہیں، اس کے مضامین میں بڑا تنوع ہوتا ہے، علی گڑھ کے اولڈ بوائے ہیں، اس لیے اس میں اپنی مادر درسگاہ کے متعلق دلچسپ مضامین بھی شائع کرتے رہتے ہیں، رسالے کے اور دوسرے مضامین میں جان اور حرکت ہوتی ہے جو خود اس کے اڈیٹر کی شخصیت میں بھی پائی جاتی ہے، میں ان سے ملا تو ان کو پیر رعنا کے بجائے جوان رعنا ہی پایا۔

(۵) حکیم سعید احمد صاحب مالک ہمدرد دواخانہ۔ ان سے پہلے دہلی میں ملاقات ہو چکی تھی لیکن اس مرتبہ وہ بہت ہی توانا، شکیل اور جمیل نظر آئے، ہندوستان کے ہمدرد دواخانے کے مالک ان کے بڑے بھائی حکیم عبد الحمید صاحب ہیں، جو دار المصنفین سے بڑا لگاؤ رکھتے ہیں، اس تعلق کی بنا پر ان سے ملنے میں اور بھی مسرت ہوئی، ان کی عمر شاید چالیس سے زیادہ نہ ہوگی، لیکن اپنی گوناگوں صلاحیتوں سے پاکستان میں یونانی دواؤں کو جو ترقی دی ہے وہ ان کا بڑا کارنامہ ہے، ہمدرد صحت کے نام سے ایک طبی رسالہ بھی نکالتے ہیں،

جس میں علمی رنگ بھی ہوتا ہے، ان ہی دنوں انھوں نے ابن الہیثم ابن ہیثم کا جشن پاکستان کے دونوں حصوں میں بڑے جوش و خروش سے منایا تھا،

(۶) شان الحق حقی صاحب۔ پاکستان کے انفارمیشن سروس میں ہیں، اور اسی کے ساتھ پاکستان کے ادارۂ ترقی اردو بورڈ کے معتمد اعزازی بھی ہیں، اس ادارہ کے ترجمان اردو نامہ کے تین ایڈیٹروں میں ایک وہ بھی ہیں، اور دوسرے دو ایڈیٹر جوش ملیح آبادی اور خواجہ حمید الدین شاہد ہیں، وہ شاعر بھی ہیں، افسانہ نگار بھی، ناول نویس بھی اور تنقید نگار بھی، انکی نظم و نثر کی تصانیف کے کچھ نام یہ ہیں: خیابان پاک، آریہ من، نشید حریت، صور اسرافیل، نوائے ظفر وغیرہ، انکی نگرانی میں ترقی اردو بورڈ کی طرف سے اردو لغت کا کام خاطر خواہ طریقہ پر جاری، اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قدیم دکھنی دور سے لیکر دور حاضر تک ہر لفظ کی تاریخ خواہ وہ رائج ہو یا متروک سند و مثال کے ذریعہ واضح کی جاتی ہے، اور ہر عہد کی مثالیں سنین اور حوالے کے ساتھ درج کی جاتی ہیں، اس طرح ابتک اردو میں جتنے لغت لکھے گئے ہیں، اس سے اس کے کام کی نوعیت بالکل علیحدہ ہے، اگر اس کی تمام جلدیں شائع ہوگئیں تو اردو لغت نویسی کا ایک بڑا کام انجام پا جائیگا، اس اجتماع میں حقی صاحب بہت ہی اخلاق سے پیش آئے اور ترقی اردو بورڈ کے کاموں کو دیکھنے کی دعوت دی۔

(۷) مولانا رازق الخیری۔ اپنے مشہور اور یگانۂ روزگار والد بزرگوار جناب راشد الخیری صاحب مرحوم کے مشن کو پاکستان میں جاری کیے ہوئے ہیں، رسالہ عصمت اسی شان سے نکال رہے ہیں جس طرح دہلی سے نکلا کرتا تھا، بوڑھے نظر آئے لیکن باتوں میں ابھی جوان ہیں، آواز میں ابھی تک کراراپن ہے۔

(۸) پروفیسر ڈاکٹر ریاض الاسلام۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۴۲ء و ۱۹۴۹ء کے اسلامک کلچر حیدرآباد دکن میں فیروز شاہ تغلق پر ایک بہت اچھا مضمون لکھا تھا، اس کی ایک کاپی میرے پاس بھیجی تھی، اس کو پڑھکر مجھکو خیال ہوا تھا کہ یہ نوجوان مقالہ نگار آگے چل کر بہت ہی لائق اہل علم ہو سکتا ہے، یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ اب وہ کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ میں پروفیسر ہیں اور وہاں عزت کی

نمونے دیکھے جاتے ہیں، پنجاب یونیورسٹی لاہور میں بھی رہ چکے ہیں، وہاں سے انھوں نے وار پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل کے پرانے پرچے بھجوائے تھے، جو میرے علمی کاموں کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے۔ ان سے غائبانہ تعارف تو تھا، اب ان سے ملا تو اور بھی خوشی ہوئی، انھوں نے اپنی یونیورسٹی میں مدعو کیا،

(۹) ڈاکٹر محمود صابر - کراچی یونیورسٹی میں ترکی زبان کے استاد ہیں، جس میں اچھی واقفیت رکھتے ہیں، ان کا ایک مضمون ترقی اردو بورڈ کے رسالہ اردو نامہ میں "بابر کا فارسی، ترکی اور اردو کلام" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، اس کو میں نے دلچسپی سے پڑھا تھا، اس میں انھوں نے بابر کے بہت سے اشعار ایک ایسے دیوان سے نقل کیے تھے جو ان کو استانبول یونیورسٹی میں ملا تھا۔ ان سے ملتے وقت ان کا یہ مضمون نظروں کے سامنے رہا، ان ہی کے ساتھ جناب محمود حسن استاد اردو کراچی یونیورسٹی بھی تھے، انکا اصلی وطن رام پور تھا، ابھی جوان کیا نوجوان ہیں،

(۱۰) ابن انشا صاحب - نیشنل بک سنٹر کے ڈائرکٹر ہیں، اس ادارہ کا مقصد پاکستان میں کتابوں کی صنعت کو اچھی لکھائی، اچھی چھپائی اور اچھے گیٹ اپ کے ساتھ ترقی دینا، اور لوگوں میں خرید کر کتابیں پڑھنے کا ذوق پیدا کرنا ہے، اس ادارہ کا تعلق غالباً یونسکو سے بھی ہے، وہ جدید کے ترقی پسند شاعر اور ادیب ہیں، روزنامہ جنگ کے کالم نویس بھی ہیں، بچوں کے لیے نظمیں بھی لکھتے ہیں، کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں، جناب جمیل الدین عالی صاحب کے بڑے بے تکلف دوست ہیں، دونوں میں جب باتیں ہوتی ہیں تو دونوں کے فقروں اور جملوں میں شعر و ادب کا لطف آ جاتا ہے، وہ بھی کراچی کی علمی مجلسوں کے سرگرم اور ممتاز رکن ہیں۔

(۱۱) خواجہ مشفق صاحب - انجمن ترقی اردو پاکستان کے روح رواں ہیں، اور بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کے کاموں کو آگے بڑھانے میں بہت سرگرم ہیں، ان سے برابر خط و کتابت ہوتی رہتی تھی،

یہ معلوم کرکے اور بھی خوشی ہوئی کہ وہ دار المصنفین کے بڑے قدر دان خواجہ عبد الوحید صاحب سابق ایڈیٹر الاسلام کے صاحبزادے ہیں،

(۱۲) مولانا اعجاز الحق قدوسی صاحب۔ پاکستان کے بڑے مقبول اور قابل قدر مصنف ہیں، انھوں نے "شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ اور ان کی تعلیمات" کے علاوہ صوفیائے پنجاب، صوفیائے سندھ، صوفیائے سرحد اور صوفیائے بنگال لکھکر نہ صرف اپنے قلم کی برق رفتاری کا ثبوت دیا ہے، بلکہ ان صوفیائے کرام کی تعلیمات کو پاکستان کے لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ان کی خیر و برکت سے ضرور مستفیض ہو رہے ہوں گے، مولانا شاعر بھی ہیں، ان کی تمام تصانیف پڑھی تھیں، اس لیے ان سے بھی مل کر بڑی خوشی ہوئی،

(۱۳) ایوب قادری صاحب۔ کراچی کے اردو کالج میں استاد ہیں، ان کی کتاب حضرت جلال الدین جہانیاں جہاں گشت کو شوق سے پہلے پڑھ چکا تھا، ان کو فارسی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی بڑی مہارت ہو گئی ہے، نواب صمصام الدین شاہنواز خاں کی مشہور تصنیف مآثر الامراء کی تمام جلدوں کا ترجمہ اردو میں کرکے علمی حلقہ میں وزن پیدا کر لیا ہے، اس وقت وہ نظام الدین احمد بخشی کی طبقات اکبری کی مختلف جلدوں کے اردو ترجمے میں لگے ہوئے ہیں، اب تک کئی کتابیں مثلاً وقائع عبد القادر خانی، کالا پانی، خاو خطاطی، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مجموعہ وصایا اربعہ، عہد بنگش کی تاریخ، مولانا محمد احسن نانوتوی وغیرہ کے مصنف ہو چکے، جو کچھ لکھتے ہیں اس میں محنت و کاوش ہوتی ہے۔ لباس، وضع قطع اور گفتگو میں بہت سادہ اور سلیم الطبع معلوم ہوئے۔

(۱۴) ڈاکٹر سمین خاں صاحب۔ پاکستان کے سرکاری محکمہ کاپی رائٹ بورڈ کے چیرمین ہیں، وہ اس لیے مدعو کیے گئے تھے کہ دار المصنفین کی مطبوعات کے کاپی رائٹ کے متعلق مفید مشورے دیں۔

ان حضرات کے علاوہ جناب سید حسام الدین راشدی صاحب کے کچھ اور احباب، کراچی کے بعض ناشر و تاجر کتب اور اخبارات کے کچھ نامہ نگار بھی تھے، میں وہاں محب محترم جناب مبین الدین صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر اعظم گڑھ، عزیزی افضال مبین الدین صاحب انجینیر سوئی گیس، ڈاکٹر سید

شمیم ذکاء کو، موٹر پر صبح حسن انجینیر ریڈیو پاکستان کے ساتھ پہنچا، ان کو بھی راشدی صاحب نے خاص طور پر مدعو کیا تھا، اس اجتماع میں پہلے سید حسام الدین راشدی صاحب نے دار المصنفین پر ایک تقریر کی اور پاکستان کے ناشروں کی مطبوعات چھاپ کر اس کو جو غیر معمولی نقصان پہنچا رہے ہیں، اس کی طرف معزز حاضرین کی توجہ دلائی، یہ تقریر جیسے ہی ختم ہوئی، جناب رازق الخیری صاحب جھلا اٹھے کہ تو ہندوستان میں پاکستان کے مصنفوں خصوصاً ادارۂ عصمت کی جو کتابیں چھپ رہی ہیں ان کی بھی روک تھام کی جائیگی؟ ان کی اس جھلاہٹ پر ایک ہلچل پیدا ہوئی، جب مجھ کو بولنے کیلئے کہا گیا تو میں نے رازق الخیری صاحب سے معذرت کی کہ ہندوستان میں بھی یہاں کی کتابیں ضرور چھپ رہی ہیں، لیکن میں نے معزز حاضرین کو مخاطب کر کے عرض کیا کہ میں یہاں دار المصنفین کے بہی خواہوں اور خیر خواہوں سے اخلاقی ہمدردی کا طالب بنکر آیا ہوں کہ اگر اس ادارہ کی کتابیں یہاں چھپتی رہیں تو یہاں کے ناشروں کو کچھ ذاتی فائدے تو ضرور حاصل ہو جائینگے لیکن دار المصنفین جیسا دینی اور خدمتگذار ادارہ موت کے منہ میں آکر ختم ہو جائے گا، جو ایک بڑا علمی سانحہ ہوگا، اور جس کا ماتم پاکستان کے لوگ بھی دکھ اور درد کے ساتھ کرنے پر مجبور ہوں گے، کیونکہ اس ادارہ کے اخراجات زیادہ تر اسکی مطبوعات کی فروخت سے پورے ہوتے ہیں، میں نے ان کو بتایا کہ اس کا بجٹ ایک لاکھ سے کچھ اوپر کا بنتا ہے، اس کے مختلف شعبوں میں تقریباً چالیس آدمی کام کرتے ہیں، جو گذشتہ چھپن سال سے کبھی گراں قدر تنخواہوں کے خواہاں نہیں ہوئے، وہ صرف علمی خدمت کے جذبے میں اپنی زندگیوں کو یہاں وقف کئے ہوئے ہیں، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی جس تنگی اور عسرت کی زندگی بسر کرکے اس ادارہ کو فروغ دینے کی کوشش میں لگے رہے، اس کی تفصیل بھی بتائی اور عرض کیا کہ اس ہوش ربا گرانی میں بھی اسکے کارکن ان ہی کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھتے ہیں، میری باتوں کو معزز سامعین نے غور سے سنا، دار المصنفین سے ہمدردی ظاہر کی، پھر اس پر بحث شروع ہوگئی کہ اس کی مطبوعات کی دستبرد کو

کیسے روکا جاسکتا ہے، اس میں جناب ممتاز حسن صاحب جمیل الدین عالی صاحب، الطاف حسین بریلوی صاحب، ڈاکٹر معین الحق صاحب اور ابن انشا صاحب نے پورا حصہ لیا، جس سے اندازہ ہوا کہ وہ دار المصنفین کے علمی کاموں کے بڑے قدردان ہیں، بالآخر یہ طے پایا کہ مزید غور و فکر کے لیے اسی اجتماع میں سے ایک کمیٹی بنا دی جائے، اس کے ارکان جناب ممتاز حسن، جناب سید حسام الدین راشدی، جناب جمیل الدین عالی، جناب ابن انشا، اور جناب ابن الحسن منتخب ہوئے، اس کے بعد یہ مجلس ختم ہوئی، اس کی دلچسپ، پرکیف اور خوشگوار یادوں کا چراغ ابھی تک آنکھوں کے سامنے روشن ہے، اس کے لیے جناب راشدی صاحب کا جتنا بھی زیادہ شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔

اس کمیٹی کی نشست جناب ممتاز حسن صاحب کے دفتر نیشنل بک ٹرسٹ میں ہوئی، اور اس میں یہ طے پایا کہ دار المصنفین سے باضابطہ اختیارات لیکر ایسے ناشرین کے خلاف قانونی کارروائی کیجائے جو اس کی مطبوعات بلا اجازت چھاپ کر اس کو نقصان پہنچاتے ہیں، راقم نے یہ اختیارات جناب ابن الحسن صاحب کو تفویض کیے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، ان سے پوری امید ہے کہ اپنے والد بزرگوار جناب ظہور الحسن صاحب سابق رکن مجلس انتظامیہ دار المصنفین کے ساتھ اس ادارہ کے مطبوعات کے حقوق کی نگہداشت کرتے رہیں گے،

اسی نشست میں اس کمیٹی کے اراکین نے اپنے طور پر ایک سوسائٹی کی بھی تاسیس کی جس کا نام "شبلی و سلیمان یادگار سوسائٹی" رکھا گیا، اس کا مقصد مولانا شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی تحقیقی اور علمی سرگرمیوں کا فروغ دینا قرار پایا، اس کے صدر جناب ممتاز حسن صاحب، سکریٹری جناب ابن الحسن صاحب، خازن جناب جمیل الدین عالی صاحب مقرر ہوئے، اور اراکین جناب سید حسام الدین راشدی (کراچی)، مولانا عبد الوہاب جمال الدین (ڈھاکہ)، پروفیسر حمید احمد (لاہور)، حکیم سعید احمد (کراچی)، حبیب احمد صدیقی اور ظہور الحسن صاحبان منتخب ہوئے، ہندوستان و پاکستان کے سیاسی

تعلقات اس وقت خوشگوار نہیں ہیں، لیکن آئندہ جب خوشگوار ہوں گے اور ہونے چاہئیں، تو پھر ہم ثقافتی طور پر اس سوسائٹی سے بھی امید رکھیں گے کہ یہ ہندوستان میں شبلی و سلیمان کے ادارہ کی مطبوعات کے حقوق کی پامالی پاکستان میں نہ ہونے دے گی۔

ایک روز شان الحق حقی صاحب کی دعوت پر اردو ترقی بورڈ کے دفتر بھی گیا جو شمالی ناظم آباد میں ہے، ابھی کرایہ کی عمارت میں ہے جو بہت اچھی معلوم ہوئی، معلوم ہوا کہ حکومت اس ادارہ کو کبھی سوا لاکھ اور کبھی دو لاکھ امداد دیتی ہے، حقی صاحب نے بورڈ میں لغت پر جس طرح کا کام ہو رہا ہے، اس کی تفصیل بتائی، الفاظ اکٹھا کر کے ان کی تشریح و تصریح جس طرح کی جاتی ہے اور ان کو جس طریقہ سے مختلف فائلوں میں رکھا جاتا ہے، وہ بھی دکھائے، اس کی طرف سے بچوں کے لیے کارآمد کتابیں بھی چھاپ کر فراہم کی جاتی ہیں، اردو کے جن مشہور مصنفوں کی کتابیں عام طور سے بازاروں میں نہیں ملتی ہیں، ان میں سے بعض کتابیں بھی یہاں سے شائع ہو گئی ہیں، اس سلسلہ میں محمد حسین آزاد کی اردو کی پہلی کتاب کے مختلف حصے، ڈاکٹر نذیر احمد کی مراۃ العروس اور منتخب الحکایات، راشد الخیری کی منازل السائرہ اور میر امن کی باغ و بہار دیکھنے میں آئیں، ان کے علاوہ جذبات نادر خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں ممتاز حسین صاحب کا ایک بہت ہی پر مغز مقدمہ ہے، شیخ نادر علی عباسی کاکوری کے رہنے والے تھے ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۲ء میں وفات پا گئے، اس طرح کل ۴۵ برس کی عمر پائی، ان کی زندگی میں ان کا مجموعۂ کلام جذبات نادر کے نام سے نولکشور پریس سے شائع ہوا تھا جس کے شروع میں عزیز مرزا، قاضی تلمذ حسین اور عبد الحلیم شرر کی مختصر تقریظیں تھیں، لیکن ان ارباب نظر کے خراج تحسین کے باوجود شعر و شاعری کے نقادوں نے ان کو وہ جگہ نہیں دی تھی جس کے وہ مستحق تھے، اس کی تلافی جناب ممتاز حسین صاحب نے ان کے مجموعۂ کلام پر ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ حالی و آزاد نے جس شاعری کو نیچرل بنا دیا تھا، نادر نے اس میں فطری جذبات اور ایک دلچسپ طرز ادا کا

اضافہ کیا، نادر بلاشک وشبہ حالی اور آزاد کی تحریک کے گل سر سبد ہیں، ممتاز حسن صاحب ان کی تعریف کرتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں: اس میں کچھ شک نہیں کہ نادر ایک طرز کے موجد تھے جو انگریزی شعراء کے بیان سے قریب تھی۔ ان کا مقصد شعر کے ذریعے اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرنا تھا، نہ کہ روایتی اردو شعراء کی طرح محض ردیف اور قافیوں میں لفظی اور صوتی ہم آہنگی پیدا کرنا، ممتاز حسن صاحب نے نادر کی ان نظموں کی بہت تعریف کی ہے جو ٹینیسن، بائرن اور ٹامس مور کی نظموں کے ترجمے ہیں، اس مقدمہ کے بعد نادر کاکوروی کی شاعری نہ صرف ایک بار پھر نظروں کے سامنے آگئی ہے، بلکہ ان کو شہرت عام اور بقائے دوام بھی حاصل ہو جائے گی،

جناب شان الحق حقی صاحب دار المصنفین کے لیے اپنے ادارہ کی مطبوعات ہدیے کے طور پر دے رہے تھے، لیکن ان کا لانا مشکل تھا، اس لیے ان سے معذرت خواہ ہوا، یہاں جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، اور جناب سید یوسف بخاری بھی کام کرتے ہیں، میں دیر کرکے دفتر میں پہنچا، اس لیے وہ سب اٹھ چکے تھے، ان سے نہ ملنے کا افسوس ہے، یہیں جلال احمد صاحب ڈائرکٹر پبلک انفارمیشن سے ملاقات ہوگئی جو جناب رشید احمد صدیقی صاحب (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے بھانجے اور جناب بشیر احمد صدیقی صاحب سابق پرنسپل شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ کے داماد ہیں، ان سے اچانک مل کر بڑی خوشی ہوئی، وہ مختلف قسم کے معلومات کے خزانہ ہیں اور بڑی اچھی گفتگو کرتے ہیں، انھوں نے اپنی سعادت مندی سے ڈاکٹر محمد عزیر (سابق رفیق دار المصنفین وریڈر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی) کے یہاں پہنچا یا، جن کے یہاں پہنچکر اخلاص و محبت کے جام پی کر سرشار رہا، جلال میاں کے ساتھ بشیر احمد صدیقی صاحب کے گھر پر بھی گیا، جو پاکستان جانے سے پہلے دار المصنفین کی نجی مجلسوں کی بساط صحبت احباب میں جلوۂ لالۂ و گل بن کر شریک ہوتے تھے، وہ عمرہ کے لیے مکہ معظمہ گئے ہوئے تھے، ان سے ملاقات تو نہ ہو سکی لیکن انکے گھر پہنچکر میں برس پہلے کی شناختہ اور عزیز دونوں کو آواز دینے کو جی چاہا، ان کے لائق لڑکوں کو دیکھ کر ان کے بچپن کا زمانہ یاد آیا، جب وہ اعظم گڑھ کی گلیوں میں کھیلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے، ان میں اب ہر ایک اچھی ملازمت پر ہے

ایک روز جناب جمیل الدین عالی صاحب کی دعوت پر اردو کالج کی نئی عمارت کے افتتاح کی تقریب میں بھی شریک ہوا، بابائے اردو کی کوششوں سے انجمن ترقی اردو کی نگرانی میں اردو کالج قائم ہوا تھا، اس میں یونیورسٹی کی ساری تعلیم اردو کے ذریعہ دی جاتی ہے، اسکے آرٹ اور کامرس کے شعبے تو ابھی انجمن ترقی اردو کے دفتر کیساتھ ہیں لیکن سائنس کے شعبے کیلئے کراچی کی آبادی سے دور ایک بڑی نئی عمارت بنگئی ہے، جو کراچی یونیورسٹی کے راستے میں ہے، سید حسام الدین راشدی صاحب کیساتھ میں رسم افتتاح کی تقریب میں پہنچا تو وہاں بہت سے ممتاز لوگ موجود تھے، جن میں انجمن ترقی اردو کے جناب اختر حسین صاحب بھی تھے جو علی گڑھ کے اولڈ بوائے ہیں، اور مغربی پاکستان کے گورنر بھی رہ چکے ہیں، ان حضرات کے ساتھ ان سے بھی نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا، یہاں رسم افتتاح میں قرآن خوانی ہوتی ہے، تمام حاضرین کے ساتھ جناب اختر حسین صاحب بھی اور لوگوں کی طرح فرش پر جھکر قرآن مجید پڑھتے رہے۔ قرآن خوانی کے بعد جمیل الدین عالی صاحب نے اپنی تقریر میں اردو کالج کی عمارت کی تعمیر کی کچھ تفصیل بتا پھر یکایک مجھکو مجمع سے مخاطب ہونے کو کہا، مجھے جو کچھ بن پڑا اردو زبان کی اہمیت اور اردو کالج کی ضرورت پر کچھ دیر تک بولتا رہا۔

اسی تقریب میں اردو کے مشہور نقاد ممتاز حسین جونپوری سے ملاقات ہوئی جو اردو کالج میں شعبہ اردو کے صدر ہیں، ان کے مضامین کے مجموعے نقد حیات، نئی قدریں اور نئے تنقیدی گوشے میری نظر سے گذرے ہیں۔ وہ شعر و ادب پر اپنا تنقیدوں کا اظہار مارکسی نظریے کے ماتحت کرتے ہیں، مگر وہ قدیم ادب کی تمام روایتوں کے باغی بھی نہیں ہیں، بلکہ اس کی صدیوں کے ست اور امرت کو نئی صحت مند ادبی تحریکوں کے ساتھ ملانے کے خواہاں ہیں تاکہ ان کے خیال کے مطابق ایک نیا جمالیاتی ذوق ایک نئی نفسیات کے ساتھ میل کھا سکے، البتہ ان کا یہ پیام ذرا غور طلب ہے کہ ہندوستانی عورتیں (جن سے پاکستانی عورتیں بھی مراد ہیں) اپنی نظر بجائے انگلینڈ اور امریکہ کے روس کی طرف لیجائیں تو اسے ایشیا کی روح اور پابند آزادی کا امتزاج دعوت نظر دیتا نظر آئے گا۔ ان سے ملا تو ان کی سادگی، متانت اور خاموشی سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے اندر مارکسی نظریے کی چنگاریاں سلگتی رہتی ہیں، انھوں نے اپنا تعلق ضلع اعظم گڈھ سے بھی بتایا۔

کراچی یونیورسٹی کے بعض اساتذہ کی دعوت پر ایک روز وہاں بھی گیا جو شہر سے بہت دور ہے، اسکی عمارت بہت ہی شاندار ہے، اسکی تعمیری شان بالکل مختلف نظر آئی معلوم ہوا کہ اسکا نقشہ کسی فرانسیسی ماہر تعمیرات نے بنایا تھا، اسلیے فرانسیسی ذوق زیادہ نمایاں ہے، ہر جگہ بڑی وسعت اور کشادگی ہے، یونیورسٹی پہنچا تو ڈاکٹر محمود حسین صدر شعبۂ تاریخ اپنے کمرہ میں لے گئے، وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے چھوٹے بھائی ہیں، اس خاندان کو دارالمصنفین سے گہرا لگاؤ رہا ہے، اسلیے توقع کے مطابق ڈاکٹر محمود حسین بڑے اخلاق سے پیش آئے، ان کے کمرہ میں یونیورسٹی کے اور اساتذہ بھی آگئے تو ان سے بھی ملاقات ہوگئی، دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں، ڈاکٹر محمود حسین صاحب کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہے۔ اردو میں اپنی مہارت کا ثبوت روسو کی مشکل کتاب سوشل کنٹریکٹ کا ترجمہ معاہدۂ عمرانی کے نام سے کرکے دیا ہے، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی طرف سے جو انگریزی تاریخ ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ کے نام سے لکھی جارہی ہے، اس کے بورڈ کے بھی صدر ہیں، اس سلسلہ کی پہلی دوسری جلدوں میں ان کے کئی ابواب ٹیپو سلطان اور سید احمد شہید بریلویؒ وغیرہ پر ہیں، انھوں نے جامعہ ملیہ دہلی کی طرح ملیر کراچی میں ایک جامعہ ملیہ قائم کی ہے، مجھکو اس کو دیکھنے کی دعوت دی لیکن افسوس ہے کہ اپنی کوشش کے باوجود وہاں نہ پہنچ سکا، اس روز ڈاکٹر ریاض الاسلام کسی ضرورت سے یونیورسٹی سے باہر تھے، اس لیے ان سے ملاقات نہ ہوسکی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صدر شعبۂ اردو اس روز یونیورسٹی نہیں آئے تھے لیکن ان کے شعبہ کے اور اساتذہ سے ملاقات ہوئی، معلوم ہوا کہ اردو کے ایم، اے فائنل کلاس میں تقریباً ایک سو طلبہ ہیں، اتنی بڑی تعداد کراچی ہی میں ہوسکتی ہے، شعبہ میں صرف چھ اساتذہ کام کرتے ہیں، جو علی گڈھ یونیورسٹی کے مقابلہ میں بہت کم ہیں، یونیورسٹی کا کتب خانہ بھی دیکھنے گیا، جہاں ایک اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے مولوی فضل اللہ ندوی صاحب بھی کام کرتے ہیں، انھوں نے بتایا کہ کتب خانہ میں سوا لاکھ کتابیں ہیں جن میں پچاس ہزار عربی، فارسی اور اردو کی ہیں، یہیں عبدالحلیم چشتی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، جو معارف میں کبھی کبھی مضامین لکھا کرتے ہیں، اس میں ان کا ایک بہت اچھا مضمون امام صغانی پر شائع ہوا تھا،

اس کے طرز تحریر کو دیکھکر میں ان کو مسن آدمی سمجھتا تھا، لیکن وہ ابھی نوجوان تو نہیں مگر جوان ہیں، ان سے میں نے کہا کہ وہ اپنی علمی سرگرمیاں جاری رکھیں، اور قلم میں جو فطری قوت پائی ہے، اس کا اچھا مصرف لیتے رہیں، اردو شعبہ کے استاد محمود حسن صاحب رامپوری برابر ساتھ رہے، یونیورسٹی میں تعلیم مخلوط ہے، لڑکوں اور لڑکیوں کو بہت بے تکلفی سے ایک دوسرے سے ملتے دیکھا، معلوم نہیں اس بے تکلفی میں اسلامی قدریں باقی ہیں کہ نہیں، اس کا اندازہ نہ ہو سکا۔

یونیورسٹی میں ڈاکٹر امیر حسن صدیقی سے ملاقات ہو گئی جو کسی کام سے وہاں آئے ہوئے تھے، اب وہاں سے ریٹائر ہو چکے ہیں، ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت سے ملے، اس لیے کہ ان کی ایک کتاب "خلافت و سلطنت" دار المصنفین سے شائع ہوئی تھی، جو استاذی المحترم حضرت سید سلیمان ندویؒ کو پسند تھی، وہ مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائے ہیں، لندن سے مذکورۂ بالا کتاب پر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی، وہاں سے آنے کے بعد مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۳ء تک لکچرار رہے، جس کے بعد وہ کراچی چلے آئے، یہاں انھوں نے سندھ مسلم کالج کی بنیاد ڈالی، اس کے پرنسپل ۱۹۴۷ء تک رہے، پھر کراچی ہی میں اسلامیہ کالج قائم کر کے اس کے پرنسپل ۱۹۵۰ء تک رہے، اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں کراچی یونیورسٹی میں تاریخ اسلام کے شعبہ کے صدر ہو گئے اور پھر فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین بھی ہوئے، ۱۹۵۹ء میں اسٹریلیا جا کر اسلامی تاریخ پر کئی لکچر دیے، ۱۹۶۴ء میں ملایا میں وزیٹنگ پروفیسر ہو کر گئے، کئی کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں، آج کل اپنے ادارہ جمعیۃ الفلاح کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں، جہاں سے اپنی نگرانی میں وائس آف اسلام ایک انگریزی رسالہ بھی نکالا کرتے ہیں، اس میں خالص اسلامی نقطۂ نظر کے مضامین شائع ہوتے ہیں، یہ ۱۹۵۲ء سے برابر نکل رہا ہے، وہ مجھ سے ملے تو ان کے ہینڈ بیگ میں ان کی تازہ انگریزی تصنیف "غیر مسلم مسلمان حکومت میں اور مسلم غیر مسلم حکومت میں" تھی، مجھکو نکال کر دی اور خاکساری میں کہا کہ دار المصنفین کے معیار کے مطابق تو نہیں ہے، لیکن اس کو ضرور پڑھیے، میں ان ہی

کے ساتھ یونیورسٹی سے واپس ہوا، انھوں نے بہت اصرار کرکے جمعیۃ الفلاح کے دفتر میں بلایا، جو ۲۰ فرید ڈاؤ روڈ پر ہے، ایک روز مولانا شبلیؒ کے بھتیجے حاجی انور نعمانی صاحب (بن محمد جنید مرحوم) کے ساتھ اس دفتر میں پہنچا، جس کو دیکھ کر ڈاکٹر امیر حسن صاحب کے اسلام کے جذبۂ خدمت سے بہت متاثر ہوا، دفتر کی عمارت بڑی صاف ستھری ہے، ہر کمرہ میں موزیک کا فرش ہے، معلوم ہوا کہ پوری عمارت تین لاکھ میں بنی ہے، ہر کمرہ میں ساری چیزیں بڑی ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں، اخبارات و رسائل کے فائل بھی اہتمام کے ساتھ رکھے ہوئے تھے، ڈاکٹر امیر حسن صاحب کے کوئی اولاد نہیں، اسی ادارہ کو اپنی اولاد بنائے ہوئے ہیں، اور تن من دھن سے اس کے فروغ میں لگے ہوئے ہیں، دفتر تو اوپر کوٹھے پر ہے، نیچے کمروں میں دکانیں ہیں، جن سے کافی آمدنی ہے، ادارہ کے اخراجات میں اس آمدنی سے بڑی مدد ملتی ہوگی، اس کی طرف سے اب تک ۲۱ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جو زیادہ تر انگریزی میں ہیں، ان کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی تاریخ کے صحیح تصورات لوگوں خصوصاً غیر مسلموں کے سامنے پیش ہوتے رہیں، خود ڈاکٹر امیر حسن کی جو کتابیں یہاں سے شائع ہوئی ہیں ان کے نام یہ ہیں:- (۱) ایران کے ازمنہ وسطیٰ میں خلافت و سلطنت (۲) مسلم ادارے کی ابتدا اور ان کا ارتقا (۳) اسلامی تاریخ کا مطالعہ، (۴) مشاہیر اسلام حصہ اول و دوم (۵) مسلم سپہ سالار (۶) اسلامی ریاست (۷) غیر مسلم مسلمان حکومت میں اور مسلم غیر مسلم حکومت میں، یہ سب انگریزی میں ہیں، ان کے اردو ترجمے بھی کئے گئے ہیں، یہاں سے انگریزی کی اور دوسری مطبوعات جو شائع ہوئی ہیں وہ یہ ہیں: (۸) سیرۃ النبی جلد اول کے مقدمہ کا انگریزی ترجمہ از محمد طیب (۹) پیغمبر اسلام از خورشید احمد (۱۰) مسلمانوں کا معاشرتی فلسفہ از ڈاکٹر بشارت علی (۱۱) کلام پاک کا تعارف از خورشید احمد (۱۲) تقابل عمرانیات از ڈاکٹر بشارت علی (۱۳) معاشرتی فلسفہ میں شاہ ولی اللہ کے کارنامے از ڈاکٹر بشارت علی (۱۴) قرآن اور حدیث کی بنیادی تعلیمات از نثار احمد، اردو میں شائع کردہ مطبوعات کے نام یہ ہیں: (۱۵) خلافت و سلطنت (۱۶) مسلم تعصبات (۱۷) اسلامی تاریخ (۱۸، ۱۹) مشاہیر اسلام حصہ اول و دوم (۲۰) اسلامی تاریخ۔ یہ کتابیں ڈاکٹر امیر حسن کی انگریزی تصانیف کے ترجمے ہیں (۲۱) پیغمبر پاک

از خورشید احمد اور احمد انس (۲۲) نوائے سروش از نثار احمد (۲۳) صاحب رحمت از نثار احمد۔

دفتر میں ربانی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جو رسالہ وائس آف اسلام کو ترتیب دیتے ہیں، انھوں نے خود بیان کیا کہ وہ پہلے عیسائی تھے، لیکن اب مسلمان ہو کر اسلام کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، قادیانیوں کے بڑے مخالف تھے، کہتے تھے کہ ان کے خلاف ایک عالمگیر تحریک اٹھانے کی ضرورت ہے، وائس آف اسلام میں اسلامی ممالک کے اتحاد پر زور دیا جاتا ہے، خود ڈاکٹر امیر حسن اپنی تحریروں میں اس کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں کہ اگر ایک اسلامی بلاک بن گیا تو وہ سرمایہ داری اور کمیونزم کے دونوں بلاکوں کے درمیان توازن پیدا کرتا رہے گا، اور اسلامی بلاک کے ذریعہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا تحفظ بھی کیا جاسکتا ہے۔

اسی روز خواجہ مشفق صاحب کی دعوت پر انجمن ترقی اردو کے دفتر میں گیا، مولانا شبلی نعمانی کے بھتیجے انور حبیب نعمانی ساتھ تھے، ان سے بھی لوگ بڑی محبت سے ملے، اس دفتر کی عمارت میں اردو کالج بھی ہے، جس میں آرٹس اور کامرس کے شعبے ہیں، خواجہ مشفق صاحب ابھی بالکل جوان ہیں، مگر انجمن کے روح رواں بنے ہوئے ہیں، انھوں نے اس کی تمام چیزیں بہت شوق سے دکھائیں، اس کے علمی کارنامے روز روشن کی طرح ظاہر ہیں، وہ کہتے تھے کہ اس کی مطبوعات کی سالانہ فروخت ستر اسی ہزار تک ہو جاتی ہے، حکومت کی طرف سے بھی امداد ملتی ہے، یہاں میں ۱۹۵۰ء میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق سے آکر ملا تھا، ان کی باتیں کانوں میں گونجنے لگیں، انھوں نے اثنائے گفتگو میں کہا تھا کہ غیر منقسم ہندوستان میں تو اردو کیلئے مہابھارت کی جنگ کرتا اور بھیم اور ارجن کی طرح لڑتا رہا، یہاں بھی اردو کیلئے لڑ رہا ہوں لیکن اپنے خود سے جنگ کرتے بن نہیں پڑتی، پھر بھی انھوں نے اپنی زندگی میں اردو کالج کی بنیاد ڈال دی تھی، جو اب کافی ترقی کر چکا ہے، انجمن کے دفتر میں جناب جلیل قدوائی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، ان کے افسانوں کے مجموعے اصنام خیالی اور موناوادا اپنی طالب علمی کے زمانے میں پڑھے تھے، اس وقت سے ان کو جانتا ہوں، اور جب کبھی ان کی کسی تحریر پر نظر پڑتی ہے تو خواہ مخواہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے، ان سے مل کر خوشی ہوئی، میں تو اب بوڑھا ہو رہا ہوں لیکن وہ جوان ہی نظر آئے، وہ مسلم یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر بھی رہ چکے ہیں، شاعر بھی ہیں، ان کی نظموں کے مجموعہ

کا نام نقش و نگار ہے، اس کے علاوہ دیوان بیدل، انتخاب حسرت، کلام غالب، تنقیدیں اور خاکے، تذکرے اور تبصرے، نوائے سینہ تاب، کارنامۂ ادب کے مرتب اور مصنف بھی ہیں، اصلی وطن اناؤ تھا، پاکستان کی حکومت کے شعبۂ تعلقات عامہ اور وزارت اطلاعات میں ملازمت کرکے اب پنشن یافتہ ہیں، مگر اب بھی علمی کاموں میں لگے رہتے ہیں۔

کراچی کے قیام میں ابومعاویہ صاحب برابر ساتھ رہے، وہ پاکستان میں دارالمصنفین کی مطبوعات کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں، جناب ایوب قادری صاحب استاد اردو کالج کے بھائی ہیں، ایک روز انھوں نے کہا کہ یہاں کے ایک بہت ہی معزز صنعت کار حاجی محمد عمر صاحب بڑے علم دوست ہیں، اور دارالمصنفین کے بڑے قدر دان ہیں، وہ مجھ سے ملنے کے خواہاں ہیں، میں ان کو پہلے سے نہیں جانتا تھا، ابومعاویہ صاحب مجھ کو ان کی کوٹھی پر لے گئے، جو بہت بڑی اور نہایت آراستہ و پیراستہ تھی، اس کے ایک بڑے ہال میں بہت اچھا کتبخانہ تھا جس کی تمام کتابوں میں بہت عمدہ جلدیں بندھی تھیں اور الماریوں میں بہت سلیقہ سے رکھی ہوئی تھیں، حاجی محمد عمر صاحب خود تو اب کاروبار نہیں کرتے ہیں، سب کچھ اپنے لڑکوں کو حوالہ کر دیا ہے، کتب خانہ میں بیٹھ کر اپنی علمی تشنگی بجھاتے رہتے ہیں، مجھ سے بڑے اخلاق سے ملے، میری تمام ناچیز تصانیف میرے سامنے لاکر رکھ دیں کہ میں ان پر دستخط کر دوں، مجھ کو حیرت تھی میری کوئی ایسی تصنیف نہیں تھی جو ان کے پاس نہ تھی، کچھ دیر کے بعد اٹھ کر چلے گئے اور واپس آئے تو ایک ہزار روپئے پیش کیے، اور فرمایا کہ میں اس کو اپنے سفر میں خرچ کروں، میں اس اخلاص اور قدر دانی سے بے حد متاثر ہوا، میں نے ان سے کہا کہ یہ رقم یہیں جمع رہنے دیں، جب دونوں حکومتوں میں مالی لین دین ہوگا تو آپ دارالمصنفین کے لائف ممبر بن جائیں، انھوں نے کہا کہ یہ رقم تو وہ نکال چکے ہیں، اب میں جو چاہوں اس سے مصرف لوں، انھوں نے بہت اصرار کرکے یہ رقم دیدی جو وہیں جمع ہے۔

ایک روز ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر گیا، جو خیابان سرسید (سرسید روڈ) پر واقع ہے، اسی کے سامنے سرسید گرلس کالج ہے، جس میں آرٹس اور سائنس کے شعبے ہیں، معلوم ہوا کہ اس میں پندرہ سو لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں، اس کی عمارت چھ ایکڑ زمین پر تقریباً بیس لاکھ روپئے میں تعمیر ہوئی ہے، شاید پردہ کے خیال سے

عمارت چار دیواری سے گھری ہوئی تھی، اس کے اندر اسمبلی ہال، لائبریری، رجمنازیم اور ایک مسجد بھی بننے والی ہے جس میں مزید تیس لاکھ روپئے خرچ ہوں گے، پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی کوششوں سے یہ کالج قائم ہوا ہے، جو اس کا بڑا کارنامہ ہے، لیکن خود کانفرنس کی عمارت اب تک نہیں بنی ہے، اور یہ ایک کرایہ کی عمارت میں ہے، جناب الطاف بریلوی صاحب نے اس کے تمام کمرے دکھائے ایک کمرہ میں اردو کے تمام مصنفوں کی تصویریں لگی ہوئی ہیں جس سے ایک نظر میں وہ سب سامنے آجاتے ہیں، جناب بریلوی صاحب نے کانفرنس کی مطبوعات بھی دکھائیں، ان میں سے دو میں نے اپنے لیے منتخب کیں، ایک تو استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندوی کے ایک اردو مقالہ کا انگریزی ترجمہ دی ایجوکیشن آف ہندوز انڈر مسلم رول تھا، اور دوسرا العلم کا غالب نمبر تھا، میں نے جناب بریلوی صاحب سے عرض کیا کہ میں نے بھی سید صاحب کے اس مقالہ کا انگریزی ترجمہ کیا تھا، جو ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں حیدر آباد دکن کے رسالہ اسلامک کلچر میں متعدد قسطوں میں شائع ہوا تھا، العلم کا غالب نمبر ۲۰×۳۲ سائز میں ۴۳۲ صفحے پر مشتمل ہے، ایسے ضخیم نمبر ہندوستان اور پاکستان سے معلوم نہیں کتنے نکل چکے ہیں، پھر بھی نکلتے رہیں گے، یہ غالب کی ذات اور ان کی شاعری دونوں کی کرامت ہے، گذشتہ سو سال سے ان پر برابر کتابیں اور مضامین شائع ہو رہے ہیں، پھر بھی غالب پر لکھنے والوں کو کوئی نہ کوئی نیا موضوع مل جاتا ہے، اس غالب نمبر میں جہاں غالب کے تصوف، مسائل حیات اور فلسفہ پر مضامین ہیں، وہاں ان کے علم نفسیات، علم نجوم اور علم کلام پر بھی مقالے ہیں، ایک مضمون غالب اور گوئٹے کے عنوان سے ۴۱ صفحے میں ہے، جو اس نمبر کا طویل ترین مقالہ ہے، اقبال نے غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے   گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

یہ مضمون اس شعر کے متن کی شرح ہے، مضمون نگار کا خیال ہے کہ گوئٹے اور غالب دونوں صاحبان عینیت

دونوں کا فلسفۂ نجات بھی ہم رنگ ہے ..... دونوں اپنی اپنی جگہ صناعِ اعظم ہیں .... الخ

اس قسم کے موازنہ میں تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن گوئٹے کی فاؤسٹ کی تمام باتوں کو غالب کی شاعری میں ڈھونڈھ نکالنا اگر ستم نہیں تو عقیدت بالائے عقیدت ضرور ہے۔

اس نمبر میں پروفیسر ممتاز حسین صدر شعبۂ اردو کالج کا بھی ایک مضمون غالب کے عنوان سے ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے اور مضامین کی طرح غالب کو مارکسی عینک سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ اس میں مختصر طریقہ پر غالب کے کلام کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے لیکن وہ غالب کی پہلو دار شخصیت کی خوبیاں بتاتے ہوئے یکایک یہ دعویٰ کر بیٹھے ہیں کہ جس طرح یورپ میں یونانی علوم و فنون کی نشاۃ ثانیہ کی روشن خیالی نے لوتھر کی مذہبی اصلاحی تحریک کے لیے راہ ہموار کی، اسی طرح ہمارے یہاں غالب کی روشن خیالی نے سرسید کی مذہبی اصلاح کے لیے راہ ہموار کی (ص ۶۶)، اس رائے میں بالغ نظری نہیں، لائق مضمون نگار کا عقیدت مندانہ جوش ان کے ناقدانہ ہوش پر غالب آگیا ہے۔

اس نمبر میں بعض مطبوعہ مضامین بھی شامل کر دیے گئے ہیں، اسی لیے اس کی ضخامت فاضل اڈیٹر صاحب کے قول کے مطابق قبل تہذیب کی زلف محبوب کی طرح بڑھتی چلی گئی، مگر ان کی رائے سے اتفاق ہے کہ یہ نمبر خاصے کی چیز بن گیا ہے، شروع میں غالب پر پاکستان کے بعض مشاہیر کے دلچسپ انٹرویو بھی ہیں، ممتاز حسن صاحب غالب کے بڑے پرستار ہیں، انھوں نے اپنے انٹرویو میں فرمایا ہے کہ

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب   ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اس فلسفیانہ شعر کا جواب نہ صرف اردو بلکہ شاید دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی مشکل سے ملے گا۔ سید حسام الدین راشدی صاحب نے اپنے انٹرویو میں جہاں اور باتیں کہی ہیں وہاں یہ بھی کہا ہے کہ اب تک غالب پر جو تحقیقی سرمایہ موجود ہے وہ یوروپین اندازِ تحقیق کے معیار پر نہیں اترتا، اس لیے یورپ کے محقق اگر غالب کے سوانح اور کوائفِ زندگی پر لکھنا چاہیں تو یہ سرمایہ ان کے کام نہیں آسکتا ...... اڈیٹر صاحب کو اعتراف ہے کہ

اس پُر بہار گلدستۂ غالب کو سج سجا کر پیش کرنے کا کریڈٹ جناب محمد ایوب قادری صاحب کو حاصل ہے، جو علمی کاموں میں محنت شاقہ کرنے کے عادی ہیں۔

ایک روز پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی بھی گیا، ۱۹۵۵ء میں بھی یہاں آیا تھا، اس وقت سے اب تک یہ سوسائٹی بہت ترقی کر گئی ہے، اس کا کتب خانہ ابھی اتنا بڑا نہیں ہے جتنا کہ ہونا چاہیے، پھر بھی اس میں اچھا ذخیرہ نظر آیا، یہ اپنی قابل قدر مطبوعات کی وجہ سے پاکستان میں ایک مقام حاصل کر چکی ہے، اس کی مطبوعات کا ذکر پہلے آچکا ہے، ڈاکٹر معین الحق صاحب کی خواہش تھی کہ میں سوسائٹی کے ایک جلسہ میں اپنا کوئی مقالہ پڑھوں، لیکن میں نے معذرت کی کیونکہ میرے پاس وہاں کوئی ایسا مقالہ نہ تھا، میرا ایک مضمون "ملفوظات خواجگان چشت" کے عنوان سے معارف کی متعدد اشاعتوں میں شائع ہوا ہے، ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں ہونا چاہیے، تاکہ پروفیسر محمد حبیب نے ان ملفوظات کو جعلی قرار دیکر جو غلط فہمی پیدا کر دی ہے، اس کا ازالہ انگریزی داں حلقہ میں بھی ہو جائے۔

پاکستان ریڈیو کراچی اسٹیشن والوں کی خواہش ہوئی کہ اس پر میری کوئی تقریر ہو جائے، میں تقریر کرنے سے گھبرایا، تو انھوں نے خود ہی یہ تجویز پیش کی کہ میں صرف دار المصنفین کے علمی کاموں پر روشنی ڈالوں، اور اسکی نوعیت انٹرویو کی شکل میں ہو، اس پر میں راضی ہو گیا، وہ مجھے ریڈیو اسٹیشن لے گئے، براڈکاسٹ روم میں مجھ سے دار المصنفین کے متعلق سوالات کرتے تھے اور میں ان کو جوابات دیتا تھا، یہی انٹرویو ریکارڈ ہوا،

میرے کراچی سے روانہ ہونے سے پہلے جناب جمیل الدین عالی صاحب نے ایک رات کو اپنے یہاں کھانے کے بعد ایک مخصوص نشست کی جس میں جناب ممتاز حسن صاحب، سید حسام الدین راشدی صاحب، ابن انشا صاحب اور محمود قاسم صاحب تھے، یہ دلچسپ اور پر لطف صحبت بارہ بجے رات تک رہی، موضوع زیادہ تر علم، ادب اور تصوف پر رہا، ممتاز حسن صاحب بڑی اچھی گفتگو کرتے ہیں، ان کے دائرۂ گفتگو میں شکسپیر، برٹرنڈرسل، برنارڈ شا، ٹی، ایس ایلیٹ، چرچل، کنگھم سے لیکر غالب، اقبال، حالی، شبلی، حسرت سب ہی آئے، وہ اپنی علمی گفتگو

اپنے لطیف دلنشا انگیز انداز بیان اور مزاحیہ فقروں سے دلچسپ بنا دیتے ہیں، اور پھر اسکے متوقع نہیں رہتے کہ ان کی بزرگی، بڑائی اور کبرسنی کے بارے ان کے مخاطب دبے رہیں، اسی لیے ان کے معاصر خواہ انکے ہمسن ہوں یا ان سے چھوٹے ہوں ان کی بہت عزت کرتے ہیں اور بے حد محبت بھی جمیل الدین عالی صاحب کی باتوں میں بڑی ذہانت پائی جاتی تھی، کوئی بھی موضوع ہوتا، اس میں اپنی خداداد نعمت سے کوئی نہ کوئی نیا نکتہ نکال دیتے، یورپ کی مختلف ادبی اور سیاسی تحریکوں پر انکی نظر بھی ہے، انکی باتوں میں جان اس وقت پیدا ہوجاتی جب انکے دوست ابن انشا صاحب ان پر کوئی نقرہ چسپت کر دیتے، اس کے جواب میں جمیل الدین عالی صاحب کی ذہانت کی رگ اور بھی زیادہ پھڑک اٹھتی، ان کا خاندان لوہارو کا رہنے والا تھا، انکی بیگم صاحبہ نواب مصطفٰی خاں شیفتہ کے خاندان کی ہیں جس کے بعد گھر کی زبان اور تہذیب کے متعلق کچھ لکھنا لاحاصل ہے، ابن انشا صاحب زیادہ تر مجھ سے دارالمصنفین سے متعلق سوالات کرتے رہے، سید حسام الدین راشدی صاحب تو دارالمصنفین کے نام اور اس کے کام پر ہر لمحہ نچھاور ہونے کے لیے تیار رہتے، ممتاز حسن صاحب کا یہ فقرہ ابھی تک دل کے کانوں میں گونج رہا ہے "ہندوستان کے تین ادارے اپنی خدمت اور ایثار کے لحاظ سے برابر یاد کیے جائیں گے، سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی پونا، دارالمصنفین اعظم گڈھ، اور جامعہ ملیہ دہلی، گو جامعہ ملیہ دہلی کی حیثیت اب بدل گئی ہے، سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کا حال تو اب معلوم نہیں لیکن دارالمصنفین اپنی روش پر قائم ہے"، ابن انشا صاحب نے شاید مجھکو آزمانے کی خاطر مجھ سے پوچھا کہ کیا دارالمصنفین پاکستان نہیں منتقل ہو سکتا ہے؟ سید حسام الدین راشدی صاحب بول اٹھے کہ اگر یہ پاکستان منتقل ہونا بھی چاہے تو میں اس کی مخالفت کروں گا، کیونکہ پھر دارالمصنفین دارالمصنفین نہیں رہے گا، جو کام وہاں چند ہزار روپے میں ہوتا ہے، یہاں چند لاکھ میں بھی نہ ہو سکے گا، دارالمصنفین کے رفقا یہاں آئے تو وہ روپے کمانے اور موٹر پر سیر کرنے میں لگ جائیں گے، ان میں خدمت اور ایثار کا جذبہ مفقود ہو جائے گا، میں نے سید حسام الدین راشدی صاحب سے کہا، آپ نے میرے دل کی ترجمانی کر دی، اور پھر یہ بھی کہا کہ پاکستان میں مولانا شبلی کی قبر تو نہیں ملے گی جس کے مجاور بننے کے بعد ہی سب کچھ

حاصل ہوتا ہے، یہ نشست بارہ بجے ختم ہوئی تو سید حسام الدین راشدی صاحب نے فرمایا کہ مدتوں کے بعد ایسی حسین اور رنگین رات گذاری ہے،

چلتے وقت جناب ممتاز حسن صاحب نے اپنی یاد تازہ رکھنے کے لیے اپنا نسخہ Inquest of Dae دی، جو رائٹرز گلڈ کراچی کی طرف سے بہت ہی عمدہ کاغذ اور گرد پوش کے ساتھ شائع ہوئی ہے، اسکے شروع میں روم کے پروفیسر جی، تکی کا پیش لفظ ہے جس میں انھوں نے اس استعجاب کا اظہار کیا ہے کہ مصنف جس کی زندگی اپنے ملک کے خزانے، بینک اور اقتصادیات کو سنوارنے میں گذری، وہ اپنے ملک کی تاریخ سے اتنا واقف ہے کہ دوسرے کم واقف ہوں گے، یہی نہیں بلکہ انسانی کوششوں سے جو بھی تحقیقات بر روئے کار آتی ہیں، چاہے وہ سائنس یا کسی اور سلسلہ کی ہوں، انکی توجہ ان کی طرف ضرور مائل ہوتی ہے، پروفیسر موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب کبھی پاکستان کی ثقافتی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں ممتاز حسن صاحب کو اثری اور تاریخی تحقیقات کے سرپرست، علمی سرگرمیوں کے روح رواں اور اردو زبان کی ترقی کے خواہاں اور پاکستان اور دوسری قوموں کے درمیان ثقافتی تعلقات کو فروغ دینے والے کی حیثیت سے نمایاں جگہ دیجائے گی، پروفیسر موصوف نے انکی انگریزی کے جاندار طرز ادا کی بھی تعریف کی ہے۔

پروفیسر صاحب نے ان کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے ہر اہل علم کو اتفاق ہوگا۔ اس کتاب کے آغاز میں ان کا مضمون "دیبل کی تلاش میں" ہے، اس سے پتہ چلے گا کہ سندھ میں عربوں کی حکومت کے زمانے کے اس مشہور شہر کی اصل جگہ کے پتہ لگانے میں ان کا کتنا بڑا حصہ ہے، یہ شہر مٹی کے تودے کے اندر مفقود ہوگیا تھا، لیکن اب پتہ چلا ہے کہ یہ وہاں پر واقع تھا، جہاں پر سندھ میں موجودہ بھمبھور ہے۔ اسکے بعد پاکستان میوزیم ایسوسی ایشن کے مختلف سالانہ اجلاسوں کے چھ خطبے ہیں، جن کو انھوں نے کلام پاک کی آیتوں اور فارسی اشعار سے مزین کرکے بہت دلچسپ بنا دیا ہے، ان کو پڑھنے کے بعد ہندوستان وپاک

کے انگریز، ہندو اور مسلمان ماہرین آثار قدیمہ کی ساری سرگرمیاں سامنے آجاتی ہیں، ان خطبوں میں کرسی کی محض رسمی باتیں نہیں پائی جاتی ہیں، بلکہ ان میں اسلامی اور ہندوستانی تاریخ اور اس کے آثار قدیمہ کے متعلق قیمتی معلومات حاصل ہوتے ہیں، ان کو پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ معلوم وہ بھی اس میں ہے اور جو کچھ نہ معلوم تھا وہ بھی اس میں ہے، ان تحریروں میں ایجاز کا بڑا اچھا نمونہ دوسرے اہل قلم بہت سے صفحات میں کہہ سکتے ہیں، ممتاز حسن صاحب چند سطروں میں لکھکر اپنے قلم کا جادو

اس کتاب میں انکے وہ صدارتی خطبے اور تقریریں بھی ہیں جو انھوں نے ڈھاکہ میں بلبل اکیڈمی، لاہو اسلامک کلچر کی نمائش اور کراچی میں آدم انعامات کی تقسیم کے موقع اور رائٹرز گلڈ کے سالانہ اجلاس کیں، ان میں وہی بالغ نظری، انسان دوستی، روشن ضمیری اور علوم و فنون سے دلچسپی نظر آتی ہے، جو ا خمیر میں فطری طور پر ودیعت کی گئی ہے، انکی فراخدلی کا بڑا ثبوت ان کی وہ تقریر ہے جو انھوں نے کراچی میں بودھ پورنیما کے موقع پر کی، اس میں اسلام اور بودھ مت کی بہت سی مشترک تعلیمات ذکر کرکے گوتم بودھ کو اپنا خراج عقیدت پیش کیا ہے، پھر گندھارا آرٹ کی تعریف میں انکے قلم میں بڑی دلکشی پیدا ہوگئی ہے، پاکستان میں ٹیکسلا، تخت بھائی، دیر اور سوات کو گندھارا آرٹ کا بہت بڑا مرکز مشرقی پاکستان میں پہاڑپور میں بودھ کی خانقاہ کو ایشیا کی سب سے بڑی بودھ خانقاہ بتایا ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ گوتم بودھ کی جو سب سے پہلی سوانح عمری سنسکرت میں لکھی گئی ہے، وہ پاکستان میں موجود ہے، اور اس کو روم کے پروفیسر تکی ایڈٹ کر رہے ہیں، آخر میں ممتاز حسن صاحب نے اس تجویز کیا ہے کہ بودھوں کی ایک خانقاہ کراچی میں بھی ہے جبکہ یہاں ہندوؤں کے مندر اور عیسائیوں گرجے موجود ہیں، وہ پاکستان میں مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی ایک یونیورسٹی قائم کرنے کے بھی خواہ ہیں، ان کے اس خطبہ میں بڑی مذہبی رواداری پائی جاتی ہے، جس کو پڑھ کر میرا یہ لکھنے کو جی چاہتا کہ پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ یہ رواداری کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر نہ ہو، اسلام امن

اس کا احساس وہاں کے غیر مسلموں کے دلوں میں ہونا چاہیے۔ اس برصغیر کے گذشتہ مسلمان فرمانرواؤں پر الزامات عائد کیے جاتے ہیں کہ انھوں نے غیر مسلموں کی عبادت گاہیں منہدم اور ان سے اور معاملات میں بد سلوک کرکے اپنے مذہبی تعصب کا ثبوت دیا، یہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس قسم کے اکثر و بیشتر الزامات بے بنیاد اور شر انگیز ہیں لیکن اس کو کیا کیجیے کہ یہ تاریخ کا ایک مستقل موضوع بن گیا ہے جس کی تردید کرنے میں مسلمان مورخوں کی ساری سرگرمیاں بے کار صرف ہو رہی ہیں۔ اب اس کی تلافی اس طرح ہو سکتی ہے کہ پاکستان کے خواص و عوام کی سیاسی نہیں بلکہ مذہبی پالیسی یہ ہونی چاہیے کہ وہ وہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ رواداری، فراخدلی اور انسان دوستی کے بہتر سے بہتر نمونے پیش کرکے نہ صرف اپنی تاریخ کو روشن کریں بلکہ غیر مسلموں کے دلوں کو تسخیر کرکے ان میں احساس پیدا کریں کہ اسلام واقعی صلح، آشتی امن اور محبت کا پیام ہے، ممتاز حسن صاحب نے اپنے خطبہ میں کہا ہے کہ ہم کو ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھنا ہے اور اس سے زیادہ ایک دوسرے کو معاف کرتے رہنا ہے۔ ایک دوسرے سے یہاں پر مراد مسلم اور غیر مسلم ہیں، کتنا اچھا جذبہ ہے، دعا ہے کہ پاکستان کے ہر مسلمان کے لیے یہ جذبہ راسخ عقیدہ بن جائے، ممتاز حسن صاحب نے اپنی اس کتاب میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے:

"سندھ اور اس کے نواحی علاقوں میں عربوں کی حکومت دو سو برس سے زیادہ رہی، اور یہ خاص طور پر اپنی انسانیت نوازی، رواداری اور ذہنی صلاحیتوں کو فروغ دینے کے لیے یاد کیجاتی ہے، اسلام نے بے علمی، تعصب اور نسلی امتیازات کو دور کیا، انسانوں کے ایک دوسرے کے بیجا فوائد اٹھانے کے نظام کو بھی ختم کیا، تعلیم کو مخصوص طبقہ کے لیے محدود کرنے کے بجائے تمام انسانوں کا مشترکہ حق قرار دیا، رسل و رسائل کو ترقی دی، تجارت اور صنعت کو ذات پات کے مخصوص دائروں سے آزاد کرایا، شہروں کی خوشحالی میں مدد پہنچائی، اسلام کی اس روادارانہ کشادہ دلی سے مفتوحہ علاقہ کے لوگ اسکی طرف مائل ہوئے، محمد بن قاسم کی شخصیت میں اسکی رواداری کی وجہ سے افسانویت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے جب وہ واپس بلا لیا گیا اور اسکو موت کی سزا دیگئی

تو اس کی غیر مسلم رعایا یعنی سندھ کے ہندو اور بودھ مذہب کے ماننے والے اس کے لیے روتے تھے اور اس کا بت بنا کر اس کی پوجا کرنے لگے۔" (ص ۶۰)

ہم ہندوستانی مسلمان یہی چاہتے ہیں کہ پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ اسلام کی اسی روادارانہ کشادہ دلی کا عملی نمونہ پیش کیا جائے، اسی میں اسلام کی خدمت ہے اور سربلندی بھی، ہندوستانی مسلمان خوش ہیں کہ پاکستان میں ایک عرصۂ دراز سے ہندو مسلم فسادات نہیں ہوئے، اگر خدانخواستہ وہاں کبھی فساد کی نوبت آئے تو یہ نہ صرف اسلامی تعلیمات کی اسپرٹ کے خلاف ہوگا بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہ ہوگا۔

کراچی میں دو مہینے رہا، اس اثنا میں عزیزوں اور اعظم گڈھ کے لوگوں سے بھی ملتا رہا، اپنے اعزہ میں استاذی المحترم علامہ سید سلیمان ندوی کی بیگم صاحبہ اور عزیزی خالد شرف الدین سلمہ کے علاوہ میرے ماموں ڈاکٹر سید عبدالقیوم صاحب میرے کالج کے زمانے کے عزیز دوست سید محمد محسن ایم اے، ان کے صاحبزادے صبیح محسن (انجینیر پاکستان ریڈیو)، شبلی رضا (اسسٹنٹ انجینیر)، ڈاکٹر نیر رضا (پولیس اسپتال)، ظفر احمد (ہڈ ماسٹر محمد بن قاسم ہائی اسکول) اور اعظم گڈھ کے لوگوں میں افضال مبین (انجینیر سوئی گیس)، رفعت سلطان (مینجر یونائیٹڈ بینک)، شاہ علاء الحق صاحب (سابق وکیل اعظم گڈھ)، جناب مرزا مرتضٰی بیگ صاحب (سابق رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنفین)، انور نعمانی (مولانا شبلیؒ کے بھتیجے) نے ہر قسم کی خاطر و تواضع اور دعوت و مدارات کی، اور جب کراچی چھوڑ رہا تھا، تو وہاں کے علمی حلقہ کے لوگوں اور دیگر بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کی یادوں کا ایک جلوس لیکر لاہور روانہ ہوا، ہوائی جہاز پر بیٹھا تو دل یہ کہہ رہا تھا کہ کاش ہندوستان و پاکستان دونوں کے افق پر انسان دوستی کی حسین اور بہار آفریں قوس قزح دکھائی دیتی، دونوں کی سرزمین باہمی خیرسگالی کے امرت کی بارش سے سیراب ہوتی رہتی، دونوں کے درمیان اتحاد کی سندھ، یگانگت کی ستلج، مودت کی گنگا اور فراخدلی کی برہمپتر بہتی رہتی تو نہ صرف دونوں ملکوں کے باشندوں کی بہت سی مشکلات حل ہو جاتیں بلکہ دونوں ملک ایشیا کی امیدوں کے مرکز بنجاتے، اقبال نے اس برصغیر کیلئے کبھی کہا تھا،

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز

اسی برعظیر کی سرزمین کے لیے انھوں نے یہ بھی کہا تھا:

چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ درناب
اس خاک سے اٹھتے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لیے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

دل کی اندرونی آواز کہہ رہی تھی، کبھی نہ کبھی دونوں ملکوں کے ساز کے شیریں نغموں سے دونوں حلقوں کے باشندوں کے دلوں میں یگانگت اور دوستی کی حرارت ضرور پیدا ہوگی۔

فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

لاہور میں اپنے ایک عزیز سید عبدالاحد سلمہٗ کے یہاں قیام کیا جو وہاں کے سکریٹریٹ میں ملازم ہیں، ڈھاکہ اور کراچی میں زیادہ دن لگ گئے تھے، اعظم گڈھ پہنچنے میں بہت تاخیر ہورہی تھی، اس لیے لاہور میں دو تین روز سے زیادہ قیام نہیں کرسکا، وہاں بھی دارالمصنفین کی مطبوعات کے سلسلہ میں اس کے بہی خواہوں سے کچھ گفتگو کرنی تھی، کراچی میں جناب محمود قاسم صاحب ڈائرکٹر نیشنل بک سنٹر (لاہور) نے طے کیا تھا کہ لاہور میں میرے پہنچنے پر وہ اپنے یہاں ایک شام ادب منعقد کرینگے اور لاہور کے اہلِ علم کو مدعو کرکے دارالمصنفین کے مسائل پر تبادلۂ خیالات کرائیں گے لیکن جس روز یہ اجتماع ہونے والا تھا، اسی روز ان کے دفتر کے ہال کا کچھ حصہ گر گیا، اسلیے یہ ملتوی کردیا گیا، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے رفیق اور پاکستان کے مشہور مصنف جناب شاہ جعفر حسین پھلواروی ندوی کو بقول ان کے میرا بڑا انتظار تھا، ان سے انکے گھر پر ملا، تو وہ دیکھتے ہی لپٹ گئے، کہنے لگے کہ میرے آنے کے سلسلہ میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں ایک اجتماع ہوگا، اسکے لیے وہ وقت چاہتے تھے، انکا اصرار ہوا کہ میں لاہور کا قیام کچھ اور بڑھاؤں لیکن مجھکو واپسی کی عجلت تھی، اسلیے انکے معذرت خواہ ہوا، پھر بھی دوسرے دن ان کی دعوت پر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

[illegible]

شوقی اور ان کی شاعری

۱۸۶۹ء – ۱۹۳۲ء

از جناب مولوی مقتدی حسن صاحب اعظمی فاضل الازہر یونیورسٹی، قاہرہ

(۳)

جدید رنگ شوقی کی شاعری میں قدیم کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا جدید رنگ بھی پایا جاتا ہے جو نتیجہ ہے شوقی کے سفر یورپ اور وہاں کے تجدیدی اور جدید ادبی رجحانات کے مطالعہ کا، یورپ کے قیام کے دوران میں فرانسیسی ادب سے واقفیت حاصل ہوئی، قریب سے یورپین تمدن و ثقافت کے مطالعہ اور وہاں کے ڈراموں وغیرہ کو دیکھنے کا موقع ملا، انھوں نے محسوس کیا کہ عرب شعرا کی طرح یورپ کے شعرا صرف مدحیہ قصائد ہی میں الجھے نہیں رہتے، بلکہ وہ معاشرہ کے حالات اور اپنے جذبات و خیالات کی بھی ترجمانی کرتے ہیں، اس مطالعہ سے ان میں تجدیدی رجحان پیدا ہوا، اور وہ اپنی شاعری میں نئے موضوعات کو اہمیت دینے لگے، شوقیات کے مقدمہ میں انھوں نے اس تاثر کا اظہار بڑی تفصیل سے کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ: شاعر کو صرف مدحیہ قصائد کے اندر محدود نہیں رہنا چاہیے، یہ شاعری کے تقاضے کے خلاف ہے، بلکہ پوری کائنات اس کے سامنے رہنی اور اپنے فن سے ہر چیز کی ترجمانی کرنی چاہیے، اس کے تخیل کے دائرہ کو اتنا وسیع ہونا چاہیے کہ اس کے اندر ہر چیز سمٹ آئے، اور اس کی شاعری کسی محدود دائرہ میں مقید نہ ہو۔

شوقی نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں عربی شاعری کے ڈھانچہ میں جس ضروری تبدیلی پر زور دیا

اس کی کوئی واضح مثال وہ خود اپنے شعر میں نہیں پیش کرسکے، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان پر بارودی کی تحریک کا بہت زیادہ اثر تھا، اسی تاثیر کی وجہ سے انھوں نے فرانسیسی ادب پر زیادہ توجہ نہیں کی، رزمیہ قصائد، فراعنہ اور نیل سے متعلق اشعار میں انھوں نے ایک نیا راستہ ضرور اختیار کیا ہے، مگر ان کے علاوہ دیگر قصائد میں یہ رنگ نمایاں نہیں ہے، طٰہ حسین نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ شوقی نے قدیم یونانی ادب اور جدید فرانسیسی ادب اور ان سے پیدا ہونے والے جدید رجحانات کو بہت زیادہ قریب سے نہیں دیکھا، اس لیے ان کی شاعری میں تجدید کا نمایاں رنگ نہیں پیدا ہو سکا۔

لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ شوقی کی شاعری میں یورپین رجحانات ملتے ہیں، تاریخی اشعار میں یہ رنگ زیادہ نمایاں ہے، یہ صحیح ہے کہ قدیم رجحان کے مقابلہ میں جدید رجحان غالب نہ آسکا، اور شوقی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ قدیم عربی شاعری ہی کو فروغ دینے میں صرف کیا۔

مؤثرات | شوقی کی شاعری جن چیزوں سے متاثر ہوئی اور جن کی وجہ سے انکی شاعری میں نیا موڑ پیدا ہوتا رہا ان میں سب سے پہلے اس دور کے ناقدین کا نام آتا ہے، انیسویں صدی سے بیسویں صدی کے اوائل تک عربی تنقید بالکل خشک، بے روح اور غیر دلچسپ تھی، تنقید نگار لغت، نحو وصرف عروض اور بلاغت کے معیار سے آگے نہیں سوچ سکتے تھے، شوقی نے شاعری کے میدان میں تمام قواعد سے مسلح ہو کر قدم رکھا، تاکہ ناقدین کی گرفت سے بچ سکیں، شیخ حسین المرصفی کی کتاب "الوسیلۃ الادبیہ" اس سلسلہ میں ان کا قابلِ وثوق ماخذ تھی۔

۱۸۹۸ء میں جب شوقی نے اپنے دیوان "الشوقیات" کا پہلا حصہ شائع کیا تو اس کے مقدمہ میں شعر کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کیا، اور فرانسیسی ادب کی روشنی میں عربی شاعری میں تجدید کی کوشش کی، تنقید نگاروں نے شوقی کی اس کوشش کو عربی شاعری کی روایات کے خلاف بغاوت تصور کر کے ان کی مخالفت کی، کیونکہ وہ یہ سوچ نہیں سکتے تھے کہ قدیم روایات سے ہٹ کر بھی عربی

شاعری کو باقی رکھا جاسکتا ہے، اس لیے شوقی اور ناقدین میں ٹکراؤ پیدا ہوا جس کی گونج آج بھی سنائی دے رہی ہے۔

محمد المویلحی نے رسالہ "مصباح الشرق" کے متعدد مضامین میں شوقی کے اس تجدیدی رجحان پر کڑی نکتہ چینی کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عربی شاعری کو اس طرح کی تجدد پسندی کی چنداں ضرورت نہیں ہے، اور شوقی کی بعض لغوی لغزشوں کا سہارا لیکر انکی شاعری کو بے وزن کرنا چاہا۔[1]

اسی طرح الیازجی نے اپنے افسانہ "عذراء الهند" میں شوقی پر زبردست نکتہ چینی کی۔[2]

ان تنقیدوں سے شوقی متاثر ہوئے، انھیں اس کی توقع نہیں تھی کہ ان کے فن کے ساتھ ایسا سخت برتاؤ کیا جائے گا، اس لیے شروع میں وہ ڈر گئے، اگر وہ ان کی نکتہ چینیوں پر توجہ نہ دیتے تو اس کا ان کے فن پر اچھا اثر پڑتا، کیونکہ یہ تنقیدیں لغوی اعتبار سے بھی کسی مخصوص قاعدہ یا طرز فکر پر مبنی نہیں تھیں ناقدوں نے اپنے ذاتی خیال اور محدود نقطۂ نظر کی بنا پر شوقی کو نکتہ چینیوں کا ہدف بنایا تھا، ہر نئی چیز سے انھیں نفرت تھی، اور صرف اس لیے کہ یہ چیزیں ان کے ذوق اور موروثی افتاد ذہن کے خلاف تھیں اپنے مالوف نہج سے ہٹ کر وہ کسی چیز سے مطمئن نہیں تھے،

مغربی ادب و ثقافت اور تہذیب و تمدن کے رواج کے بعد شعرا میں نمایاں تبدیلی ہوچکی تھی، ان کے احساس میں نزاکت اور مزاج میں رقت پیدا ہوگئی تھی، اور ان کا ذوق شاعری بہت کچھ سنور چکا تھا، شوقی اور ان کے جیسے دوسرے شعرا نے یہ محسوس کیا کہ محدود روایتی عربی شاعری میں امرؤ القیس اور زہیر سے لیکر آج تک ایک ہی طرز کے افکار و خیالات اور اسلوب کو دہرایا جارہا ہے، اس لیے جدید دور کے لوگوں کے لیے اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی ہے، شعراء میں تو اس رجحان سے تبدیلی پیدا ہوگئی، لیکن تنقید اس نئے رجحان کے ساتھ نہیں

---

[1] مختارات المنفلوطی ص ۲۴۶ و مابعد [2] شکیب ارسلان: شوقی ص ۵۴

چل سکی ۔ ناقدوں نے ایسے ادیبوں اور شاعروں کو ادب کا باغی قرار دیا اور لغت و قواعد کا سہارا لیکر قدیم ڈھانچہ کی حمایت و حفاظت کے لیے آمادہ ہو گئے ۔ ان لوگوں کا شاید خیال یہ تھا کہ یورپ کی مادی تہذیب سے مشرق میں جو زندگی کا نیا ڈھانچہ بن گیا ہے ، شاعری کے قدیم اسلوب پر اس کا اثر نہ پڑنا چاہیے ، اس ادبی جمود سے بہت سے ادبا فصیح عربی زبان میں لکھنے ہی کے مخالف ہو گئے ، اور عامی زبان کو اپنا ترجمان بنا لیا ۔ لیکن شوقی نے زبان کے خلاف اس بغاوت میں حصہ نہیں لیا ، اور شاعری کی قدیم روایات اور ڈھانچہ کو باقی رکھا مگر ان کے تنقید نگار اس سے بھی مطمئن نہیں ہوئے ، ان کی خواہش تھی کہ شوقی منظوم ڈراموں اور فرانسیسی شاعری کے نمونوں کی تقلید اور موروثی عربی شاعری سے کسی طرح تجاوز نہ کریں ،

ناقدین کی اس روش کا شوقی پر گہرا اثر پڑا ، چنانچہ تجدید کا جو رجحان ان کے دیوان شوقیات کے مقدمہ میں نمایاں نظر آتا ہے وہ بعد میں مدھم ہونے لگا ، اور شوقی قدیم عربی شاعری کے دائرہ میں محدود ہو گئے ، متقدمین شعراء کا تتبع کیا ، اور اسی کو اپنے فن کی آماجگاہ بنا لیا ، لیکن جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں تقلید و تتبع کے اس میدان میں بھی ان کا فنی کمال نمایاں ہو گیا ، اور بہت سے قصیدوں میں وہ اپنے پیشرو شعراء سے آگے بڑھ گئے ۔[1]

یہ تنقید تلخ تو ضرور تھی لیکن اس سے یہ فائدہ ہوا کہ شوقی شاعری میں بہت زیادہ محتاط ہو گئے ، اور قدیم طرز سخن میں اتنی مہارت حاصل کی کہ بعض قصیدوں میں قدیم روایات اور فن محاکات کی تصویر پیش کر دی ، دوسری طرف اس تنقید کا مضر اثر یہ پڑا کہ شوقی کے تجدیدی حوصلوں پر بندش لگ گئی اور دیوان کے مقدمہ میں انھوں نے شاعری میں جن نئے ابواب کے اضافہ کی طرف اشارہ کیا تھا ، وہ معرض وجود میں نہ آ سکے ، منظوم ڈراموں کا سلسلہ بھی

---

[1] شوقی ضیف : شوقی شاعر العصر الحدیث ص ۹

ناتمام رہ گیا، اور شوقی اپنے ممدوح خدیوؔ کی تعریف کے لیے وقف ہو کر رہ گئے۔

اس کے بعد ادبی زندگی میں ایک نیا موڑ پیدا ہوا، مغربی ادب شعراء اور ادیبوں کا ربط زیادہ بڑھا، فرانسیسی ادب کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کا بھی انھوں نے مطالعہ کیا ان کے ادبی نمونوں کو دیکھنے کے ساتھ یورپین مصنفین کی تنقید کو بھی پڑھنے کا انھیں موقع ملا اس سے انھیں اندازہ ہوا کہ جدید عربی ادب مغربی ادب کے مقابلہ میں انتہائی محدود اور زندگی کے میدان میں بالکل قاصر ہے۔

اس سے ادبا کی ایک جماعت میں تنقید و شاعری کا ... نیا رجحان پیدا ہوا، جو قدیم رجحان سے یکسر مختلف تھا، اس جماعت میں ازہر کا کوئی ادیب نہیں، سب جدید تعلیم یافتہ تھے، جو ہر طرح کے تعصب اور جمود سے خالی الذہن تھے، یہ بیسویں صدی کے اوائل کا زمانہ تھا، اس نئی تحریک کے لیڈر عبدالرحمٰن شکری، ابراہیم عبدالقادر المازنی اور عباس محمود العقاد تھے، اول الذکر دونوں مدرسۃ المعلمین العلیا کے تعلیم یافتہ تھے، عقاد نے کسی مدرسہ میں تعلیم نہیں حاصل کی تھی، بلکہ اپنی خداداد صلاحیت اور وسیع مطالعہ کی بدولت اپنے دونوں ساتھیوں ہی کی طرح مغربی ادب سے پوری طرح واقف اور اس کی وسعتوں سے آگاہ تھے۔

عبدالرحمٰن شکری کی توجہ تمامتر تنقید کے بجائے شاعری پر رہی، انھوں نے جدید عربی شاعری میں ایسے ادب کا اضافہ کیا جس میں کسی کی مدح و توصیف کے بجائے انسانی زندگی اور اس کے خیر و شر اور آلام و مصائب کی ترجمانی تھی، انھوں نے ۱۹۰۹ء میں جدید شاعری پر مشتمل دیوان کا پہلا حصہ شائع کیا، شکری صرف شاعر تھے، اور عقاد اور مازنی نقاد بھی تھے اور شاعر بھی، انھوں نے جدید شاعری کا نمونہ بھی پیش کیا، اور جدید تنقیدی رجحان کو بھی آگے بڑھایا، مشہور انگریز ادبا اور تنقید نگاروں کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔[1]

---

[1] المازنی: الشعر غایاتہ و وسائطہ طبع ۱۹۱۵ء

ان کی کوشش سے عربی تنقید میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا، اور قدیم اسکول کے حامیوں کے دوش بدوش نیا طبقہ بھی میدان میں اتر آیا جو بہت جلد پرانے طرز کے ناقدین پر چھا گیا۔ مازنی، عقاد اور شکری کے ہاتھوں جدید تنقید کی جو تحریک پروان چڑھ رہی تھی، اس نے بیسویں صدی کے شروع ہی میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا۔ ۱۹۱۳ء میں عقاد نے شکری کے دیوان کے دوسرے حصہ کا مقدمہ لکھا، اس میں شکری کی تجدیدی کوششوں کو سراہتے ہوئے جدید شاعری کے موضوع پر بھی روشنی ڈالی، اور بتایا کہ شاعری میں قوم کی مادی و سماجی زندگی اور خود شاعر کی نفسیات کی ترجمانی ضروری ہے، جدید شاعری کی جن لوگوں نے اس بنا پر مخالفت کی تھی کہ اس کا یہ اسلوب انگریزی ہے، عربی اسلوب سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اس کا جواب دیتے ہوئے عقاد نے دیوان کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ شعر کو نفس انسانی کا ترجمان ہونا چاہیے، اس میں مشرقی و مغربی اور انگریز اور غیر انگریز کی کوئی قید نہیں ہے، اس مقدمہ میں شکری اور ان کے جدید طرز شاعری کا مکمل دفاع کیا، اس کے بعد جب مازنی نے اپنا دیوان شائع کیا تو اس کے پیش لفظ میں عقاد نے اس دور کی شاعری، تنقید اور تجدیدی رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا کہ: بیس سال قبل کے حالات سے آج کے حالات بالکل مختلف ہیں، ادب کی بساط پر ایسے لوگ آچکے ہیں جنھیں ماضی سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا، نئے ادب کے مطالعہ کی بدولت وہ بہت آگے جا چکے ہیں، ان کا احساس و شعور مشرقی ضرور ہے، لیکن دنیا کو وہ اسی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس نگاہ سے ایک مغربی دیکھتا ہے۔ لکھنے والوں کے قلم اب آزاد ہو چکے ہیں اور انھوں نے مصنوعی قیود کا پردہ چاک کر دیا ہے، شعرا میں آزادی کی ایسی روح پیدا ہو چکی ہے جس نے آج کے ادب کو بہت اونچا مقام عطا کیا ہے، آج کا شاعر اگر غمگین ہے تو کسی کو تہنیت نامہ نہیں لکھ سکتا۔ خلوت میں جس کی مذمت اور ہجو کرتا ہے جلوت میں اس کی تعریف نہیں کر سکتا۔ اپنے فن کو وہ عطایا و تحائف کے عوض نہیں بیچتا جس طرح

ایک تاجر اپنا سامان بازار میں فروخت کرتا ہے،

عقاد نے اس مقدمہ میں جدید اسکول کے اصول و نظریات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ نئی نسل کا شاعر خود اعتمادی سے الامال اور ریاکاری و خوشامد سے کوسوں دور رہتا ہے، مدح و تعریف کے رجحانات اور تکلف و تصنع کی بیڑیوں سے وہ آزاد ہو چکا ہے۔ اس کے کلام میں نہ تو مدح و تہنیت کے اشعار ہیں، اور تقریبات میں سنانے والے قصائد۔ اسکی شاعری تجربات کا نچوڑ، ذاتی رجحانات و شعور کی ترجمانی، لوگوں کی زندگی کی تصویر اور ان کے افکار و خیالات کا مرقع ہے

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جدید عربی تحریک کے تینوں رہنماؤں میں جو قدیم روایات کے حامیوں سے برسرپیکار رہتے تھے خود اختلاف پیدا ہو گیا اور مازنی و شکری میں قلمی معرکہ آرائی شروع ہو گئی، چنانچہ شکری نے اپنے دیوان کے پانچویں حصہ کے مقدمہ میں مازنی پر مغربی شعرا سے سرقہ کا الزام لگایا اور ان پر بڑی تنقید کی، اس دوران میں جنگ عظیم ختم ہو گئی اور شوقی وطن واپس آ گئے، عقاد و مازنی کے نزدیک شوقی کی شاعری بالکل ناقابل اعتنا تھی اور جدید ادبی اسکول سے اس کا کوئی میل نہیں تھا اور اس پر انھوں نے بڑی تنقیدیں کیں، شوقی کے حامی اور ادیبوں نے بھی اس کا پورا جواب دیا جس کی تفصیل بڑی طویل ہے۔

فروری ۱۹۲۳ء میں جب مصر میں پارلیمانی نظام قائم ہوا اور مصری عوام کو رائے کی آزادی ملی تو مختلف سیاسی پارٹیوں کا وجود عمل میں آیا، الہلال اور المقتطف وغیرہ ادبی و سیاسی رسالوں کے ذریعہ سیاسی و تنقیدی ادب کے میدان میں بھی سرگرمی پیدا ہوئی، اسی دور میں طہٰ حسین نے جاہلی دور کے ادب پر شکوک نگاہ ڈالی اور یہ دعویٰ کیا کہ اسکی تاریخ قطعی نہیں کہی جا سکتی، انھوں نے اس موضوع پر جب اپنی کتاب شائع کی تو ادبی دنیا میں

زبردست ہیجان پیدا ہوگیا۔ اور ان کے مقابلہ اور تردید کے لیے ایک گروہ اٹھ کھڑا ہوا جس کا مقصد عربی زبان کے قدیم ادبی سرمایہ و نظریات کا تحفظ تھا۔

یہ اختلاف طرفین اور ان کے مخالفین کا اختلاف نہیں رہ گیا تھا۔ بلکہ اس کی حیثیت ایسے اختلافی مسئلہ کی ہوگئی جس نے دو مختلف مکتب فکر یعنی مجددین (تجدید پسند) اور مخالفین (قدامت پرست) پیدا کر دیے، قدیم مکتب فکر کی رہنمائی مصطفےٰ صادق الرافعی کر رہے تھے، جو صرف طہٰ حسین ہی کے نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کے شدید مخالف تھے جو عربی ادب سے بغاوت یا اس میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے۔ الہلال میں ان کے اور سلامہ موسیٰ کے درمیان "قدیم وجدید" کے موضوع پر طویل بحث و مناظرہ کا سلسلہ شروع ہوگیا، سلامہ موسیٰ عربی ادب کے پورے سرمایہ کو مشکوک نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مادی زندگی بدل چکی ہے، اس لیے شعور و جذبات میں تبدیلی اور ادب اور تعبیر کا طرز بدلنا بھی ضروری ہے۔ اس کے مقابلہ میں رافعی کا خیال تھا کہ عربی ادب میں ہر جدید رجحان کو سمونے کی گنجائش موجود ہے۔ اس لیے اس کے ڈھانچہ کو بدلنا غلط ہے، عربوں کے اسلوب اور طرز کے خلاف جو ادب بھی ہوگا وہ عربی ادب نہیں کہلا سکتا۔ اس معرکہ آرائی میں آگے چل کر عقاد بھی شریک ہوگئے، اور ان کے اور رافعی کے درمیان مضامین کا سلسلہ شروع ہوگیا، رافعی نے اپنی کتاب "علی السفود" میں عقاد اور ان کے نظریات و اشعار پر زبردست تنقید کی ہے،[1]

عربی تنقید کی اس گرم بازاری کے دوران میں نئی نسل کے ناقدوں نے بھی مختلف رسالوں میں لکھنا شروع کیا، اور ادب کی تحلیل و تجزیہ سے متعلق متعدد مسائل اٹھ کھڑے ہوئے،

---

[1] شوقی شاعر العصر الحدیث ص ۱۰۷)

شاعری میں "قدیم و جدید" کے موضوع پر لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ شوقی کی شاعری اب صرف مدحیہ قصائد تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ قومی زندگی اور تعمیری کاموں سے متعلق نئے موضوعات و حالات پر بھی اظہارِ خیال کرنے لگے تھے، اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ شوقی کے آخری صنف کے اشعار بھی ان کے مدحیہ قصائد کی طرح ناقابلِ اعتنا رہیں، یا جدید شاعری میں ان کا کوئی قابلِ ذکر مقام ہے۔ اس موضوع پر طہٰ حسین، مازنی اور عقاد سبھی نے روشنی ڈالی، اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ شوقی کی تجدیدی کوشش نامکمل ہے، کیونکہ شاعر نے اپنے آپ کو واقعات سے اس طرح وابستہ کر دیا ہے کہ اگر وہ واقعات رونما نہ ہوں تو اس کا قلم خاموش رہے گا۔ حالانکہ شاعر کا اصول یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی شاعری کا ایک واضح مقصد رکھے، اور اسی پر اس کی توجہ مرکوز رہے۔ واقعات کے جھونکوں کے ساتھ گھومنے میں کوئی کمال نہیں ہے۔ ان ناقدوں میں خصوصیت کے ساتھ عقاد نے شوقی پر زبردست تنقید کی اور لکھا: لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جدید اور عصری شاعری کا مطلب ایجادات و اختراعات کا تذکرہ ہے۔ اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ لازم ہوگا کہ شعراء کارخانوں و فیکٹریوں سے مربوط رہیں، اور جب بھی کوئی نئی چیز ایجاد ہو، تو اس کو اپنے اشعار میں جگہ دیں۔ یورپ اور امریکہ کے شعراء نے تو ایسے موضوعات پر بہت کم لکھا ہے، پھر بھی ہم انہیں قدیم یا تقلیدی شاعر نہیں کہہ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ قدیم معیار سے شاعری کو جانچنا چاہتے ہیں اور ان پر جاہلی دور کی شاعری چھائی ہوئی ہے۔ اور وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ تجدید پسند ہیں۔ جاہلی شعراء نے اگر اونٹنی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا تو ان لوگوں کو ہوائی جہاز پر اشعار کہنا چاہیے۔ گویا شاعری کا مقصد ذرائع حمل و نقل تک محدود رہنا چاہیے۔ جدید علوم سے تعلق رکھنے والے بعض افراد بھی یہ سمجھتے ہیں کہ شاعر جب تک اپنے زمانہ کے تمام سماجی معاملات پر قصائد نہ لکھے اس وقت تک اسے اپنے دور کا ترجمان نہیں مانا جا سکتا، مگر یہ ستم ظریفی ہے۔

گوشے کا پوار دیوان دیکھ جائیے، جرمنی کی سیاسی کشمکش سے متعلق ایک شعر بھی نہیں ملے گا، پھر بھی تمام ناقدین اسے متفقہ طور پر جرمنی کا سب سے بڑا قومی شاعر تسلیم کرتے ہیں۔[1]

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۳۰ء کی درمیانی مدت میں شوقی پر مختلف لوگوں نے مختلف حیثیتوں سے تنقید کی جن میں عقاد اور طٰہٰ حسین کی تنقید زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ شوقی نے مختلف مناسبتوں پر جو اشعار لکھے تھے، ان سے طٰہٰ حسین بالکل مطمئن نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شوقی اور ان کے ہم مشرب حافظ معلومات و مطالعہ کے میدان میں سستی کا شکار ہیں۔ اسی اثنا میں احمد لطفی السید نے جب ارسطو کی کتاب "الاخلاق" کا ترجمہ کیا تو شوقی نے ایک عمدہ قصیدہ لکھا۔ اور افلاطون کے بعض نظریات کو اس کے شاگرد ارسطو کی جانب منسوب کر دیا۔ طٰہٰ حسین کو موقع مل گیا، انھوں نے شوقی پر بڑی لے دے کی، اور فلسفیانہ معلومات میں ان پر کوتاہی کا الزام لگایا۔[2]

لیکن یہ سب کو معلوم ہے کہ شاعر نظریہ کی ترجمانی نہیں کرتا، اس کی بنیادی ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ شعور اور احساس کو الفاظ کا جامہ پہنا دے۔ اس لیے جن لوگوں نے شوقی سے فلسفہ کی تعبیر یا مغربی شاعری کی تقلید کا مطالبہ کیا تھا، وہ حق بجانب نہیں تھے، ان کی رائے میں غلو ہے، مثلاً شکسپیر کے بارے میں شوقی کے قصیدہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے طٰہٰ حسین لکھتے ہیں: شوقی کے اس قصیدہ کو پڑھنے والے جان سکتے ہیں کہ انگریز شاعر کے بارے میں شوقی کا مطالعہ محدود تھا اور محض شکسپیر کی ستائش ہے، اور شکسپیر کے اشعار کو انجیل کی آیتوں سے اور ان کے مفہوم کو حضرت عیسیٰؑ کے مفہوم سے تشبیہ دی گئی ہے، معلوم نہیں حضرت عیسیٰؑ اور شکسپیر میں کونسی چیز مشترک ہے، اور ایک شاعر کے ادب کو انجیل سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے، شاید ہمارے شاعر نے یہ سوچا کہ

---

[1] العقاد: ساعات بین الکتب ص ۱۱۹، مطبوعہ سنہ ۱۹۲۹ء [2] طٰہٰ حسین: حافظ و شوقی ص ۱۱۵

اس سے پڑھنے والوں پر ایک تاثر قائم ہوگا، اور وہ الفاظ کے شکوہ و جلال میں کھو کر مفہوم سے غافل ہو جائیں گے۔ حالانکہ اسی شاعر کے بارے میں فرانسیسی اور جرمن شعراء کی رائے پڑھیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ شوقی کے افکار ان کے مقابلہ میں بالکل بے وزن ہیں، حالانکہ موضوع دونوں کا ایک ہے۔"[1]

طٰہٰ حسین اور عقاد نے شوقی پر جو تنقید کی ہے اس کا بیشتر حصہ اسی طرح کے تحکم اور بیجا اعتراض پر مبنی ہے، یہ دونوں شوقی کی شاعری کو مغربی تنقید کے معیار سے جانچتے تھے، شوقی پر ان کا اعتراض یہ تھا کہ وہ قدیم شاعری کے ڈھانچوں اور تصویروں کو اپنے اشعار میں بعینہٖ نقل کر دیتے ہیں جس سے ایک طرح کا تکلف ظاہر ہوتا ہے، ترکی میں "ام المحسنین" کی واپسی پر شوقی نے ایک قصیدہ لکھا جس کے چند اشعار یہ ہیں :-

(۱) ارفعی الستر وحیی بالجبین وارینا فلق الصبح المبین

(۲) وقفی الهودج فینا ساعة نقتبس من نور ام المحسنین

(۳) واترکی فضل زمام بیننا نتناوب نحن والروح الامین

(۱) پردہ اٹھا کر چہرے سے سلام کرو اور ہمیں نور صبح دیکھنے دو۔

(۲) تھوڑی دیر ہودج کو روکے رکھو تاکہ ہم ام المحسنین سے روشنی حاصل کر لیں۔

(۳) اور ہمارے لیے لگام کا باقیماندہ حصہ چھوڑ دو اسے ہم اور روح الامین پکڑے ہوئے چلیں گے۔

ظاہر ہے ام المحسنین کی واپسی ہودج میں نہیں بلکہ موٹر میں ہوئی تھی، نہ وہاں زمام تھی نہ پردہ نہ کچھ اور، اس لیے ناقدین نے اعتراض کیا کہ شوقی کو اپنی شاعری میں واقعیت پسندی سے کام لینا چاہیے، اور ہودج کے بجائے موٹر کہنا چاہیے تھا، مگر وہ حال سے کھنچ کر ماضی کی طرف چلے جاتے ہیں، اور جاہلی دور کی اونٹنی اور اونٹ کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاہرہ کی متمدن اور شہری زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، مواصلات کے وسائل اب چونکہ بالکل

[1] طٰہٰ حسین: حافظ و شوقی ص ۲۰۳

بدل چکے ہیں، اس لیے آج کی شاعری میں قدیم وسائل کا تذکرہ حال سے گریز اور ماضی سے بیجا تعلق کی حیثیت رکھتا ہے، اس سے شاعری "واقعیت" کے بجائے "فرضی" ہو جاتی ہے لیکن اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو اس طرح کے استعمالات میں کوئی حرج نہیں، شاعر جب ان چیزوں کو استعمال کرتا ہے تو اس کا مقصد بعینہ یہی چیزیں نہیں ہوتیں بلکہ ان سے رمز کے طور پر وہ آج کی مروجہ اشیا، مراد لیتا ہے، ہودج کا تذکرہ اسلیے کیا گیا ہے کہ قدیم شاعر کی ایک جانی پہچانی چیز کے ذکر سے کلام میں وقار اور جلال پیدا کیا جائے، ناقدین کو اعتراض سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے تھا کہ شاعر کو خود معلوم ہے کہ یہ قدیم زمانے کی سواری ہے جس کو اب کوئی استعمال نہیں کرتا، اس کے باوجود اس نے اس کا نام کیوں لیا؟ اسکی وجہ صرف یہی ہے کہ اس سے شاعری میں ایک طرح کا جمال پیدا ہو، اور ماضی کا وقار اس سے وابستہ ہو جائے، وہ ان چیزوں سے کبھی حقیقی معنی مراد نہیں لیتا بلکہ رمز کے طور پر وہی وسائل اور صورتیں مراد ہوتی ہیں، جو آج قدیم وسائل کی جگہ لے چکی ہیں۔

دنیا کا ہر فرد جانتا ہے کہ انسان اپنے ماضی سے اپنا رشتہ یکسر ختم نہیں کر سکتا، اس سے اس کا لگاؤ برابر باقی رہتا ہے، اور اس میں جو کشش اس کے لیے موجود ہے اس میں کمی نہیں آتی، ایسی صورت میں اگر ہم شوقی کو اس جذبہ کے اظہار سے محروم رکھیں تو یہ یقیناً ناانصافی ہوگی، البتہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ شوقی قدیم ڈھانچہ اور تصاویر کی تقلید میں کہاں تک کامیاب رہے، اور اس تتبع میں اپنے جذبات و خیالات کی ترجمانی کس طرح کی ہے، محض قدیم عناصر کے استعمال پر نکیر کرنا بڑی زیادتی ہے، جبکہ وہ مفہوم کی ادائیگی اور جذبات کی تصویر کشی میں پوری طرح کامیاب ہیں اور اس سے ان کے کلام میں کوئی شاعرانہ نقص نہیں پیدا ہوتا، بلکہ اس میں وہ بسا اوقات اپنے پیش روؤں سے آگے نکل گئے ہیں، پھر وہ صرف قدیم عناصر

کے دائرہ میں محدود نہیں ہے، بلکہ قدیم وجدید کے امتزاج کا عمدہ نمونہ بھی پیش کیا ہے جس سے عربی شاعری کی روح بھی باقی رہتی ہے، اور موجودہ دنیا سے بھی تعلق منقطع نہیں ہوتا،

شوقی پر تنقید کرنے والوں میں طہٰ حسین، عقاد سے زیادہ معتدل اور حقیقت شناس ہیں، انھوں نے شوقی پر تنقید میں مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے، اور ہمیشہ ان کی فنی صلاحیتوں اور ذہنی تفوق کو سراہا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ شوقی عربی شاعری میں اس کی قدیم تر و تازگی واپس لائے اور مصر کی جدید ترقی کے لیے راستہ ہموار کیا جس سے آج مصر کو اسلامی ممالک میں عرب شعراء کی قیادت و رہنمائی کا مقام حاصل ہوا[1]. لیکن عقاد نے شوقی کے ہر قصیدہ کو بے وزن ثابت کرنے میں پورا زور صرف کر دیا،

ناقدین نے شوقی اور ان کی شاعری پر جو تنقیدیں کیں ان سے شوقی اور ان کے فن کو بڑا فائدہ ہوا، اور اس کے بہترین نتائج برآمد ہوئے، اسی سے عوام سے ان کا ربط پیدا ہوا، اور انھوں نے ان کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی، لیکن اس تبدیلی سے ان کے ناقدین کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، اور وہ شوقی کے ہر قسم کے اشعار پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے رہے، ان کا خیال تھا کہ شوقی اپنی شاعری اور منظوم ڈراموں میں بھی یورپ کے شعراء کی بلندی کو چھونے سے قاصر رہے۔

عوام اور صحافت انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مصر کے شعرا، جمہور سے عام طور پر متاثر نظر آتے ہیں، اس سے پہلے کی ادبی تاریخ میں یہ چیز کم ملتی ہے ابو تمام اور متنبی جیسے ممتاز شعراء کا پورا کلام امراء و سلاطین اور ان کے مصاحبین کے تذکرے سے پُر ہے، ان کی شاعری کا محور عوام کے بجائے صرف دولتمند طبقہ ہے، اسی لیے قرون وسطیٰ

---

[1] شوقی شاعر العصر الحدیث ص ۱۱۵

کی عربی شاعری مسلم عوام کی ترجمانی و تصویر کشی سے قاصر ہے، اس میں انکے رجحانات و احساسات کو کوئی مقام نہیں دیا گیا ہے، خود شوقی کے استاد بارودی کی شاعری اس سے خالی ہے، لیکن بعد کے دور میں تعلیم کی اشاعت اور طباعت کے وسائل کی فراوانی سے بیشتر شعرا کو عوامی مسائل اور ان کے جذبات و احساسات کا لحاظ رکھنا پڑا، اس سے ان کی شاعری میں جدت و تازگی پیدا ہوئی، اور انھوں نے اخبارات و رسائل میں اپنا کلام نشر کرنا شروع کیا، شوقی اور حافظ وغیرہ کا اس میں بڑا حصہ ہے، اس کے اثرات ان کی شاعری میں نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں،

مغربی حکومتوں نے جب ترکی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تو اس سے عام مسلمانوں میں ان کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا، شوقی نے بھی اپنی شاعری میں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی، چنانچہ شوقیات میں ایسے قصیدوں کی کثرت ہے، جن میں ترک قوم اور خلیفہ کی شجاعت و بہادری اور ان سے وابستہ امیدوں کا تذکرہ ہے، شوقی کی رگوں میں ترکی نسل کا بھی خون تھا، اس لیے انکی اس شاعری میں اور زیادہ گرمی اور جوش پیدا ہو گیا، اور ترکوں سے متعلق ان کے اشعار میں غیر معمولی جلال و جمال نظر آتا ہے۔

ایسے اشعار میں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی تھی، اس لیے ان میں مذہبی عنصر زیادہ ہے، اور خلیفہ کی جو مدح ہے، اس کی حیثیت سلاطین کی شان میں مدحیہ قصائد سے مختلف ہے، یہ مدحیہ قصیدے خلیفہ کو سنانے یا انعام حاصل کرنے کے لیے نہیں لکھے گئے تھے، بلکہ ان کے مخاطب مسلم عوام تھے، اس لیے ان میں ان کے جذبات کا احترام اور ان کے دینی شعور کی ترجمانی ضروری تھی، اس میں شوقی پوری طرح کامیاب ہوئے، ترکی خلیفہ کی مدح کے قصیدوں میں اسلامی جذبات کی بہترین عکاسی کی ہے، "صدی الحرب" (جنگ کی صدائے بازگشت)

کے عنوان سے جو قصیدہ لکھا، اس کا مطلع ہے

بسیفک یعلو الحق والحق اغلب — وینصر دین اللہ ایان تضرب

(تمہاری شمشیر سے حق بلند ہوتا ہے اور حق ہمیشہ غالب ہوتا ہے، تمہاری ہر ضرب میں دین کی نصرت اور مدد ہوتی ہے)

ظاہر ہے کہ ان دینی جذبات کے مخاطب خلیفہ نہیں، بلکہ مصری اور عرب عوام تھے، یہ عربی شاعری کی تاریخ کا اہم موڑ تھا، اور اس کے بعد شعراء نے عوام اور جمہور کو اپنے کلام میں ہمیشہ پیش نظر رکھا، اور ان کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی۔

پورا قصیدہ اسی طرح کے دینی جذبات اور ترکوں کی شجاعت و بہادری کے تذکرے سے معمور ہے، آخر میں خلیفہ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فلازلت کهف الدین والهدی الذی — الی اللہ بالزلفی له نتقرب

تو ہمیشہ دین کی پناہ اور رہنما کی حیثیت سے باقی رہ اور تیرے تقرب سے ہم خدا کا قرب حاصل کرتے رہیں۔

پھر یہ دینی جذبہ آگے بڑھکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح تک پہنچ گیا، شوقی سے پہلے بھی شعراء نے نعتیہ قصائد لکھے تھے، ان میں البوصیری کے قصیدۂ ہمزیہ اور قصیدہ بردہ کو زیادہ شہرت حاصل ہے، شوقی نے البوصیری کے تتبع میں دو قصیدے لکھے، ہمزیہ اور میمیہ، ہمزیہ قصیدہ کا مطلع ہے،

ولد الهدی فالکائنات ضیاء — وفم الزمان تبسم وثناء

ہادی عالم کی ولادت سے کائنات منور ہے، اور زمانہ سراپا تبسم و تعریف

اس قصیدہ میں شوقی نے البوصیری کے خیالات و معانی کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور اسلامی توحید اور اسلام کے سیاسی وسماجی نظام کی طرف بھی

اشارہ کیا ہے، کہتے ہیں:

انصفت اھل الفقر من اھل الغنی　　فالکل فی حق الحیاۃ سواء

فلو ان انسانا تخیر ملۃ　　ما اختار الا دینک الفقراء

(آپ نے فقرا اور مالدار کے درمیان انصاف کر کے حق زیست میں سب کو مساوی قرار دیا اگر لوگوں کو مذہب کے انتخاب کی آزادی دیدی جائے تو فقرا آپ ہی کا مذہب اختیار کریں گے)

قصیدہ بردہ کی مقبولیت بے مثال ہے، اسے پڑھکر آج بھی لوگوں پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ احمد زکی لکھتے ہیں

البوصیری کا تتبع ہر زمانہ میں بے شمار لوگوں نے کیا لیکن ان کے قصیدہ بردہ کو جو مقبولیت حاصل ہوئی تھی وہ آج تک باقی ہے، شوقی کے قصیدہ سے بھی بردہ کی اہمیت کم نہیں ہو سکی، مگر خود اس قصیدہ کو بھی بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، مصر میں حدیث کے استاذ الاساتذہ اور جامعہ ازہر کے شیخ سلیم البشری نے اس کی شرح لکھی، شوقی نے یہ قصیدہ اپنے دور شباب میں لکھا تھا، شیخ ازہر کے قلم سے اس کی شرح شوقی کی کامیابی اور مقبولیت کی واضح دلیل ہے[1]

شوقی کی شاعری میں جلا وطنی کے بعد ہی سے تبدیلی پیدا ہو گئی تھی، اور وہ قصر کی محدود زندگی سے نکل کر ایک وسیع فضا میں آگئے تھے، اور ان میں قومی شعور بیدار ہو چکا تھا، جب وہ وطن واپس آئے اور یہاں قومی انقلابی تحریک اور عوام کے خون سے رنگین وطن کی سرزمین نے ان میں زبردست ہیجان پیدا کر دیا، وطن کی واپسی میں طلبہ نے ان کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا پلیٹ فارم سے کندھوں پر اٹھا کر باہر لائے، احترام و محبت کا یہ جذبہ دیکھکر شوقی فرط مسرت سے رو پڑے، ان کا ضمیر بیدار ہو گیا، اور انھوں نے "بعد المنفیٰ" کے عنوان سے ایک قصیدہ لکھا جس میں

---

[1] ذکری الشاعرین ص ۱۳۱

وطن کی واپسی اور اپنی خوشی اور وطن سے اپنے گہرے لگاؤ کا اظہار کیا ہے، کہتے ہیں :-

یا وطنی لقیتک بعد یاس   کانی قد لقیت بک الشبابا

وکل مسافر سیئوب یوما   اذا رزق السلامة والایابا

ولو انی دعیت لکنت دینی   علیہ اقابل الحتم المجابا

ادیر الیک قبل البیت وجھی   اذا فھت الشہادة والمتابا

میرے وطن ! مایوسی کے بعد تم سے ملکر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جوانی کے ایام لوٹ آئے ہیں،
ہر مسافر ضرور لوٹ کر آتا ہے بشرطیکہ سلامتی اور رجوع اس کے لیے مقدر ہو،
میری موت بھی آتی تو تم کو اپنا مذہب سمجھکر تمھیں پر جان دیتا،
اور کلمۂ شہادت ادا کرتے ہوئے قبلہ سے پہلے تمھاری طرف رخ کرتا۔

مصر میں جب بھی کوئی قومی وسیاسی واقعہ پیش آتا تو شوقی اس پر قصیدہ لکھتے تھے، اور اہل وطن کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتے تھے، ایک فوجی افسر کے قتل کے الزام میں انگریزی فوجی عدالت نے کچھ لوگوں کو قید کر دیا تھا، ۱۹۲۴ء میں ان رہائی کے موقع پر شوقی نے قصیدہ لکھا :-

وجد السجین ید اتحطم قیدہ   من ذا یحطم للبلاد قیودا

یا فتیة النیل السعید خذوا المدی   واستانفوا نفس الجھاد مدیدا

ان الذی قسم البلاد حباکم   بلدا کاوطان النجوم مجیدا

قد کان ـ والدنیا لحود کلھا ــــ   للعبقریة والفنون مھودا

قیدی کو رہا کرنے والے تو مل گئے لیکن ملک کی بیڑیوں کو کون توڑے گا؟
وادی نیل کے جوانو ! مسلح ہو کر پھر اپنی جد وجہد کا آغاز کرو

خدا نے تمھیں ایسا ملک عطا کیا ہے جو آسمان کے مانند برتر و بہتر ہے۔
جب پوری دنیا میں صلاحیتوں کا گلا گھونٹا جا رہا تھا اس وقت بھی یہ ملک علوم و فنون کا گہوارہ تھا)

اس سے ان کی قومی شاعری کو اتنی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی کہ تعلیم یافتہ طبقہ انکے قصیدوں کا بیجینی سے منتظر رہتا، اور ان کو پڑھ کر تسکین حاصل کرتا تھا، قومی شاعری کے میدان میں حافظ ابراہیم بھی شوقی کے ساتھ چلنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن ان کے اشعار میں وہ قوت و حسن نہ پیدا ہو سکا جو شوقی کا خاص حصہ ہے۔

انھوں نے قومی ترانے بھی لکھے جنھیں بیحد مقبولیت حاصل ہوئی، ایک ترانہ کے چند اشعار یہ ہیں:-

الیوم نسود لوادینا	و نعید محاسن ماضینا
ویشید العز بایدینا	وطن نفدیہ و یفدینا
وطن بالحق نؤیدہ	و بعین اللہ نشیدہ
و نحسنہ و نزینہ	بمآثرنا و مساعینا
سر التاریخ و عنصرہ	و سریر الدھر و منبرہ
و جنان الخلد و کوثرہ	و کفی الآباء ریاحینا

ملک پر اب ہماری سیادت ہوگی اور ہم ماضی کی خوبیوں کو پھر اجاگر کریں گے،

ہمارے ہاتھوں وطن کی عزت بڑھے گی جس پر ہم اور جو ہم پر فدا ہے،
ہم صحیح طور پر وطن کی مدد کریں گے اور خدا کی مدد سے اسے مضبوط بنائیں گے
اپنے کارناموں اور کوششوں سے اسے مزین و آراستہ کریں گے،

یہ ملک تاریخ کا راز اور اس کا عنصر ہے اور موجودہ دور کے لیے منبر و تخت ہے۔
اس میں جنت و کوثر کی صفت ہے اور ہمارے بزرگ اس کے لیے باعث زینت (باقی)

ادبیات

تضمین

بر نعت حضرت امیر خسرو رحمہ اللہ

از

جناب منظور علی تمنا بجنوری

(۱) اے شاہکار علم ازل، اے نازش پیغمبری
شد کلک قدرت نقش بند تو از صورتگری
ہم مالک کونین شد بہر جمالت مشتری
اے چہرۂ زیبائے تو رشک بتان آذری
ہر چند وصفت میکنم در حسن زان بالاتری

(۲) اے نور ذات کبریا قندیل قصر خسروی
بر فرق تو زیبد بجا واللہ تاج سروری
الشمس روئے پاک تو، واللیل زلف عنبری
اے چہرۂ زیبائے تو رشک بتان آذری
ہر چند وصفت میکنم در حسن زان بالاتری

(۳) چون گشت حسنت در جہان آمادۂ جلوہ گری
گشتہ خجل از حسن تو حور و ملک جن و پری
نا رد بجنت ہیچکس یکسر مجال ہمسری
تو از پری چابکتری، وز برگ گل نازکتری
وز ہر چہ گویم بہتری حقا عجائب دلبری

(۴) گیسوئے عنبر زائے تو، ابروئے خوش آرائے تو
چشمان سرمہ سائے تو، صف بستہ مژگان ہائے تو
زلف حسینان جائے تو پامال زیر پائے تو
عالم ہمہ یغمائے تو، خلق خدا شیدائے تو
آن نرگس رعنائے تو، آوردہ رسم کافری

(۵) گشتم بگلزار جہاں، گلہائے رنگیں چیدہ ام
بہتر ز حسنت دیگرے دیدم نہ و نشنیدہ ام
بالا ز تو نامد نظر ہم از خدا پرسیدہ ام
آفاق ہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

(۶) چوں در شبِ اسریٰ رسید پایت بعرشِ عنبری
قدرت ز خود بر فرقِ تو آراست تاجِ سروری
در بر گرفت و ایں صدا آمد ز صوتِ سرمدی
من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

(۷) بکشید نقاشِ ازل نقشِ تو در عالم دگر
ممکن نہ باشد از بشر توصیفِ مافوق البشر
حقا ثنا خوانِ تو است خلاقِ عالم سربسر
ہرگز نیاید در نظر صورت ز رویت خوبتر
شمسی ندانم یا قمر یا زہرہ یا مشتری

(۸) اے خسروِ ہر دو جہاں المصطفےٰ والمجتبےٰ
عرضِ تمنا گوش کن مختارِ کل ارض و سما
للہ یک چشمِ کرم برحالِ زارم برکشا
خسرو غریب است و گدا افتادہ در شہرِ شما
باشد کہ از بہرِ خدا سوئے غریباں بنگری

(۹) اے راز دارِ کن فکاں محبوبِ ربِّ دوسرا
پشت و پناہِ عاصیاں اے شافعِ روزِ جزا
بنہادہ سر بر آستاں گفتہ تمنا بینوا
خسرو غریب است و گدا، افتادہ در شہرِ شما
باشد کہ از بہرِ خدا سوئے غریباں بنگری

ہدیۂ سلام

از جناب وارث القادری

قسم خدا کی بعنوانِ فیضِ عام چلا
رسولِ پاکؐ سے انسانیت کا نام چلا

زمیں کا نظم ، نہ افلاک کا نظام چلا | بغیر ان کے کسی کا نہ کوئی کام چلا
یہ سلسلہ مری جانب سے صبح و شام چلا | صبا چلی کہ مرا ہدیۂ سلام چلا
یہ راہِ نور ہے اس پہ چلے تو سر سے چلے | وہ کیا چلا جو مدینے بقصدِ گام چلا
خدا کی ساری خدائی کا پیشوا ہے تو | نظامِ حق کا ترے زیرِ اہتمام چلا
میں تیرے نور کے صدقے ظہور کے قرباں | ازل کی صبح چلائی ابد کی شام چلا
ترے ہی رخ نے عطا کی دلوں کو تابانی | تری ہی زلف سے رنگِ سوادِ شام چلا
بفیضِ عکسِ تجلی چمک اٹھا خورشید | بہ رنگِ نقشِ کفِ پا مہِ تمام چلا
زمانہ کر کے ترقی خدا سے دور ہوا | اسی قدر یہ گرا جتنا تیز گام چلا
نشیبِ فرش کا ساکن بحکمِ ربِّ جلیل | فرازِ عرش کی جانب پئے کلام چلا
وہ شرارِ بولہبی ہو کہ جہل کی ظلمت | کسی کی کچھ نہ چلی جب ترا پیام چلا

زہے نصیب کہ وارث چلے تو لوگ کہیں
حضورِ سرورِ کونین کا غلام چلا

نعت شریف

از جناب تسکین قریشی

فروغِ کون و مکاں رازِ عالم آرائی | محمدؐ عربی، سیدی و مولائی
حبیبِ ربِّ جلیل و جمیل، صلِّ علیٰ | تمام مظہرِ جاہ و جمال و زیبائی
بجز مدینہ کہیں بھی پناہ مل نہ سکی | ہجومِ یاس میں سب کو یہیں کی یاد آئی
خدا گواہ کہ محبوبیت کی محفل میں | حبیبِ پاک ہیں شایانِ شانِ یکتائی
گدائے دولتِ دنیا نہیں گدائے رسول | یہاں کی دین ہو دنیائے دل کی دارائی
ریاضِ خلد ہے کیا بزمِ کائنات ہے کیا | اگر ہو یادِ مدینہ انیسِ تنہائی
حریمِ قدس ادب گاہِ عشق ہے تسکینؔ | قدم قدم پہ ہے لازم یہاں جبیں سائی

مطبوعات جدیدہ

مفتاح القرآن جلد اول و دوم } مرتبہ مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی، صفحات ۶۶۰، قیمت ہر جلد ۳۰ روپیہ : - مولف مہتمم رائد ہنہ براہ گنگھور، ضلع میرٹھ۔ یو، پی سے ملیگی

اردو میں قرآن مجید کے متعدد ترجمے اور تفسیریں لکھی جا چکی ہیں، اب مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی مفتاح القرآن کے نام سے ایک نئی تفسیر لکھ رہے ہیں، اس کی دو جلدیں شائع ہوئی ہیں جو سورہ فاتحہ و بقرہ کے ترجمہ و تفسیر پر مشتمل ہیں، مصنف کا مشغلہ درس و تدریس ہے لیکن ان کو تالیف و تصنیف کا ذوق بھی ہے، اور انھوں نے یہ تفسیر بڑی محنت اور غور و فکر سے لکھی ہے، ان کے بعض تفسیری نکات و آراء میں گہرائی اور بصیرت ہے، سورہ کے مضامین کا تجزیہ اور آیات کے نظم و ترتیب کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور نحوی مسائل سے خاص طور پر تعرض کیا گیا ہے، مگر قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کا کام بڑی احتیاط، پختگی اور ذمہ داری کا ہے، مشہور تفسیری اقوال سے انحراف کے لیے وسیع علم و نظر، قرآن میں گہری بصیرت، عربیت کا عمدہ ذوق اور دین کی صحیح مزاج شناسی نہایت ضروری ہے، مصنف کے تفردات اور شاذ آراء محض جدت پر مبنی ہیں، ان کے اس قسم کے بہت سے خیالات لائق بحث ہیں، خصوصاً جن مقامات میں انھوں نے جمہور مفسرین سے اختلاف اور اپنے نقطۂ نظر کی صحت پر اصرار کیا ہے، ان کی رائیں زیادہ محل نظر ہیں، مثلاً انسان کو خلیفۃ اللہ نہ ماننا، بیت المقدس کو ابتداءً مسلمانوں کا قبلہ نہ تسلیم کرنا، "اضربوہ ببعضها"

میں "تعبض" کے معنی کاٹنا لینا، ملکین (ہاروت و ماروت) کو انسان اور جادوگر قرار دینا وغیرہ، ترجمہ میں بھی کہیں کہیں بے احتیاطی ہوگئی ہے، اور بعض صحیح و ثابت حدیثوں کو ضعیف اور ساقط الاعتبار قرار دیا گیا ہے، طرزِ تحریر، طریقۂ تصنیف اور اندازِ ترتیب بھی قابلِ اصلاح ہے، متن، ترجمہ اور تفسیر ایک دوسرے سے خلط ملط ہوگئے ہیں، دوسرے مترجمین و مفسرین کی تردید میں تفسیر کے بجائے جدل و مناظرہ کا رنگ آگیا ہے، تحریر میں جاذبیت و دل آویزی کی کمی اور خشکی ہے، ان خامیوں کے باوجود یہ تفسیر بعض حیثیتوں سے مفید اور معلومات افزا ہے۔

معارف الحدیث جلد پنجم۔ مرتبہ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۴۰۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۔۔۔ غیر مجلد ۔۔۔ پیسے

پتہ:۔ کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

مولانا محمد منظور نعمانی نے معارف الحدیث کے نام سے منتخب حدیثوں کی جمع و ترتیب اور ان کے ترجمہ و تشریح کا جو مفید سلسلہ شروع کیا ہے، اس کی چار جلدیں پہلے چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں، اور ان پر معارف میں تبصرہ بھی ہو چکا ہے، یہ پانچویں جلد اذکار و ادعیہ سے متعلق حدیثوں کا مجموعہ ہے، اس میں ذکر اللہ، تلاوت قرآن، دعا و استعاذہ، استغفار و توبہ اور صلاۃ و سلام علی النبی کے زیر عنوان ان ابواب کی حدیثیں جمع کر کے ان کی اہمیت، انکے فضائل و برکات آداب و شرائط اور رسول اللہ سے ان کے بارہ میں منقول الفاظ و کلمات کی برکت و تاثیر بیان کی گئی ہے، فاضل مؤلف نے احادیث کا بڑا معنی خیز اور سلیس ترجمہ اور ان کی نہایت دلنشین اور مؤثر تشریح کی ہے، اور ان کے متعلق بعض شکوک و شبہات کا تشفی بخش جواب بھی دیا ہے، ہر عنوان سے پہلے تمہید میں اس کی حقیقت و اہمیت اور غرض و حکمت تحریر کی گئی ہے، یہ پورا سلسلہ بہت مفید ہے، یہ حصہ اذکار و ادعیہ پر مشتمل ہے، اس لیے اس میں قلبی سکون و طمانیت کا بڑا سامان ہے،

مولانا کی موثر تحریر نے اس کو اور زیادہ دلنشین بنا دیا ہے، اور وہ ہر صاحب فضل مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے۔

امت مسلمہ کا نصب العین۔ مرتبہ مولانا سید احمد عروج قادری صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۹۲ قیمت ۴ روپیہ، پتہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، دہلی ۶

اس کتاب میں اقامت دین کی اہمیت اور اس کے مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے اور کتاب و سنت کی روشنی میں اس کو مسلمانوں کا مقصد اور نصب العین ثابت کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں لائق مصنف نے انبیاء کی بعثت و دعوت، وعدۂ نصرت، انسان کی خلافت و نیابت الٰہی، شہادت علی الناس اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مفصل ذکر کر کے دکھایا ہے کہ ان سب کی غرض و غایت دین کی اقامت و اظہار ہے، ضمناً اقامت دین کے متعلق بعض شبہات و اعتراضات کا مفصل جواب بھی دیا ہے، یہ کتاب جواباً لکھی گئی ہے، اس لیے تحریر میں مناظرانہ رنگ اور لہجہ کی تیزی آگئی ہے، مگر اصل مباحث کا مدار کتاب و سنت اور اور مستند علماء و مفسرین کے اقوال پر ہے، اور اکثر بحثیں علمی حیثیت سے بھی مفید اور دلچسپ ہیں۔

فہرست عربی مخطوطات رضا لائبریری رامپور (انگریزی) مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی صاحب، متوسط تقطیع کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۵۰۰ مجلد، قیمت ۵۰ ؎ ناشر رضا لائبریری ٹرسٹ رامپور، یو، پی

یہ رضا لائبریری رامپور کے عربی مخطوطات کی فہرست کی تیسری جلد ہے، جو گورنمنٹ آف انڈیا کی سرپرستی میں اہتمام سے انگریزی میں شائع کی گئی ہے، اور فقہ اور اصول فقہ، فرائض، مناظرہ اور جدل و خلاف کے تقریباً ایک ہزار مخطوطات کا اس میں ذکر ہے، فنون

کی علٰحدہ تقسیم کے علاوہ فقہ، اصول فقہ اور علم الفرائض میں چاروں مشہور فقہی مذاہب اور اہلحدیث، زیدیہ، شیعہ اور خوارج کی کتابوں کا علٰحدہ علٰحدہ ذکر ہے، فاضل مرتب نے تصنیف، مصنف اور شارح کا نام، ان کے سنین وفات، مخطوط کے زمانہ، شان خط، سائز، صفحات اور سطروں کی تعداد، اس کے کامل و ناقص ہونے کی تصریح اور اہم خصوصیات بھی تحریر کی ہیں، مصنف کا نام اس کی خوبی کی پوری ضمانت ہے، اس فہرست میں بعض نہایت اہم، قدیم اور نایاب مخطوطات بھی شامل ہیں، اس کی اشاعت سے علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی،

مفتاح الکنوز (فہرست عربی مخطوطات) جلد ثالث } بڑی تقطیع، کتابت و طباعت اچھی صفحات
و مراۃ العلوم فہرست فارسی مخطوطات جلد سوم } بالترتیب ۲۰۰ و ۲۹۵ غیر مجلد و ۲۹۰ مجلد
و فہرست مخطوطات اردو خدابخش اورنیٹل پبلک لائبریری پٹنہ } قیمت درج نہیں، پتہ خدابخش خاں اورنیٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔

خدابخش خاں لائبریری پٹنہ کے عربی و فارسی مخطوطات کی فہرستوں کی دو دو جلدیں عرصہ ہوا شائع ہوئی تھیں، اب ان کی تیسری جلد سید اطہر شیر صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے مرتب کرکے شائع کی ہے، لائبریری کے اردو مخطوطات کی کوئی باقاعدہ فہرست شائع نہیں کی گئی تھی، اس لئے عابد امام زیدی صاحب لائبریری اسسٹنٹ نے ان کی پہلی جلد شائع کی ہے، عربی و فارسی مخطوطات کی موجودہ تیسری جلد کی ترتیب سابق جلدوں کے مطابق ہے، یعنی فن وار کتابوں کے نام حروف تہجی کی ترتیب پر ذکر کرنے کے بعد ان کے مصنفین، کاتبوں کے نام، سنہ کتابت، رسم الخط، اوراق و سطور کی تعداد، سائز اور بعض اہم خصوصیات کی وضاحت کی گئی ہے، اردو فہرست میں بھی ان امور کا ذکر ہے، لیکن اس کی ترتیب، کتابوں کے بجائے مصنفین کے ناموں پر ہے، عربی فہرست کے دیباچہ میں الحاوی فی علم التداوی کو الہاوی اور اردو کے دیباچہ میں خطبۂ مسنونہ غلط لکھا گیا ہے، ان فہرستوں کی ترتیب و اشاعت پر مرتبین اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

داستانے چند - مرتبہ جناب راز چاند پوری تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۲۰ قیمت ؎ پتہ: نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔

جناب راز چاند پوری اردو کے نامور شاعر سیاب اکبرآبادی مرحوم کے مخصوص تلامذہ میں ہیں، ان کی سیاب صاحب سے برابر خط و کتابت رہتی تھی، اور وہ برسوں آگرہ میں انکے ساتھ رہے بھی تھے، اس لیے سیاب صاحب کے متعلق ان کے پاس بہت سے خطوط و رسائل اور مختلف یادداشتیں محفوظ تھیں، اس کتابچہ میں انھوں نے اپنی ان معلومات اور یادداشتوں کی مدد سے سیاب مرحوم کی شخصیت، زندگی، سوانح اور خدمات شعر و ادب کی یہ داستان مرتب کی ہے، جو مختصر ہونے کے باوجود دلچسپ اور ادبی حیثیت سے مفید ہے، لائق مصنف خود بھی اردو زبان کے پختہ مشق شاعر و ادیب ہیں، اس لیے زبان بہت منجھی ہوئی اور تحریر بڑی شگفتہ اور دلآویز ہے۔

مقالات یوم شبلی - مرتبہ حافظ نذر احمد صاحب تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۹۶ قیمت ۲؎ پیسے۔ پتہ مرتب سے مسلم اکیڈمی، ۱۸ محمد نگر، لاہور۔ ملیگی

علامہ شبلی مرحوم کے بعض پاکستانی عقیدتمندوں نے ان کے نام سے لاہور میں ایک شبلی کالج قائم کیا ہے، اس کے طلباء کی "بزم ادب" نے مئی ۱۹۶۵ء میں "یوم شبلی" کی تقریب دھوم دھام سے منائی تھی، اس میں مولانا کی شخصیت، ان کے کمالات اور خدمات کے بعض پہلوؤں پر مقالات پڑھے گئے تھے، اور ان کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا، کالج کے لائق پرنسپل حافظ نذر احمد صاحب نے ان سب کا مجموعہ شائع کر دیا ہے، یہ مضامین ہلکے پھلکے ہونے کے باوجود مفید اور طلبہ کو مولانا کی شخصیت اور کارناموں سے روشناس کرانے کے لیے کافی ہیں، اس تقریب کے فاضل صدر ڈاکٹر سید عبد اللہ کا خطبہ مختصر ہونے کے باوجود پر مغز اور جامع ہے۔ اس میں پاکستان کے ان ناشرین کا "ذکر خیر" بھی ہے جو مولانا کی تصنیفات ناجائز طور پر غلط سلط چھاپ رہے ہیں، و مضامین میں دار المصنفین اور

ندوۃ العلماء کے متعلق مولانا کا تخیل اور ان کی ضرورت و اہمیت دکھائی گئی ہے، مجموعی حیثیت سے سب مضامین مفید اور دلچسپ ہیں، شروع میں مولانا کے قلم کی لکھی ہوئی ایک غزل اور غیر مطبوعہ خط کا عکس بھی دیا گیا ہے، جو تقریب کے بانیوں کی درخواست پر دار المصنفین سے بھیجا گیا تھا۔

صحرا صحرا۔ مرتبہ جناب کبیر احمد صاحب صبا جائسی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۲۶ قیمت عہ پتہ کتاب گھر، علی گڑھ۔

جناب کبیر احمد صبا جائسی ایک ہونہار ادیب و شاعر ہیں، اُن میں شعر و ادب کا اچھا ذوق ہے، "صحرا صحرا" ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے، مصنف شعر و سخن کے موجودہ ترقی پسند رجحان سے واقف ہیں، لیکن انھوں نے روایتی شاعری سے اپنا تعلق باقی رکھا ہے، انکے جذبات میں بلندی اور خیالات میں پاکیزگی ہے، ان کا صحرا میں آبلہ پائی کا شوق تنہائی میں دامن تر اور گرد سفر کا سہارا اور شورش و یلغار میں آگے بڑھنے کا حوصلہ قابل داد ہے، یہ صبا صاحب کا پہلا مجموعہ ہے، اس لیے ابھی ان کے بعض اشعار میں ابہام و تعقید ہے، نیز بعض الفاظ اور ترکیبوں میں سلاست و روانی کی کمی بھی ہے، وہ اصلاً فارسی ادبیات کے طالب علم ہیں، اس مجموعہ کے آخر میں چار پُرکیف فارسی غزلیں بھی ہیں،

مبادی الصرف۔ مرتبہ مولانا ابوالہلال عثمانی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۴۵، قیمت درج نہیں، پتہ دار المعارف، دیوبند،

مصنف نے مبتدیوں کی عربی تعلیم کے لیے ایک مفید سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتابچہ اس کا پہلا حصہ ہے، اس میں بہترین پیرایہ اور اچھے انداز میں صرفی مسائل تحریر کیے گئے ہیں، اردو میں صرف و نحو کی جو مفید کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ بھی ان میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔

"ض"

مصنفاتِ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

اسوۂ صحابہ: (حصہ اول) قیمت: ۳؎

اسوۂ صحابہ: (حصہ دوم) ر ۳؎

اسوۂ صحابیات: ر عا ر

تاریخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کے خصوصیات کی تفصیل: قیمت: عا ر

حکمائے اسلام: (حصہ اول) دوسری صدی ہجری سے لیکر خاندانِ فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، قیمت: عا ر

حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، قیمت: ع ر

شعرالہند (حصہ اول) ر عا ر

شعرالہند (حصہ دوم) ر لعہ ر

۹- انقلاب الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان کا ایک کتاب کا انشا پردازانہ ترجمہ قیمت: للعہ ر

۱۰- سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: (زیر طبع)

۱۱- امام رازی: امام فخرالدین رازی کے سوانح اور اُن کی تصنیفات: قیمت ۳؎

۱۲- ابن خلدون: ابن خلدون کے سوانحِ زندگی اور اُس کے فلسفہ کی تشریح (زیر طبع)

۱۳- اقبالِ کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانحِ حیات کے ساتھ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل، اُن کے فلسفۂ خودی کی تشریح، اور اُن کے فارسی و اردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت ۳؎

مقالاتِ عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی و فقہی و تنقیدی و ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعر کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر طویل ریویو بھی لکھے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اُن کے مضامین کی ترتیب و اشاعت بھی دارالمصنفین کے پیش نظر ہے، یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے جو اُنھوں نے زبان و ادب و شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، صفحات: ۲۴۶ قیمت: عہ ر منیجر دارالمصنفین اعظم گڑھ

(اڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ اپنی مکی و مدنی زندگی میں ۲۳ برس تک مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت، بلا امتیاز نسل و رنگ و بلا لحاظ زاد و بوم سراپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بنائے ہوئے نقشہ کے مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب میں انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف ابواب کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ پورا دین اسلام ہی نہیں، بلکہ اس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے لئے آیۂ رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسلام میں عورتوں کا درجہ، اور ان کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخ اسلام میں ان کا مرتبہ، بلا تفریق مذہب و ملت پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب وغیرہ سب داخل ہیں، غیر مسلم رعایا کے حقوق، حیوانات کے حقوق اور ان کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو بابوں میں دنیا پر دینِ اسلام کے علمبردار مسلمانوں کے علمی احسانات، ان کے علمی کارناموں، اور مختلف علوم و فنون میں ان کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت:- ۳۳۰ صفحے، قیمت:- عہ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰) جون سنہ ۱۹۷۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

[illegible]

نمبر ۱۰۵ ۔ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۰ء ۔ عدد ۶

مضامین

مقالات

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالی نے انتقال فرمایا، موصوف کو حضرت مجدد الف ثانیؒ سے نسبی اور خاندانی تعلق بھی تھا، وہ اس دور کے عارف کامل اور نامور شیخ تھے، ان کی خانقاہ ارشاد و ہدایت کا مرکز تھی، اور اس سے بڑا فیض پہنچا، راقم کو بھی انکی خدمت میں حاضری اور کئی مجلسوں میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی، معلوم ہوتا تھا علم و عرفان کا چشمہ ابل رہا ہے اور دلوں کی کھیتیاں سیراب ہو رہی ہیں، میری حاضری کے وقت حضرت کی عمر اسی سال کے قریب رہی ہوگی، خلقۃً بھی نحیف تھے، لیکن روحانی قوت کا یہ حال تھا کہ گھنٹوں پورے جوش کے ساتھ تقریر و ملفوظات کا سلسلہ جاری رہتا تھا، اور یہ روزانہ کا معمول تھا، آپکے ملفوظات و مواعظ علم و عرفان کا گنجینہ ہیں، جہاں تک معلوم ہے ان کو قلم بند کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا، مولانا علی میاں نے کچھ مجلسوں کے ملفوظات قلمبند کئے تھے، جو الفرقان میں شائع ہو چکے ہیں، اگر تمام ملفوظات و مواعظ قلمبند ہو کر شائع ہو گئے ہوتے تو علم و عرفان کا یہ گنجینہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا، ان کی وفات سے ارشاد و ہدایت کی ایک نورانی شمع گل ہو گئی، اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے۔

ندوہ کی اسٹرائک کے متعلق راقم اپنے خیالات اخبارؔ کے ذریعہ ظاہر کر چکا ہے، اور ۱۰ رجون کو ندوہ کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہونے والا ہے، اس لیے اب کسی دوسری تحریر کی ضرورت نہ تھی لیکن اس سلسلہ میں چند ضروری باتیں کہنی ہیں، ندوہ کی اسٹرائک کوئی نئی چیز نہیں، مولانا شبلی کے زمانہ میں اس سے بڑی اسٹرائک

ہو چکی ہے، سید صاحب کے زمانہ میں بھی ہوئی تھی، دار العلوم دیوبند جیسا مقدس ادارہ اس وبا سے نہ بچ سکا اس لیے اسٹرائک کی حیثیت سے اس کی زیادہ اہمیت نہیں ہے لیکن عربی مدارس کے طلبہ کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کی تقلید میں مطالبات منوانے کا یہ طریقہ نہایت نامناسب اور انکی دینی حیثیت سے فروتر ہے، یونیورسٹیوں کے طلبہ کی اکثریت مذہب، اخلاق اور مشرقی آداب و تہذیب سے بالکل آزاد ہوتی ہے، اور عربی کے طلبہ ان کے نمائندے ہوتے ہیں، مگر ان طلبہ کی تقلید میں وہ ساری حرکتیں کرتے ہیں جن کی مذہب کیا معمولی اخلاق و تہذیب بھی اجازت نہیں دیتی جو ان کیلئے انتہائی شرمناک ہے،

طلبہ کو سیاسی اغراض کے لیے استعمال کرنا لیڈروں کا معمول بن گیا ہے، چنانچہ انکی ہر اسٹرائک میں کچھ لوگ انکی حمایت میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور سارا الزام منتظمین کے سر رکھ دیتے ہیں، یہی سیاست بازی ندوہ کی اسٹرائک میں بھی ہوئی اور بیرونی لوگوں نے اس کو زیادہ ہوا دی، اخلاق کا سبق دینا آسان ہے لیکن ان پر عمل ان معلمین اخلاق کے لیے بھی دشوار ہے، اگر ان کو کسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر، کسی کالج کا پرنسپل اور کسی امتحان کا نگراں بنا دیا جائے تو ان کو ایسا سبق ملے کہ سارا فلسفۂ اخلاق بھول جائیں، انکی سیاست بازی کے بہت سے میدان ہیں، وہ عربی مدارس پر رحم کریں، اور ان کو اپنی سیاست کا اکھاڑہ نہ بنائیں، اور غیر متعلق بحثوں میں اس مسئلہ کو نہ الجھائیں، البتہ اگر اصلاحی اور تعمیری نقطۂ نظر سے کوئی مفید مشورہ دیں تو وہ قابل غور ہو سکتا ہے۔

اگر طلبہ، مدرسین اور منتظمین اپنے حقوق و فرائض کے حدود کا خیال رکھیں تو عربی مدارس کیلئے اس مسئلہ کا حل دشوار نہیں ہے، طلبہ کا فرض اطاعت و سعادتمندی ہے اور اساتذہ و منتظمین کا شفقت و محبت، اس میں دونوں طرف سے کوتاہی ہوتی ہے، طلبہ کی غلطی یہ ہے کہ وہ حدود کا لحاظ نہیں رکھتے، رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔

اور معمولی معمولی شکایتوں پر جو آسانی سے پوری ہو سکتی ہیں، رائج الوقت نامناسب طریقے اختیار کرتے ہیں، اور منتظمین کی غفلت یہ ہے کہ وہ ان شکایتوں کی طرف اس وقت توجہ کرتے ہیں جب معاملہ حد سے آگے بڑھ جاتا ہے، اگر ابتدا ہی میں جائز شکایتیں دور کر دیجائیں تو اس کی نوبت ہی نہ آنے پائے، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ طلبہ کا ہر مطالبہ قابل قبول نہیں ہوتا، ورنہ نظام ہی قائم نہیں رہ سکتا، ان سب معاملات پر مجلس انتظامیہ میں غور کیا جائے گا۔

یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ عراق کے مجتہد اعظم آقائے سید محسن الحکیم کی وفات کی خبر ملی، وہ شیعوں کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا اور اعلم کے منصب جلیل پر فائز تھے، مذہبی امور میں انکا فیصلہ حرف آخر کا حکم رکھتا تھا جس کے سامنے پوری شیعی دنیا سر تسلیم خم کرتی تھی، علمی حیثیت سے وہ دنیا اسلام کے نامور علماء میں تھے اور سنیوں میں بھی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، انھوں نے اپنے فرقہ کی بڑی مفید علمی و دینی خدمات انجام دی ہیں، اسی کے ساتھ وہ اتحاد اسلامی کے بھی قائل تھے، اور شیعہ سنی اختلافات کو ناپسند کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

سنیوں کے یہاں اس قسم کا کوئی منصب نہیں ہے، جس کو پوری سنی دنیا ماننے پر مجبور ہو، اسکا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں ہر شخص مجتہد ہے، اور جن کو نہ صرف دینی علوم سے کوئی واقفیت نہیں بلکہ مذہب سے بھی عملاً کوئی علاقہ نہیں، ان کو بھی اجتہاد کا دعویٰ ہے، چنانچہ آجکل ایسے بہت سے مجتہد اور مفسر قرآن ملیں گے جو عربی کی ابجد سے بھی واقف نہیں، ان کا کام یہ ہے کہ جو نیا قالب نظر آئے اسلام کو اس میں ڈھالنے کی کوشش کریں، ان کے اجتہاد کے عجیب و غریب نمونے آئے دن نظر آتے رہتے ہیں، اور اس تخریب کا نام انھوں نے اسلامی خدمت رکھا ہے، شیعوں کے نظام میں اگرچہ تنگی ہے لیکن مذہبی ضبط و نظام کے نقطۂ نظر سے بہت مفید ہے۔

مقالات

اسلامک اسٹڈیز کا مقصد اور اسکی تاریخ

از ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، سابق پروفیسر عربی، پنجاب یونیورسٹی

معارف بابت فروری ۱۹۸۰ء میں آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے چھٹے اجلاس منعقدہ دارالمصنفین اعظم گڈھ کی جو مفصل اور دلچسپ روداد ہمارے محترم سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کے قلم سے شائع ہوئی، اس کو میں نے بڑے ذوق وشوق سے پڑھا، بلکہ اس کا بڑے غور وخوض سے مطالعہ کیا، کیونکہ کانفرنس کے دوران میں بعض ایسے مسائل زیر بحث آئے جو علمی اور ملی دونوں اعتبار سے اہم ہیں، اور ہم سب لوگوں کو دعوت فکر دیتے ہیں، اس مضمون کے ذریعے میں بعض ایسے ہی مسائل کے بارے میں اظہار خیال کی اجازت چاہتا ہوں،

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے!

اگرچہ یہ مضمون کانفرنس کے انعقاد کے کئی ماہ بعد شائع ہو رہا ہے، لیکن مسائل زیر بحث اپنی نوعیت کے اعتبار سے عارضی اور وقتی نہیں ہیں، بلکہ زمان ومکان کی قید سے آزاد ہیں، اس لیے امید ہے کہ اس کو بعد از وقت تصور نہیں کیا جائے گا، اس تاخیر کی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ معارف کا وہ شمارہ جس میں کانفرنس کی روداد شائع ہوئی تھی، مجھے بہت دیر سے موصول ہوا۔ اس کے علاوہ جب میں نے روداد پڑھی، اس وقت میں بعض ضروری کاموں کی تکمیل میں مصروف

تھا، اور مضمون کی تحریر کی طرف فوراً متوجہ نہ ہو سکا اور اسی مصروفیت میں ایک دو مہینے گذر گئے۔ آخر کار میں نے اپنے دل سے کہا کہ ھلمّت الصحیفۃ والمقالۃ وادن الحبرۃ المفعمۃ۔

جو علماء و فضلاء کانفرنس میں شریک ہوئے، اُن کو کیا معلوم تھا کہ کانفرنس کے پُرمغز خطبوں اور دلچسپ مفید مقالوں کے بعد ایک اجنبی دخیل کی سمع خراشی بھی بصورت تبصرہ برداشت کرنی پڑے گی۔

سید صاحب موصوف نے اس روداد کو ایسی تفصیل اور خوش اسلوبی سے لکھا ہے اور اپنے زور قلم اور حسن بیان سے کانفرنس کا ایسا دلنشین نقشہ کھینچا ہے کہ میں نے یوں محسوس کیا گویا میں بھی شریک محفل ہوں اور حاضرین کی دلچسپ باتیں اپنے کانوں سے سن رہا ہوں، اور مقرروں اور مقالہ نگاروں کے خیالات اور ارشادات سے مستفید ہو رہا ہوں۔ سید صاحب اپنی روداد میں لکھتے ہیں کہ "دارالمصنفین کی دعوت پر ہندوستان کے اسلامیات کے تمام سیارے اس وقت یہاں آکر جمع ہو گئے ہیں، ان میں کوئی آفتاب ہے تو کوئی ماہتاب، کوئی عطارد ہے تو کوئی مشتری"۔ خیر گزری کہ بات عطارد اور مشتری تک رہ گئی، ورنہ سید صاحب اگر اختر شماری کرتے ہوئے شرکائے کانفرنس میں سے کسی کو "مریخ" اور کسی کو "زحل" کا خطاب عطا کر دیتے، تو ان کے پُرزور قلم کی روانی اور اس کے فیضان کو کون روک سکتا تھا!

بہر حال مجھے اس خیال سے کمال مسرت ہوئی کہ خدا کے فضل و کرم سے اس گئے گزرے زمانہ میں بھی چند ایک ایسے "مجنون مزاج" دیوانے موجود ہیں، جنھوں نے تمام اطراف ہند سے اور تمام دیار و امصار سے اپنا کام کاج چھوڑ کر شدّ رحال کیا، اور اپنے اپنے شانے لیکر دارالمصنفین میں اس مقصد سے جمع ہوئے کہ "لیلی اسلام" کے زلف و کاکل کے سنوارنے میں حصہ لیں، اور اس کام کے لیے دارالمصنفین سے زیادہ مناسب اور موزوں مقام اور کیا ہو سکتا تھا جہاں عروس اسلام کی مشاطگی اور آراستگی کا کام نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے انتہائی خوش اسلوبی سے انجام پا رہا ہے۔

لیکن اس مسرت کے ساتھ ساتھ میرے دلِ حزیں میں ایک آہ بھری حسرت بھی ہے اور وہ حسرت یہ ہے کہ پہلی اسلام کے ان دیوانوں کی والہانہ شیفتگی اور وارفتگی کی روح پرور کیفیت کو میں اپنی مشتاق آنکھوں سے نہ دیکھ سکا، اور ان پر اپنی گہری دلی عقیدت کے پھول نچھاور نہ کر سکا۔

بآں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند زِ ما سلام رسانید ہر کجا ہستند

اس سلسلے میں کانفرنس کے بانی یعنی فاضلِ معاصر ڈاکٹر عبد العلیم صاحب کا شکریہ کے ساتھ ذکر کرنا بھی لازم ہے۔ جب تک کانفرنس کے اجلاس علی گڑھ یا دیگر مقامات میں منعقد ہوتے رہیں گے، ان کے اس "صدقۂ جاریہ" کا ثواب بھی خداوند کریم کے حضور سے ان کو ملتا رہے گا، کیونکہ خداوند کریم نے، جو عادل اور شکور ہے، خود فرمایا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ۔

مجھے وہ دن خوب یاد ہیں، جب میں اپنے طالب علمی (Wanderjahre) کے زمانے میں یورپ کے مختلف علمی مرکزوں کی سیر کرتا ہوا برلن پہنچا تھا، اور وہاں کی یونیورسٹی کے مشہور و معروف پروفیسر کارل ہائنرش بیکر (C. H. Becker) سے ملاقات کی تھی[1]، اس موقع پر پروفیسر ممدوح کی زبان سے میں نے پہلی مرتبہ عبد العلیم صاحب کا نام سنا تھا، پروفیسر موصوف آپ کے علمی شوق اور آپ کی لیاقت و قابلیت کے قائل تھے، اور جب میں نے ان کی زبانی سنا کہ عبد العلیم صاحب ان کی نگرانی میں اعجاز القرآن کے موضوع پر مقالہ لکھ رہے ہیں تو میں اسی زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کی مذہبی وابستگی اور ان کے اسلامی جذبہ کا معترف ہو چکا تھا۔ اب تو ڈاکٹر صاحب ماشاء اللہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں اور ان کو خدمتِ اسلام اور حمایتِ اسلام کے وسیع مواقع حاصل ہیں، ان کے نیازمندوں کو کامل امید ہے کہ وہ ان مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔

میں جس امت کا ایک نہایت ادنیٰ اور ناکارہ فرد ہوں، اس امتِ مرحومہ کی سرگذشت

---

[1] اس ضمن میں ملاحظہ کیجیے میرا مضمون "پروفیسر بیکر کے ساتھ چند دن" در رسالہ معارف بابت جولائی ۱۹۳۵ء۔

دینی تاریخ اسلام ہی کے ساتھ مجھے بڑا شعوری سے گہرا شغف رہا ہے، اور یہ شغف ایک ایسے جنون کی حد تک طاری رہا ہے کہ عالم وحشت میں، خدا جانے میں نے کن کن وادیوں کی خاک چھانی ہے اور کن کن صحراؤں کی بادیہ پیمائی کی ہے۔ اس کے علاوہ اس امت کے جو اصول ومبادی (Principles) ہیں اور جو نصب العین (Ideals) ہیں، انکے قبول کرنے کے ساتھ ساتھ میں ان کی حقیقت اور اصلیت کو معلوم کرنا چاہتا تھا، اور ان کی صداقت کے جو دلائل و براہین ہیں، ان کو جاننا چاہتا تھا، الغرض مجھے اسلام کے مذہبی اور تاریخی مسائل کے ساتھ جو گہری دلچسپی رہی ہے، اس کی وجہ سے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ میں نے اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کی روداد اور اس کے فکر انگیز خطبوں کو بڑے غور سے پڑھا، اور ان کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ میرے دل و دماغ میں خیالات نے ایک بے پناہ ہجوم کیا، اور میرے خیالات کا یہی وہ تلاطم ہے، جس سے مجھے اس تبصرہ کے لکھنے کی تحریک ہوئی ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ میں اپنے ناقص خیالات زیر بحث مسائل کے متعلق پیش کروں، میں اس امر کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ "اسلامک اسٹڈیز" کی جو اصطلاح ہمارے ہاں مغرب سے آئی ہے، اس کی اصلیت اور حقیقت کیا ہے اور اس کا موضوع بحث کیا ہے اور وہ کون سے مغربی علما رہے جنھوں نے اسلامک اسٹڈیز (Islamic Studies) کو عام مشرقیات (Oriental Studies) سے الگ ایک مستقل شعبہ تحقیق و تدقیق کی صورت دی اور وہ کون سے مسائل تھے جن پر انھوں نے اس سلسلہ میں گفتگو کی، اس کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ اصطلاح ہمارے ہاں کب اور کیسے رائج ہوئی اور ہمارے لیے اسلامک اسٹڈیز کے کیا حدود ہیں اور اس کی غرض و غایت کیا ہے، یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ان تمام امور کے متعلق ہمارا ذہن بالکل صاف ہو تاکہ ہم اسلامیات کا دائرۂ تحقیق اور اس کا مقصد واضح طور پر متعین کرسکیں اور اس سے ہمیں

اسکا نصاب تعلیم وضع کرنے میں رہنمائی حاصل ہو، اور ہم ان تمام معاملات میں خطا اور غلطی سے محفوظ رہیں، کانفرنس کے اجلاس انشاء اللہ آیندہ بھی منعقد ہوتے رہیں گے لیکن اسکے ساتھ یہ بات اشد ضروری ہے کہ جو لوگ ان اجلاسوں میں شریک ہوں، ان کے ذہن میں اسلامیات کی اصلیت، اس کی غرض وغایت اور اس کے موضوعات کا ایک واضح تصور موجود ہو،

اسلامیات کا تعلیمی پہلو

اسلامک اسٹڈیز یعنی اسلامیات کے دو پہلو ہیں، ایک علمی اور تحقیقی (Research) اور دوسرا تعلیمی (Edeucational)۔ جہاں تک اس کے تعلیمی پہلو کا تعلق ہے، "اسلامیات" کی اصطلاح سے پہلے اسلام کی تعلیم کے لیے ہمارے اسلامی اسکولوں اور کالجوں میں "دینیات" کی اصطلاح رائج تھی، لیکن مروجہ اسلامیات کے مقابلہ میں دینیات کا تصور اور اس کا دائرہ بہت محدود تھا۔ میں نے ابتدائی تعلیم امرت سر کے اسلامیہ ہائی اسکول میں پائی تھی، جو سر سید احمد خاں مرحوم و مغفور کے زمانہ میں قائم ہوا تھا، اور علی گڑھ کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے نام پر ایم، اے، او ہائی اسکول کہلاتا تھا، اس مدرسہ میں طبعی طور پر دینیات کی تعلیم کا بھی انتظام تھا، اور خدا کے فضل وکرم سے ہمارے اساتذہ بڑے متدین اور فرض شناس تھے، لیکن جہاں تک اسلام کی تعلیم کا تعلق ہے، مالا بدمنہ کی چند متفرق فصلوں کے سوا ہم طالب علم اور کچھ حاصل نہ کر سکے، انجمن حمایت اسلام لاہور کے تیار کردہ دینیات کے چند رسالے بھی ہم نے پڑھے، لیکن ان میں صرف طریقۂ ادائے نماز اور وضو اور غسل کے چند ضروری مسائل کا بیان تھا، قرآن مجید کے آخری پارہ کی دس بارہ سورتیں بھی تھیں، جو ہمیں بجا طور پر زبانی یاد کرائی جاتی تھیں، کیونکہ نماز میں سورۂ فاتحہ کے علاوہ قرآن پاک کے کچھ حصہ کی قرأت بھی ضروری ہے، اب مجھے اس بات پر حیرت ہوتی ہے، کہ دینیات کی چند سال کی تعلیم کے باوجود میں اس زمانہ میں اس وقت کے مروجہ طریق تعلیم کے ذریعہ سے "اجزائے ایمان"۔ "ارکان اسلام" اور "اخلاق اسلامی" کا کوئی

اجمالی تصور بھی حاصل نہ کرسکا۔ باقی رہے اسلام کے وہ ہمہ گیر فطری اور عقلی اصول اور وہ بلند نصب العین (Ideals) جو اس کے لیے وجہ امتیاز ہیں اور ہم حلقہ بگوشانِ اسلام کے لیے موجب افتخار اور وسیلۂ نجات ہیں، اور اسلام کے وہ تصورات (Concepts) جنکی بدولت اسلام نے ایک عالمگیر مذہب کا درجہ پایا، اور تمام عرب و عجم اور اسود و احمر کو اپنا غلام بنایا، افسوس صد افسوس کہ ان سے میرے کان ایک مدت تک آشنا نہ ہوسکے، اور اسکی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں ہمارے اسکولوں میں دینیات کا نصاب ادھورا اور ناقص تھا،

باقی رہے اسلامی کالج، ان میں بھی دینیات کی تعلیم تسلی بخش نہ تھی، کیونکہ کوئی نصاب معین نہ تھا، اساتذۂ کرام جس مرغوب اور دلپسند مضمون پر چاہا تقریر شروع کردیتے تھے، اور اس کے دوران میں جس حریف مولوی کو چاہا لتاڑ ڈالا اور جس "فرقہ ضالہ" پر چاہا برس پڑے، اُن کا کوئی محاسبہ کرنے والا نہ تھا۔

اسلامیات کے نصاب تعلیم کا مسئلہ بڑا اہم اور نازک ہے، اور اس کے کئی پہلو ہیں جو غور طلب ہیں، ان پر میں انشاء اللہ کسی آیندہ صحبت میں گفتگو کروں گا۔ کیونکہ سردست مجھے اسلامیات کے علمی اور تحقیقی پہلو کے متعلق چند ایک اصولی باتوں کی توضیح مطلوب ہے۔

اسلامک اسٹڈیز کی تاریخ اب ہمیں یہ دریافت کرنا ہے کہ بلاد مغرب میں اسلامک اسٹڈیز نے ایک مستقل شعبۂ علم کی حیثیت کیسے حاصل کی اور وہ کون سے علماء تھے، جنھوں نے یورپ میں علمی انداز میں اسلامی علوم کی تحقیق شروع کی اور جن کی مجموعی علمی مساعی سے اسلامک اسٹڈیز نے ایک مستقل فن کی صورت اختیار کی۔

بلاد مغرب میں جب مشرقی ملکوں کا تحقیقی مطالعہ شروع ہوا تو ابتداء میں مستشرقین کی

توجہ بیشتر مشرقی زبانوں اور ان کے متعلقہ آداب پر مبذول رہی، اس کے بعد تاریخ و تمدن کی باری آئی، باقی رہے مذاہب و ادیان تو ان کی بحث اگرچہ ان کے دائرۂ تحقیق سے کلیۃً خارج نہ تھی، تاہم ایک مدت دراز تک ان پر خصوصی توجہ نہ دی جاسکی، آخرکار جب ان کی طبیعتیں لسانی (Philological) اور ادبی (Literary) مباحث سے قدرے سیر ہوچکیں، تو ان کی توجہ رفتہ رفتہ اسلامی دینی علوم کی طرف منعطف ہوئی اور اس توجہ کا بالآخر نتیجہ ہوا کہ انیسویں صدی کے نصف ثانی میں "اسلامک اسٹڈیز" نے ایک مستقل شعبہ کی حیثیت اختیار کی، یورپ میں اسلامک اسٹڈیز کی جس طرح تشکیل ہوئی، اس کی ایک واضح تاریخ ہے جس کو یہاں نہایت اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں، اور جس کا جاننا ان تمام احباب کے لیے ضروری ہے جو مشرق میں اس اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں اور اس کو اختیار کرکے اسلامک اسٹڈیز کی حدود میں رہ کر تحقیقی یا تعلیمی کام کرنا چاہتے ہیں۔

اسلامک اسٹڈیز کا پہلا رکن اسلامیات کے تاریخی جائزہ کے سلسلہ میں مجھے سب سے پہلے مشہور جرمن مستشرق پروفیسر نولڈکہ (Nöldeke) (۱۸۳۶ء تا ۱۹۳۰ء) کا نام نامی لینا ہے جنھوں نے ۱۸۶۰ء میں اپنی مشہور "تاریخ القرآن" شائع کی[1]، اور یورپ میں قرآن پاک کے متعلق تحقیق و تدقیق کا علمی انداز میں آغاز کیا، اور اس طرح سے گویا اسلامک اسٹڈیز کا پہلا سنگ بنیاد رکھا، ۱۸۶۰ء کا سنہ اس لحاظ سے بھی یادگار ہے کہ اس کے صرف ایک سال بعد یعنی ۱۸۶۱ء میں ولیم میور نے "لائف آف محمدؐ" کے نام سے سیرت نبوی پر ایک جامع کتاب لندن سے چار جلدوں میں شائع کی، لیکن اس وقت مجھے نولڈکہ کی "تاریخ القرآن" کا تذکرہ مقصود ہے جس سے یورپ میں قرآنی مباحث کی ابتدا علمی انداز میں ہوئی، اس تالیف میں انھوں نے

---

[1] Theodor Nöldeke, Geschichte des Qorans. Göttingen, 1860

قرآن شریف کی جمع و تدوین، اس کے مسائل اور مکی و مدنی سورتوں کی تقسیم اور ان کے مضامین کی تفصیل کے علاوہ سورتوں کی ترتیب نزولی سے بھی بحث کی تھی،[1] ترتیب نزولی کی یہ بحث یورپ کے لیے بالکل جدید نہ تھی، کیونکہ نولڈکر سے پہلے ۱۸۴۴ء میں گستاوروائل (G. Weil) اس مسئلہ پر بحث کر چکے تھے، بہرحال پروفیسر نولڈکر کی تصنیف میں مباحث کے لحاظ سے بڑی جامعیت تھی، اور ان مباحث پر عیسائی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ محض علمی انداز پر گفتگو کی گئی تھی۔

پروفیسر ممدوح انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "تمام انبیاءؑ میں سے رسول عربیؐ سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئے ہیں" یہ رائے اگرچہ ناقابل انکار تاریخی حقائق پر مبنی ہے، تاہم اس قسم کا واشگاف اعتراف پروفیسر نولڈکر کی علمی دیانت اور انکی ذاتی عظمت کی دلیل ہے، لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے اس بات کو آگے نہیں بڑھایا، مثلاً وہ اس اظہار رائے کے بعد یہ سوال اٹھا سکتے تھے کہ آخر کار رسول کریمؐ کی بے مثال کامیابی کے کیا اسباب تھے، اگر وہ ان اسباب کی تحقیق کرتے تو اس بحث کے اثناء میں نہ صرف آنحضرتؐ کی جادو بھری شخصیت کے بہت سے پہلو ہماری نظر کے سامنے آجاتے، بلکہ اسلام کی قوت اور کشش اور اس کی امتیازی خصوصیات کے بارے میں بھی بہت سے دلچسپ حقائق کا انکشاف ہوتا۔

تاریخ القرآن "تاریخ القرآن" کی تالیف کے بعد پروفیسر نولڈکر کا اشہب قلم السنہ سامیہ (Semitic Studies) کے وسیع میدان میں نصف صدی تک اپنی حیرت انگیز جولانی دکھاتا رہا، اور ان کو تاریخ القرآن پر نظر ثانی کرنے یا اس کی توسیع کرنے کی فرصت نہ مل سکی۔ یہ کام تاہم ان کے لائق شاگرد پروفیسر شوالی (Shwally) نے انجام دیا اور

---

[1] قرآن پاک کی سورتوں کی ترتیب نزولی پر پروفیسر محمد اجمل خاں مرحوم "ترتیب نزول قرآن مجید" کے نام سے ایک مستقل کتاب ۱۹۳۱ء میں دہلی سے شائع کر چکے ہیں۔

اس کتاب کے مضامین میں اتنا اضافہ کیا کہ اس کی ایک جلد سے دو جلدیں بن گئیں، جو یکے بعد دیگرے ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئیں، پروفیسر شوالی اپنے نامور استاد کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے، لیکن "تاریخ القرآن" کی توسیع کا کام بدستور جاری رہا، چنانچہ ۱۹۳۸ء میں تیسری جلد کا اضافہ ہوا، جس کے لیے ہم پروفیسر برگ شستراسر اور پرٹسیل کے ممنون ہیں، اس تیسری جلد میں قرآن مجید کے متن اور اس کی مختلف قرأت سے بحث ہے۔

پروفیسر نولڈکہ کے علمی کارناموں کے تذکرہ کے لیے اس تبصرہ کا دامن تنگ ہے، لہذا اس موقع پر صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے امام المستشرقین تھے، مشرقیات کی ریاست و قیادت ایک مدت سے فرانسیسی مستشرقین کے ہاتھوں میں چلی آ رہی تھی، لیکن انیسویں صدی کے نصف ثانی میں یہ لیڈر شپ قطعی طور پر جرمنی کی طرف منتقل ہو گئی، اور جن جرمن مستشرقین کی نمایاں علمی مساعی کی بدولت یہ قیادت جرمنی کے حصہ میں آئی، پروفیسر نولڈکہ اس گروہ کے سرخیل تھے اور ہمارے نقطۂ نظر سے یہ بات قابل توجہ اور معنی خیز ہے، کہ یورپ میں اسلامک اسٹڈیز کی عمارت کا پہلا ستون ایک ایسے نامور اور ممتاز عالم کے ہاتھوں قائم ہوا جس کو علمی دنیا میں ایک نہایت اعلیٰ و ارفع مقام حاصل تھا،

قرآنی مباحث کے ضمن میں پروفیسر ہوروونس کی "تحقیقات قرآنیہ"[1] بھی قابل ذکر ہے، جس میں فاضل مصنف نے قصص القرآن کے علاوہ ان تمام اعلام سے بھی بحث کی ہے، جو قرآن پاک میں مذکور ہوئے ہیں، آجکل جرمنی میں پروفیسر روڈی پاریٹ (Rudi Parit) قرآن مجید کے متعلق تحقیقی کام کر رہے ہیں، اور انھوں نے اسی سلسلہ میں قرآن شریف کا جرمن زبان میں ایک تازہ ترجمہ شائع کیا ہے، گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں انگریزی، فرانسیسی، جرمن

---

[1] Josef Horovitz, Koranische Untersuchungen. Berlin, 1926

اور ولندیزی (ڈچ) زبانوں میں قرآن شریف کے متعدد نئے ترجمے شائع ہو چکے ہیں جنکی اپنی اپنی خصوصیات ہیں، مثلاً پروفیسر کرامر کے ڈچ ترجمہ کے ساتھ مضامین کا ایک مفصل انڈکس بھی شامل ہے۔ قرآنی مباحث کے ضمن میں قرآن پاک کے تراجم کا ذکر لازمی ہے، لیکن افسوس ہے کہ اطناب کے خوف سے اس موقع پر ان کی تفصیل نہیں دی جا سکتی۔

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جس طرح قرآن مجید دین اسلام کی اساس اور بنیاد ہے، اسی طرح قرآن پاک کے متعلقہ مباحث کو اسلامیات میں اولین درجہ حاصل ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر نولڈکہ نے یورپ میں ان مباحث کا علمی طریق پر آغاز کر کے اسلامک اسٹڈیز کی عمارت کا پہلا ستون قائم کیا، اور وہ خود ان اسٹڈیز کے اولین ارکان میں سے ہیں۔

علم تفسیر القرآن | قرآنی مباحث کے ساتھ علم تفسیر کا ذکر کرنا بھی مناسب اور ضروری ہے۔ اگرچہ یورپ میں امام جلال الدین سیوطی کی طبقات المفسرین چھپ چکی تھی، لیکن علم تفسیر اور خصوصاً تاریخ التفسیر کے علمی مطالعہ کی منزل ہنوز بہت دور تھی۔ اسی عدم توجہ کا یہ نتیجہ ہے کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں برن کارا دو (Baron carra de Vaux) کے قلم سے "تفسیر" پر جو آرٹیکل شائع ہوا تھا، وہ اس علم کی عظمت اور اہمیت کے مقابلہ میں بالکل مختصر، ناکافی اور تشنہ تھا، اس کمی کو آخر کار پروفیسر گولڈ سیہر نے پورا کیا۔ انھوں نے ۱۹۱۳ء میں علم تفسیر کے ارتقاء اور مفسرین کے طبقات اور ان کے رجحانات پر جو لکچر دیے تھے، وہ ۱۹۲۰ء میں لائڈن سے جرمن زبان میں طبع ہو کر شائع ہو گئے تھے[ل]۔ امام سیوطی نے مفسرین کے طبقات کی ترتیب زمانی لحاظ سے کی تھی لیکن گولڈ سیہر نے ان کے طبقات ان کے مخصوص رجحانات کے اعتبار سے قائم کیے، مثلاً ان کے نزدیک ایک گروہ ایسے علماء کا ہے جنھوں نے قرآن کی تفسیر اسلامی روایات اور حدیث کی روشنی میں کی ہے مثلاً

ل- Ignaz Goldziher, Die Richtungen der islamischen Koran-auslegung. Leiden 1920

امام ابن جریر طبری وغیرہ۔ ایک طبقہ معتزلی خیال کے مفسرین کا ہے، جنھوں نے قرآن مجید کی تفسیر اپنے مخصوص عقائد کے مطابق کی ہے، اور جن کے سرخیل علامہ زمخشری ہیں، اسی طرح ایک گروہ متصوفہ کا ہے، اور سب سے آخر میں زمانہ حال کے مفسرین ہیں، جو عہد حاضر کے طرز خیال اور نظریات سے متاثر ہوئے ہیں، انھوں نے قرآن کو اسی انداز میں سمجھا ہے اور اسی انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے، ایک مصری فاضل عبدالقادر صاحب نے اس کتاب کو مذاہب التفسیر الاسلامیہ کے نام سے عربی میں ترجمہ کر دیا ہے جس کا مطالعہ ہمارے علماء کے لیے ازبس مفید ہے، پروفیسر گولڈ سیہر کے بعض بیانات محل نظر ہیں لیکن فاضل مترجم نے ان کی نشاندہی کر دی ہے، اور علمائے کرام خود بھی ان پر آسانی سے متنبہ ہو سکتے ہیں۔

بیضاوی کا درس جرمنی میں

علم تفسیر کے سلسلہ میں تفسیر بیضاوی کے اس درس کا ذکر کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جو لائپزگ یونیورسٹی میں وہاں کے عربی کے مشہور عالم پروفیسر فلائشر گذشتہ صدی میں عربی کی تعلیم کے ضمن میں دیا کرتے تھے، پروفیسر ممدوح نے اپنے درس کے لیے بیضاوی کو بھی کمال احتیاط اور صحت کے ساتھ ایڈٹ کر دیا تھا جو ان کے تبحر علمی پر شاہد عدل ہے، اس عمدہ ایڈیشن کی اشاعت میں ان کو جو حیرت انگیز اور لائق ستائش کامیابی ہوئی، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عربی صرف و نحو کی پیچیدگیوں سے خوب واقف تھے، اور عربی لغت پر بھی بڑا عبور رکھتے تھے، اور جس محنت سے وہ اپنے درس کی تیاری کرتے تھے، اس کی کیفیت ان کے ایک لائق شاگرد پروفیسر اگسٹ مُلر نے ان کے حالات میں لکھی ہے، وہ رقمطراز ہیں کہ "ایک دن ہم لوگ حسب معمول سبق کے لیے ان کے حجرہ درس (لیکچر روم) میں پہنچے تو ہم کیا دیکھتے ہیں کہ پروفیسر فلائشر وہاں پہلے ہی سے موجود ہیں، اور ایک اونچے سے میز پر تفسیر بیضاوی دھری ہے، اور اس کے پاس ہی شیخ زادہ کا حاشیہ کھلا ہے، اور وہ اس کے مطالعہ میں ایسے محو ہیں کہ کئی منٹوں تک ان کو اپنے شاگردوں کی

آمد اور ان کی موجودگی کا مطلق کوئی احساس نہیں ہوا۔"

ایک دن پروفیسر فلائشر نے اپنے شاگردوں سے یہ قصہ بیان کیا کہ میں نے سنا ہے کہ میرا بیضاوی کا اڈیشن کسی طرح قسطنطنیہ کے شیخ الاسلام کے پاس بھی جا پہنچا۔ پہلے تو انھوں نے اسے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور اسے درخور اعتنا نہ سمجھا، لیکن کچھ دیر کے بعد، خدا جانے، ان کے دل میں کیا خیال آیا کہ کتاب کو دوبارہ اٹھایا اور اسے کھول کر پڑھنا شروع کیا، اور دیر تک پڑھتے رہے اور پھر حاضرین مجلس سے مخاطب ہو کر کہا کہ "مجھے اس مغربی عالم پر تعجب ہے، جو تفسیر بیضاوی کو اسی خوبی کے ساتھ لکھتا ہے جس خوبی سے کوئی مشرقی عالم سمجھ سکتا ہے۔"

پروفیسر گولٹ سیہر | پروفیسر اگناز گولٹ سیہر بوڈاپسٹ (ہنگری) کے رہنے والے تھے[۱]، قومیت اور زبان کے لحاظ سے ہنگیرین اور مذہباً یہودی تھے۔ اپنے علم و فضل کی بدولت اگرچہ انھوں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی تھی لیکن یہودی ہونے کی وجہ سے ان کے اپنے وطن میں خاطر خواہ قدر دانی نہ ہو سکی لیکن اس کے باوجود ان کی ہمت و عزیمت میں فرق نہ آیا، اور وہ تحقیق و تدقیق اور تصنیف و تالیف میں بدستور مصروف رہے۔ یورپ میں اسلامک اسٹڈیز کو فروغ دینے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے، ہنگیرین کے علاوہ جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں لکھتے تھے، ان کے بے شمار مقالوں، رسالوں اور کتابوں کی تفصیل ان کی ایک ببلیوگرافی یعنی فہرست مؤلفات میں مندرج ہے جو ایک سو صفحات پر مشتمل ہے، اور ۱۹۲۷ء میں پیرس میں طبع ہو چکی ہے۔ ان کو عربی زبان اور ادب سے بھی شغف رہا ہے، عربی ادب کی تاریخ پر ان کی ایک مختصر سی کتاب ہے، جس کو ان کے شاگرد ڈاکٹر سمتھ (؟) نے انگریزی میں منتقل کر دیا ہے اور آجکل متداول ہے، ان کو عربی زبان پر بہت اچھا عبور تھا،

---

[۱] Ignaz Goldziher (b. 1850 – d. 1921)

پروفیسر اگناز گولٹ سیہر کے نام کا پہلا جزو Ignaz جو کہ اصل میں اگناز ہے بگڑ کر ہنگیرین زبان میں اگناس ہو گیا ہے۔

چنانچہ ان کی عادت تھی کہ جب کبھی ان کے پاس کوئی مطبوعہ عربی کتاب پہنچتی تھی تو وہ اس کی تصحیفات اور اغلاط کو ان کے سیاق و سباق سے بھانپ لیتے تھے، اور پھر اپنی تصحیحات کو قلمبند کرکے اس کتاب کے ایڈیٹر کو بھیجدیتے تھے، دوسروں کی حوصلہ افزائی اور معاونت کرنے میں بڑی فراخدلی سے کام لیتے تھے۔ ڈاکٹر آرنلڈ اپنی "پریچنگ آف اسلام" کے طبع ثانی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "پروفیسر گولٹ سیہر نے میری کتاب کے موضوع میں جس دلچسپی کا اظہار کیا ہے، اس سے اپنے کام کو جاری رکھنے میں میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ہے"۔

پروفیسر گولٹ سیہر بڑے متین اور متدین قسم کے عالم تھے۔ ان کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کے موقع پر ایک سوشل اجتماع میں انھوں نے دیکھا کہ چند نوجوان مسلمان ایک میز کے گرد کھڑے شغل شراب کر رہے ہیں، وہ ان کی طرف بڑھے اور ان سے کہا کہ "میں جانتا ہوں اور تم بھی خوب جانتے ہو کہ اسلام میں شراب نوشی حرام ہے، بڑے افسوس اور رنج کی بات ہے کہ تم لوگ اس طرح علانیہ اپنے شعائر دینی کی بے حرمتی کر رہے ہو"۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

علم حدیث کا مطالعہ | دیگر علمی خدمات کے علاوہ گولٹ سیہر کا ایک مخصوص کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے یورپ کے علمی حلقوں میں علم حدیث کے ساتھ ایک مستقل فن کی حیثیت سے اعتنا کیا اور اس علم کے تمام مسائل سے بحث کی۔ اگرچہ گولٹ سیہر سے پہلے ولیم میور اپنی "لائف آف محمدؐ" کے طویل مقدمہ میں اسلامی روایات کا جائزہ لے چکا تھا، لیکن اس کی تنقید محض اس اعتبار سے تھی کہ سیرت نبوی کے سلسلہ میں یہ روایات کس حد تک قابلِ استناد ہیں۔ لیکن گولٹ سیہر نے حدیث کے ساتھ ایک مستقل فن کی حیثیت سے بحث کی، چنانچہ جب انھوں نے اپنی مشہور کتاب "مطالعات مہ" (یعنی اسلامیہ) دو جلدوں میں شائع کی تو اس کی دوسری جلد کو بیشتر علم حدیث کے متعلق

مباحث کے لیے وقف کر دیا۔ اور اس کے بعد یورپ میں حدیث نبوی کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بیشتر اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔ مثلاً پروفیسر گیوم (Guillaume) نے Traditions of Islam کے نام سے جو کتاب ۱۹۲۴ء میں شائع کی تھی وہ بھی گویا گولڈ سیہر کی تصنیف کا انگریزی خلاصہ ہے۔

گولڈ سیہر نے دیگر باتوں کے علاوہ ضعیف اور موضوع حدیثوں کا بھی ذکر کیا ہے، اور وضع حدیث کے اسباب و محرکات سے بھی بحث کی ہے۔ نقد حدیث ہم مسلمانوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں، ہمارے علمائے سلف نے موضوع اور کمزور حدیثوں کا جو پایۂ استناد سے ساقط تھیں، خود ہی چھانٹ کر الگ کر دیا ہے، اور کھوٹے کھرے کی پہچان کے اصول قائم کر دیے ہیں، لیکن "تنقید حدیث" کا کام اگر اغیار کے ہاتھوں انجام پائے، تو یہ "تنقید حدیث" بسا اوقات "تنقیص حدیث" کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور موضوع اور کمزور حدیثوں کا بار بار ذکر کرنے کا ایک خوفناک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پڑھنے والا یا سننے والا احادیث کے سارے ذخیرے ہی سے بدظن ہو جاتا ہے۔ اور وہ بالآخر صحیح حدیثوں سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔ اور ان کی قدر و منزلت اس کے دل سے اتر جاتی ہے اور مطالعۂ حدیث اور عمل بالحدیث کے جو فوائد اور برکات ہیں، ان سے وہ محروم ہو جاتا ہے۔

انکار حدیث کا فتنہ | ہندوستان وہ ملک ہے جس میں کسی زمانے میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ اور دیگر صلحائے امت نے علم حدیث کے جھنڈے بلند کیے تھے، اور آج یہ حالت ہے کہ ان ہی دیار میں "انکار صحت حدیث" بلکہ "انکار حجیت حدیث" کی ایک ایسی باد سموم چلی ہے جس سے حدیث کا استخفاف کرنا اور اس کی تنقیص کرنا گویا ایک فیشن بن گیا ہے۔ بلکہ "روشن خیالی" کی دلیل سمجھی جاتی ہے، لیکن اس تنقیص حدیث کے نتائج اور مضرات نہ صرف علمی بلکہ عملی لحاظ سے اتنے دور رس اور اتنے خطرناک ہیں کہ میں ان کی طرف اشارہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ "انکار صحت حدیث" ملحد اسلام کے

خلافت اغیار کا ایک حصہ تھا جس سے وہ ہم پر وار کرنا چاہتے تھے، اغیار اس بات کو خوب بھانپ گئے تھے کہ اسلام کی قوت اور کشش کا راز دیگر امور کے علاوہ اس بات میں مضمر ہے کہ سچے مسلمانوں کو اپنے آقائے نامدار کے ساتھ دلی شغف ہے اور ایسی والہانہ عقیدت ہے کہ اس نام کی عزت کے لیے اور اس کے ناموس کی حفاظت کے لیے کٹ مرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں، اور جب تک مسلمانوں کی یہ عقیدت اپنے پیغمبر کے ساتھ قائم ہے، ان کو اسلام سے منحرف کرنا ناممکن ہے۔ اس رشتۂ عقیدت کو توڑنے کا ایک طریقہ انھوں نے یہ سوچا بلکہ اختیار کیا کہ حدیث نبوی کی تنقید ایسے پیرایہ میں کیجائے، جس سے حدیث نبوی کی وقعت مسلمانوں کے دلوں سے جاتی رہے، کیونکہ ان کو اس بات کی پوری امید تھی کہ جب مسلمان حدیث نبوی سے بدظن ہو جائیں گے تو ان کے ہادی کی جو آواز ان کے کانوں میں حدیث کے ذریعہ سے پہنچ رہی ہے، خود بخود منقطع ہو جائے گی، اور اس کے ساتھ ہی ان کی عقیدت میں بھی یقیناً فرق آجائے گا۔ اور اسلام کے ساتھ ان کی وابستگی کے جو رشتے ہیں، ان میں سے ایک قوی رشتہ ٹوٹ جائے گا، اور اس صورت میں مسلمانوں کو اپنے دین سے منحرف کرنا آسان ہو جائے گا۔

حدیث نبوی کا احترام

ہمارے اسلاف کے دلوں میں حدیث نبوی کا جو احترام تھا اور وہ جس طرح ہر حالت میں اس کا ادب ملحوظ خاطر رکھتے تھے، وہ ایک چھوٹے سے واقعہ سے بخوبی ثابت ہے۔ امام سیوطی نے جب کمزور اور مشکوک حدیثوں کو چھانٹ کر ایک کتاب میں الگ جمع کر دیا، تو آپ کو خوب معلوم ہے کہ انھوں نے اس کا نام کیا رکھا تھا، انھوں نے اس کا نام رکھا تھا "اللآلی المصنوعۃ" یعنی بناوٹی موتی۔ اس نام کی لطافت دیکھئے کس قدر نفیس اور خوبصورت نام ہے، جس کا ایک ایک حرف سے حدیث نبوی کا ادب اور احترام مترشح ہے۔ اس نام پر غور کرنے سے صاف عیاں ہے کہ امام صاحب کے نزدیک اگرچہ یہ روایتیں موضوع ہیں، لیکن آخر کار یہ بھی سچی حدیثوں کے نمونہ پر

بنائی گئی ہیں، اس لیے ان کی مثال ان مصنوعی موتیوں کی ہے جو مصنوعی ہونے کے بعد آخر کار موتی ہیں!

اسلامک اسٹڈیز کا دوسرا رکن اس جملۂ معترضہ کے بعد اب میں اپنے موضوع کی طرف لوٹتا ہوں، اور عرض کرتا ہوں کہ پروفیسر گولٹ سیہر پہلے مغربی عالم تھے جنھوں نے علم حدیث پر سیر حاصل بحث کی اور یہ وہ دوسرا ستون تھا جس پر یورپ میں اسلامک اسٹڈیز کی عمارت تیار ہوئی، اور خود پروفیسر گولٹ سیہر نولڈکہ کے ساتھ اسلامیات کے دوسرے رکن قرار پائے۔

کتب حدیث کے انڈکس علم حدیث کے سلسلہ میں مجھ پر اس بیش قیمت اور قابل قدر خدمت کا تذکرہ کرنا لازم ہے، جو ہالینڈ کی لائڈن یونیورسٹی میں ایک مدت سے کتب حدیث کے مطالعہ کی تسہیل کے لیے جاری ہے۔ جب گولٹ سیہر کی تحریروں سے علم حدیث کی اہمیت واضح ہوگئی تو لائڈن یونیورسٹی کے پروفیسر وینسنک نے کتب حدیث سے استفادہ کرنے والوں کی سہولت کے لیے دو منصوبے بنائے۔ ایک منصوبہ کے مطابق اس نے حدیث کے مضامین اور مطالب کا ایک انڈکس یعنی اشارہ خود تیار کیا اور اس کا نام ہینڈبک آف ارلی محمڈن ٹریڈیشن رکھا،[1] اور سینکڑوں عنوانات مثلاً صوم، صلوٰۃ، تراویح، اذان وغیرہ قائم کیے اور ان کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دے کر انکے ذیل میں ان تمام احادیث کی نشاندہی کر دی ہے، جن میں ان مضامین کا ذکر آیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے اعلام کو بھی اپنے اشاریہ میں شامل کیا ہے، اور اس طریق سے اکثر اکابر صحابہ وصحابیات کا بھی ذکر خیر آگیا ہے، مثلاً اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ حضرت ابوبکرؓ یا حضرت علیؓ یا حضرت بلالؓ کا یا کسی اور صحابی یا صحابیہ

---

[1] Arent Jan Wensink (b. 1882; d. 1939):
A Hand Book of Early Muhammadan Tradition,
Alphabetically Arranged. 269 pages. Leiden, 1927

کا ذکر احادیث و آثار کی کتابوں میں کہاں کہاں اور کس سلسلہ میں آیا ہے، تو ان کے ناموں کے تحت آپ کو ان تمام احادیث و روایات کا سراغ مل جائیگا جن میں ان حضرات کا ذکر آیا ہو، اس غرض سے پروفیسر ونسنک نے صحاح ستہ کے علاوہ موطا امام مالکؒ، مسند احمد بن حنبلؒ، سنن دارمیؒ، مسند طیالسی، سیرت ابن ہشام، مغازی واقدی اور طبقات ابن سعد کو بھی پیش نظر رکھا ہے، اور ان کے باقاعدہ حوالے دیے ہیں، پروفیسر ممدوح نے حدیث نبوی اور اسلامی اخبار و روایات کے اس سارے وسیع اور ضخیم ذخیرے پر جس محنت شاقہ اور استیعاب کے ساتھ غائر نگاہ ڈالی ہے، اس کے تصور سے انسان حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی اس بات پر بھی کمال تعجب ہوتا ہے کہ کارکنانِ قضا و قدر نے کس طرح ایک مغربی عالم سے حدیث نبوی کی ایسی بیش بہا خدمت لی ہے، مصنف کی محنت اور دیدہ ریزی اور اس کے اشاریہ کی افادیت کا اندازہ وہی لوگ کما حقہ لگا سکتے ہیں جن کو اس کی طرف رجوع کرنے اور اس سے استفادہ کرنے کا اتفاق ہوتا ہے۔

مفتاح کنوز السنۃ | یہ انڈکس اسقدر مفید ہے کہ مصر کے ایک فاضل محمد فواد عبدالباقی نے اسے مصنف کی اجازت سے عربی میں کردیا تھا، اور اسے مفتاح کنوز السنۃ کے نام سے ۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء) میں قاہرہ سے شائع کردیا تھا، اسکی ابتداء میں مرحوم منشی المنار سید محمد رشید رضا کا دیباچہ اور مرحوم قاضی احمد محمد شاکر کا لکھا ہوا مقدمہ بھی پڑھنے کے لائق ہے، ان وسیع القلب اور عالی ظرف مصری علماء نے کتاب مذکور کی افادیت کا پورا پورا اعتراف کیا ہے، اور اس کے مصنف کی جانفشانی کی دل کھول کر داد دی ہے، چنانچہ قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ کتب حدیث اس شخص کے لیے جس نے ان کا مدت دراز تک مطالعہ نہ کیا ہو، بند صندوقوں کی مانند ہیں، اور اس کے لیے اُن تک رسائی پانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے لیکن استاد محمد فواد عبدالباقی صاحب نے اس شخص کے لیے ایک ایسی کلید تیار کردی ہے جس کے ذریعہ سے وہ ان خزانوں تک پہنچ سکتا ہے، اور عقلاً عقل اور صفائے قلب حاصل کرسکتا ہے"۔ اسی طرح سید محمد رشید رضا رقمطراز ہیں کہ تلاش کہ

مجھے یہ کتاب اوائل عمر میں دستیاب ہوتی جب میں کتب حدیث کے ساتھ اشتغال رکھتا تھا، تو اس صورت میں میری عمر کا ایک چوتھائی حصہ بچ جاتا، جو میں نے حدیثوں کی تلاش اور کتب حدیث کی ورق گردانی میں صرف کیا ہو۔"

المعجم لالفاظ الحدیث | پروفیسر وینسنک کا دوسرا منصوبہ الفاظ حدیث کا انڈکس ہے، جسکی تدوین اشاعت ایک وسیع پیمانہ پر کئی برس سے جاری ہے، اس اشاریہ کا عنوان المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی ہے[1]، جس میں ایک ایک لفظ کو لیکر اس کے ذیل میں اُن تمام حدیثوں اور روایتوں کے پورے جملے نقل کر دیئے گئے ہیں جن میں وہ لفظ استعمال ہوا ہے، اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ منصوبہ بہت لمبا ہے، اس کے بانی پروفیسر وینسنک ۱۹۳۹ء میں اپنے خالق کے سایۂ رحمت میں جا چکے ہیں، ان کے بعد مینگ (Mensing) صاحب نے تالیف و تدوین کا کام سنبھالا تھا لیکن وہ بھی چند سالوں کے بعد انتقال کر گئے، اس معجم کے اڈیٹر یکے بعد دیگرے اس دنیائے فانی سے رخصت ہو رہے ہیں، لیکن معجم کی تدوین اور اشاعت کا کام بدستور جاری ہے، کیونکہ اسکے پبلشر کو اس خاص کام کے لیے یورپ کی متعدد اکاڈمیوں، علمی مجلسوں اور حکومتوں کی طرف سے مالی امداد ملتی ہے، اس کی تالیف و تدوین میں اس وقت تین چار فضلا شریک ہیں اور اسکی تین ضخیم مجلدات بڑی تقطیع پر شائع ہو چکی ہیں اور باقی حصہ کی اشاعت بالاقساط جاری ہے، کام بہت حد تک انجام پا چکا ہے لیکن ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔

اے ابنائے ملت! یہ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جو کام ہمارے کرنے کا تھا، اس کو اغیار انجام دے رہے ہیں، مغرب کے چند علماء اس پر اپنی عزیز عمریں صرف کر چکے ہیں، اور دیگر چند فضلاء ابھی تک اس پر دیدہ ریزی کر رہے ہیں، اور ان کی علمی مجلسیں اور ان کی حکومتیں ان کی کفالت کرتے ہوئے اس علمی منصوبہ کی تکمیل کے لیے اب تک لاکھوں روپیہ کے عطیے دے چکی ہیں۔

(باقی)

---

[1] *Concordance et Indices de la Tradition Musulmane. Brill. Leiden*

پاکستان میں دو مہینے

از سید صباح الدین عبد الرحمن

(۳)

ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کے موجودہ ڈائرکٹر موج کوثر اور رود کوثر کے مشہور مصنف اور غالبیات کے ماہر جناب شیخ محمد اکرام صاحب آئی سی ایس ہیں، جو سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو کر اپنی علمی خدمت سے اس کو سیراب کر رہے ہیں، وہ موج کوثر میں استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کی نسبت بقول ان ہی کے خوب زہر اگل چکے ہیں (شبلی نامہ ص ۱۱) اور شبلی نامہ میں مولانا شبلی کے متعلق کچھ ایسی باتیں لکھ دی ہیں جو وابستگان شبلی کو پسند نہیں ہیں، اور دار المصنفین کو بڑھتے ہوئے امراض میں مبتلا بتایا ہے (ص ۱۱)، اس لیے خیال ہوا کہ وہ مولانا سید سلیمان ندوی کے ایک حقیر شاگرد اور مولانا شبلی کے آستانہ کے ایک خادم اور دار المصنفین کے ایک ادنی خدمت گزار سے پورے انشراح کے ساتھ ملنا پسند نہیں کریں گے لیکن جب میں ان کے ادارہ میں پہنچا تو بڑی خندہ پیشانی سے ملے، ان کے چہرہ پر کبرسنی کے زیادہ آثار نہ تھے، بلکہ اس پر تازگی تھی، شگفتگی تھی، وقار بھی اور علم و ادب کی خدمت کرنے کا عزم بھی، انھوں نے ادارہ کے تمام رفقاء کو اپنے کمرہ میں بلا لیا، پھر دیر تک خوشگوار گفتگو ہوتی رہی، پوچھا کہ دار المصنفین کا کیا حال ہے، میں نے عرض کیا کہ وہ تو علمی بھکشوؤں کی ایک جماعت ہے، جو بھکشوؤں کا حال ہونا چاہیے، وہی وہاں کے بھکشوؤں کا ہے، یہ سن کر ہنسنے لگے، مولانا شبلی پر بھی گفتگو آگئی جو بڑی ہی دلچسپ رہی، میں نے عرض کیا کہ پہلے مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک لطیفہ سن لیں جس کا ایک ٹکڑا تو ہم لوگوں کیلئے ہے

اور دوسرا آپ کے لیے ہو. خلافت تحریک کے زمانہ میں حضرت سید صاحب کی قیادت میں خلافت کا ایک وفد حجاز گیا. جس میں مولانا محمد علی مرحوم بھی تھے، وہاں دونوں میں اختلاف ہوگیا، اور جب یہ وفد ہندوستان واپس آیا تو مولانا محمد علی مرحوم نے اپنے اخبار ہمدرد میں مضامین لکھنے شروع کیے جن میں سید صاحب کی مخالفت تھی، سید صاحب نے ان مضامین کا کوئی جواب نہیں دیا، وہ ان ہی دنوں دہلی تشریف لے گئے، تو مولانا محمد علی سے بھی ملے. ان سے فرمایا کہ آپ میرے خلاف جتنا بھی لکھیں گے میں خاموش رہوں گا، مولانا محمد علی کی حاضر جوابی تو مشہور ہے؛ انھوں نے برجستہ فرمایا، میں لکھ کاہے کو رہا ہوں، آپ کو خاموش کرنے کے لیے ہی تو لکھ رہا ہوں". اس لطیفہ سے پورا کمرہ قہقہوں سے گونجنے لگا، اس کے بعد مجلس کا رنگ ہی بدل گیا، مولانا شبلی پر پھر گفتگو آگئی تو میں نے کہا کہ ان پر چاہے جتنی بھی تنقیدیں کیجائیں لیکن جن کے لیے انھوں نے اتنی کتابیں لکھی ہیں، وہ ان کو پڑھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنی گل و گلزار سے بسی ہوئی تحریروں کے ذریعہ انکی گذشتہ عظمت و شان کا تاج ان کو پہنا رہے ہیں، اسی اور صرف اسی میں ان کی عظمت کا راز ہے، جناب اکرام صاحب نے اس سے اتفاق کیا، پھر شعرالعجم کا ذکر آیا تو میں نے عرض کیا کہ اس پر ہر قسم کی تنقیدوں کے باوجود یہ اعتراف کرنا پڑیگا کہ شعرالعجم نے ہندوستان میں ایک خاص قسم کا ادبی اور تنقیدی ذوق پیدا کیا، اور فارسی شاعری سے لطف و لذت لینے کا سلیقہ سکھایا، اکرام صاحب نے اس کی بھی تائید کی، کچھ اور گفتگو بڑھی تو میں نے عرض کیا کہ پنجاب کے ایک دیدہ ور اہل قلم نے مولانا شبلی کی انشا پردازی کا بڑا اچھا تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں بلٹز کرگ (Blitzkrieg) استعمال کرتے ہیں، وہ ایک ہلہ بول کر، ایک طوفانی حملہ کرکے پہلے ذہن کو مفلوج اور مغلوب کر دیتے ہیں، پھر اپنی بات منوا لیتے ہیں، وہ تسخیر ذہن کا جو کام اپنی چند سطروں میں کرتے ہیں، دوسرے لوگ اپنی طویل تحریروں میں نہیں کر سکتے، پھر اس ایجاز و اختصار میں ایسی قوت پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، اس کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا، ان کے ایجاز و اختصار میں جوش بھی ہوتا ہے، حسن بھی اور قطعیت بھی، اکرام صاحب پوچھنے لگے یہ کن صاحب کا تجزیہ ہے، میں نے عرض کیا، ڈاکٹر سید عبداللہ کا،

انھوں نے کہا کہ میں اس کو ضرور پڑھوں گا، میں ان کا مہمان تھا، اس لیے میری خاطر اس وقت ذرا کھل کر، وہ گفتگو کرنے سے پرہیز کر رہے تھے۔ ان سے مل کر مجھ کو یہ خیال ہوا کہ ان کی جیسی باوقار شخصیت کے قلم سے شبلی نامہ میں بعض ایسی بحثیں کیسے نکل پڑیں، جو انکی تصنیفی متانت کے لیے بھی کسی طرح موزوں نہیں ہیں، ان کی بڑی خوبی یہ بھی ہو کہ وہ اپنی رائے میں ترمیم بھی کر لیتے ہیں، چنانچہ ان کی تصانیف کے دوسرے اڈیشن میں بہت کچھ ترمیمات ہو جاتی ہیں، وہ شبلی نامہ کا دوسرا اڈیشن شائع کریں گے تو امید ہے کہ نہ صرف اسکے لب و لہجہ میں فرق آ جائیگا، بلکہ انکی بہت سی رائیں بھی بدلی ہوئی ہوں گی، حیات شبلی کا ذکر آیا تو سرسید کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ان کو اتفاق نہ تھا، اور میں نے محسوس کیا کہ اس سلسلہ میں ان کو آزردگی تھی، میں نے عرض کیا کہ آپ یہی کہیں گے کہ سید صاحب نے مولانا شبلی کو سرسید سے زیادہ بڑھایا ہے، تو اسی سرزمین پنجاب کے ایک بہت بڑے بزرگ حضرت ذکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ سماعت فرمائیں، انھوں نے بغداد جا کر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی سے فیوض حاصل کیے اور وہاں ان ہی سے خرقۂ خلافت پایا، جب وہ اپنے مرشد سے رخصت ہوئے تو حضرت جلال الدین تبریزی بھی ان کے ساتھ ہو گئے، جو ان دنوں وہیں مقیم تھے، جب یہ دونوں بزرگ نیشاپور پہنچے تو حضرت جلال الدین تبریزی، حضرت شیخ فریدالدین عطار کی خدمت میں تشریف لے گئے ان سے مل کر واپس ہوئے تو حضرت بہاءالدین ذکریا نے ان سے دریافت کیا کہ شیخ فریدالدین سے کیا کیا صحبت رہی، انھوں نے جواب دیا کہ انھوں نے پوچھا کہ بغداد میں کون درویش مشغول بحق ہے، مگر میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، حضرت بہاءالدین ذکریا نے ان سے کہا کہ اپنے مرشد شیخ الشیوخ شہاب الدین کا کیوں ذکر نہیں کیا، حضرت جلال الدین تبریزی نے جواب دیا کہ شیخ فریدالدین کی عظمت میرے دل پہ ایسی چھائی ہوئی تھی کہ شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کو بھول گیا، یہ سن کر شیخ بہاءالدین ذکریا کو بہت ملال ہوا، اور انھوں نے کہا کہ تم دوسروں کی عظمت کے مقابلہ میں اپنے شیخ کو بھول سکتے ہو تو

ہماری تمھاری راہیں آج سے الگ ہیں، وہ ملتان چلے آئے اور حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے دوسری راہ لی، اس روایت کو بیان کرکے میں نے عرض کیا کہ سید صاحب اور ان کی طرح ہم لوگوں کا بھی یہی مسلک ہے کہ دوسروں کی عظمت کے مقابلہ میں اپنے مرشد اور استاد کی عظمت ہی کو برتر سمجھتے ہیں، خواہ آپ کو یا کسی اور کو اس عقیدت کے پہلو سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، اکرام صاحب میری بیان کردہ روایت کو سنکر ہنسنے لگے، پھر میں نے عرض کیا کہ عقیدت بھی اپنی جگہ پر اور اس سے ناقدوں کا اختلاف بھی اپنی جگہ پر، میں نے یہ بھی عرض کیا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ حیات شبلی لکھتے وقت سید صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتا، ان قیمتی آنسوؤں کے بعد عقیدت کی فراوانی وہی ہونی چاہیے جو حیاتِ شبلی میں پائی جاتی ہے، اکرام صاحب نے میری ان باتوں کو غور سے سنا اور شاید ان پر اپنے اصلی خیالات کا اظہار کرکے الجھنا پسند نہیں کیا کہ میں ان کا مہمان تھا۔

ان سطروں کو لکھتے وقت کچھ اور باتیں لکھنے کو جی چاہتا ہے، گو خاموش رہنا ہی زیادہ بہتر تھا لیکن اکرام صاحب کی ملاقات کے بعد ان کی نوازشوں سے سیراب ہونے کے بعد خواہ مخواہ لکھ رہا ہوں کہ انھوں نے شبلی نامہ میں لکھا ہے کہ شبلی اور سرسید کے متعلق انھوں نے (مولانا سید سلیمان ندوی نے) جس انداز سے بحث کی ہے اس سے ہمارے خیال میں شبلی کو بجائے فائدے کے نقصان ہوگا، (ص ۱۱) اکرام صاحب کو اگر مولانا شبلی کو نقصان پہنچنے کے بجائے ان کے فائدے کا واقعی خیال ہے تو اس کا فیصلہ کہ شبلی نامہ سے مولانا شبلی کو نقصان پہنچا ہے یا فائدہ، وہ خود نہیں فرما سکتے، بلکہ اس کتاب کے ناظرین ہی کر سکتے ہیں، اسکے علاوہ کبھی انھوں نے اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق اور وحید قریشی نے مولانا شبلی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے مولانا شبلی کو نقصان پہنچا ہے یا فائدہ،

حیات شبلی میں سید صاحب نے مولانا شبلی اور سرسید کے اختلافات کی تفصیل ضرور لکھی ہے جو کوئی نئی بات نہیں ہے، سرسید کی زندگی میں لوگوں نے ان سے جس طرح اختلاف کیا تھا، وہ صرف مخالفت ہی

کی حد تک نہیں رہی، بلکہ ان پر کفر کا فتویٰ بھی دیا گیا۔ ان کے بعض بہت ہی معتمد ساتھیوں کو بھی ان سے اختلاف ہو گیا تھا۔ حالی نے حیات جاوید میں سرسید کی مخالفت کا ایک مستقل باب ہی قائم کیا ہے۔ اس سے سرسید کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ سرسید کے خیالات سے اختلاف کی صدائے بازگشت اور ان پر تنقیدیں تو اس دور میں اب بھی سنائی دیتی ہیں، اور خود علی گڑھ کے حلقہ سے بھی مولوی طفیل احمد منگلوری نے "مسلمانوں کے روشن مستقبل" میں کیا کچھ نہیں لکھا ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے مختلف حیثیتوں سے وابستہ رہے ہیں، وہاں وہ کچھ دنوں استاد بھی رہ چکے ہیں، وہ اپنی تصنیف "ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں" میں لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانہ میں سرسید بجنور میں صدر امین تھے، وہ نہ صرف سرکاری ملازم کی حیثیت سے انگریزی حکومت کا وفادار رہنا اپنا فرض سمجھتے تھے، بلکہ انھیں دل سے یقین تھا کہ اس حکومت کا قائم رہنا ہندوستان میں امن قائم کرنے کے لیے اور اسے خوشحالی اور ترقی کی راہ دکھانے کیلئے ضروری ہے، اس لیے انھوں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس کا ساتھ دیا۔ (ص ۳۴)

"وہ سچا مذہبی جوش رکھتے تھے، مگر ان کا رویہ مذہب کی طرف زیادہ ذہنی تھا، اور اس میں خالص روحانی عنصر بہت کم تھا، وہ ہندوؤں، عیسائیوں اور دوسرے مذہب کے لوگوں کے ساتھ بھی رواداری برتتے تھے، مگر یہ صوفیوں کی قلبی رواداری تھی نہ جدید جمہوریت پسندوں کی ذہنی رواداری بلکہ محض ہندوستانی تہذیب کی روایتی رواداری، وہ روشن خیال اور ترقی پسند تھے، مگر کچھ حدود کے اندر، انھیں ہندوستانی سماج کی جہالت، تنگ نظری اور توہم پرستی کا احساس تھا، اور اس کی اصلاح کرنا چاہتے تھے، مگر اس کے بنیادی جاگیرداری ڈھانچے کو بدلنے کو تیار نہ تھے۔" (ص ۵۳-۵۴)

"مسٹر بیک نے ان کو اس پر راضی کر لیا کہ محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کے نام سے ایک انجمن قائم کی جائے جس کے مقاصد میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا، ان کو سیاسی شورش سے دور رکھنا اور

سلطنت برطانیہ کے استحکام اور حفاظت میں مدد دینا سب سے اہم تھا۔....... یہ انجمن مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھنے میں کامیاب نہیں رہی مگر پھر بھی مسلمانوں کے ایک حلقہ کے دلوں میں فرقہ وارانہ سیاست کا بیج جو اس نے بویا تھا، بہت جلد جڑ پکڑ لی۔" (ص ۶۰)

" محمڈن ایسوسی ایشن سرسید کے بڑھاپے کی کمزور اولاد تھی جس نے اگلے ۱۹۰۱ء میں مسٹر بیک کے انتقال کے ساتھ دم توڑ دیا، مگر فرقہ پروری کا وہ بیج بو گئی جو چھ سال بعد مسلم لیگ کی شکل میں پھوٹنے والا تھا۔" (ص ۶۱)

انجمن ترقی اردو کے مرکزی دفتر سے اس کا ہفتہ وار آرگن ہماری زبان کے نام سے علی گڑھ سے نکلتا ہے ۲۲ اپریل ۱۹۷۰ء کی اشاعت اس وقت سامنے ہے، اس کے اڈیٹر ڈاکٹر مسعود حسین مسلم یونیورسٹی کے ایک ممتاز اور لائق استاد ہیں، وہ اس کے اداریہ میں لکھتے ہیں :-

" علی گڑھ اور اردو کا رشتہ محبت و نفرت، لاگ اور لگاؤ کی ایک دلچسپ اور عبرت ناک کہانی ہے، علی گڑھ نے اردو کو ہمیشہ سرنگوں رکھا اور اردو نے علی گڑھ کو ہمیشہ سرفراز رکھا۔ سرسید اور علی گڑھ کی تحریک کا تصور اردو کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۸۶۹ء تک سرسید نے مسلسل اردو یونیورسٹی کا خواب دیکھا، اور سائنٹفک سوسائٹی جس کا مقصد اردو کو علمی تراجم سے مالا مال کرنا تھا، اس کے روح رواں بنے رہے لیکن یورپ سے واپس آنے کے بعد ۱۸۷۰ء میں انھوں نے سید محمود کی اعانت سے ادبی تعلیمی اسکیم مرتب کی تو اس وقت تک ان کا ورناکولر یونیورسٹی میں ایمان متزلزل ہو گیا تھا۔ علی گڑھ میں انگریزی کے ساتھ ایک اردو ڈیکلینی کا قیام عمل میں آیا لیکن اس طرح کہ وہ سسک سسک کر چند سال جینے کے بعد ۱۸۸۱ء میں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی، اس کے بعد سرسید اس نقطۂ نظر کے قائل ہو گئے تھے کہ یہ خیال بہت برا ہے کہ اگر ہماری تعلیم ہماری زبان میں ہو تو ہمارے لیے اور ملک کی ترقی کے لیے زیادہ مفید ہے، اب سرسید نہ صرف مشرقی علوم و السنہ

کی تحصیل کرنے والوں کو خاتمہ کی روٹی کھانے والے کہتے تھے بلکہ اردو زبان کو صرف تحصیل اور دیہاتی مکتبوں کی تعلیم کے لیے محدود رکھنا چاہتے تھے، اس کے بعد علی گڑھ کی چہار دیواری میں سرسید اردو کے لیے کچھ نہ کر سکے۔"

سرسید کے متعلق اس قسم کی اور بھی بہت سی تحریریں دوسرے اہل قلم کے یہاں بھی ملیں گی، ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے "سرسید اور اصلاح معاشرہ" کے نام سے جو کتاب شائع ہوئی ہے، اس میں بھی سرسید کے "افکار و نظریات میں چند نقائص" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، گو یہ بہت اجمالی ہے (ص ۲۵۳)

سرسید کی مخالفت میں ان کی زندگی سے لیکر اب تک جتنی تحریریں نکلی ہیں ان کو پڑھنے کے بعد حیات شبلی میں سرسید اور مولانا شبلی کے جو اختلافات دکھائے گئے ہیں، وہ بہت سنگین نظر نہ آئیں گے، اس سے قطع نظر ان کو قلمبند کرنے میں کہیں بھی نامناسب الفاظ اور جملے نہیں لکھے گئے ہیں، جو شبلی نامہ میں بعض جگہوں پر مطالعہ کرنے میں آتے ہیں، اس کے لائق مصنف کو اعتراف ہے کہ "آپ (حیات شبلی کے) مؤلف کی ایک آدھ بات سے اختلاف کر لیں لیکن اس میں جو ذخیرۂ معلومات جمع ہے، اس کی قدر نہ کرنا بے انصافی ہے، اگر آپ اسے کامل سوانح عمری نہ بھی سمجھیں اور کڑے نقطۂ نظر سے آخر ہماری زبان میں کتنی کامل سوانح عمریاں ہیں، تب بھی حیات شبلی میں فاضل مؤلف نے ہماری تیس چالیس سال کی مکمل علمی، ادبی اور مذہبی تاریخ جس طرح پیش کی ہے، اور یاد رکھیں بغیر یورپ کی کوئی سات سو سال کی علمی تاریخ لکھ دی ہے، اس کے احسان سے کس طرح انکار ہو سکتا ہے۔" (شبلی نامہ ص ۱۲)

اب شبلی نامہ کے فاضل مؤلف کو یہ غور فرمانا ہے کہ وہ حیات شبلی کی ایک آدھ بات سے اختلاف اور شدید اختلاف کرنے میں اپنی علمی سرگرمیوں کا مصرف لیں یا اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کو مفید، مفید تر، بلکہ مفید ترین علمی کاموں میں صرف کرکے علم، ادب اور تاریخ کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کریں۔

میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں اکرام صاحب سے رخصت ہونے لگا تو ان سے ان کی مشہور کتاب

غالب نامہ کا تازہ اڈیشن آنا تھا لیکن اس کے بجائے انھوں نے اپنی اور بھی مشہور تصنیف رود کوثر
کا نیا اڈیشن میری قیام گاہ پر بھجوانے کا وعدہ فرمایا۔ اکرام صاحب کے ساتھ ادارہ کے اور لوگوں سے
ملاقات کرنے کا بھی موقع ملا۔ اس وقت پروفیسر حمید احمد خاں صاحب بھی تھے، جو پنجاب یونیورسٹی کے
وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔ اب اس ادارہ کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں۔ ان کی خوبیاں کراچی میں سن چکا
تھا، اس لیے ان سے شوق سے ملا۔ میں نے ان کا ایک مضمون "غالب کی شاعری میں حسن و عشق" بہت
غور سے پڑھا ہے اس کے کچھ خیالات سے اتفاق نہیں ہے، خصوصاً ان کی اس رائے سے تو میرے ساتھ
اور لوگوں کو بھی اختلاف ہوگا کہ غالب کا کلام اسلامی ہندوستان کی سماجی اور روحانی تاریخ
کا خلاصہ ہے، میرا جی چاہتا تھا کہ ان سے پوچھوں کہ یہ انھوں نے جوش عقیدت میں لکھا ہے
یا واقعی انکی یہ رائے حقیقت پر مبنی ہے لیکن وہ اس محبت سے پیش آرہے تھے کہ اس بحث میں پڑنے کا موقع
نہ تھا، انھوں نے غالب کے نسخۂ حمیدیہ کو پھر سے ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے، اس کا ایک نسخہ مجھکو بھی عنایت
فرمایا۔ یہ بہت عمدہ کاغذ پر دیدہ زیب گرد پوش کے ساتھ عمدہ ٹائپ میں چھپا ہے۔ غالب کو اپنی زندگی
میں ہمیشہ دکھ رہا کہ ان کے دیوان کی طباعت ان کی خواہش کے مطابق کبھی نہیں ہوئی، اس لیے وہ دلی
اس کے بانی اور اس کے چھاپے خانے پر لعنت بھیجتے رہے، ان کی روح مولانا امتیاز علی عرشی کے اس
اعلیٰ اڈیشن کی طباعت سے خوش ہوئی ہوگی، جو انھوں نے ۱۹۴۲ء میں انتخاب غالب کے نام سے
شائع کیا تھا، اس کے بعد وہ عالم بالا میں پروفیسر حمید احمد خاں کے اس اڈیشن سے بھی خوش ہو رہے ہونگے،
پروفیسر صاحب نے اپنے دیباچہ میں مفتی انوار الحق کے ترتیب دیے ہوئے نسخۂ حمیدیہ کو یہ لکھ کر مجروح کیا ہے
کہ ۱۹۲۱ء کا نسخۂ حمیدیہ بھوپال کے قلمی دیوان کی بہل مطبوعہ نقل ہے۔ افسوس ہے کہ قلمی دیوان کے
انحراف کی جتنی مختلف قسمیں تصور میں آسکتی ہیں وہ مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخہ میں موجود ہیں۔ مفتی صاحب
کے مطبوعہ نسخے میں نہ صرف بعد کی سب اصلاحیں ہیں، بلکہ وہ پوری کی پوری غزلیں بھی شامل ہیں جنکا

بھوپال کے مخطوطے میں سرے سے وجود ہی نہیں (دیباچہ ۲۲) وہ مفتی صاحب کے نسخے کے متعلق یہ بھی لکھتے ہیں کہ مطبوعہ نسخے میں ایک بڑا فتور یہ پیدا ہوا ہے کہ قلمی نسخے میں غزلیات کی ترتیب مطبوعہ نسخے تک پہنچتے پہنچتے کچھ کی کچھ ہو گئی ہے (ص ۲۱) پروفیسر صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ مطبوعہ نسخہ متعدد فرو گذاشتوں کی وجہ سے وہ مقصد کما حقہ پورا نہ کر سکا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ مفتی صاحب کے نسخہ پر بعض سخت جملے پروفیسر صاحب کے قلم سے نہ نکلتے تو زیادہ مناسب تھا، کیونکہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی دریافت نے اس زمانہ کے ادبی حلقوں میں سنسنی سی پیدا کر دی، اس سنسنی پیدا کرنے میں مفتی صاحب کا بڑا حصہ ہے، گذشتہ پچاس برس سے غالب پر جس نے بھی کچھ لکھا ہے، اس نسخہ کو ضرور سامنے رکھا ہے، خود پروفیسر صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ قلمی دیوان کے پیش نظر ہوتے ہوئے مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخہ پر تکیہ ناگزیر ہے (ص ۲۲) انھوں نے اپنے نسخہ کی تیاری میں مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخہ کے متن کو بنیادی متن قرار دیا ہے (ص ۲۲) یہ اور بات ہے کہ پروفیسر صاحب کے ایڈٹ کرنے کا طریقہ ان سے زیادہ بہتر ہے، مگر اس سے مفتی صاحب کی محنت رائگاں قرار نہیں دی جا سکتی ہے، ممکن ہے کہ آیندہ نسخہ حمیدیہ کو کوئی اور بہتر طریقہ پر ایڈٹ کر دے اور وہ پروفیسر صاحب کی محنت اور مشقت پر پانی پھیرنے کی کوشش کرے تو کیا یہ اس کا ستم نہ ہوگا، مفتی صاحب کے نسخہ حمیدیہ میں پروفیسر صاحب کو کتابت کی بہت سی فرو گذاشتیں نظر آئیں، لیکن خوش قسمت غالب کی یہ بد قسمتی رہی کہ ان کے اشعار کی کتابت کے وقت بکثرت غلطیاں رہ جاتی ہیں، جیسا کہ پروفیسر صاحب کو بھی تجربہ ہے، کیونکہ ان کو اپنے نسخہ کے آخر میں ۱۵ صفحے کا غلط نامہ لگانا پڑا ہے،

ان باتوں سے قطع نظر پروفیسر صاحب نے یہ دیوان ایڈٹ کر کے غالب کے پرستاروں کو ایک بہت ہی خوبصورت تحفہ عطا کیا ہے، غالب کے صد سالہ جشن کے موقع پر شاید اس سے بہتر دیوان کہیں اور نہیں چھپا، یہ مجلس ترقی ادب، ۲- کلب روڈ، لاہور کی طرف سے شائع ہوا ہے، اس کی قیمت پندرہ روپے ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں نے دیوانِ غالب کا مطبوعہ نسخہ شیرانی بھی عطا کیا۔ اس کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ یہ نسخہ حمیدیہ کے بعد مرتب ہوا، اس لیے اس میں غالب کا وہ کلام بھی ہے جو نسخہ حمیدیہ میں نہیں تھا، یہ حافظ محمود خاں شیرانی کے ذخیرۂ کتب میں تھا جو اب پنجاب یونیورسٹی لاہور کی ملکیت ہے، اس کو مجلس ترقی ادب لاہور نے فوٹو آفسٹ میں شائع کرکے غالب کے صد سالہ جشن کے موقع پر عقیدت کا ایک نذرانہ پیش کیا ہے، اس کے بعد غالبیات پر کام کرنے والوں کو اصل نسخہ دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی، غالب کے کلام کے اور نسخوں کے ساتھ اس خوبصورت نسخہ کا رکھنا ناگزیر ہے، اسکی قیمت بھی پندرہ روپئے ہے،

ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے رفیق مولانا شاہ محمد جعفر ندوی پھلواروی نے مجھکو اپنی طرف بہت کھینچا، کیوں؟ اسکی وجہ میں نہیں بتا سکتا، وہ اب تک بہت سی کتابوں اور رسالوں مثلاً الدین یسرٌ، ریاض السنہ، پیغمبر انسانیت، ازدواجی زندگی کے لیے قانونی تجاویز، مسئلہ تعدد ازدواج، تحدید نسل، اجتہادی مسائل، زیر دستوں کی آقائی، المغزی وغیرہ کے مصنف اور مترجم ہو چکے ہیں، وہ ادارہ کے اہم مصنف ہیں، اس کے منجملہ مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اسلام کی ایسی ترقی یافتہ تعبیرات پیش کیجائیں جو ماضی کی وابستگی کے ساتھ حال کی ترقیوں پر بھی حاوی ہو، اور اسی روشنی میں روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھنے والے فقہی مسائل کی جدید تدوین کیجائے، اس مقصد کی تکمیل میں مولانا شاہ محمد جعفر کا قلم بہت ہی سرگرم ہے، وہ دین میں عسر (دشواری) کے بجائے یسر (آسانی) چاہتے ہیں، وہ فروعات پر زیادہ زور دے کر اصل اصول کو گم کرکے عقلی و نقلی گنجایشوں سے فائدہ اٹھانے کے قائل ہیں، وہ اسلام کی اسپرٹ کو ہر حال میں برقرار رکھنے کی تلقین کرتے ہیں، لیکن اس کے بعض قوانین میں ترمیم اور تبدیلی بھی چاہتے ہیں، وہ اجتہاد کے دروازے کو ہمیشہ کھلا رکھنے اور جدید فقہ کے تدوین کرنے کے داعی ہیں، اسی اجتہاد کے خیال سے انھوں نے جہاں اور اہم مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے، وہاں کچھ ایسا

باتیں بھی پیش کی ہیں جن سے بعض حلقوں میں ہلچل پیدا ہو گئی ہے، مثلاً انھوں نے اپنی تحریروں میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر کوئی شخص عربی الفاظ عمدگی سے نہ ادا کر سکتا ہو اور عربی زبان سمجھنے پر قادر نہ ہو تو وہ اپنی مادری زبان میں نماز ادا کر سکتا ہے (الدین یسر، ص ۳۰۶) ان کا خیال ہے کہ مالِ زکوٰۃ کی تعیین، نصاب کا اندازہ، زکوٰۃ کی مقدار وغیرہ مصالح انسانی کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل ہو سکتا ہے، انسانی فائدے اور اجتماعی مفاد پر روزے کو قربان کیا جا سکتا ہے، (الدین یسر، ص ۳۳۱)، رویت ہلال کا مسئلہ فلکی حساب کے مطابق طے کیا جا سکتا ہے، مومنہ کا نکاح کتابی مرد سے ہو سکتا ہے (ایضاً ص ۱۷۳) وہ وراثت کے اسلامی قانون میں بھی تبدیلی کے خواہاں ہیں، ان کی یہ بھی رائے ہے کہ اگر کوئی اسلامی حکومت مصالحِ امت کے پیشِ نظر اپنی مملکت میں آج تعددِ ازدواج ممنوع قرار دیدے تو اسے اس کا پورا حق حاصل ہوگا یہ کوئی مداخلت فی الدین نہیں، لیکن اگر حالات بدل جائیں اور مصالحِ امت تعدد کے متقاضی ہوں تو پہلا حکم منسوخ کرنے کا بھی اس حکومت کو اختیار ہے، وہ کسی کمپنی یا بینک کے کمرشل انٹرسٹ کو ربوا قرار دینے کے لیے تیار نہیں ہیں، کیونکہ اس میں ربوا کی اسپرٹ نہیں پائی جاتی، الغرض ان کی اس قسم کی جتنی تحریریں نکلی ہیں، اُن میں اختلاف کی پوری گنجایش ہے، قلم کا جادو بھی عجیب چیز ہے، اس کے زور سے بعض اوقات جس چیز کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے، اسی کو ناجائز بھی ٹھہرایا جا سکتا ہے، دینی اور فقہی مسائل میں تو یہ زور جانبین کی طرف سے ہر زمانہ میں دیکھا گیا ہے۔

خود مولانا کو اعتراف ہے کہ فقہ جدید کی تشکیل کی طرف غالباً اس لیے بھی اقدام نہیں ہو سکا کہ یہ کام اتنا سہل نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے، اس میں بیشمار نزاکتیں ہیں، مولانا لکھنے کو تو سب کچھ لکھ گئے ہیں لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی، اسی کے ساتھ وہ اپنے ناظرین سے اس کے بھی ملتجی ہوتے ہیں کہ شریعت کو غیر متبدل نہ سمجھا جائے، بلکہ اس میں جو توسع اور تیسر

رکھا گیا ہے اسے آج بھی اور آئندہ بھی باقی رکھ کر اس سے فائدہ اٹھایا جائے، ان کا خیال ہے کہ شریعت اپنے وقتی تقاضوں کے مطابق ہر جگہ ہیئت و شکل بدلتی رہتی ہے، اور اس تبدیلی سے اصل دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ مگر ان کو بھی اعتراف ہے کہ ان کے معترضین کہتے ہیں کہ ان کا ادارہ قائم ہی اس لیے ہوا ہے کہ وہ مغرب زدہ لوگوں کے رجحانات کی تائید میں اباحیت کا دروازہ کھول دے، سچ تو یہ ہے کہ جن مسائل پر مولانا لکھ کر اپنی تحریروں کو مالا مال کرتے رہتے ہیں وہ محض لکھنے سے سلجھ نہیں سکتے ہیں، کیونکہ ان کی رد میں بھی فکر و نظر کا انبار لگایا جا سکتا ہے، یہ سارے مسائل تو ایسے ہیں جو اجماع امت ہی کے ذریعہ سے طے ہو سکتے ہیں۔ اسلامی ممالک میں بات بات پر کانفرنسیں منعقد ہوتی رہتی ہیں، حتیٰ کہ کلچر کے نام پر رقص و سرود پر بھی اسلامی کانفرنسیں ہو جاتی ہیں لیکن جن حالات اور مسائل سے مسلمانوں کی شرعی اور دینی زندگی میں پراگندگی پیدا ہو گئی ہے، اور مسلمان اور اسلام دو متضاد چیزیں نظر آنے لگے ہیں، ان کو دور کرنے یا ان پر قابو پانے کے لیے اجماع امت کہیں نہیں دیکھنے میں آتا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں ملیشیا میں بعض مسائل کو اجماع کے ذریعہ طے کرنے کی کوشش کی گئی تھی، لیکن اس کے ابھی خاطر خواہ نتائج ظاہر نہیں ہوئے ہیں، مولانا محمد جعفر پھلواروی جس ملک میں رہتے ہیں وہاں اسکا موقع ہے کہ علماء اور اہل الرائے جمع ہو کر ان تمام مسائل پر اپنے قطعی فیصلے صادر کر سکتے ہیں، جن کو مولانا ڈرتے اور ہچکچاتے ہوئے پیش کرتے رہتے ہیں، اور جن کو پڑھ کر انکے ناظرین رد و قبول کرنے کی کشمکش میں پڑ جاتے ہیں۔ ان کا خود بھی خیال ہے کہ اس قسم کے متنازعہ فیہ مسائل پر فیصلہ صادر کرنا ان کا کام نہیں، بلکہ ان کو ارباب حل و عقد ہی طے کر سکتے ہیں (الدین یسر، ص ۷۵) لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ارباب حل و عقد کہاں گم ہیں، ان کی دریافت کیسے ہو سکتی ہے، اور ہو گی بھی کہ نہیں یا صرف کتابیں ہی لکھ کر مسلمانوں کے عام ذہن کو کشمکش میں مبتلا کر دینے پر اکتفا کر لیا جائیگا۔

مولانا محمد جعفر پھلواروی نے لاہور میں میری قیام گاہ پر آکر اپنی دو تصانیف "اسلام اور موسیقی"

اور "مجمع البحرین" عنایت کیں، اور از راہ محبت کہا کہ میں ان دونوں پر خود ریویو لکھوں، میں کوئی عالم تو نہیں، اس لیے ان دونوں کتابوں پر کسی عالم کی رائے ہی قابل توجہ ہو سکتی ہے،

اسلام اور موسیقی کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا، دوسرے اڈیشن کی طباعت ۱۹۸۲ء میں ہوئی، جس میں پہلے اڈیشن سے کچھ اور اضافے ہیں، مولانا نے اپنے دونوں اڈیشنوں میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ محدثین عام طور پر موسیقی کی اباحت کے قائل ہیں، فقہا اس کو حرام قرار دیتے ہیں، صوفیہ عام طور پر اس کو جائز سمجھتے ہیں، مگر اس کے لیے بہت کڑی شرطیں رکھی ہیں، تاکہ کوئی اس کا غلط استعمال نہ کر سکے، خود مولانا کا رجحان اس مسئلہ میں محدثین کے مسلک کی طرف ہے، حالانکہ وہ اپنی نظر و فکر میں اہل قرآن سے زیادہ قریب تر ہیں، جہاں تک میرا مطالعہ ہے، موسیقی مزامیر کے بغیر تو ہر زمانہ میں جائز قرار دی گئی ہے، لیکن مزامیر کی حرمت میں تو اکثر و بیشتر علماء اور فقہا متفق رہے ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ موسیقی اور مزامیر کی حلت و حرمت پر ہر زمانہ میں ہر جگہ بحث ہوتی رہی ہے، مثلاً حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مشہور اور مستند مجموعۂ ملفوظات فوائد الفواد میں ہے کہ ایک مجلس میں ان کے مریدوں نے عرض کی کہ آجکل مخدوم کی خدمت کی خاطر ہر وقت سماع سننا جائز کر دیا گیا ہے، حضرت خواجہ نے فرمایا کہ جو چیز حرام ہے وہ کسی کے کہنے سے حلال نہیں ہو سکتی اور جو چیز حلال ہے وہ کسی کے حکم سے حرام نہیں ہو سکتی، مثلاً امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں سماع دف اور چغانہ کے ساتھ جائز ہے، ہمارے علماء (احناف) اس کے خلاف ہیں، لیکن اب اس اختلاف میں حاکم وقت کا جو حکم ہوگا وہی صحیح ہوگا، مریدوں میں سے کسی ایک نے گذارش کی کہ آجکل بعض خانقاہوں میں درویش چنگ و رباب و مزامیر کی محفل میں رقص کرتے ہیں، حضرت خواجہ نے فرمایا کہ وہ اچھا نہیں کرتے کیونکہ جو فعل نامشروع ہے، وہ ناپسندیدہ ہے، ...... یہ تمام باتیں معصیت کی ہیں (ص ۲۳۵) ایک بار مجلس سماع ہوئی جس میں حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ بھی تھے، قوالوں نے جب

دف کے ساتھ گانا شروع کیا، تو حضرت چراغ دہلوی اٹھ کھڑے ہوئے، لوگوں نے بیٹھنے کی درخواست کی، تو فرمایا یہ خلافِ سنت ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کو یہ واقعہ سنایا گیا تو انھوں نے فرمایا وہ سچ کہتے ہیں، اور حق وہی ہے جو وہ کہتے ہیں۔ (اخبار الاخیار ص ۱۴۶)۔ ایک بار کسی نے مجلس سماع میں حضرت چراغ دہلویؒ سے مزامیر، دف، رباب کے متعلق استفسار کیا تو فرمایا، مزامیر تو بالاجماع مباح نہیں ہیں، اگر کوئی طریقت سے گرے تو کم از کم شریعت میں رہے، اور اگر شریعت کا بھی نہ ہوگا تو پھر کہاں کا رہے گا اور نجات کی کیا صورت ہوگی، اول تو سماع ہی میں علماء کا اختلاف ہے، اگرچہ کچھ شرائط کے ساتھ اسکو مباح کیا گیا ہے، لیکن مزامیر تو بالاتفاق حرام ہیں، (خیر المجالس مجلس ہشتم واخبار الاخیار ص ۶۷) حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی وفات کو ساڑھے چھ سو برس گذر گئے، اس وقت بھی یہی بحث تھی، اور اب بھی یہی بحث ہے، اب اگر مولانا جعفر پھلواروی کو موسیقی اور مزامیر کی حلت پر اصرار ہے تو پھر وہ جہاں ہیں وہاں کے حاکم کا سہارا لے کر اس کو حلال قرار دے سکتے ہیں، ان کی یہ تصنیف بقول ان کے مینارہ کی روشنی تو بن سکتی ہے، لیکن اس مسئلہ پر حرف آخر قرار نہیں دیجا سکتی ہے،

مولانا پھلواری کی نئی تصنیف "مجمع البحرین" میں سنی اور شیعہ فرقوں کی متفق علیہ روایتوں کو جمع کرکے دونوں کے باہمی اختلافات اور منافرت کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے، شیعہ سنی کا جھگڑا اسلامی تاریخ کا ایک دردناک بلکہ شرمناک پہلو ہے، ان سے امت مسلمہ کو غیر معمولی نقصان پہنچا اور پہنچ رہا ہے، مولانا کی یہ کتاب ان جھگڑوں کی تلخیوں کو دور کرنے میں ضرور مدد پہنچائے گی، اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سنیوں اور شیعوں کے اکثر مذہبی عقائد میں وحدت نہیں ہے، دونوں توحید، رسالت اور ارکان اسلام کے یکساں طور پر قائل نہیں ہیں، لیکن اس کو تسلیم کرنے کے باوجود ان میں جو منافرت ہے، وہ کیسے دور ہو سکتی ہے اس کو بھی پیش

کرنے کی ضرورت ہے، اگر ان دونوں فرقوں کے جھگڑوں سے ان کی تاریخ داغدار ہے تو ان کے تعاون اور اتحاد کی تاریخ بھی دلچسپ اور اہم موضوع ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کے صفحات تو ان کے مشترک کاموں سے بھرے پڑے ہیں، اگر ان کو تلاش و تحقیق سے جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے، ان کی تفصیلات پڑھ کر دونوں ایک دوسرے سے قریب تر ہو سکتے ہیں، اسی کے ساتھ سنی اور شیعہ کے مریض فرقوں کو ان کا اصل مرض بھی بتانے کی ضرورت ہے، ذرا بہت ہی صاف صاف یہ لکھنے میں اس وقت تامل نہیں ہو رہا ہے کہ شیعہ سنی میں اختلاف کا سب سے بڑا سبب تبرا بازی ہے، اور سنی جس طرح اس کا جواب دیتے ہیں وہ بھی کوئی اچھی صورت نہیں، کسی کی غیر رواداری کا جواب غیر رواداری سے دینا اخلاق کی بلندی نہیں ہے، دونوں کو اس سلسلہ میں اپنی اپنی کم نظری اور بے بصری پر نظر ثانی کرنا لازمی ہے۔ اگر شیعے گھروں میں بیٹھ کر تبرا کریں تو سنیوں کو کوئی شکایت نہ ہونی چاہیے، شیعی مورخوں میں مسعودی، یعقوبی اور الفخری نے خلفائے ثلاثہ کی دینی حیثیت کو تو نہیں لیکن ان کی تاریخی عظمت کا اعتراف کر لیا ہے، اسی طرح عام شیعے تبرا کہنے کے باوجود ان کی تاریخی عظمت کا اعتراف کر لیں تو پھر دونوں کے درمیان بہت سی تلخیاں دور ہو جائیں، ان فروعی باتوں پر جھگڑنا انسانی نادانی بلکہ ملی خودکشی ہے، آخرت میں کسی شیعہ سے یہ پرسش نہ ہوگی کہ اس نے تبرا کیوں نہیں کہا، اور نہ کسی سنی سے یہ بازپرس ہوگی کہ اس نے تبرا کیوں نہیں روکا، لیکن اس کی پرسش دونوں سے ضرور ہوگی کہ آپس میں لڑ کر امت مسلمہ کو نقصان پہنچایا، ان سطروں کے لکھتے وقت دہلی سے رسالہ اسلام اور عصر جدید پہنچا، اسکے شروع میں اس کے مشہور اڈیٹر ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا "مسلمانوں کا اتحاد" کے عنوان سے ایک طویل اداریہ ہے، انھوں نے اس کے آخر میں شیعہ سنی اتحاد کی اپیل کرتے ہوئے صفی لکھنوی کا یہ شعر لکھا ہے ؎

اپنے عمل پہ دوستو خنجرگری ہے خودکشی ہم بھی اسی جہاز میں تم بھی اسی جہاز میں

اس شعر کے اجمال کی تفصیل مولانا محمد جعفر پھلواروی کی کتاب میں ملے گی جس کے متعلق پاکستان کے ایک شیعی عالم حجۃ الاسلام علامہ مفتی جعفر حسین نے لکھا ہے کہ اس کتاب کی بعض روایتیں دونوں فریقوں یا کسی ایک فرقہ کے ہاں متروک العمل ہیں لیکن امید ہے کہ یہ خدمت اتحاد اسلامی کے استحکام اور منافرت کے ختم ہونے کا باعث ہو،

مولانا محمد جعفر پھلواروی سے ملنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ جس طرح بولتے ہیں، اسی طرح لکھتے بھی ہیں، ان کی ملاقات کے بعد اب جب ان کی تحریریں پڑھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھ نہیں رہے ہیں بلکہ سامنے بیٹھکر بول رہے ہیں، وہ فطری طور پر بڑے باغ و بہار ہیں جس کا رنگ ان کی تحریروں میں بھی آجاتا ہے، لکھتے وقت ان کے ذہن میں کوئی بے تکلف یا چست فقرہ آجاتا ہے تو پھر اس کو اسی طرح لکھ دیتے ہیں جس طرح اپنے بہت ہی بے تکلف احباب سے گفتگو کرتے وقت بول جاتے،

ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے ایک اور اہم مصنف مولانا محمد حنیف ندوی نے اسکی تمام چیزیں شوق سے دکھلائیں، وہ دار المصنفین آچکے ہیں، ندوی بھی ہیں، اس لیے دار المصنفین کے ایک خدمتگذار کی طرف ان کی لپک فطری تھی، انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ امام غزالی کی تعلیمات اور ابن خلدون کے افکار کی بڑی ترویج کی ہے، امام غزالی کی المنقذ کا اردو ترجمہ سرگذشت غزالی کے نام سے کیا ہے، پھر ابن خلدون کے تنقیدی، عمرانی، دینی اور علمی خیالات کا تجزیہ اپنی کتاب افکار ابن خلدون میں کیا ہے، ان کے علاوہ علامہ ابو الحسن اشعری کی مقالات الاسلامیین کا ترجمہ مسلمانوں کے عقائد و افکار کے نام سے کیا ہے، ان کی یہ تمام کتابیں ان کے ادارہ سے شائع ہو چکی ہیں، ان کے مذہبی خیالات ان کی کتاب مسئلۂ اجتہاد سے معلوم ہوں گے، وہ بھی بدلتے ہوئے زمانہ کے ساتھ اسلام کے مروجہ شرعی اور فقہی مسائل میں اجتہاد کے لیے مصر ہیں، مگر اس طرح کہ ایک طرف تو وہ دلنشین قانونی پیرایۂ بیان کے حامل ہوں، اور دوسری طرف ایسے مرتب اور سجے سجائے ہوں کہ کسی طرح بھی [illegible] عصری

قوانین ان سے فائق مرتبہ کے نہ ٹھہرائے جائیں (مسئلۂ اجتہاد ص ۲۰۰)، ایسی اجتہادی کوششیں عمل میں آجائیں تو پھر مسلمانوں کا مستقبل کیسا روشن نظر آئے،

اس ادارہ کے رفقاء میں شاہد حسین رزاقی صاحب نسبتاً کم عمر نظر آئے، یوپی کے رہنے والے تھے، حیدرآباد میں تعلیم پائی، اب پاکستانی ہیں، ان کی تحریریں صاف سلیس اور دلنشین ہوتی ہیں، خدا کرے وہ اپنے سلجھے انداز بیان سے اعلیٰ قسم کی علمی خدمات میں لگے رہیں، انھوں نے اپنی تصنیف تاریخ جمہوریت میں جمہوریت کے فکری اور عملی ارتقا کے ساتھ اسلام کی نظری اور عملی جمہوریت کو بھی بڑی خوبی سے پیش کیا ہے، ان کی ایک تصنیف سرسید اور اصلاح معاشرہ بھی ہے جس میں سرسید کی معاشرتی، تعلیمی، تمدنی، اخلاقی، دینی اور مذہبی اصلاحات کی کوششوں کا بڑا اچھا تجزیہ ہے، سرسید پر جو اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان ہی میں اسکا بھی شمار ہوگا، ان کی ایک اچھی تصنیف "انڈونیشیا" بھی ہے جس میں اس ملک کی مفید اور تاریخی معلومات فراہم کردی گئی ہیں،

محمد اسحاق بھٹی صاحب بھی اب اس ادارہ کے رفیق ہیں، پہلے الاعتصام کے اڈیٹر تھے، وہ بھی زیادہ عمر کے نہیں معلوم ہوئے، انھوں نے ابن ندیم کی الفہرست کا اردو ترجمہ کیا ہے، جو چھپ کر تیار ہے،

محمد سرور صاحب جامعی بھی اب اس ادارہ سے وابستہ ہوگئے ہیں، اُن سے ۱۹۲۳ء میں جامعہ ملیہ دہلی میں ملتا رہا تھا، تقریباً ۵۰ برس کے بعد پھر ملاقات ہوئی، ان پر کبرسنی کے زیادہ آثار نہیں پائے، وہ غالباً ۱۹۲۹ء میں جامعہ سے فارغ ہوئے جس کے بعد جامعہ ازہر قاہرہ چلے گئے، وہاں سے واپسی کے بعد جامعہ ملیہ ہی کی خدمت کرنے میں مشغول ہوگئے، پھر ڈاکٹر ذاکر حسین کے مشورے سے مولانا عبید اللہ سندھی کے پاس مکہ معظمہ چلے گئے، ان کا خود بیان ہے کہ وہ ان دنوں تشکک اور بے یقینی کے ملے جلے جذبات سے دبے ہوئے تھے، لیکن مولانا کی صحبت میں ان کے ذہن کی بہت سی گرہیں

کھل گئیں، وہ ان کی وفات تک ان کے ساتھ رہے، مولانا نے لاہور میں سندھ ساگر اکاڈمی قائم کی تو اس کے روح رواں سرور صاحب بنا دیے، مولانا شاہ ولی اللہ کے بڑے قائل تھے، ان کی تصانیف میں انسانیت کے تمام تقاضوں کا حل اور مداوا پاتے تھے، ان کا خیال تھا کہ انکی مشہور تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں اسلامی شریعت اور انسانی دوستی کے تمام اصولوں کی مطابقت پائی جاتی ہے۔ وہ اس کتاب کی تعلیمات کی ترویج ہندوستان میں کرنا چاہتے تھے۔ ان میں قوت گویائی تو تھی لیکن تحریری قوت نہ تھی، اس لیے جب سرور صاحب ان کو مل گئے تو اپنے افکار شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کی روشنی میں قلمبند کرانا شروع کیا۔ سرور صاحب نے بھی اپنے کو مٹا کر انکا ساتھ دیا، مولانا اب اس دنیا میں نہیں ہیں، لیکن وہ اس برصغیر میں سرور صاحب کے قلم ہی کے ذریعہ سے زندہ ہیں، ان کی کتاب "مولانا عبید اللہ سندھی" میں مولانا کے حالات کے ساتھ ان کی تعلیمات اور سیاسی افکار کا بہت اچھا تجزیہ ملے گا۔ اس کے ناظرین کو مولانا کے افکار سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن سرور صاحب نے جس ٹھنڈے، سلجھے اور منجھے ہوئے طرز میں پیش کیا ہے، ان سے ان کے قلم کی قوت، سنجیدگی اور اثر پذیری کا ضرور اندازہ ہوتا ہے، وہ مولانا محمد علی کی ہمہ گیر، فعال اور سراپا عمل شخصیت اور ان کی وسیع اور نوع بہ نوع سرگرمیوں سے بھی متاثر رہے، جیسا کہ ان کی کتاب مولانا محمد علی سے ظاہر ہے۔ وہ ان کو تاریخ اور تاریخ ساز دونوں بتاتے ہیں، اس میں انھوں نے مولانا محمد علی سے بڑی عقیدت کا اظہار کیا ہے، جس کو قلمبند کرنے میں ان کی تحریروں میں شگفتگی بھی ہے توازن بھی اور تاثیر بھی، امید ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی نمایاں خدمت کرنے میں ہر طرح پیش پیش رہیں گے۔

اس ادارہ کے سکریٹری محمد اشرف ڈار صاحب سے بھی مل کر خوشی ہوئی، وہ پہلے نشر و اشاعت کے ایک ادارہ Orientalia کے مالک تھے، انھوں نے خود یاد دلایا کہ میں نے

استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کے رسالہ خواتین اسلام کی بہادری کا جو انگریزی ترجمہ کیا تھا، اس کی طباعت و اشاعت کے سلسلہ میں ان سے کافی خط و کتابت رہی تھی، ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی عمارت لاہور کے بہترین حصہ کلب روڈ میں شہر کے ہنگاموں سے دور، درختوں، پھولوں اور سبزہ زاروں کے بیچ میں واقع ہے، اس کی فضا دارالمصنفین سے ملی جلی معلوم ہوئی، اس کی طرف سے انگریزی میں بھی کتابیں شائع ہوا کرتی ہیں جن کی تعداد دو درجن سے زیادہ ہو گئی ہے، ان میں پروفیسر محمد شریف، ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم، بشیر احمد ڈار، مظہر الدین صدیقی، افضل اقبال اور ڈاکٹر محمد یوسف کی بھی تصانیف ہیں، اردو میں یہاں سے پانچ درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جو مجموعی حیثیت سے ایک بڑا اور قابل قدر کارنامہ ہے، ان سے پاکستان کے لوگوں کے علمی، ذہنی اور مذہبی نشو و نما میں بڑی مدد ملتی رہے گی، پہلے ذکر آیا ہے کہ یہ ادارہ اسلام کی ترقی یافتہ تعبیرات بھی پیش کرنے میں لگا ہوا ہے، یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کو گرد و پیش کی دنیا سے بالکل بے خبر نہیں رہنا چاہیے، دنیا میں جو سیاسی، معاشی اور ذہنی انقلابات ہو رہے ہیں، ان کو نظر انداز کر کے ماضی کی عظمت اور روایت سے چمٹا رہنا درست نہیں، لیکن اگر قدامت پسندی میں تاریک پہلو ہیں تو تجدد پسندی میں بھی بڑے خطرات ہیں، قدامت پسندی کی تو ایک حد تعین ہو چکی ہے، لیکن تجدد پسندی کی حد کی کوئی انتہا نہیں، اگر تقلید پسندی کے تاریک پہلو دور کرنے کے بعد ہماری زندگی زمانہ کے ساتھ رواں دواں بن سکتی ہے تو یہ بھی احتمال ہے کہ تجدد پسندی کا جو سیلاب آئیگا اس سے معلوم نہیں اسلام اپنی اصلی صورت کے بجائے کس شکل میں دکھائی دے گا، ادارہ کے ارباب حل و عقد کو ان پیچیدگیوں کا ضرور احساس ہوگا، ان کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت نہیں،

جس روز ادارۂ ثقافت اسلامیہ گیا، اسی روز شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب سے جا کر ملا، وہ دارالمصنفین کی مطبوعات کے گذشتہ پچاس سال سے خریدار ہیں، اور اپنے تعلقات میں بڑی متواتر کا

اور وضعداری کا ثبوت دیتے رہے یہ وہ بڑے بڑے مصنفوں کی کتابیں بھی شائع کرکے شہرت حاصل کر چکے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جو کوئی ان کو نہیں جانتا ہے اس کو وہ پڑھا لکھا آدمی نہیں سمجھتے ہیں، وہ پہلے اندرون لوہاری دروازہ کی ایک دوکان میں بیٹھا کرتے تھے، اب انارکلی کی ایک بڑی دکان میں بیٹھتے ہیں جس میں زیادہ تر انگریزی کتابیں ہیں، ان کی پرانی دوکان پر ان کے بھتیجے احمد علی صاحب بیٹھتے ہیں، یہاں میں نے تزک جہانگیری اور ڈاکٹر تاراچند کی انگریزی کتاب انفلوانس آف اسلام ان انڈین کلچر کے اردو ترجمے دیکھے، جو میری نظر سے نہیں گذرے تھے، حضرت شیخ علی ہجویریؒ کی کشف المحجوب کا ایک عمدہ اڈیشن بھی دیکھنے میں آیا، اسی دوکان میں ایک صاحب نے بتایا کہ میری نئی تصنیف "ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں" لاہور کے ایک ناشر نے چھاپ لی ہے، یہ سن کر افسوس ہوا،

وہاں سے انگریزی کتابوں کے مشہور ناشر شیخ محمد اشرف صاحب سے ملنے کشمیری گیٹ گیا، ذہن میں ان کی جو تصویر تھی، اس سے مختلف نظر آئے، میں سمجھتا تھا کہ وہ صاحب قسم کے آدمی ہوں گے لیکن شروانی اور لمبی ترکش ٹوپی پہنے ہوئے اپنے کام میں مشغول تھے، ان سے مل کر یہ اثر ہوا کہ انگریزی کتابوں کی اشاعت میں وہ ذاتی منفعت سے زیادہ خدمت کا جذبہ زیادہ رکھتے ہیں، عبداللہ یوسف علی نے کلام پاک کا جو ترجمہ انگریزی میں کیا ہے، وہ ان کے یہاں سے شائع ہو کر بہت مقبول ہو چکا ہے، اب وہ صحیح بخاری کا بھی انگریزی ترجمہ شائع کر رہے ہیں، جس کا مسودہ مجھکو بھی دکھایا، یہ شائع ہو گیا تو ان کے ذریعہ سے ایک اور بڑا کام انجام پا جائیگا، میں نے استاذی المحترم جناب مولانا سید سلیمان ندوی کی دو کتابوں کے انگریزی ترجمے کیے ہیں، ان کو بھی انھوں نے Arab Navigation اور Heroic Deeds of Muslim Women کے نام سے شائع کیے ہیں،

دوسرے دن ادارۂ بتول اچھرہ گیا، یہ بھی دارالمصنفین کی کتابوں کا خریدار ہے، اس کے منیجر صاحب بہت ہی خلیق ہیں، ظہر کی نماز کا وقت آیا تو سامنے جماعت اسلامی کے دفتر میں جماعت ہونے والی تھی، وہاں نماز پڑھنے گیا، تو مولانا ابو الاعلےٰ مودودی امیر جماعت اسلامی نے امامت کی، نماز کے بعد ان سے تعارف ہوا، تو وہ مجھ کو اپنے دفتر لے گئے، ان کی ایک کتاب "الجہاد فی الاسلام" ان کی تصنیفی زندگی کے آغاز میں دارالمصنفین سے شائع ہوئی تھی، وہ دارالمصنفین کے حالات پوچھتے رہے، وہ بوڑھے ہو گئے ہیں لیکن اب بھی شکیل، وجیہ اور باوقار نظر آئے، بہت سلیقہ سے رہتے ہیں، ان کے دفتر کے اندر ہر چیز میں سلیقگی اور باقاعدگی تھی، ان سے مل کر مولانا امین احسن اصلاحی کے یہاں حاضر ہوا، وہ اعظم گڈھ ہی کے رہنے والے تھے، پاکستان جانے سے پہلے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (اعظم گڈھ) میں مدرس تھے، ان کا دارالمصنفین میں برابر آنا جانا رہتا تھا، ہم لوگوں سے بڑے اچھے تعلقات تھے، وہ مجھ سے تقریباً بیس برس کے بعد ملے، تو خوشی میں بچھے جاتے تھے، خاطر، تواضع، دعوت و مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اپنی گفتگو میں اعظم گڈھ اور یہاں کے لوگوں کے سوا کوئی اور موضوع نہیں آنے دیتے تھے، جس سے اندازہ ہوا کہ ان کے دل کے اندر ان کے پرانے وطن کی یادوں کا گلدستہ ابھی تک تازہ اور شگفتہ ہے، وہ رسالہ میثاق کے اڈیٹر بھی ہیں، لیکن ان کا زیادہ تر وقت کلام پاک کی تفسیر لکھنے میں صرف ہوتا ہے، وہ مولانا حمید الدین فراہیؒ کے بڑے نامور شاگرد ہیں، فہم و تدبر قرآن میں انہی کے ترجمان ہیں، مولانا فراہی کی تفسیر عربی میں ہے، اور اس کا زیادہ تر حصہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکا ہے، مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر اردو میں ہے، اس کا پہلا حصہ شائع ہو چکا ہے، جب ان کی پوری تفسیر چھپ کر سامنے آجائیگی تو مولانا فراہی کی تفسیروں کے ابتک نہ چھپنے کی بہت کچھ تلافی ہو جائے گی،

مجھکو واپسی کی بہت عجلت تھی، پھر بھی یہ طے کیا کہ حضرت شیخ علی ہجویریؒ کے مزار اقدس

پر حاضری دیے بغیر رختِ سفر باندھنا مناسب نہیں، ایک روز اس کی زیارت کے لیے وہاں بھی حاضر ہوا، میری ناچیز تصنیف بزمِ صوفیہ کا پہلا باب اُن ہی کے حالات سے شروع ہوتا ہے، ان کی مشہور کتاب کشف المحجوب سے بہت زیادہ متاثر ہوں، میرا خیال ہے کہ اس برصغیر میں تصوف پر اس سے بہتر کتاب ابتک نہیں لکھی گئی، یہ اسلامی تصوف کی انجیل ہے، اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہی اصل تصوف ہے، ان کے مرقد مبارک کے پاس سڑک کے دونوں طرف پھولوں کی دکانیں تھیں، جہاں سے پھول خرید کر زائرین مزار پر چڑھاتے ہیں، میرا بھی جی چاہا کہ یہاں کے رواج کے مطابق پھول خرید کر اخراجِ عقیدت پیش کروں، لیکن پھر خیال آیا کہ حضرت شیخ علی ہجویریؒ شریعت کے بڑے پابند تھے، اس قسم کی قبر پرستی سے ان کی روح خوش نہ ہوگی، مزار کے نزدیک پہنچکر فاتحہ پڑھی، لیکن ایک زائر کو اس کے پاس سجدہ میں گرا ہوا دیکھکر آنکھیں بند کرلیں، کچھ حفاظ کلام پاک پڑھ رہے تھے، وہاں کھڑا تھا، تو کشف المحجوب کا سارا متن آنکھوں کے سامنے تھا، ان کا یہ قول برابر یاد آرہا تھا، کہ جس شخص نے خدا کا عنایت کیا ہوا علم یعنی شریعت کو معلوم نہیں کیا اُس کا دل نادانی کے مرض میں گرفتار ہے، جس طرح آفتاب سے نور، جوہر سے عرض اور موصوف سے صفت جدا نہیں ہوسکتی ہے، اسی طرح شریعت حقیقت سے علیحدہ نہیں ہوسکتی، خیال آیا کہ اس مزار مقدس پر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے چلہ کشی کی تھی، نگاہیں ڈھونڈھ رہی تھیں کہ وہ کونسی جگہ رہی ہوگی، جہاں ہندوستان میں اسلامی تصوف کے آفتاب و ماہتاب کی روشنی پھیلانے والے یہ بزرگانِ دین متمکن ہوئے ہوں گے۔

وہاں سے بادشاہی مسجد پہنچا، جس کو اورنگ زیب عالمگیر نے آج سے تقریباً تین سو سال پہلے ۱۶۷۳ء میں بنوایا تھا، ۱۹۳۳ء میں اس کو خستہ حال میں پایا تھا، جس سے دکھ ہوا تھا، لیکن اب یہ بہت بارونق نظر آئی، اس کی پوری مرمت کردی گئی ہے، معلوم ہوا کہ اس کی مرمت میں سر سکندر حیات کا بڑا حصہ ہے، انھوں نے اپنی وزارت کے زمانہ میں اس کے لیے ۲۰ لاکھ روپئے جمع کیے تھے،

اس وقت سے ابتک اس سے بھی زیادہ رقمیں خرچ ہو چکی ہوں گی۔ اس کا ہر حصہ اب مرتب اور شاندار ہوگیا ہے، اس سے باہر اس کے چاروں طرف مرغزار اور سبزہ زار ہے، جو لاہور کے لوگوں کے لیے اچھی سیرگاہ ہے، اس کے پھاٹک کے سامنے جہانگیر کے مقبرہ کے اوپر کی بارہ دری پڑی ہے جو سکھ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں اس کو اجاڑ کر لے آئے تھے۔ مسجد کے پھاٹک کے دائیں طرف سر سکندر حیات خاں کا مزار ہے، اور اس کے بائیں جانب شاعر مشرق اقبال کا مقبرہ ہے جو افغانستان کے سابق حکمراں نادر شاہ کی طرف سے پورا سنگ مرمر کا بنایا گیا ہے، اس کے پاس پہنچا تو اپنے استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کی وہ تحریر یاد آگئی جس میں انھوں نے ان کی موت پر اُن کو ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت، اسلام کا فخر، کاروانِ ملت کا حدی خواں، عارف فلسفی، عاشقِ رسول، شاعر فلسفہ کہہ کر ماتم کیا تھا، فاتحہ پڑھتے وقت خیال آیا کہ وہ اپنی شاعری سے کیا ذہنی انقلاب پیدا کر گئے ہیں، نوجوانوں کو شاہین کا کیرکٹر دے گئے، مسلمانوں کو مرد مومن کا پیام دے گئے، انسانیت کو خودی کے فلسفہ سے بلند کر گئے، خودی کی خلوتوں میں مصطفائی، خودی کی جلوتوں میں کبریائی کی شان پیدا کر گئے۔ خودی کی زد میں زمین و آسمان کرسی و عرش سب کر گئے، انسان کی قوت جاذبہ کے سامنے کوہ، صحرا، سمندر، گنبد افلاک، یہ ہوائیں اور یہ خاموش فضائیں سب کچھ جھکا گئے۔ تقدیر کا شکوہ کرنے کے بجائے تقدیر یزداں بننے کی تعلیم دے گئے، دل کی زبان کہہ رہی تھی، اے شاعرِ مشرق! تیری تربت پر رحمتِ ایزدی، برکت خداوندی اور انوار الٰہی کی بارش برابر ہوتی رہے۔ آمین

بادشاہی مسجد کے سامنے لاہور کا قلعہ تھا، اس کے اندر داخل ہوا تو اس کی پوری تاریخ سینما کے سیمیں پردوں کی طرح سامنے آنے لگی، پہلے یہ قلعہ مٹی کا تھا، مملوک سلاطین نے اس پر قبضہ کیا، منگولوں نے اس کو تباہ کیا، غیاث الدین بلبن نے اس کی از سرِ نو تعمیر کی، پھر تیمور نے

اس کو برباد کیا، سلطان مبارک خلجی نے اس کو پھر سے بنوایا، اکبر نے اس کی از سر نو تعمیر اینٹ اور پتھر سے کی، جہانگیر نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا، شاہ جہاں نے اپنے ذوق کے مطابق اس میں جا بجا سنگ مرمر کی عمارتیں بنوائیں قیمتی پتھروں کی چینہ کاری سے تمام عمارتوں میں حسن پیدا کیا، پھر سکھوں کے قبضہ میں آیا، ان کے بعد اس پر انگریزوں کا پرچم لہرایا، اور اب پاکستان کی حکومت کے زیرنگیں ہے، ۱۹۵۳ء میں یہاں آیا تھا، تو پورے قلعہ کو بہت ہی خستہ پایا تھا، اب کافی خرچ کرکے اس کی خستگی دور کردی گئی ہے، اور یہ بڑی اچھی تفریح گاہ ہے، میں نے اسکی ہر چیز دیکھی، شیش محل، شاہ برج، نولکھا، دیوان خاص، دیوانِ عام، موتی مسجد، عرض گاہ، حضوری باغ، جھروکہ، بڑی خوابگاہ، سنگ مرمر کی بارہ دری، میوزیم وغیرہ وغیرہ۔ ان کو دیکھتے وقت جذبات میں کچھ ایسا تلاطم تھا کہ کسی چیز کو بھی دیکھنے میں جی نہ لگا، خیال آیا کہ جہانگیر ایک موقع پر آیا تھا، تو اس محل کے منازل دلکشا اور نشیمن ہائے روح افزا کی دلکشی اور یہاں کے گل و ریاحین کی لطافت و نزاکت کو دیکھ کر پکار اٹھا تھا۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

لیکن اب یہ کھنڈر ہے، قلعہ کی باقی کچھی عمارتوں کی تعمیری شان و شوکت سے بے نیاز ہو کر ایک منہدم شدہ عمارت کے کھنڈر کے بیچ میں آکر کھڑا ہو گیا، اور اپنی زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ یہ منازل دلکشا اور نشیمن ہائے روح افزا کا کھنڈر نہیں بلکہ مغل فرمانرواؤں کے تدبر اور سیاست کا بھی کھنڈر ہے، انکے زمانے کی قومی حمیت اور غیرت کا بھی کھنڈر ہے، اس زمانہ کے لوگوں کی سیرت، کردار اور اخلاق کا بھی کھنڈر ہے، وہ اپنے حکمرانوں کے قلعے کے ساتھ اپنے اخلاق و کردار کا بھی قلعہ بناتے رہتے تو دامن دل... کو جو چیزیں کھینچتی تھیں، وہ کھنڈر نہ ہونے پاتیں، ان کا کردار کھنڈر ہو گیا تھا، اسلئے ان کے حکمرانوں کا قلعہ بھی کھنڈر بن گیا، اس قلعہ کی شکستہ دیواریں کہہ رہی ہیں کہ قوم جنگی قلعہ

اور اس کے دلکش مناظر اور روح افزا نشیمن دیکھنے نہیں بنتی، ہاں اسکے گرد و ارکے شاہ یہ، اسکی سیرت کے دیوانِ خاص اور اسکی خیریت کے نو لکھے بنائے جاتے ہیں تو پھر اسکی حلاکت کے اندر اسکی ہر چیز میں پچین کاری استرکاری اور ترصیع کاری نظر آتی ہے، اور اسکی کوئی چیز نہیں گڑتی لیکن اگر اسکے سیرت و کردار کھنڈر نہیں تو ظاہری نمود و نمایش اور استحکام کے باوجود اس کی ہر چیز کھنڈر رہے، اس لحاظ سے لاہور کا قلعہ ایک تفریح گاہ نہیں، بلکہ عبرت کدہ نظر آیا، اس کی شکستہ عمارتیں یہ پیام دے رہی ہیں کہ جہاں یہ واقع ہے، وہاں کے لوگوں کو اپنے عروج و کمال کی تاریخ کے ساتھ اپنے گذشتہ زوال کے اسباب پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

اسی روز پاکستان کے مشہور اخبار نویس جناب مجید نظامی سے ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی وہ پہلے نوائے وقت کے اڈیٹر تھے، اب اس سے علیحدہ ہوکر ندائے ملت نکالتے ہیں، وہ دار المصنفین کے بڑے قدر دان ہیں، انھوں نے دار المصنفین کی مطبوعات کے حقوق کے تحفظ کے لیے اپنے اخبار کے ذریعہ فضا پیدا کرنے کا یقین دلایا، ان کی متانت اور سنجیدگی سے متاثر ہوا،

لاہور سے روانہ ہوتے وقت بڑا قلق رہا کہ وقت کی قلت کی وجہ سے مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر عنایت اللہ، ڈاکٹر سید عبداللہ اور شورش کشمیری صاحب سے نہ مل سکا،

جناب شیخ محمد اکرام صاحب نے اپنی تصنیف رود کوثر کا جو تازہ ترین اڈیشن میری قیام گاہ پہ بھیجا، وہ لاہور سے ہندوستان تک بہت اچھا زادِ سفر رہا، لاہور چھوڑتے وقت گل برگ اور شاہراہ اقبال سے گذرا، جو اس شہر کے بہترین حصے ہیں، گینڈا سنگھ اور حسینی والا دونوں کے چک پوسٹ پر مسافروں کے لیے بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں بنی ہوئی ہے، وہ اپنے بستروں اور ٹرنکوں پر بیٹھ کر وقت گذارتے ہیں، میں بھی اپنے ہولڈال پر بیٹھا رود کوثر پڑھتا رہا، جس سے یہ صبر آزما وقت اچھا گذرا، حسینی والا میں ایک مہربان اور با مروت ہندو رکشے والے نے میری بہت سی مشکلیں حل کر دیں،

اور بہت ہی اخلاق سے فیروز پور جھرکا لی کے اسٹیشن تک پہنچایا، درمیانی راستے کے مناظر بہت اچھے تھے، ورد کو شریف پڑھتا جاتا اور یہ مناظر بھی دیکھتا جاتا، مے دو آتشہ کا لطف حاصل ہو رہا تھا، اس کتاب کے پہلے اڈیشن کو بھی پڑھا تھا، لیکن اس نئے اڈیشن میں بہت کچھ اضافہ ہے، لائق مصنف کے قلم میں بڑا زور ہے، وہ لکھتے وقت اپنے ناظرین کو محسوس کراتے ہیں کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں، وہ حرف آخر ہے، اس سے اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں، یہ ان کے طرز ادا کی خوبی ہے، کتاب کے اندرونی ٹائیٹل پر لکھا ہوا ہے کہ یہ مغلیہ دور کی مذہبی، فکری اور علمی تاریخ ہے، لیکن یہ کتاب تاریخ نہیں بن سکی ہے، کیونکہ تاریخی واقعات کی ترتیب اور تنظیم میں جو تسلسل ہونا چاہیے وہ اس میں نہیں، اگر اس میں سے کوئی حصہ نکال دیا جائے تو اس کے ناظرین کو اس میں کوئی کمی محسوس نہ ہوگی، عہد مغلیہ میں جو بعض مذہبی اور فکری تحریکیں پیدا ہوئیں اور اس دور میں جو بعض مشاہیر علما اور مشائخ گذرے، ان سے متعلق مصنف کے تاثرات کا یہ بہترین مجموعہ ہے جس سے اس دور کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اس کا جب پہلا اڈیشن شائع ہوا تھا تو اس قسم کی معلومات لوگوں کی نظروں سے کم گذری تھیں، اس لیے یہ پسند کی گئی اور خوب پڑھی گئی، اب اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور لکھا جا رہا ہے، اس لیے اس کے مطالعہ کی نوعیت کچھ بدل گئی ہے، پھر بھی یہ کتاب اردو کی بہت اچھی تصانیف میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، خود مجھ کو بھی مجموعی حیثیت سے یہ بہت پسند آئی، کہیں کہیں لائق مصنف کے خیالات، تحقیقات اور استنباط سے اختلاف ضرور ہے، لیکن ان کا اظہار چنداں ضروری نہیں، خصوصاً ان سے خوشگوار ملاقات کے بعد۔

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

میرے اس سفرنامہ کی یہ آخری قسط مطبع میں جا چکی تھی کہ اچانک جناب شیخ محمد اکرام صاحب کا ایک تار نیپال کے دارالسلطنت کٹھمنڈو سے ملا کہ وہ ۱۰ مئی کی شام کو اعظم گڈھ پہنچ رہے ہیں، وہ وہاں کسی

سمینار میں گئے ہوئے تھے، نیپال سے اعظم گڑھ آنا اور ہفت خواں طے کرنا دونوں برابر ہے، یہاں مئی کا مہینہ بڑا سخت ہوتا ہے، لیکن اس سخت موسم میں ان کی ٹیکسی دار المصنفین میں داخل ہوئی تو ایسا معلوم ہوا کہ ان کی تحریروں سے جو گلے اور شکوے کبھی پیدا ہوئے تھے، وہ سب جاتے رہے، ہم لوگ نیاز مند ہو کر ان کے خیر مقدم کے لیے جھکے ہوئے تھے، انھوں نے اس نیاز مندی کو دیکھ کر فرمایا کہ ان کے پاکستان کے بعض دوست کہا کرتے تھے کہ وہ اعظم گڈھ گئے تو ان کی سخت مخالفت ہوگی، مگر وہ یہاں بڑی محبت اور یگانگت پارہے ہیں، ان سے ہر قسم کی باتیں دل کھول کر بڑی بے تکلفی سے ہوئیں، زیادہ تر مولانا شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور حیات شبلی موضوع رہا، وہ حیات شبلی کے اسی حصہ پر زیادہ باتیں کرتے رہے جس میں مولانا شبلی اور سرسید کے اختلاف کا ذکر ہے، انھوں نے جو کچھ کہا، ہم لوگوں نے نہایت خندہ پیشانی سے سنا، لیکن ہمارے خیالات وہی رہے جس کا اظہار اس مضمون کے شروع میں ہم کر چکے ہیں، انھوں نے دار المصنفین کے احاطہ کو بہت ہی پر فضا پایا، مولانا شبلی کو ایک Creative Genius کہا، ان کی قبر پر پھول بھی چڑھائے، وہ فکر مند ہوئے کہ ان کی قبر بہت سادہ اور کتبہ کے بغیر ہے، میں نے ان سے ہنس کر کہا کہ دار المصنفین تو خود ان کی قبر کا کتبہ ہے، مگر وہ اس سے مطمئن نہ تھے، وہ اس کو ایک خوبصورت مقبرہ کی شکل میں پھولوں سے لدا ہوا دیکھنا چاہتے تھے، وہ کل یہاں ۲۴ گھنٹے رہے، اور کچھ ایسے گھل مل گئے کہ ہم لوگوں کا جی چاہتا تھا کہ وہ یہاں دو تین روز اور قیام کریں، لیکن ان کا پروگرام کچھ ایسا تھا کہ وہ زیادہ قیام نہ کر سکے، جب ہم لوگوں نے ان کو رخصت کیا تو ایسا محسوس ہوا کہ علم کے ایک شیدائی، ادب کے ایک فدائی، فن کے ایک بڑے قدر دان اور ضرورت کے وقت بہت اچھے دوست کے ساتھ دار المصنفین کے اندر بڑے ہی خوشگوار لمحات گذرے۔

شوقی اور ان کی شاعری

۱۸۶۹ء — ۱۹۳۲ء

از جناب مولوی مقتدیٰ حسن صاحب اعظمی فاضل الازہر یونیورسٹی قاہرہ

(۴)

مذہبی اشعار | مذہبی شاعری میں شاعر کے دینی رجحان، خالقِ کائنات سے تعلق اور مذہب کی مقدس چیزوں کے بارے میں شاعر کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے، لیکن اس کے ساتھ معاشرہ اور سماج کے حالات کی تصویریں بھی ہوتی ہیں، کیونکہ شاعر اپنے گرد وپیش سے بھی متاثر ہوتا ہے اور اس تاثر کو بھی الفاظ کا جامہ پہناتا ہے، اگر کوئی معاشرہ زبوں حالی کا شکار ہو جائے تو اس دور کے شعراء کے کلام میں حزن و ملال اور دنیا کی بے ثباتی کے اشعار ملیں گے، اسی طرح جنگ یا سماجی ترقی کے دور کی شاعری میں جوش و ولولے کی جھلک نظر آئے گی، اول الذکر کی مثال میں ابن الفارض (متوفی ۶۳۲ھ) کو اور آخر الذکر کی مثال میں ابو تمام (متوفی ۲۳۱ھ) کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

شوقی بھی اپنے مذہبی کلام میں ماحول سے متاثر ہوئے اور وقت کے تقاضوں کے ساتھ چلنے کی کوشش کی، ان کے دور میں "اسلامی اتحاد" کا نعرہ بلند ہو چکا تھا، جس کا مقصد اسلامی ممالک کو متحد کر کے ان کو تقویت پہنچانا تھا، ترکی خلیفہ سلطان عبد الحمید نے اس اتحاد کی دعوت دی تھی، اور سید جمال الدین افغانی اس تحریک کے روح رواں تھے، شوقی نے بھی اپنے اشعار سے اس تحریک کی تائید و حمایت کی اور اخیر تک اس کی تاثیر و افادیت پر انھیں یقین رہا۔

شوقی پکے مسلمان تھے، اور ان کو اپنے اسلام پر فخر تھا، اس لیے ان کی شاعری کا بڑا حصہ اسلامیات

سے متعلق ہے، لیکن ان کے دیوان کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ وہ زاہد خشک نہ تھے بلکہ جام و مینا سے بھی شغل رکھتے تھے، یہ ان کی زندگی کا عجیب تضاد ہے، جس کو ان کی مذہبی شاعری پر بحث کرنے سے پہلے دور کرنا ضروری ہے، آئندہ سطور میں اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی جائے گی،

شوقی کے دیوان میں ایک حصہ ایسا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیوی عیش و تنعم میں ڈوبی ہوئی زندگی بسر کرتے تھے، اور " بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست " کے فلسفہ پر یقین رکھتے تھے، لیکن دوسری طرف ایسے اشعار بھی بکثرت ہیں، جن میں شاعر کا دینی جذبہ دوسرے تمام جذبات پر غالب ہے، اور اس نے آخرت کے لیے اپنی دنیا کو تج دیا ہے، ذیل میں دونوں طرح کے اشعار پیش کیے جاتے ہیں، پھر اس تضاد کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی،

خمریات | شوقی کو خمریات سے غیر معمولی دلچسپی تھی، ان کی خمریات کو دیکھکر ابونواس کے اشعار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے،[۵] ایک جگہ مے نوشی کا یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اس سے منافقانہ ماحول سے نکل کر انسان آزاد فضا میں پہنچ جاتا ہے

فلعل سلطان المدامة مخرجي   من عالم لم یحو غیر نفاق

(شاید شراب مجھے ایسی دنیا سے بچا لے جس میں نفاق کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے)

ایک جگہ کہتے ہیں کہ شراب سے انسان کے نفس کو آرام ملتا ہے اور غم غلط ہو جاتا ہے:

راحة النفوس وهل   عند راحة تعب ؟

(شراب باعث راحت و تسکین ہے، اس سے کسی طرح کا رنج نہیں ہو سکتا)

لا تسقنی الا دهاقا اننی   أسقی بكأس فی الهموم دهاق

(شراب کے لبریز پیالے پلاؤ کیونکہ غم میں لبریز پیالے ہی پیتا ہوں)

---

[۵] ڈاکٹر ماہر حسن فہمی: شوقی ؛ شعرہ الاسلامی ص۰،

غزل کے اشعار کا نمونہ یہ ہے:

مشت علی الحسن یا فی تلفتها　　للناظرین وبانا فی تثنیها

(محبوبہ چلتے ہوئے غزال کی طرح مڑتی اور شاخ کے مانند لچکتی تھی)

وفتاة ما زادها فی غریب الـ......حسن الا غرائب الاخلاق

(دوشیزہ کے حسن کو اس کے اچھے اخلاق نے دوبالا کر دیا ہے)

ذقت منها حلوا و مرا و کانت　　لذة العشق فی اختلاف المذاق

(محبوبہ کی جانب سے تلخ و شیریں دونوں سے سابقہ رہا ہے اور عشق کا مزہ اسی اختلاف میں ہے)

شوقی نے جن اشعار میں دور شباب کے کوائف اور واقعات کا تذکرہ کیا ہے ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں جوانی کے ختم ہو جانے کا اگر کچھ رنج و غم ہے تو صرف اس لیے کہ اس زندگی کے ساتھ ہی ساتھ محبت اور اس کی گوناگوں دلچسپیاں بھی ختم ہو گئیں،

بعض ناقدین نے لکھا ہے کہ شوقی کے غزلیہ اشعار مصنوعی اور غیر واقعی ہیں، انھوں نے محبوبہ سے ملاقات وغیرہ کی داستانیں محض خیالی لکھی ہیں، (فی الادب الحدیث ج ۲ ص ۲۳۶)، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، شوقی کی غزل نہ تو خیالی ہے اور نہ قدیم شاعری کی نقل و تقلید، بلکہ انھوں نے غزلیہ اشعار میں اپنی زندگی اور تجربات کی ترجمانی کی ہے، جس ماحول میں شوقی تھے، اسی ماحول کو اپنے اشعار میں پیش کیا ہے،

شوقی کا تغزل دو طرح کا ہے، تقلیدی جو قدیم طرز کے مطابق قصیدوں کی تشبیب میں ہوتا ہے، اس میں تکلف، تصنع اور جذبات کا فقدان نمایاں ہے، کیونکہ اس تغزل میں صرف قدیم شعراء کی تقلید ہوتی ہے، اپنے جذبات کی ترجمانی نہیں،

دوسرے وہ قصائد جو تمامتر تغزل پر مشتمل ہیں، ان میں شاعر نے اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے

اس قسم کے اشعار میں جذبات کی سچی تصویریں ہیں، ان کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شوقی کے غزلیہ اشعار، ان کی محبت اور ان کے عاشقانہ جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے کسی مخصوص محبوبہ کو متعین نہیں کیا۔[1]

یہ شوقی کے ان اشعار کا جن سے ان کی آزاد طبیعت اور غیر دینی رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے مختصر جائزہ تھا، اب تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا جاتا ہے۔

تدین اور زہد شوقی کے دینی اور زاہدانہ اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے زاہد و عالم دین ہیں، لہو و لعب اور عیش و عشرت سے انھیں شدید نفرت ہے،

ربنا یا ذا التجلی والجلال　　یا خفی اللطف یا رب النوال
(اے رب ذو الجلال　　اے لطیف و صاحب عطا
ھب لنا الصالح من عمر و مال　　ربنا والطف بنا فی کل حال
(ہمیں پاکیزہ زندگی اور مال عطا کر　　اور ہر حال میں ہم پر رحم فرما)
ربنا ثبت علی الحق القلوب　　وادفع الاسواء عنا والخطوب
(دلوں کو حق پر ثابت رکھ　　اور مصائب و محن کو ہم سے دور رکھ)
ربنا اللھم جنبنا الذنوب　　واھدنا الحکمۃ فی کل الفعال
(ہمیں گناہوں سے بچا　　اور ہر کام میں ہمیں سمجھ عطا فرما)
ربنا اللھم اصلح شأننا　　واقم فی نفعنا حکامنا
ہمارے حالات کو سدھار دے　　اور حکام کو ہمارے لیے نفع بخش بنا دے
ربنا واحفظ بنا اوطاننا　　واجعل الملۃ فی اوج الکمال
ہمارے ذریعہ ہمارے وطن کی حفاظت کر　　اور مذہب کو معراج کمال تک پہنچا دے)[2]

---

[1] شوقی: شعراء الاسلام ص ۷۷، [2] الشوقیات ص ۱۰ طبع ۱۹۶۱ء

ایک مقام پر کہتے ہیں :-

الھی قد اتیتک قبل نومی مقراً بالاساءۃ طول یومی

الھی ان ظلمت وان کذبت وان یوماً بلا سبب غضبت

فانی یا غفور الیک تبت وانک اکرم المجاوزینا[1]

(خدایا سونے سے پہلے دن بھر کے گناہوں پر ندامت کا جذبہ لے کر حاضر ہوا ہوں

خدایا اگر میں نے ظلم، جھوٹ یا بلا وجہ غصہ سے اپنا دامن آلودہ کیا ہو

تو اب تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں اور تو سب سے بڑھ کر معاف کرنے والا ہے۔)

ان اشعار سے شاعر کے دینی جذبات، خدا سے اسکے تعلق، خشوع و تضرع اور ندامت و امید کی ملی جلی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ "الھی" اور "ربنا" کی تکرار خدا سے اس کے غیر معمولی لگاؤ کی آئینہ دار

ترکی حکومت کو جب یونانیوں پر فتح حاصل ہوئی تو شوقی کو بڑی خوشی حاصل ہوئی، اور اس کامیابی کو انھوں نے دین اسلام کی کامیابی اور فتح سے تعبیر کیا۔

بسیفک یعلو الحق والحق اغلب وینصر دین اللہ ایان تضرب

(تمھاری تلوار سے حق کو بلندی حاصل ہوتی ہے اور وہ غالب آتا ہے، تمھاری ہر ضرب دین کی نصرت و فتح ہو)

شوقی کے دینی اشعار سے ابو العتاہیہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ موت سے زندگی کی مسرتوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے، اور دوستی اور دشمنی کے تمام رشتے ٹوٹ جاتے ہیں، موت و زیست کے اس سلسلہ میں یہ راز مضمر ہے کہ انسان کی زندگی کا ایک مقصد ہے اور وہ ایک مخصوص غرض و غایت کے لیے مرتے یا جیتے ہیں، اس زندگی کے بعد انسان کو آخرت کی زندگی میں حساب و کتاب کا سامنا کرنا ہوگا۔ اور پہلی زندگی کے اعمال کا بدلہ ملے گا، اور یہ دنیوی زندگی اخروی زندگی کا نمونہ ہے۔ اسلیے انسان کو دنیا میں آخرت کے لیے توشہ، سیرت طیبہ، عمل صالح، نیک روش

اور پاکدامنی سے آراستہ ہونا ضروری ہے،

وجهت الحياة طريق الزمر | الى بعثة و شئون أخر
وما باطلا ينزل النازلون | ولا عبثا يزمعون السفر
فلا تحتقر عالما انت فيه | ولا تجحد الآخر المنتظر
وخذ لك زادين من سيرة | ومن عمل صالح يدخر
وكن في الطريق عفيف الخطى | شريف السماع كريم النظر

(لوگ زندگی کی راہ سے بعثت اور دوسرے امور کی طرف جارہے ہیں
آنے والے بلا وجہ نہیں آتے، اور نہ تو ان کا سفر عبث ہوتا ہے
موجودہ دنیا کو حقیر نہ سمجھو اور نہ تو آخرت کا انکار کرو
اپنے لیے بہتر سیرت اور نیک عمل کو توشہ بنا لو۔
اپنی روش میں عفت و پاکدامنی اور شرافت و بزرگی کا لحاظ رکھو)

شوقی کے زہد کا کمال ملاحظہ فرمائیے، موت کو غمہائے روزگار سے نجات کا ذریعہ قرار دیتے ہیں:

یا موت مل بالشراع | واحمل جريح الحياة
سر بالقلوع السراع | الى شطوط النجاة

(اے موت! مجروح حیات کو اپنے سفینہ میں اٹھالے چل
اور اس سفینہ کو تیزی سے نجات کے ساحل پر پہنچا دے)

کبھی عیش و ہوا پرستی میں غلو بھی انسان میں گناہ کا احساس پیدا کردیتا ہے اور وہ ذہنی تکلیف میں مبتلا ہوجاتا ہے، اس سے نکلنے کے لیے وہ اللہ سے لو لگاتا ہے اور اسکی غفاری وستاری کا سہارا لیتا ہے۔

دعوتك والضمير يطيل لومی وانت الله خیر الراحمینا

ان جل ذنبی عن الغفران لی امل فی الله یجعلنی فی خیر معتصم

(میں تجھے پکارتا ہوں اور ضمیر مجھے برابر ملامت کرتا ہے، اور اے اللہ تو سب سے بہتر رحیم ہو

گناہوں کی سنگینی کے باوجود مجھے اللہ کی ذات سے نجات کی امید ہے)

اور کبھی یہ سوچتا ہے کہ اس کے لیے نجات کا دروازہ بند ہے، کیونکہ اس کے گناہ بہت بڑے اور بے شمار ہیں :

ویارب هل تغنی عن العبد حجة وفی العمر ما فیه من الهفوات

(زندگی کی بے شمار لغزشوں کے بعد بندہ کو کوئی حجت کام نہیں دے سکتی)

شوقی کے ان اشعار سے ان کے دینی جذبات، خدا سے تعلق و تضرع اور زاہدانہ افکار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، درحقیقت شوقی کے کلام کا یہ تضاد اور ان کی طبیعت کے یہ دو مختلف رجحانات سماجی تبدیلیوں کا نتیجہ ہیں، جن میں افراد کی نفسیات کا عام رخ یہی ہوتا ہے، انیسویں صدی میں اسلامی ممالک خصوصاً مصر میں بڑی اجتماعی، ثقافتی اور سیاسی تبدیلیاں ہوئیں، اس زمانہ میں تمام اسلامی ممالک مغربی تہذیب کی طرف قدم بڑھا رہے تھے، جس کی نمایاں خصوصیت دنیا اور اس کی لذتوں کی طلب ہے، مگر ماضی سے بھی ان کا تعلق قائم تھا، اس لیے اس دور کی زندگی قدیم اسلامی تہذیب اور جدید یورپین تہذیب کا مجموعہ بن گئی تھی اور اس نئی تہذیب کے ساتھ ہی وہ تمام افکار و خیالات اسلامی دنیا میں داخل ہو چکے تھے، جن کو مغربی تہذیب کی خصوصیت قرار دیا جاسکتا ہے، شوقی کا بھی دونوں تہذیبوں سے سابقہ پڑا، اس لیے دونوں سے ان کا متاثر ہونا ضروری تھا۔[1]

---

[1] ماہر حسن فہمی : شوقی، شعرہ الاسلامی ص ۹۶

اس دور کا پورا معاشرہ اس طرح کے تضاد کا شکار تھا۔ معاشرہ کے اسی تضاد نے لوگوں کے دلوں میں ایک طرح کا تذبذب پیدا کر دیا تھا۔ وہ کبھی قدیم کو ترجیح دیتے تھے اور کبھی جدید کو، کبھی دین کی طرف لپکتے تھے اور کبھی اس سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔ گویا قدیم و جدید افکار و رجحانات کے درمیان ایک زبردست قسم کی کشمکش برپا تھی، شعراء رقت شعور کی وجہ سے اس کشمکش سے زیادہ متاثر ہوئے، اس لیے شوقی نے بھی اسی زمانہ میں بہت سی موروثی عادات و رسوم کو ترک اور نئی عادتوں کو قبول کیا، ڈاکٹر ہیکل لکھتے ہیں: شوقی کبھی مذہبی آدمی ہیں اور کبھی مذہب سے آزاد، اور ان دو متضاد پہلوؤں میں وہ سچے ہیں، کیونکہ اس دور کے حالات نے شاعر کو اس متضاد مرحلہ تک پہنچایا تھا۔[1]

شوقی ایک مومن اور مسلمان تھے لیکن سماجی تبدیلیوں کے دور میں انھوں نے زندگی بسر کی جس میں ان کے سامنے لذت پرستی پر آمادہ کرنے والی چیزیں آئیں، اور وہ اپنی رقیق طبیعت کی وجہ سے ان کی طرف کبھی کبھی مائل بھی ہو گئے۔ علی نجدی کا بیان ہے: دوسرے لوگوں کی طرح شوقی کے سامنے بھی لذت و عیش پرستی اور زہد و دینداری کے محرکات آئے اور وہ دونوں ہی سے متاثر ہوئے جیسا کہ عام شعراء کا طریقہ ہے۔[2]

مذہبی شاعری کے اہم عنوانات شوقی ایک سچے مذہب پرست اور دینی آدمی تھے، اسلام سے انھیں محبت اور دلی لگاؤ تھا، لیکن ماحول اور معاشرے کے اثرات سے ان کی زندگی میں کچھ ایسے عناصر شامل ہو گئے تھے جنھوں نے انھیں لذت پرستی کی طرف مائل کیا، اس کے باوجود انکے دیوان کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا بڑا حصہ اسلامی موضوعات و شخصیات سے متعلق ہے جو شاعر کی مذہب پرستی اور اسلام دوستی کا ثبوت ہے، ڈاکٹر زکی المحاسنی لکھتے ہیں "شوقی کے

---

[1] مقدمۃ الشوقیات ج ا ص ۲، [2] علی النجدی: الدین والاخلاق فی شعر شوقی ص ۱۴۱

دیوان "الشوقیات" کی چاروں جلدوں یا "الشوقیات المجہولہ" میں جتنے قصائد ہیں ان میں خدا، رسول دین و مذہب، اخلاق اور تقویٰ کا ذکر ہے اور جدید ادبی تاریخ میں اگر کسی کو اسلام کے شاعر اعظم کا لقب دیا جا سکتا ہے تو وہ شوقی ہیں۔"[1]

شوقی نے اسلام کے دینی، سماجی اور سیاسی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ مسلم لیڈروں پر بھی توجہ دی، اس پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے،

مسلم قائدین | مسلم قائدین اور "اسلامی اتحاد" دونوں اس زمانہ میں لازم و ملزوم تھے، مسلم لیڈروں کی تنظیم و احترام اور ان کی جد و جہد کے تذکرہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ان کی تقلید کی دعوت دی جائے، جس کے ذریعے آج کا مسلمان بھی اسی بلند و بالا مقام کو حاصل کر سکے جس پر اسکے اسلاف متمکن تھے، شوقی نے اس سلسلہ میں پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں البوصیری کے قصیدہ البردہ کی تقلید میں اپنا مشہور قصیدہ "نہج البردہ" کہا جس کا مطلع یہ ہے:

ریم علی القاع بین البان والعلم　　　احل سفک دمی فی الاشہر الحرم

نعت نبیؐ میں دوسرا قصیدہ "ذکری المولد" ہے جس کا مطلع ہے:

سلوا قلبی غداۃ سلا وتابا　　　لعل علی الجمال لہ عتابا

حضورؐ کی مدح میں ان کا ہمزیہ قصیدہ عرب دنیا میں آج بھی مشہور اور زبان زد عوام و خواص ہے، اس کا مطلع ہے:

ولد الھدی فالکائنات ضیاء　　　وفم الزمان تبسم وثناء

(ہدایت پیدا ہوئی ساری کائنات اسکی روشنی سے منور ہو گئی اور زمانہ کے لب تبسم اور ثنا میں ڈوب گئے)

ان کے قصیدے "دول العرب وعظماء الاسلام" میں اسلامی تاریخ کے بیشتر اہم واقعات نظم کئے گئے ہیں،

---

[1] دعوۃ الحق ص ۵۵، نومبر ۱۹۶۸ء

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک کی مدح میں جن شعراء نے نعتیہ قصیدے لکھے،
ان میں سے اعشی اور کعب بن زہیر وغیرہ قابل ذکر ہیں، آپ کے وصال کے بعد شعراء نے سیاسی
مصالح کی بنا پر اہل بیت اور حضور کی تعریف میں اشعار لکھے، بعض نے ادبی ذوق اور شاعرانہ
رجحان کی بنا پر اس وادی میں قدم رکھا، لیکن البوصیری اور شوقی کا شمار ان شعراء میں ہے جنھوں نے
سچے جذبہ سے اس موضوع پر قلم اٹھایا، ان کے دل کی تڑپ نے انھیں حضور اکرم کی مدح و توصیف
پر مجبور کر دیا، شوقی نے اپنے نعتیہ قصائد میں حضور کی ان صفات کو خصوصیت سے نمایاں کیا ہے
جن سے دعوت اسلام کے پھیلنے میں مدد ملی، اور دشمنوں نے آپ کے حسن اخلاق سے متاثر ہو کر
آپ کی صداقت کا کلمہ پڑھا، اس سے شوقی کا مقصد یہ تھا کہ اگر آج بھی مسلمان ان صفات عالیہ
و اخلاق حسنہ کو اپنے اندر پیدا کرلیں تو اس سے اسلام کو تقویت حاصل ہوگی،

ایک قصیدہ میں لکھتے ہیں :-

واذا سخوت بلغت بالجود المدیٰ	وفعلت مالا تفعل الانواء
واذا غضبت فانما هي غضبة	في الحق لا ضغن ولا بغضاء
واذا خطبت فللمنابر هزة	تعرو الندی وللقلوب بکاء
واذا قضیت فلا ارتیاب کانما	جاء الخصوم من السماء قضاء
واذا ابنیت فخیر زوج عشرة	واذا ابتنیت فدونك الآباء
واذا صحبت رای الوفاء مجسما	في بردك الاصحاب والخلطاء

(آپ سخاوت کرتے ہیں تو انتہا کو پہنچ جاتے ہیں، بادل بھی آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے
آپ کا غصہ حق کے لیے ہوتا ہے، اس میں کینہ اور دشمنی نہیں ہوتی
آپ جب خطبہ دیتے ہیں تو منبر اور مجلس جھوم اٹھتی ہے اور دل رونے لگتے ہیں

آپؐ فیصلہ شک وشبہ سے پاک اور آسمانی فیصلہ ہوتا ہے

آپ ایک مثالی شوہر اور ایک مثالی باپ ہیں

آپ صحابہ اور ملنے والوں کے لیے سراپا وفاداری ہیں)

شوقی نے اپنے نعتیہ قصیدہ میں ان اعتراضات کا بھی جواب دیا ہے جو اسلام پر کیے جاتے ہیں، اُن ہی میں سے ایک اعتراض یہ ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام نے اپنی دعوت کو پھیلانے کے لیے تلوار سے کام لیا، حالانکہ انبیاء کا مقصد خونریزی نہیں ہوتا، وہ تو عالم کے لیے رحمت ہوتے ہیں، شوقی نے اس الزام کی پوری تردید کی اور دکھایا کہ اسلام پر اعتراض کرنے والے ذرا ایک نظر مسیحی مذہب پر ڈال لیں جس کے متبعین کی خونریزیوں سے آج بھی تاریخ کے صفحات رنگین ہیں، لکھتے ہیں :-

قالوا غزوت ورسل اللہ ما بعثوا	بقتل نفس ولاجاؤا السفک دم
جھل وتضلیل احلام وسفسطہ	فتحت بالسیف بعد الفتح بالقلم
والشر ان تلقہ بالخیر ضقت بہ	ذرعا وان تلقہ بالشر ینحسم
سل المسیحیۃ الغراء کم شربت	بالصاب من شھوات الظالم الغلم
لولا حماۃ لھا ھبوا لنصرتھا	بالسیف ما انتفعت بالرفق والرحم

لوگوں کا اعتراض ہے کہ آپ نے جنگ کی حالانکہ رسول کا منصب قتل وخونریزی نہیں ہوتا لیکن یہ نادانی، خام خیالی اور بکواس ہے، آپ نے تلوار سے پہلے قلم کے ذریعہ قلوب کو فتح کیا ہے اگر انسان برائی کا بدلہ ہمیشہ بھلائی سے دینے لگے تو پریشانی میں مبتلا ہو جائیگا، اور اگر برائی کا بدلہ برائی سے دے تو برائی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مسیحی مذہب سے پوچھو کہ کتنی خون آشامیوں کے بعد اس کی اشاعت ہوئی ہے؟

اگر مسیحیت کے مددگار تلوار لیکر نہ اٹھتے تو زمانے اس کو کوئی فائدہ نہ ملتا۔) [۱]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ شوقی نے ان مشاہیر اسلام کا تذکرہ بھی کیا ہے جن کے کارنامے آج بھی زندہ ہیں اور جن پر ہمیشہ اسلامی تاریخ فخر کرے گی، چنانچہ "نہج البردہ" میں خلفائے راشدین کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ اور "دول العرب وعظماء الاسلام" میں اہم اسلامی شخصیتوں اور حکومتوں کا ذکر ایسے دلنشین انداز میں کیا ہے جس سے اسلاف اور ان کے کارناموں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے،

حضرت ابوبکر صدیق کے ذکر میں ان کی فتوحات، نشر و اشاعت اسلام میں انکی جد و جہد دینی غیرت، زہد و تقویٰ اور جود و سخا، ان تمام اوصاف کا تذکرہ کیا ہے:

فيا اخا الضراء والشدائد	والناس اخوان لدى الفوائد
وقدوة الزهاد بعد الهادي	وصاحب الهجرة والجهاد
ويا رحيما قلبه رقيقا	بماله كم حرر الرقيقا

(اے سختیوں میں لوگوں کے کام آنے والے، لوگ تو صرف آرام کے وقت دوست بنتے ہیں
حضور کے بعد آپ زاہدوں کے پیشوا اور صاحب ہجرت و جہاد ہیں
رحیم اور رقیق القلب ہیں، اپنے مال سے بیشمار غلاموں کو آزاد کرا چکے ہیں)

اسی طرح حضرت عمر بن الخطاب، عثمان بن عفان اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم سب کا تذکرہ نہایت والہانہ انداز سے کیا ہے، اور ان کے ان کارناموں کو گنایا ہے،

اس کے بعد حضرت خالد بن ولید، حضرت معاویہ اور عبدالرحمٰن الداخل وغیرہ مشاہیر کا ذکر کیا ہے، اور عباسی اور فاطمی حکومتوں پر یہ قصیدہ ختم کیا ہے، عباسی حکومت کی مشہور شخصیت ابوجعفر المنصور اور فاطمی حکومت کی مشہور شخصیت المعز لدین اللہ کی تعریف کی ہے، اور انکے

---

۱ الشوقیات ج ۱ ص ۲۴۲

تعمیری کاموں کو سراہا ہے، ایک دوسرے قصیدے میں جس کا عنوان ہے "کیارالحوادث فی وادی النیل"، صلاح الدین ایوبی کی مدح میں ان کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔

مزقت جمعهم على كل ارض مثلما مزق الظلام الضياء

هكذا المسلمون والعرب لنا لون لا ما يقوله الاعداء

(ہر جگہ ان کے شیرازہ کو تو نے منتشر کر دیا جیسے روشنی سے تاریکی چھٹ جاتی ہے،
مسلمان عرب ایسے ہی ہوتے ہیں نہ کہ جیسا دشمن سمجھتے ہیں)

اسلاف کے تذکرے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے مسلم قائدین اور مشہور لیڈروں اور بادشاہوں کا بھی ذکر کیا ہے، ان میں ترکی خلیفہ کا نام سب سے نمایاں ہے، عرب لیڈروں کے علاوہ دوسرے ممالک کے مسلم لیڈروں کی خدمات کو بھی سراہا ہے، اور ان کی وفات پر آنسو بہائے ہیں، ہندوستان کی مایۂ ناز شخصیت مولانا محمد علی جوہر کی وفات اور بیت المقدس میں تدفین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

یا قدس هیئ من رياضك ربوة لنزيل تربك واحتفل بلقائه

بطل حقوق الشرق من احماله وقضية الاسلام من اعبائه

لم تنسه الهند العزيزة رقة للشرق او صبرا على اشيائه

هو في جوار الله مالك غربة في ظل بيت انت من ابنائه

(اے سرزمین بیت المقدس اپنے چمن کا ایک گوشہ اس مہمان کے لیے بھی خالی کر دے اور اس کے ساتھ تپاک سے پیش آ۔
اس مردِ جانباز نے مشرق کے حقوق اور اسلام کے معاملہ میں مدافعت کا بیڑا اٹھایا تھا،
ہندوستان کے مسائل میں مشرق اور اس کے معاملات کو اس نے کبھی فراموش نہیں کیا

اللہ کے جوار میں آرام سے سوجا جس گھر کا تو فرزند ہے اسکے سایہ میں تجھے مسافرت کا احساس نہیں ہونا چاہیئے)
اسی طرح شوقیؔ نے متعدد سیاسی و دینی زعماء و اکابر کا تذکرہ کیا ہے، اور مسلمانوں کو انکے نقش قدم پر چلنے کی دعوت دی ہے۔

اخلاقیات | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہی انسانی اخلاق کی اصلاح تھی "بعثت لاتمم مکارم الاخلاق"۔ اس کے بغیر اسلامی معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا، اس لیے شوقیؔ نے اخلاقیات پر غیر معمولی توجہ دی ہے، اخلاق کا مقام ان کے نزدیک بہت اہم ہے، جو قوم عمدہ اخلاق کھو دیتی ہے اس کا کوئی وزن باقی نہیں رہتا، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وانما الامم الاخلاق ما بقیت	فان ھمو ذھبت اخلاقھم ذھبوا
کذا الناس بالاخلاق یبقی صلاحھم	ویذھب عنھم امرھم حین تذھب
ولقد یقام من السیوف ولیس من	عثرات اخلاق الشعوب قیامُ
واذا الاخلاق کانت سُلّما	نالت النجم ید الملتمس
واذا اصیب القوم فی اخلاقھم	فأُقم علیھم ماتما وعویلا

(قوموں کے اخلاق اگر باقی ہوں تو وہ بھی باقی رہیں گی اور جب اخلاق ختم ہو جائینگے تو خود قوم ختم ہو جائیگی)
(لوگوں کا سدھار اخلاق ہی سے ہو سکتا ہے، جب اخلاق ختم ہو جائے گا تو لوگ خود بگڑ جائیں گے)
(تلوار کی ضرب کے بعد انسان سنبھل سکتا ہے، لیکن اخلاقی لغزش کے بعد سنبھلنا ممکن نہیں)
(اخلاق کے سہارے انسان ستاروں کو چھو سکتا ہے)
(اخلاق کی رو سے جب قوم میں زوال آجائے تو اس پر ماتم و نوحہ کرو)

اسلام میں غرباء و امراء کو مساوی حقوق حاصل ہیں، کسی طبقہ کو دوسرے پر کوئی فضیلت یا ترجیح نہیں ہے:

بک یا ابن عبد اللہ قامت سمحۃ — بالحق من ملل الہدی غراء
فرست بعدک للعباد حکومۃ — لا سوقۃ فیھا ولا امراء
اللہ فوق الخلق فیھا وحدہٗ — والناس تحت لوائھا انضاء
انصفت اھل الفقر من اھل الغنی — فالکل فی حق الحیاۃ سواء

(اے رسولؐ آپ ہی کے ذریعہ شریعت مطہرہ نے حق کو غالب و قائم کیا
آپ نے انسان کے لیے ایسی حکومت قائم کی جس میں امیر و غریب کا فرق مٹا دیا گیا
اس کی تعلیم ہے کہ اللہ واحد اور سب پر بالا ہے اور لوگ شریعت کے جھنڈے تلے مجبور یا مطیع ہیں
آپ نے مالدار و غریب کے درمیان انصاف کیا، چنانچہ سب کو برابر جینے کا حق حاصل ہے)

مذہبی شاعری کے مختلف ادوار | شوقی کے اسلامی اشعار کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور جلا وطنی کے قبل کا، دوسرا دور جلا وطنی کا اور تیسرا دور وطن آنے کے بعد کا، ان میں ہر دور پر مختصر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

پہلا دور | شوقی نے جب ہوش سنبھالا اس زمانہ کی اسلامی دنیا میں دین کا بول بالا تھا، اور مسلمان دین کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، مسلمان حکومتیں اور عوام دینی رشتہ میں جڑے ہوئے تھے، ان کی قیادت و سربراہی عثمانی خلیفہ کرتے تھے، ان کی کوشش تھی کہ سارے مسلمان اسلامی اخوت کے رشتہ میں منسلک ہو جائیں، شوقی اس جذبہ کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے خلیفہ کی تعریف میں قصیدے لکھے، انکے نزدیک اسلام اور مسلمانوں کو اگر کہیں پناہ مل سکتی تھی تو وہ خلیفہ کی شخصیت تھی، اس کی مدح میں لکھتے ہیں:

ضحی المسلمون والاسلام — فرع عثمان دم فداک الدوام

وضع الشرق فی یدیک یدیہ   وأتت من حماتہ الاقسام

غیر غاو او خائن او حسود   برئت من اولئک الاحلام

(تجھ سے اسلام اور مسلمان راضی ہیں، عثمان کی نسل! تو ہمیشہ باقی رہے اور دوام تجھ پر فدا ہو
مشرق نے تمھارے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیا ہے، اور اس کے سربراہوں نے قسمیں کھائی ہیں
تجھ میں نہ تو بے راہ روی ہے نہ خیانت، نہ حسد، تو اس طرح کے نقائص سے بری ہے)

۱۳۱۵ھ کی جنگ میں یونانیوں پر جب ترکوں کو فتح حاصل ہوئی تو شوقی نے سلطان کی مدح میں ایک پرزور قصیدہ لکھا جس کے چند اشعار یہ ہیں :-

بحمد اللہ رب العالمینا   وحمدک یا امیر المومنینا

لقینا فی عدوک ما لقینا   لقینا الفتح والنصر المبینا

جمعت لنا الممالک والشعوبا   وکانت فی سیاستہا ضروبا

بنی عثمان انا قد قدرنا   فتوحکم الکبار وقد شکرنا

سالنا اللہ نصرا فانتصرنا   بکم واللہ خیر الناصرینا

(خدا کی حمد جو رب العالمین ہے۔ اور تمھاری تعریف اے امیر المومنین!
دشمنوں کے مقابلہ میں اللہ کے فضل اور آپ کی بدولت ہمیں کھلی ہوئی فتح حاصل ہوئی
تو نے ان مختلف ممالک واقوام کو جمع کر دیا جن کی سیاست باہم مختلف تھی
آل عثمان! ہمیں تمھاری فتوحات کا اندازہ ہے اور ہم تمھارے شکرگذار ہیں
اللہ تعالیٰ سے ہم نے فتح کی دعا کی تھی اور تمھاری بدولت ہمیں فتح حاصل ہوئی، خدا بہترین مددگار ہے)

شوقی عثمانی سلاطین کو مسلمانوں کا مذہبی خلیفہ اور ان کی اطاعت ضروری سمجھتے تھے۔
علامہ شکیب ارسلان لکھتے ہیں: سلطان عبد الحمید کی ذات سے شوقی کو کوئی خاص تعلق نہیں تھا

صرف منصب خلافت پر فائز ہونے کی وجہ سے شوقی اور عام مسلمانوں کے دلوں میں ان کی شخصیت کا احترام تھا، چنانچہ سلطان عبدالحمید کے بعد جب ان کے بھائی محمد رشاد محمد پنجم کے نام سے تحت خلافت پر بیٹھے تو شوقی نے ان کی بھی مدح لکھی، کیونکہ ان کی نظر میں اسی منصب کی حیثیت اہم تھی۔[1]

شوقی نے پہلے دور میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں تین قصیدے لکھے، پہلا "نہج البردہ" جس میں البوصیری کا تتبع کیا ہے۔ دوسرا ہمزیہ اس میں بھی البوصیری کے ہمزیہ قصیدہ کا تتبع کیا ہے اور تیسرا ذکری المولد جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کے سلسلہ میں مسلمانوں کو آپ کی پاکیزہ تعلیمات پر عمل کرنے کی ترغیب دی ہے، اس دور میں شوقی نے زیادہ تر دوسرے شعراء کا تتبع کیا ہے، شاعر اور جس قصیدہ کا وہ تتبع کرتے ہیں، اس سے پوری طرح متاثر ہوتے ہیں اور ان کا یہ تاثر ان کے قصائد میں نمایاں نظر آتا ہے، "صدی الحرب" کے عنوان سے جو قصیدہ لکھا ہے اس کا مطلع ہے:

بسیفک یعلو الحق والحق اغلب　　　وینصر دین اللہ ایان تضرب

متنبی نے کافور کی مدح میں جو قصیدہ لکھا تھا اور جس کا مطلع تھا:

اغالب فیک الشوق والشوق اغلب　　　واعجب من ذا الھجر والوصل اعجب

یہ قصیدہ اس کے تتبع میں لکھا گیا ہے، شوقی نے بھی سلطان عبدالحمید کی مدح میں ٹھیک وہی طریقہ اختیار کیا ہے، جو متنبی کا ہے۔

دوسرا دور | جلاوطنی کے بعد سے شوقی کی مذہبی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ جلاوطنی کا زمانہ کاٹنے کے لیے شوقی جب اندلس آئے تو انھیں اسلامی اتحاد سے مایوسی ہو چکی تھی، کیونکہ جنگ عظیم میں عربوں نے ترکی حکومت کا ساتھ نہیں دیا تھا، اس زمانہ میں شوقی نے جو اشعار کہے

---

[1] شکیب ارسلان: شوقی او صداقۃ اربعین سنۃ ص ۲۹۰

ان میں ایک طرف مصر اور وہاں کے باشندوں کے ساتھ غیر معمولی لگاؤ پایا جاتا ہے، تو دوسری طرف اندلس میں اسلامی آثار کو دیکھکر وہ خون کے آنسو روتے ہیں، اور اپنے اسلاف کی گذشتہ عظمت و سطوت کا تذکرہ کرتے ہیں، اسی دور میں انھوں نے قلعۃ الحمراء، دول العرب وعظماء الاسلام اور صقر قریش وغیرہ نظمیں لکھیں، اندلس میں مسلمان سلاطین کے آثار نے شوقی کے جذبات کو ابھار دیا تھا، اور وہ ان آثار پر آنسو بہا کر مسلمانوں کے خوابیدہ جذبات کو بیدار اور ان کے عزائم کو بلند کرنا چاہتے تھے۔

قرطبہ کے اسلامی آثار جہاں کسی زمانہ میں مسلمانوں کے دم سے رونق اور بہار تھی اب سنسان نظر آرہے تھے۔ انکی گذشتہ عظمت وسطوت کا نام ونشان تک مٹ چکا تھا، ایک شعر میں کہتے ہیں:

قریۃ لا تُعَدُّ فی الارض کانت تمسک الارض ان تمید وتتر
واذا الدار ما بہا من أنیس واذ القوم ما لھم من مُحُس

(جو شہر آج بے حیثیت بنا ہوا ہے وہی کل تک زمین کے لیے باعثِ استقرار وسکون تھا
اب اس گھر میں نہ تو کوئی انیس ہے اور نہ گھر والوں کو کوئی جانتا ہے)

قصیدہ کے آخر میں اندلس سے مسلمانوں کے خاتمہ کا نقشہ بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے

خرج القوم فی کتائب صُمّ عن حفاظ کموکب الدفن خرس
رکبوا بالبحار نعشا وکانت تحت آبائھم ھی العرش امس

(یہاں سے مسلمان خاموش دستوں میں اس طرح نکلے جیسے لوگ جنازہ لیکر چلتے ہیں
جنازوں پر نعش کی صورت میں سوار ہوئے، حالانکہ انہی جنازوں پر انکے اجداد شاہانہ شان سے آئے تھے)

ان آثار اور یہاں کے سلاطین کے انجام سے عبرت اندوزی کے ذکر میں لکھتے ہیں:

حسبهم هذه الطلول عظات ... من حديد على الدهور ودرس

واذا فاتك التفات الى الما ... ضى فقد غاب عنك وجه التاسى

(ان کھنڈرات میں مسلمانوں کے لیے زبردست عبرت کا سامان موجود ہے
جب کوئی قوم ماضی کو فراموش کر دیتی ہے، تو وہ سلف کی پیروی میں ناکام ہو جاتی ہے)

اسی جلا وطنی کے زمانہ میں "دول العرب وعظماء الاسلام" کے عنوان سے اپنا مشہور قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے:

الحمد لله القديم الباقى ... ذى العرش والسبع العلا الطباق

اندلس کے اسلامی آثار کو دیکھنے کے بعد شوقی کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ کاش مسلمانوں کے اقبال کا زمانہ پھر لوٹ آئے اور ان کی کھوئی ہوئی عزت انھیں واپس مل جائے، مشاہیر اسلام کے کارناموں کو اسی غرض سے انھوں نے اس قصیدہ میں نمایاں کیا ہے کہ موجودہ نسل میں اپنے کھوئے ہوئے مقام کو واپس لینے کا جذبہ پیدا ہو۔

حتى اراد الله ان نظمت ... من سير الرجال ما استعظمت

علما بما يبعث فى الاحداث ... عجائب الاعمال والاحداث

(میں نے مشیت الٰہی سے مشاہیر کی سیرت کو نظم کا جامہ پہنایا ہے
کیونکہ واقعات سے آدمی بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتا ہے)

تیسرا دور
۱۹۱۹ء کے اخیر میں جب شوقی جلا وطنی کے دن کاٹ کر وطن واپس آئے تو ان کی مذہبی شاعری کا تیسرا دور شروع ہوا، اندلس سے واپسی کے بعد شوقی نے دیکھا کہ مصر کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہے۔ پہلے ساری عظمت اور بڑائی خلیفہ کی ذات میں مرکوز تھی، عوام کی اسکے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہ تھی لیکن اب عوام کا زمانہ تھا، خلیفہ بدل سکتا ہے لیکن عوام اور

ان کے حوصلے ہمیشہ باقی رہیں گے، ان حالات کو دیکھکر شوقی نے بھی اپنی شاعری کا رخ قصر شاہی سے عوام کی طرف پھیر دیا اور مسلمان عوام اور نوجوانوں کو اپنا مخاطب بنایا۔

۱۹۲۳ء میں انگریزی عدالت سے سزا پانے والے مصری جب قید سے چھوٹ کر واپس آئے تو شوقی نے گرمجوشی سے ان کا خیر مقدم کیا، ان کی کوششوں کو سراہا اور انھیں ملک کی آزادی کیلئے جدوجہد کا نیا پیغام دیا،

یا مصر اشبال العرین ترعرعت	ومشت الیک من السجون اسودا
طلبوا الجلاء علی الجہاد مثوبۃ	لم یطلبوا اجر الجہاد زہیدا
یا فتیۃ النیل السعید خذوا (المدی)	واستانفوا النفس الجہاد مدیدا
انتم غدا اہل الامور وانما	کنا علیکم فی الامور وفودا
فابنوا علی اسس الزمان وروحہ	رکن الحضارۃ باذخا وشدیدا
انی نظرت الی الشعوب فلم اجد	کالجہل داء للشعوب مبیدا

(اے مصر الجہاد کے شیر قید خانوں سے نکل کر تیرے پاس پہنچ گئے
جہاد کا ثواب انھوں نے سامراج کی جلا وطنی کی صورت میں طلب کیا اور یہ اجر مناسب ہے
اے وادی نیل کے جوانو! ہتھیار سے مسلح ہوکر اپنا جہاد پھر شروع کرو
کل ملک کی باگ ڈور تمھارے ہاتھ میں ہوگی اور ہم تمھارے پیغامبر
زمانہ کے حالات کے مطابق تہذیب وتمدن کی مضبوط عمارت تعمیر کرو
قوموں کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ جہالت سے زیادہ مہلک کوئی بیماری نہیں ہے)[1]

اس دور کے اشعار کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کا رخ خلیفہ کے بجائے عوام کی طرف ہوگیا اور ان کی شاعری عوام کے جذبات کی ترجمان بن گئی، اس دور میں شوقی نے جو مرثیے لکھے

---

[1] شوقیات ج ۱ ص ۱۲۲

ان میں بھی عوام ہی کی طرف توجہ دی اور اس کو حوصلہ بلند رکھنے کا پیغام سنایا۔ طرابلس کے لیڈر "عمر المختار" کو اٹلی نے پھانسی کی سزا دی تھی، ۱۹۳۱ء میں شوقی نے ان کا مرثیہ لکھا، اس میں عوام کو خطاب کرتے ہوئے ان کی اس طرح حوصلہ افزائی کی

یا ایھا الشعب القریب اسامع فاصوغ فی عمر الشھید رثاء

ذھب الزعیم وانت باق خالد فانقد رجالک واختر الزعماء

(لوگو! شہید عمر کے بارے میں میرا مرثیہ سنو لیڈر چلا گیا لیکن تم لوگ باقی رہوگے، اپنے لوگوں میں سے کسی کو پرکھ کر اپنا رہنما منتخب کر لو[1])

اس دور کی شاعری میں اگرچہ شوقی نے اسلامی اتحاد کی دعوت کو نہیں دہرایا، کیونکہ خلافت کا نظام ختم ہونے کے بعد قوم پرستی کا دور شروع ہو گیا تھا، مگر شوقی اپنے پرانے نظریہ پر قائم تھے، جس کا اظہار انھوں نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔

مذہبی اشعار کے اس مختصر جائزہ سے یہ ظاہر ہوگا کہ شوقی سچے اور مخلص اسلامی شاعر تھے مسلمانوں کے مسائل اور اسلامی تعلیمات سے انھیں محبت تھی، اور وہ اسلامی بنیادوں پر مسلمانوں کی اصلاح چاہتے تھے۔ ان کے دل میں ان کے لیے تڑپ تھی۔ علامہ اقبال کے علاوہ کوئی دوسرا شاعر ایسا نہیں نظر آتا جس نے اتنی ہمہ گیری کے ساتھ اسلامی مسائل پر اظہار خیال کیا ہو، خود شوقی کو بھی اس کا احساس تھا، ایک شعر میں کہتے ہیں:

کان شعری الغناء فی فرحۃ الشرق وکان العزاء فی احزانہ

(مشرق کی خوشی میں میرے اشعار نغمہ طرب اور اس کے غم کے وقت باعث تسلی ہوتے ہیں)

---

[1] الشوقیات ج ۳ ص ۱۰۷

کلکتہ کی ایران سوسائٹی کی سلور جوبلی

از پروفیسر مسعود حسن، صدر شعبۂ عربی مولانا آزاد کالج کلکتہ

ملک کی مشہور علمی، ادبی اور ثقافتی انجمن ایران سوسائٹی کلکتہ کی تاسیس، ۲؍اگست ۱۹۴۴ء کو ہوئی تھی، اس مدت میں اس نے جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اس نے جو شہرت حاصل کی ہے، ان سب کی وجہ سے وہ بجا طور پر اسکی مستحق تھی کہ اس کی ۲۵ ویں سالگرہ کی تقریب اسکے شایان شان منائی جائے، اس کے محترم بانی اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد اسحٰق نے اس کی تیاری شروع کر دی تھی، اور اس کے سلور جوبلی سوونیر کی تیاری میں مشغول تھے کہ اچانک قلب کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے عالم جاودانی کو سدھارے، خداوند تعالیٰ انکی تربت پر رحمت کے پھول برسائے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ۔۔۔ سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ڈاکٹر صاحب مرحوم سوسائٹی کے روح رواں اور معمار اعظم تھے، انھوں نے اس کو اپنے خون جگر سے پروان چڑھایا تھا، وہ اپنی صحت کو خطرے میں ڈالکر دن رات اس کے کاموں میں لگے رہتے تھے، ان کی وفات سے سوسائٹی کے کارکنوں کو صدمۂ عظیم پہنچا، ان کی روح کی تسکین کی خاطر سوسائٹی کی سلور جوبلی کی تقریب اور بھی ضروری سمجھی گئی، اس کے لیے ۷؍۸؍۹؍مارچ ۱۹۷۰ء کی تاریخیں مقرر ہوئیں، سلور جوبلی سوونیر کی ترتیب کا بڑا حصہ ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم اپنی زندگی میں انجام دے چکے تھے، اسکی تکمیل و طباعت کے مختلف مرحلے سوسائٹی کے جواں سال و جواں ہمت نائب صدر جناب خواجہ محمد یوسف نے طے کیے، وہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی میں ان کے دست و بازو تھے، اور اب ان کی وفات کے بعد سوسائٹی کے قلب و جگر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں،

۱۸ مارچ کو ۵ ½ بجے شام یہ تقریب شروع ہوئی، اس کے لیے میدان میں ایک شاندار شامیانہ نصب کیا گیا تھا، جو برقی قمقموں، پھول کے ہاروں اور رنگین پردوں سے آراستہ تھا۔ سوسائٹی کے اراکین کلکتہ کے تعلیمی اداروں کے اساتذہ، اعلیٰ سرکاری افسروں، مجلس قانون ساز کے ممبروں اور دوسرے معززین کے علاوہ بیرون کلکتہ سے نمائندوں کی اچھی خاصی جماعت شرکت کے لیے آئی تھی جن میں گجرات سے پروفیسر کاؤس جی ڈاور، مدراس سے ڈاکٹر حیدر علی خاں، پٹنہ سے پروفیسر سید حسن، پروفیسر علی حیدر، بھاگلپور سے پروفیسر صدر الدین احمد اور دہلی سے ڈاکٹر حکیم الدین قریشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایران سوسائٹی کا یہ پہلا اجتماع تھا جس میں ڈاکٹر صاحب موجود نہیں تھے، اسوقت انکے عقیدتمندوں کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔

آج لیکن ہمنوا! سارا چمن ماتم میں ہے   شمع روشن بجھ گئی بزم سخن ماتم میں ہے

تقدس مآب ڈاکٹر لک ڈا ساوٹے ل ہندوستان، پاکستان اور سیلون کے میٹرو پولیٹن تشریف لائے، تقدس مآب کو جلسے اور اس کی نمائش کے افتتاح کرنے کی زحمت دی گئی تھی۔ جناب محمد علی اکبر کاشانی نے جو نہ صرف سوسائٹی کے سابق اور موجودہ صدر بلکہ اسکے محسن اعظم بھی ہیں، تقدس مآب میٹرو پولیٹن اور تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا، ڈاکٹر محمد اسحٰق صاحب کے دست راست جناب عبدالمجید صاحب ضیا نے جو ان دنوں قائم مقام جنرل سکریٹری ہیں، اختصار کے ساتھ سوسائٹی کی تاریخ اور خدمات پر روشنی ڈالی، اسکے بعد سب سے پہلے پروفیسر ڈاور نے ایک طویل فاضلانہ تقریر کی جس میں انھوں نے ہندوستان اور ایران کے قدیم ادبی و ثقافتی تعلقات پر روشنی ڈالی۔ پھر ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ نے جو سوسائٹی کے سرگرم رکن اور نائب صدر رہ چکے ہیں، اپنے خاص انداز میں ایک پرجوش تقریر کی، ریاست کے مشہور اشتراکی لیڈر اور مجلس قانون ساز کے رکن سید ابو المنصور حبیب اللہ اور ڈاکٹر اے ایم اوحدی کی تقریریں بھی دلچسپی سے سنی گئیں، میٹرو پولیٹن کا فصیح شگفتہ اور دلنشین خطبہ سب کو پسند آیا، انھوں نے ہمسایہ ملکوں کی زبانوں کے سیکھنے اور ان سے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔ اسکے بعد جناب صدر کی تحریک پر ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کی یاد میں خاموشی کا ایک منٹ کا وقفہ ہوا، اس رسم کو تمام

حاضرینِ جلسہ نے تعظیماً کھڑے ہو کر ادا کیا۔ مسٹر پولا دیان پرنسپل آرمینس کالج نے جو سوسائٹی کے سابق صدر رہ چکے ہیں اور موجودہ خازن ہیں، مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ ایک مختصر سی ضیافت کے بعد افتتاحیہ اجلاس تقریباً ۹ بجے ختم ہوا، اب تقدس مآب ہیرو پر لین ہنڈ ال سے سوسائٹی کی عمارت میں تشریف لے گئے اور وہاں انھوں نے علمی نمائش کے افتتاح کی رسم انجام دی، یہ نمائش سوسائٹی کے ہال میں کی گئی تھی، ایک میز پر سوسائٹی کی تقریباً ڈیڑھ درجن مطبوعات قرینہ سے رکھی گئی تھیں، دوسری میز پر اسکے سہ ماہی رسالہ انڈو ایرانیکا کی جلدیں سجی ہوئی تھیں، جو ۱۹۴۶ء سے باقاعدہ جاری ہے، ایک طرف جناب ڈاکٹر اسحٰق مرحوم کی تصنیفات خراج عقیدت وصول کر رہی تھیں، دوسری جانب فارسی کی قلمی اور نادر کتابیں جو ایشیاٹک سوسائٹی اور انڈین میوزیم سے مستعار لی گئی تھیں، اصحاب ذوق کی ضیافت کا سامان پیش کر رہی تھیں، ایرانی آرٹ سے متعلق بہت سی تصویریں دیواروں پر آویزاں کی گئی تھیں، فارسی رسائل وجرائد کا ایک ذخیرہ جو ایران سوسائٹی کی ملک ہے، توجہ کا مرکز بنا رہا، نمائش کے ایک حصہ میں رکھی ہوئی کچھ مطبوعات فارسی ادب کے سلسلہ میں بنگال کی خدمات کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

۸ مارچ کی شام کو سلور جوبلی کا عام اجلاس تھا، یہ جشن کی سب سے بڑی تقریب تھی، اس روز شامیانہ کی تزئین وآرائش میں پہلے سے زیادہ اہتمام کیا گیا تھا۔ عزت مآب شری پی بی مکرجی قائم مقام چیف جسٹس مغربی بنگال جو اس اجلاس کی صدارت فرمانے والے تھے، سب سے پہلے تشریف لائے۔ پھر ہز ایکسلنسی آقائی امیر تیمور سفیر شاہنشاہی ایران رونق افروز ہوئے، اس اجلاس کے مہمان خصوصی تھے، انھوں نے صرف اس جشن میں شرکت فرمانے کے لیے دہلی سے کلکتہ کے سفر کی زحمت گوارا کی تھی، سب سے آخر میں ہز ایکسلنسی شری شانتی سروپ دھون گورنر مغربی بنگال کی تشریف آوری ہوئی، وہ اپنی مختلف مشغولیتوں کے باوجود تقریب کے افتتاح کے لیے تشریف فرما ہوئے تھے جناب علی اکبر کاشانی اور جناب خواجہ محمد یوسف کی قیادت میں سوسائٹی کے عہدیداروں نے پنڈال کے پھاٹک پر ان تینوں معزز مہمانوں کا پرتپاک خیر مقدم کیا، کارروائی ۶ ½ بجے شروع ہوئی، آرمینین کالج کے طلبا وطالبات نے ہندی اور ایرانی ترانے موسیقی کے درمیان خوش الحانی سے گائے، استقبالیہ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے کاشانی صاحب نے

اپنا سپاسنامہ پڑھا، ایران و ہند کے قدیم ثقافتی رشتہ کا ذکر کرتے ہوئے اسکا اعتراف کیا کہ ہندوستان اپنی لمبی تاریخ کے ہر دور میں تہذیب ثقافت کے ہر شعبہ میں ایران کا ممنون رہا ہے، انھوں نے فارسی علم و ادب سے بنگال کی دلچسپی کا بھی ذکر فرمایا اور حافظ کا یہ مشہور شعر پڑھا جسے انھوں نے بنگال کے فرمانروا سلطان غیاث الدین کو لکھکر بھیجا تھا:

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند   زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

خواجہ محمد یوسف صاحب عثمانی نے نائب صدر جمہوریہ ہند شری جی۔ ایس پاٹھک، وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی، اسپیکر لوک سبھا ڈاکٹر جی ایس ڈھلون، اسپیکر مغربی بنگال شری بجوئے کمال بنرجی، میئر کلکتہ کارپوریشن شری پرساتنا کمار اور حیدرآباد کے مشہور مورخ اور ماہر تعلیم پروفیسر ہارون خاں شیروانی کے پیغامات تہنیت پڑھکر سنائے، دارالمصنفین کی جانب سے مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے جو پیغام بذریعہ تار بھیجا تھا اسے بھی سنایا گیا، گورنر موصوف کا خطبہ نہایت اہم، مفید اور پر از معلومات تھا، انھوں نے ہندوستان اور ایران کے باہمی تعلقات کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ "ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے ساتھ یہ رابطہ ختم ہو گیا تھا، شکر ہے کہ دونوں ملکوں کی مکمل آزادی کے بعد یہ از سر نو شروع ہو گیا ہے۔" ہز اکسلنسی کے مندرجہ ذیل جملے خاص طور پر بڑی توجہ سے سنے گئے۔

"ایرانیوں کو یہ فخر حاصل ہے اور بجا طور پر فخر حاصل ہے کہ رگ وید کی پہلی آیت ایران کی سرزمین میں نازل ہوئی۔۔۔۔ ہمارے ملک کا سب سے قدیم نام نہ بھارت ہے اور نہ آریہ ورت بلکہ "ہند" ہے، جو ہمیں ایران نے عطا کیا ہے۔۔۔۔ فارسی ادب اپنی بیشمار دلچسپ حکایات کی وجہ سے مشہور ہے، آپ انھیں اصل فارسی زبان میں پڑھیے اور ان کا لطف اٹھایئے،۔۔۔۔ مجھے بہت سی فارسی کہانیاں یاد ہیں۔۔۔۔ میں پیشنگوئی کر سکتا ہوں کہ یہ عظیم الشان فارسی زبان ایک دن وسط ایشیا، تاجکستان، ازبکستان، آذربائیجان، ایران، افغانستان اور ہندوستان کے درمیان رابطہ کی زبان بن جائیگی۔۔۔۔ فارسی دنیا کی سب سے خوبصورت زبان ہے۔۔۔ ایک مرتبہ میں روس گیا تھا وہاں مجھے اپنی ٹوٹی پھوٹی فارسی میں باتیں کرنے کا موقع ملا تھا، اور اسی وقت مجھے پہلی بار اس آریہ زبان کی بین الاقوامی اہمیت کا اندازہ ہوا تھا۔۔۔"

جناب خلیل الرحمٰن ڈپٹی مجسٹریٹ نے اپنا فارسی قصیدہ پڑھا جو اس موقع کے لیے لکھا گیا تھا، اسکے بعد کاشانی صاحب نے سلور جوبلی کے موقع پر شائع ہونے والے مجموعۂ مقالات کا ایک ایک نسخہ گورنر مغربی بنگال، سفیر ایران، اور قائم مقام چیف جسٹس کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کیا، یہ مجموعہ ۴۰۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اور ایک مختصر دیباچہ، ایران سوسائٹی کے تفصیلی تعارف اور ۵۲ محققانہ علمی مقالات پر مشتمل ہے، مقالات کی فہرست درج ذیل ہے:-

(حصۂ انگریزی) ۱- فرخ بیگ کی بنائی ہوئی ابراہیم عادل شاہ ثانی کی تصویر- از پروفیسر نذیر احمد، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ (۲) ایک یہودی فارسی مناظرہ، از پروفیسر جے پی آسمس موس، کوپن ہاجن یونیورسٹی (۳) ہندوستان میں ایران سے آنے والے آرمنی، از مسز اینی جیل کلکتہ (۴) تصوف کا سنہرا رشتہ، از پروفیسر فردوز کاؤس جی داور، گجرات یونیورسٹی- (۵) مطیعی کی گنج معانی، از ڈاکٹر ضیاء الدین عبدالحئی ڈیسائی، ارکیالوجیکل سروے آف انڈیا۔ (۶) ترک افاغنہ کے عہد میں عربی و فارسی ادبیات کی ترقی میں بنگال کا حصہ، از ڈاکٹر جیبن موئے دت، کلکتہ یونیورسٹی، (۷) جدید فارسی کردار از ڈاکٹر ولیم ایلر، مغربی جرمنی (۸) محمد عارف شیدا، از ڈاکٹر عبدالحمید فاروقی، گجرات کالج احمد آباد (۹) خراسان میں عربی زبان، از پروفیسر رچرڈ این فرائی، ہارورڈ یونیورسٹی (۱۰) ایک ہندستانی حکمراں اور انقلاب فرانس، از پروفیسر مجیب الحسن، جامعہ ملیہ دہلی، (۱۱) فارسی شاعری کا باوا آدم، رودکی، از ڈاکٹر محمد اسحٰق کلکتہ (۱۲) جیمز موریر اور حاجی بابا اصفہانی، از ڈاکٹر حسن جوادی (۱۳) منوچہر کی رائے میں ایک کامل خدا پرست کا تصور از پروفیسر ایم ایف کانگا (۱۴) گمشدہ پہلوی ادب کی جھلکیاں، از جمشید کاؤس جی کٹراک (۱۵) ۱۹۰۵ء-۱۱ء کے دوران ایران کا دستوری انقلاب، از پروفیسر نکے آر کڈی، (۱۶) قدیم ایران سے متعلق گیارہویں صدی کی ایک عربی اندلسی تصنیف کا ایک باب، از ڈاکٹر محمد صابر خاں کلکتہ، (۱۷) محمد تقی بہار مصور فطرت کی حیثیت سے از پروفیسر فرانسس زک اچالسکی، (۱۸) پارسیوں کی سنسکرت تحریریں، از ڈاکٹر ایچ کے مرزا (۱۹) رودکی کے اشعار کا ایک جعلی مخطوطہ، از پروفیسر عبدالغنی مرزوئف (۲۰) فارسی زبان کے ہندی الاصل شعراء، از مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن دارالمصنفین اعظم گڈھ (۲۱) مرلک میں پائے گئے ایرانی ہل کے نمونے، از ڈاکٹر ادمس سیلون

(۲۲) قدیم فارسی کتبی تحریر کا ایک کتبہ، از ریورینڈ ر الف نورمن شارپ (۲۳) قطب شاہی حکومت کے آخری دور کے ثقافتی حالات، از پروفیسر ہارون خان شروانی حیدرآباد۔

فارسی و عربی حصہ: (۲۴) ملک الشعراء بہار، از پروفیسر شاہ اسلام شاہ محمد روف (۲۵) مسألۃ صفات الذاکرین والمتفکرین للسلمی، از مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی کلکتہ۔

دوسری تقریر ہز ایکسلنسی آقائی امیر تیموری کی تھی انھوں نے انگریزی میں بلیغ اور مؤثر انداز میں ایک طویل تقریر کی۔ آپ نے پہلے ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کی علمی و ادبی صلاحیتوں اور ان کی ایران دوستی اور فارسی ادبیات سے غیر معمولی دلچسپی کی تعریف کی، پھر ایران سوسائٹی کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اسے اپنا خراج تحسین عطا کیا، ایران و ہند کے قدیم روابط کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ہندوستان کی قیمتی خدمات کا اعتراف کیا، پھر جدید ایران کی علمی، ادبی، تعلیمی اور اقتصادی ترقیوں کی تفصیلات پیش کیں، اس کے بعد قائم مقام جنرل سکریٹری نے لکھی ہوئی رپورٹ پیش کی جس میں انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے سوسائٹی کی پچیس سالہ اہم کارگزاریوں کی تفصیل بتائی، پھر دو مختصر تقریریں مسٹر جسٹس تعلقدار اور مسٹر مودک سابق ممبر انڈین سوشل سروس کی ہوئیں، اول الذکر نے فارسی ادب کے شاہکاروں کو بنگلہ زبان میں منتقل کرنے کی طرف توجہ دلائی، موخر الذکر کئی موقعوں پر سوسائٹی کے صدر رہ چکے ہیں، اور شروع سے اس کی سرپرستی فرما ان کی تقریر سوسائٹی کی محبت اور سوسائٹی کے بانی سے مخلصانہ عقیدت کے جذبات سے لبریز تھی۔

جناب خواجہ محمد یوسف صاحب کی درخواست پر جناب صدر تقریر کے لیے کھڑے ہوئے، انھوں نے بڑے خلوص سے کارکنان سوسائٹی کا شکریہ ادا کیا، اور انھیں جشن سیمیں کی کامیابی پر دلی مبارک اور ایران سے اپنی محبت کا اظہار کرنے کے بعد انھوں نے فرمایا:

"..... ہندوستان ایران کی اس سرزمین کو ہمیشہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھے گا جو گلستاں بوستاں اور گل داستان محبت کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہے، ایران عشق، محبت، علم اور فنون لطیفہ کی جنت ارضی ہے۔۔ مجھے امید ہے کہ ایران سوسائٹی دونوں ملکوں کے درمیان مفاہمت اور دونوں ملکوں کی زبان، مذہب، تہذیب اور سب سے بڑھ کر ان دونوں کی انسان دوستی کو نشو و نما دینے کی ہر ممکن سعی کرے گی۔"

ایران سوسائٹی کی بہتری تقریبات کی جناب صدر، اور حاضرین کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ترجمان ہمیشہ خواجہ محمد یوسف صاحب کا نام خطاب ہوتا ہے چنانچہ اس موقعہ پر بھی انھوں نے یہ فرض بڑے سلیقہ سے انجام دیا، اس سلسلے میں انھوں نے بنگال میں مشرقی علوم کی اہم خدمات کی طرف جو اشارے کیے وہ بہت مفید اور برمحل تھے۔

مسٹر کاشانی صدر سوسائٹی کی طرف سے ایک مختصر سی ضیافت کے بعد یہ اجلاس تقریباً دس بجے شب کو ختم ہوا۔

تیسرے دن ۸ مارچ کو جشن سیمیں کی آخری تقریبات تھیں، اور شام کے علاوہ دن کا پروگرام بھی تھا، سب سے پہلے ۹ بجے صبح کو سوسائٹی کے ہال میں مقالہ خوانی کا جلسہ عالیجناب ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب کی صدارت میں شروع ہوا، ڈاکٹر صاحب موصوف اپنی پیرانہ سالی اور بے شمار مصروفیتوں کے باوجود تشریف لائے، خواجہ محمد یوسف صاحب نے اپنی تعارفی تقریر میں بجا طور پر کہا کہ "ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب ہندستان میں علوم اسلامیہ کے ماہرین کی صف میں ایک بڑی ممتاز حیثیت کے مالک ہیں"۔ اسکے بعد حسب ذیل مقالات پڑھے گئے، افسوس ہے کہ وقت کی قلت کی بنا پر ان پر بحث کے لیے موقع نہیں نکالا جا سکا،

(۱) قدیم ایران (انگریزی) از پروفیسر فیروز کاؤس جی داور، احمد آباد (۲) پہلوی دور حکومت میں ایران کا تعلیمی نظام (فارسی) از آقای محمد مہدی شیبانی، تہران (۳) بھاگلپور کی تاریخ (انگریزی) از پروفیسر صدالدین احمد صاحب بھاگلپور (۴) فارسی در تامل ناڈو (فارسی) از پروفیسر حیدر علی خان صاحب مدراس (۵) ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کے متعلق میرے تاثرات (...) از پروفیسر سید حسن صاحب پٹنہ (۶) نگرشی چند بسیمین ایکے از فضلاء بزرگ عربی و فارسی در کلکتہ (فارسی) از ڈاکٹر اکرم برقی صاحب کلکتہ (۷) سیر تحول روابط ایران در عصر حاضر (فارسی) از ڈاکٹر حکیم الدین صاحب دہلی (۸) شمع علم کے پروانے (انگریزی) از پروفیسر علی حیدر نیر صاحب پٹنہ (۹) شوریدہ شیراز (انگریزی) جناب عبد المجید صاحب کلکتہ۔

دوران ... ختم ہونے کے بعد جناب صدر نے اپنے خطبہ میں بالاختصار اسلامی عہد کے ان علما کا ذکر کیا جو ہندستان اور
عربی اور ... یہاں پائے جاتے تھے اور جنھوں نے اسلامی تاریخ و تمدن پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں، انھوں نے فارسی زبان
واشعار ... اس کا ذکر فرمایا اور قصیدہ کے کلام سے مختلف نمونے پیش کرکے انکی تشریح کی۔

... خوانی ختم ہونے کے ساتھ ہی سلور جوبلی لنچ کی شاندار ضیافت ہوئی جس میں کم و بیش دو سو مہمانوں نے شرکت کی۔ ... آقائے امیر تیمور سفیر ایران نے بھی اپنی شرکت سے اس دعوت کو زینت بخشی

۱۱ جام ہو لیے، جلسہ کی کاروا
ن صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ اور سائٹی کی سلور جو

شام کا پروگرام ادبی و تفریحی تھا، صدارت کے فرائض جناب
شارپ (۲۳) قطب شاہی حکومت
محترمہ بیگم صغریٰ آسنر بادی، جناب علقمہ شبلی استاد فارسی مدرسہ عالیہ کلکتہ، جناب ...

حضرت امیر رضا کاظمی سابق ہیڈ ماسٹر مدرسہ عالیہ کی اردو اور فارسی نظموں سے شروع ہوئی جو جشن کے لیے لکھی گئی تھیں۔ سب سے پہلی تقریر پروفیسر ڈاورکی تھی، دوسری تقریر ڈاکٹر حیدر علی صاحب نے کی جو بڑی شستہ، سنجیدہ اور مفید تھی، معزز مقرر نے ہندوستان کی درسگاہوں کے نصاب میں عربی اور فارسی دو زبانوں کی افادیت پر بڑی مدلل بحث کی، ان کا یہ بیان بھی بہت پسند کیا گیا کہ موت نے ہم سے صرف ڈاکٹر محمد اسحٰق صاحب کا خاکی جسم چھین لیا ہے، ان کی روح اب بھی سوسائٹی کے کاموں میں ہماری نگرانی اور رہنمائی کر رہی ہے اور کرتی رہے گی، آخری تقریر محترمہ لیڈی رانو کمرجی کی تھی، یہ رابندر ناتھ ٹیگور کی عزیز شاگرد رہ چکی ہیں، اور مغربی بنگال میں آرٹ اور دیگر فنون لطیفہ کی بڑی قدر دان ہیں، وہ سوسائٹی کی نائب صدر بھی رہ چکی ہیں، انھوں نے اپنی تقریر میں اپنے قیام ایران کے دلکش تاثرات بیان کیے، مہمانوں اور کارکنوں کا شکریہ ادا کرنے کی خدمت مسٹر رستم سکلات نے انجام دی جو سوسائٹی کے بڑے سرگرم رکن ہیں،

اس کے بعد ایک تمثیلی مشاعرہ ہوا، اسٹیج پر سب سے پہلے رودکی، پھر فردوسی، پھر سعدی، پھر پروین اعتصامی نمودار ہوئیں، ان چاروں نے اپنے حالات زندگی انگریزی میں بیان کیے، پھر اپنا منتخب کلام اپنی بیاض سے پڑھ کر سنایا اور رخصت ہوئے، یہ سارے کردار آمینین کالج کے طلبہ اور طالبات نے بڑی کامیابی سے ادا کیے، جس کے لیے کالج کے پرنسپل مسٹر بولادیان اور کالج کے فارسی کے استاد آقائی مہدی شیخانی مبارکباد کے مستحق ہیں، اسی کالج کی ایک لڑکی نے کئی فارسی نظمیں اور ایرانی نغمے، ایرانی لہجہ اور ایرانی دھن میں بڑے سلیقہ سے گائے

مطبوعات جدیدہ

تاریخ بیہق ۔ مرتبہ جناب ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ صاحب حسینی، بڑی تقطیع، کاغذ بہتر، کتابت طباعت ٹائپ، صفحات ..، قیمت [illegible]، ناشر دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد،

ابو الحسن علی بن ابو القاسم زید بیہقی چھٹی صدی ہجری کے نامور علماء مصنفین میں تھے، عربی و فارسی میں انکی متعدد کتابیں ہیں، ان میں تاریخ بیہق (فارسی) زیادہ اہم اور مشہور ہے، یہ بیہق کے متعلق مفید و متنوع معلومات پر مشتمل ہے، اس میں پہلے علم تاریخ کی اہمیت، مختلف ملکوں کے نام اور ان کے متعلق اہم کتب تاریخ کی فہرست ہے، پھر بیہق کے فضائل، وہاں آنے والے صحابہ، اس کی فتح، آب و ہوا، مشہور مقامات، معزز اور حکمران خاندانوں کا ذکر اور بیہق کے فضلاء و مشاہیر فن، شعراے فارسی اور دیگر ارباب کمال کے تراجم اور اہم حوادث و وقائع قلمبند کیے ہیں، اس کے تین قلمی نسخوں کا ابتک پتہ چل سکا ہے، جو برٹش میوزیم لندن، برلن اور تاشقند کے کتبخانوں ب ہیں، ان میں برٹش میوزیم کا نسخہ سب سے قدیم، مکمل، صحیح اور خوشخط ہے، کئی سال پہلے ایران کے لائق فاضل حمد بہمنیار نے اسی نسخہ کو اصل اور دوسرے دونوں نسخوں کو مد نظر رکھکر تاریخ بیہق کا مکمل متن تصحیح و مقابلہ کے بعد حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع کیا تھا، اس کے شروع میں آقا محمد عبدالوہاب قزوینی کا ایک اہم اور پر از معلومات مقدمہ بھی ہے، اب مشہور فاضل ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی حیدرآبادی نے تینوں ی نسخوں کی مدد سے اس کو دوبارہ ایڈٹ کیا ہے، گو اس میں بہمنیار کے مرتبہ نسخہ کی طرح تعلیقات نہیں ہیں لیکن اشی میں متن کی تصحیح میں بڑی تدقیق و کاوش سے کام لیا گیا ہے، اور آخر میں تین مختلف فہرستیں بھی دیگئی ہ، سب سے آخر میں مرتب نے بیہقی کے حالات اور کمالات، تاریخ بیہق اور اس کے قلمی نسخوں کے بارہ میں

ایک جامع مقدمہ انگریزی میں لکھا ہے، فاضل مرتب اس علمی و تحقیقی کارنامے پر مبارکباد کے مستحق ہیں
لیکن حیرت ہے کہ انھوں نے کاؤن کے چاپخانہ سے شائع ہونے والے ایڈیشن کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

اسلام اور اس کا آئین حکومت
اسلام و اشتراکیت
} مرتبہ جناب غلام محمد صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت غنیمت، صفحات ۴۴ و ۴۰، قیمت بالترتیب ۷۵ پیسے و ۷۵ پیسے، پتہ نمبر ۱ مسیح گڑھ، ڈاکخانہ جامعہ نگر، نئی دہلی، دوسری کتاب کا پتہ: ۲۴، بی امر کالونی، مارکیٹ، و جیت نگر، نئی دہلی ۲۴۔

پہلے کتابچہ میں اسلام کے آئین حکومت اور دوسرے میں اسلامی اشتراکیت کے خد و خال پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، گو ہر بات قرآنی آیات کی سند سے لکھی گئی ہے لیکن اسلام کے بجائے ترجمانی اشتراکیت کی زیادہ ہوگئی ہے، یہ دونوں کتابچے تمامتر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تفسیر ترجمان القرآن (سورہ توبہ) سے ماخوذ و منقول ہیں، اور اس کو چھپانے کے لیے ایک ہی سلسلۂ بیان میں چند سطریں ایک جگہ کی لی گئی ہیں اور چند سطریں دوسری جگہ سے لیکن تحریر خود بولتی ہے کہ مولانا کا قلم ہے، بعض بعض عبارتیں تو بجنسہ نقل کر دی گئی ہیں، اور بعض میں معمولی تبدیلی کر دی گئی ہے، لیکن دیباچہ یا کتاب کے کسی صفحے پر نہ کہیں مولانا کا نام آنے پایا ہے اور نہ ان کی تفسیر کا حوالہ ہے۔ جہاں مصنف نے خود اپنی طرف سے کچھ لکھا ہے اور وہ بہت ہی کم ہے، وہاں انھوں نے آیتوں کا غلط سلط مطلب نکالا ہے، خود مولانا کے یہاں جو غلطیاں ہیں، وہ اس میں بھی رہ گئی ہیں، مولانا کی عبارتیں چونکہ ادھر ادھر سے لے کر ایک سلسلۂ بیان میں جوڑ دی گئی ہیں، اس لیے ان میں ربط و ترتیب نہیں ہے۔

"ض"

مصنفات مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

اسوۂ صحابہ: (حصہ اول) قیمت: عـہ

اسوۂ صحابہ: (حصہ دوم) ״ ہشے

اسوۂ صحابیات: ״ عاہ

تاریخ فقہ اسلامی: فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات کی تفصیل: قیمت: غلہ

حکمائے اسلام: (حصہ اول) دوسری صدی ہجری سے لیکر خاندانِ فرنگی محل تک کے مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات، قیمت: غلہ

حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متاخرین حکمائے اسلام کے حالات، قیمت: سعہ

شعر الہند (حصہ اول) ״ غلہ

شعر الہند (حصہ دوم) ״ لعہ

۹- انقلاب الامم: مشہور فرنچ مصنف ڈاکٹر لیبان کا ایک کتاب کا انشا پردازانہ ترجمہ قیمت: للعہ

۱۰- سیرۃ عمر بن عبدالعزیز: (زیر طبع)

۱۱- امام رازی: امام فخرالدین رازی کے سوانح اور ان کی تصنیفات: قیمت ہشے

۱۲- ابن خلدون: ابن خلدون کے سوانح زندگی اور اس کے فلسفہ کی تشریح (زیر طبع)

۱۳- اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کے مفصل سوانح حیات کے ساتھ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کی تفصیل، ان کے فلسفۂ خودی کی تشریح، اور ان کے فارسی و اردو اشعار کا بہترین انتخاب قیمت سے

مقالات عبدالسلام

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ان گرانقدر تصنیفات و تالیفات و تراجم کے علاوہ سیکڑوں علمی و فقہی ... تنقیدی ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعر کے دواوین اور بعض اہم ادبی کتابوں پر ریویو ... بھی لکھے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح ان کے مضامین کی ترتیب و اشاعت بھی دارالمصنفین کے ... پیش نظر ہے، یہ مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین و خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زبان و ادب و شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے، صفحات: ۲۴۶ قیمت: عہ منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(اڈیٹر معارف کی نئی کتاب)

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام
کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے، اور جس کی آپ اپنی مکی و مدنی زندگی میں ۲۳ برس تک
مسلسل تبلیغ فرماتے رہے، وہ اس کرۂ خاکی کے تمام انسانوں کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت، بلا امتیاز
نسل و رنگ و بلا لحاظ زاد و بوم سراپا رحمت ہے، اور اسی پر عمل کرنے اور اسی کے بتائے ہوئے نقشہ
مطابق زندگی اختیار کرنے سے انسان فوز و فلاح کی منزل تک پہونچ سکتا ہے، اس کتاب
انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں مختلف ا
کے تحت نہایت تفصیل کے ساتھ اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، اُن کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ
اسلام ہی نہیں، بلکہ اُس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ خیر و برکت کا خزینہ اور تمام کائنات کے
رحمت ہے، ذیل کے چند ابواب سے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہوسکتا ہے، اسلام میں عورت کا
درجہ اور اُن کی حیثیت، غلاموں کے حقوق، اور تاریخ اسلام میں اُن کا مرتبہ، بلا تفریق مذہب
پڑوسیوں کے حقوق، عام انسانوں کے حقوق جن میں اہل کتاب اور مشرکین عرب غیرہ سب
غیر مسلم رعایا کے حقوق، حیوانات کے حقوق، اور ان کے متعلق اسلام کی تعلیمات، آخر کے دو ابواب
دنیا پر دین اسلام کے علمبردار مسلمانوں کے علمی احسانات، اُن کے علمی کارناموں، اور مختلف علوم
فنون کے ایجادات و اکتشافات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

ضخامت:- ۳۲۰ صفحے، قیمت:

مینجر دارالمصنفین اعظم گڈھ